English	Urdu
Civics	مدنیات
Motives	محرکات
Occupations	مشاغل
Pragmatism	مصرف پسندی
Project Method	منصوبی طریقہ
Faculty Psychology	نفسیات انشعابی
Structural Psychology	نفسیات ترکیبی
Fedoral Government	وفاقی حکومت
Heuristic Method	طریقۂ دریافت
Amateur	عطائی
Will-to-power	عزم للقوۃ
Scientific Method	علمی طریقہ
Social	عمرانی، معاشری
Idealism	عین پسندی
Active, Activity	فعالی ، فعالیت
Efficiency	کارکردگی
Dynamic	متحرک ، حرکی
Environment	ماحول

فہرست مصطلحات

ذیل میں اُن اصطلاحوں کی فہرست دی جاتی ہے جو کتاب میں استعمال کی گئی ہیں - چونکہ بہت سی اصطلاحوں کے متعلق اتفاق رائے نہیں ہے اس لیے کوشش یہ کی گئی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آسان اور قابل فہم الفاظ منتخب کیے جائیں :—

Concentration of Studies اجتماع مطالعہ
Social Efficiency اجتماعی افادہ
Impressions ارتسامات
Tests آزمائشیں۔
Communist اشتمالی
Utilitarian افادی، افادیت پسند
Values اقدار
Passive انفعالی
Individuality انفرادیت
Transfer of Training انتقال قوت اکتسابی
Informal Education بےضابطہ تعلیم

Prestige Suggestion تاثیر تفوق
Suggestion تاثیر خیال
Psychoanalysis تحلیل نفسی
Scepticism تشکیک
Socialization of Education تعلیم کی معاشری تنظیم
Continuation Education تعلیم مزید
Creative تخلیقی
Gatharsis تنقیہ
Instinct جبلت
Correlation of Studies ربط مضامین نصاب
Impulse رجحان
Formal صوری

فہرست کتب

(مصنفوں اور کتابوں کی فہرست جن کے حوالے اس کتاب میں دیے گئے ہیں - صفحوں کے نمبر مقابل میں درج ہیں)

گ

ل

م

اصول تعلیم

مفصل فہرست مطالب
(باعتبار حروف تہجی)

ا

کیونکہ اس میں انہیں ہر قسم کے ارباب غرض کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی، عوام کے توہمات اور تعصبات کو رفع کرنا ہوگا اور مخالفتوں کے اصلی اسباب کو دور کرنے کے طریقے سوچنے پڑیں گے - ان سیاسی اور اقتصادی اختلافات کی اہمیت کو گھٹا کر دکھانے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا - ہمیں صاف صاف اس بات کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ مختلف فرقوں کے مطالبات کو ہم‌آہنگ کرنا ایک بہت کٹھن کام ہے جس کے لیے نہ صرف قانونی فیصلے اور آئینی تصفیے کی ضرورت ہے بلکہ لوگوں کی ذہنیت کو بدلنا ہے اور انہیں یہ احساس دلانا ہے کہ ان کے باہمی اختلافات تھوڑے اور عارضی ہیں اور ان عظیم‌الشان مقاصد کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے جو سب فرقوں میں مشترک ہیں - اور ان عارضی اختلافات کی خاطر مستقل مفاد اور مقاصد کو قربان کر دینا دانشمندی کے خلاف ہے - اگر مدرسے کی تعلیم نوجوان طلبہ میں ہمدردی، رواداری اور احترام حیات کے جذبات پیدا کرے، جو مذہبی سیرت کے اہم اجزا ہیں، تو وہ ان اختلافی مسائل کے حل کرنے میں بھی معقولیت، شائستگی، اور حسن مراعات کو ہاتھ سے نہ دیں گے، بحث و مباحثے میں وہ تلخی اور ناگواری پیدا نہیں ہوگی جو ہماری موجودہ سیاسی زندگی کا جزو لازم ہو گئی ہے - اس طریقے پر مذہبی تعلیم دینے سے نہ صرف مذہب کے دامن سے یہ شرم‌ناک دھبا دھل جائے گا، بلکہ یہ تعلیم ہمارے ملکی اور سیاسی معاملات کے سلجھانے میں بھی بہت مدد دے گی اور لوگوں میں فصل پیدا کرنے کے بجائے وصل کا جاں‌فزا پیغام سنائے گی -

ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتی - لہذا ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہے کہ وہ اس پورے مسئلے پر احتیاط کے ساتھ غور کریں اور ایسے ذرائع اختیار کریں کہ مغربی تعلیم کے قابل قدر عناصر ' یعنی سائنس اور صنعت و حرفت اور معاشری علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ طلبہ میں ان مذہبی قدروں کا احترام بھی پیدا ہو جو مذہبی تہذیب کی روح رواں سمجھی جاتی ہیں - ہندوستانیوں کے فرقہ وارانہ اختلافات نے نہ صرف ان کی قومی عزت اور سیاسی وقار کو خاک میں ملا دیا ہے بلکہ خود مذہب کے رخ روشن کو گرد آلود کر دیا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں بہت سے سمجھ دار اور تعلیم یافتہ لوگوں کا دل اس کی طرف سے پھیر دیا ہے - لیکن ہمارا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ ان اختلافات کی اصلی وجہ مذہب نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی اغراض ہیں جن کو بعض بے حمیت اور خود پرست لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مذہبی رنگ دے دیا ہے اور وہ عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر کے اپنا کام نکالتے ہیں - یہ بیچارے اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے اور آسانی سے ان لوگوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں - وہ اپنے نزدیک مذہب کی حمایت میں جانی اور مالی نقصان اُٹھاتے ہیں جس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کو مذہب سے قلبی محبت ہے خواہ وہ اس کا اظہار اپنی عاقبت ناشناسی کے وجہ سے غلط طریقے پر کریں - اس صورت حال کی اصلاح کی ذمہ داری صرف معلموں ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ملک کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کرے - یہ کام آسان نہیں ہے

بےپرواہ ہوں اور اِس کے احکام پر عمل نہ کریں لیکن اُن کے قلب کی گہرائیوں میں مذہب کا احترام موجود ہے اور وہ کسی ایسے نظام تعلیم کی دل سے قدر نہیں کرسکتے جو اُن کو محض حصول معاش میں مدد دے اور اس سے زیادہ اِس کا کوئی مصرف نہ ہو - ممکن ہے بادی‌النظر میں یہ راے صحیح نہ معلوم ہو کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل والدین باوجود ہر قسم کی مالی دقتوں کے اپنی اولاد کو یہی مغربی تعلیم دلا رہے ہیں اور اِس کے لیے اپنی ذات پر ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ وہ اس تعلیم سے مطمئن ہیں - وہ اس کو واسطہ یا ذریعہ سمجھتے ہیں کوئی قدر مستقل نہیں مانتے - اس کے مقابلے میں ان کے دل میں اس پرانے نظام تعلیم کی زیادہ قدر ہے جو بہت تنگ اور محدود تھا لیکن کم سے کم اس میں مذہبی تربیت پر زور دیا جاتا تھا - چنانچہ ابتدا میں تنگ خیال مذہبی پیشواؤں نے مغربی تعلیم کو بالکل ہی ناجائز قرار دے دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ ضروریات زمانہ سے مجبور ہوکر لوگوں نے اس کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ اب وہ اُس کے حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہیں - لیکن جب تک اِس تعلیم کا رشتہ مذہب کے ساتھ نہ جوڑا جائے گا اس کا اثر سطحی اور محدود ہوگا یعنی زیادہ سے زیادہ اس سے علم اور واقفیت میں اضافہ ہوگا ' تمدنی زندگی کے ظاہری پہلو کی تھوڑی بہت اصلاح ہوگی لیکن ہمارے جذبات اور عقائد کی دنیا اور ہماری شخصی اور قومی تہذیب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہو سکتا اور زندگی کے اہم اور اصلی مقاصد کے حصول میں یہ

تکمیل رہا ہو حقیقی مذہبی جذبے پر دلالت کرتا ہے - لہذا جب ہم کہتے ہیں کہ تعلیم کو مذہب کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے اور مذہبی جذبے کی تربیت میں حصہ لینا چاہیے تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معلم کو طلبہ میں قدروں کا احساس، احترام حیات، رواداری و ہمدردی، عزت نفس، اور حقیقی انکسار کے جذبات پیدا کرنے چاہییں۔ یہاں مذہبی تربیت کے انتظام اور طریقوں سے بحث کرنے کا موقع نہیں اور نہ اس کی گنجائش ہے - لیکن ہم اب تک جن تعلیمی اصولوں سے بحث کرچکے ہیں ان پر غور کرنے سے اس کے متعلق بھی بعض اہم نتائج نکل سکتے ہیں مثلاً یہ کہ مذہبی تربیت کے لیے سب سے زیادہ اہم اور اثر آفریں عنصر معلم کی شخصیت ہے جو براہ راست طلبہ کی شخصیت اور نظام اقدار کی تشکیل کرتی ہے - اور اس کے بعد مدرسوں میں معاشری اور اخلاقی زندگی کی تنظیم، مختلف مذاہب کے خیالات کا بےتعصبانہ مطالعہ، طلبہ کے دل میں عالم فطرت کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا کرنا، فنون لطیفہ کے ذریعے ان کے وجدان کو نشو و نما دینا، ان کے لیے اپنے بنی نوع کی خدمت کے مواقع فراہم کرنا، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو مناسب طریقے پر استعمال کیا جائے تو وہ مذہبی تربیت میں معین ہو سکتی ہیں -

موجودہ ہندوستانی تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ مذہب سے بالکل بےتعلق ہوگئی ہے اور طلبہ میں مذہبی روح کو بیدار نہیں کرتی - اسی وجہ سے عوام کو کبھی اس سے سچی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی - خواہ وہ بظاہر مذہب کی طرف سے

کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے مخصوص عقائد کی تعلیم دیں - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدرسہ مذہبی تربیت کے فرض سے بالکل سبکدوش سمجھا جائے - مذہبیت کا جذبہ ایک عام احساس ہے جو مختلف مذاہب میں مشترک ہے - اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں - مثلاً ایک سچے مذہبی آدمی کو روحانی قدروں کا احساس ہوتا ہے اور یہ یقین کہ انسان کی شخصیت' دنیاوی زندگی کا چراغ گل ہو جانے' سے فنا نہیں ہوتی بلکہ روحانی ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہتی ہے - اس کے دل میں زندگی کا گہرا احترام ہوتا ہے خواہ اس کا جلوہ انسانوں میں نظر آئے یا حیوانوں میں یا مناظر فطرت میں' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ زندگی وہ عطیۂ الہی ہے جس کا بدل دنیا کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی - اسی وجہ سے اس کے دل میں رواداری اور ہمدردی کا وہ حقیقی جذبہ ہوتا ہے جو اتحاد اغراض مقاصد پر نہیں بلکہ احساس نوعی پر مبنی ہے - مگر جہاں وہ انسانی شخصیت کی عزت کرتا ہے وہاں یہ بھی جانتا ہے کائنات کے مقابلے میں انسان کی ہستی بہت چھوٹی ہے اور اس کی علمی ترقی اور تسخیر فطرت کے زبردست کارناموں کے باوجود اس کا علم اور قوت بہت محدود ہے - یہ خیال اس کے دل میں سچا عجز اور انکسار پیدا کرتا ہے جس کی شناخت یہ ہے کہ اس کے قوائے عمل کو معطل نہیں کر دیتا بلکہ اس کو جد و جہد کی دعوت دیتا ہے - نیوٹن (Newton) جیسے زبردست سائنس داں کا یہ قول کہ اس کے علم کی مثال سائنس کے بحر زخار کے سامنے ایسی ہے جیسے کوئی بچہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا کنکریوں سے

کی نہایت گہری اور شدید نفسی ضروریات کو پورا کرتا ہے' اس کی نظر کو عارضی اور وقتی چیزوں سے ہٹا کر دائمی اور ابدی حقائق سے روشناس کرتا ہے اور اس کے اور خالق کائنات کے درمیان وہ تعلق قائم کرتا ہے جو اس کی شخصیت کی تکمیل کے لیے لازمی ہے - اگر مذہب ایک بے معنی لفظ ہو' اگر روح اور خدا کا تصور انسانی دماغ کے توہمات کا نتیجہ ہو اور انسان بھی مثل اور کیمیاوی مرکبات کے محض کیمیاوی اور طبیعی مادوں اور قوتوں کا مجموعہ ہو تو انسانی زندگی کی حقیقی اور ابدی اہمیت باقی نہیں رہتی - یہ ممکن ہے کہ بعض اشخاص باوجود لامذہب ہونے کے اپنے معاشری احساس اور عقل کی بدولت اعلیٰ تمدنی اور اخلاقی اصولوں کی پیروی کریں لیکن عام لوگوں کے لیے اِس بات کا امکان بہت کم ہے - کیونکہ عقل اور اخلاق کے اصول خشک اور مجرد ہوتے ہیں ان میں وہ کشش اور تاثیر نہیں جو مذہبی عقائد میں ہوتی ہے - علاوہ بریں مذہب کا دائرہ اخلاق کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے اور اس میں ایسے تجربات اور مسائل بھی آجاتے ہیں جن کا موضوع افراد کے باہمی تعلقات نہیں ہیں بلکہ ہر فرد کی اپنی روحانی زندگی ہے- جو شخص مذہب کے اثر سے بالکل محروم رہا ہے اس کے شخصی ارتقا کا یہ پہلو بالکل معطل رہے گا -

ظاہر ہے کہ مذہب ان چیزوں میں سے ہے جو سکھائی نہیں جاسکتیں - جہاں تک سرکاری مدرسوں کا تعلق ہے ان کے لیے یہ بات نہ تو ممکن ہے نہ مناسب ہے' کہ وہ اپنے طلبہ کے لیے ہر مذہب کے عقائد و عبادات کی تعلیم کا انتظار کریں - یہ فرض طلبہ کے والدین اور مذہبی جماعتوں پر عائد ہوتا ہے

اپنی سیرت کی تشکیل میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے ملک میں ہمیشہ سے تہذیب اور مذہب کا گہرا اور قریبی تعلق چلا آتا ہے - لہٰذا تعلیم کو، جو افراد کے لیے تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے اور انہیں اس کا حامل بناتی ہے، مذہب کی اہمیت کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے - یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہماری جدید تاریخ کے صفحات ان فتنوں اور خون ریزیوں کے بیان سے آلودہ ہیں جن کی ذمہ‌داری بظاہر مذہب یا اختلاف مذاہب پر عائد ہوتی ہے اور اس وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ جن کی نظر سطح سے گزر کر تہ تک نہیں پہونچتی ہے سرے سے مذہب ہی سے بددل ہو گئے ہیں اور انہیں اس الم‌ناک صورت حال کا علاج یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کو قطعاً ترک کر دیا جائے - لیکن ان کا یہ خیال ایک بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس میں شکست پسندی کا رنگ جھلکتا ہے - حقیقت امر یہ ہے کہ مذہب کوئی خارجی لباس نہیں کہ اسے جب چاہیں پہن لیں جب چاہیں اُتار پھینکیں - جاپان کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں سے ایک کمیشن یورپ بھیجا گیا تھا کہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کر کے رپورٹ پیش کرے کہ جاپانی قوم کے لیے کون سا مذہب سب سے زیادہ موزوں ہوگا - اگر یہ قصہ صحیح ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ عجیب و غریب حرکت کی تھی ان کو مذہب کے مفہوم اور منشا سے مطلق واقفیت نہیں - مذہب محض چند رسوم اور عبادات کا نام نہیں جنہیں انسان سیکھ لے اور ادا کردیا کرے - وہ انسان کی روحانی فطرت کا مظہر ہے اس

تیرا مرض تجبی سے ہے تجھ کو نظر نہیں

جرم صغیر سمجھے ہے تو اپنے آپ کو

پوشیدہ تجھ میں عالم اکبر مگر نہیں

اِس "جرم صغیر" یعنی انسان کی ذات میں عالمِ اکبر

کو تلاش کرنا اور اس کو پا لینا تعلیم اور تہذیب کا منتہائے

کمال ہے - لیکن جو لوگ ہر وقت خارجی مقاصد اور مادی

منافع کی طلب میں مصروف رہتے ہیں انہیں اپنی تہذیب

نفس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی - ادب

اور فنون لطیفہ سے محظوظ ہونا ، فطرت کے خوبصورت مناظر

سے لطف اور سکون قلب حاصل کرنا ، کبھی کبھی دنیاوی

مکروہات اور جد و جہد سے پیچھا چھڑا کر اپنے نفس کی

گہرائیوں کا مشاہدہ کرنا اور اپنی زندگی کا جائزہ لینا ، یہ تمام

باتیں بھی انسانی شخصیت کی تکمیل کے لیے اسی طرح

ضروری ہیں جس طرح قوت یا دولت کے لیے جد و جہد کرنا۔

جہاں حیات انسانی کے ارتقاء کے لیے عقل کی ضرورت ہے

وہاں اُس اعلیٰ تر قوت وجدان کی تربیت بھی لازم ہے جس

پر مشرق کے ارباب فکر ہمیشہ سے اور مغرب میں برگسان اور

اس کے ہم خیال آج کل زور دے رہے ہیں، جس کے واسطے سے

انسان کائنات اور خالق کائنات کی معرفت حاصل کرتا ہے -

ہندوستان میں تعلیم کا جو نظریہ یا فلسفہ مرتب کیا جائے

اُس میں یہ پہلو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی

ہندوستانی تہذیب کی اِمتیازی خصوصیت ہے -

مذہب اور مذہبیت کو نہ ڈیوئی نے واضح طور پر سیرت

کے عناصر میں شمار کیا ہے نہ رسل نے - لیکن ہم ہندوستانی

کرنا تو نہ ممکن ہے نہ قرین مصلحت، اس لیے ہمیں رواداری کی صفت پیدا کرنی چاہیے تاکہ ذہنی اور معاشری زندگی میں امن و امان قائم رہے اور ترقی کی صورت نکلے -

جس طرح رواداری کے بغیر ذہنی آزادی اور جرأت سے ناگوار نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے ' اسی طرح لوگوں میں قوت عمل محنت ' جد و جہد اور حوصلہ مندی کی نشو و نما بھی اندیشے سے خالی نہیں اگر اس کے ساتھ ہی امن پسندی ' قناعت' اور مشاہدۂ نفس کی تربیت نہ کی جائے جو ہندوستانی تہذیب کی خصوصیات رہی ہیں - بے شک فوری ضروریات کی وجہ سے ہمیں فعالیت پر زیادہ زور دینا چاہیے - لیکن ان کی خاطر ہم ان مستقل اور ابدی قدروں کو قربان نہیں کرسکتے جن کی آغوش میں پرورش پاکر انسانیت اوج کمال کو پہنچتی ہے - جو تعلیم اور تہذیب افراد میں رشک اور مسابقت کے جذبات کو فروغ دیتی ہے' اور دنیاوی جاہ و قوت کے لیے مجنونانہ جد و جہد کو ضروری سمجھتی ہے وہ انسانیت کے مرتبے کو بہت پست کر دیتی ہے - انسانی سیرت میں توازن اور سکون کی ضرورت ہے تاکہ انسان اپنی خودی کا اظہار محض خارجی اشیا کی طلب اور جستجو میں نہ کرے بلکہ ان خزانوں کو بھی ٹٹولے جو اس کی ذات میں پنہاں ہیں اور ان سے مستفید اور لطف اندوز ہو - حکیم اسلام ' علی مرتضیٰ کے ایک شعر کا کسی شخص نے اُردو ترجمہ کیا ہے جس میں انسان کی نفسی گہرائیوں اور روحانی خزانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :—

تیری دوا تجھی میں ہے تجھ کو خبر نہیں

رواداری نہیں - اس کو بےپروائی کہنا زیادہ مناسب ہوگا -
بعض لوگوں نے اس ذہنی روش کو جو تشکیک پر مبنی ہے
بہت وقعت دی ہے اور وہ اس کو روشن خیالی اور ذہنی
آزادی سمجھتے ہیں - لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کی
بےپروائی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے نقص پر دلالت کرتی ہے
اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے کوئی خاص معیار اخلاق
یا نظام اقدار قائم نہیں کیا اور اس کی زندگی کسی زبردست
اصول یا مقصد کے ساتھ وابستہ نہیں ہے - ہم جس رواداری
کے خواہاں ہیں وہ عقائد کی پختگی کے منافی نہیں بلکہ
اس کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم
زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اپنے خیالات اور عقائد رکھتے
ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں لیکن اصولاً اور عملاً دوسروں کے
اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بالکل مختلف
خیالات اور عقائد رکھیں - ہم اپنی رائے کا اظہار جوش اور
خلوص کے ساتھ کرتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنا ہم رائے
بنا لیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم بردباری اور خندہ پیشانی
سے اپنے مخالفوں کی رائے سننے کے لیے تیار رہیں اور اس
اختلاف رائے کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں کسی قسم
کی ناگواری پیدا نہیں ہوتی - مبادلۂ خیال، بحث و مباحثہ،
اختلاف رائے، علمی اور عقلی ترقی کی جان ہیں بشرطیکہ
ہمدردی اور رواداری کی فضا موجود ہو - ہمارے ملک کی
حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہے کہ ذرا سے اختلاف خیال کی وجہ
سے آپس کے لڑائی جھگڑے کا دروازہ کھل جاتا ہے جس میں
قومی عزت اور قوت کا خون ہوتا ہے - اختلاف خیال کو دور

سبق بھی دے تاکہ وہ بےتامل اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیا کریں - اس سبق کو اس خوبی اور استحکام کے ساتھ عملی اور نظری طور پر ان کے ذہن نشین کرنا چاہیے کہ ان کی زندگی اور فلسفۂ زندگی کا جزو بن جائے -

اگر ہم ان صفات کے وسیع‌ترین معنی لیں تو ان میں وہ سب باتیں آجاتی ہیں جو ہم اپنے طلبہ کی سیرت میں پیدا کرنا چاہتے ہیں - لیکن الفاظ کو محض ذاتی رائے کی بنا پر اِس قدر وسعت دینا مناسب نہیں کیونکہ ہر شخص کا معہود ذہنی مختلف ہوتا ہے اور اس وجہ سے ان کے مفہوم کے متعلق اتفاق رائے بہت مشکل ہو جائے گا اس لیے اس بحث کے خاتمے پر بہت اختصار کے ساتھ ہم اتنا اور بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی طلبہ کی سیرت کی تربیت میں تین امور کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا ضروری ہے - تربیت جذبات کے ضمن میں ہم نے ہمدردی کی صفت پر بہت زور دیا ہے - لیکن اپنے ملک کے مخصوص حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں ہمدردی کے ساتھ ساتھ ایک اور جذبے کی تربیت کرنی چاہیے جس کا تعلق عقل اور جذبات دونوں سے ہے یعنی رواداری' دوسروں کی رائے اور خیالات اور جذبات کا اتنا ہی احترام کرنا جیسا ہم اپنے خیالات اور جذبات کا کرتے ہیں - رواداری کی ایک قسم تو وہ ہے جو آج کل کے تعلیم یافتہ طبقے میں پیدا ہو رہی ہے' یعنی چونکہ اکثر معاملات میں وہ خود کوئی پختہ اصول و عقائد نہیں رکھتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک کسی اصول یا عقیدے کی کوئی خاص اہمیت نہیں' سبھی ایک سے ہیں - یہ حقیقی

کو صداقت پر ترجیح دے - دنیا میں کوئی شخص اتنا بلند مرتبہ نہیں کہ اس کے لیے صداقت کے سامنے سر جھکانا ذلت کا باعث ہو - دنیاوی وجاہت اور مرتبے کے لحاظ سے نہیں بلکہ سیرت اور اخلاق کے اعتبار سے جو بزرگ‌ترین ہستیاں گزری ہیں ان سب میں یہ صفت مشترک تھی کہ انہوں نے کبھی اپنی ذاتی عزت کو صداقت سے بڑھ کر نہیں جانا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں کیا - جمہوریت اور انفرادی آزادی کے زمانے میں کسی شخص کو خاص کر ان لوگوں کو جو اپنے ہم‌جنسوں کی سرکردگی اور رہنمائی کرتے ہیں اس قسم کی اخلاقی جرأت کے بغیر چارہ نہیں - کسی پالیسی یا پروگرام کو وقت اور حالات کے مقتضا کے مطابق چلانے کے لیے دماغی قابلیت اور اخلاقی جرأت دونوں درکار ہیں - اگر کوئی مدبر یا سیاسی لیڈر اس قدر ذہین اور دانشمند ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات کو دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسے کیا طریقہ عمل اختیار کرنا چاہیے لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ دوسروں کی رائے یا اپنی سابقہ رائے کی مخالفت کرسکے تو ملک کو اس کی دماغی قابلیت سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ؟ اسی طرح اخلاقی جرأت بھی بجائے خود کامیابی کی ضامن نہیں ہوسکتی جب تک انسان میں اتنی قابلیت نہ ہو کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کر کے فیصلہ کرسکے کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے - لہذا تعلیم کا فرض یہ ہے کہ جہاں طلبہ میں زمانہ شناسی کا ملکہ پیدا کرے اور انہیں آزادی کے ساتھ اپنے عقائد کا اظہار اور ان پر عمل کرنا سکھائے وہاں صداقت کے سامنے سر جھکانے کا

سیاست ' معاشرت ' اقتصاد' مذہب' غرض ہر شعبۂ زندگی میں ارباب غرض جن کے ہاتھ میں عوام کی باگ ہے یہی چاہتے ہیں کہ ان میں غور و فکر کی عادت نہ پیدا ہو اور وہ آنکھیں بند کیے ہوئے مقررہ راستوں پر چلتے رہیں - تعلیم کا انقلابی فرض یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو ان بزرگوں کے احکام کی تنقید کرنا سکھائے اور ان میں اتنی ہمت پیدا کرے کہ وہ خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اپنی عقل کے فتوے پر عمل کریں -

اخلاقی جرأت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کا تعلق دوسروں سے نہیں بلکہ خود ہماری ذات سے ہے اور جس کی ضرورت غالباً اس حالت میں بھی ہوتی اگر بجائے معاشری زندگی بسر کرنے کے بالکل تنہائی کی زندگی بسر کرتے - اکثر لوگوں میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرسکیں - وہ جانتے ہیں کہ ان کی فلاں بات غلط ہے یا فلاں کام خلاف عقل و انصاف ہے لیکن وہ گویا اپنے ہی نفس سے اس درجہ مرعوب اور خوف زدہ ہوتے ہیں کہ انہیں یہ ہمت نہیں پڑتی کہ اپنی غلطی کو صاف صاف تسلیم کریں - ایسے لوگ نفس کے بندے بن کر رہ جاتے ہیں وہ اس چیز کو وضع‌داری سمجھتے ہیں کہ جو بات ایک دفعہ کر بیٹھیں اس پر اڑیل ٹٹو کی طرح اڑے رہیں کیونکہ ان کے خیال میں رائے یا عمل کی تبدیلی سبکی اور ذلت کا باعث ہے - اس میں شک نہیں کہ دوسروں کے سامنے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ ہم فلاں مسئلے میں غلطی پر تھے یا ہم سے فلاں معاملے میں خطا ہوئی - لیکن ہم ہرگز ایسے شخص کی سیرت کا احترام نہیں کر سکتے جو اپنی عزت کو بلکہ عزت کے ایک غلط تصور

عقیدوں پر پختگی کے ساتھ قائم رہنا ' ان کو دوسروں کی خوشنودی کی خاطر تبدیل نہ کرنا' جب ضرورت ہو اپنی رائے بےدھڑک ظاہر کر دینا ' اور حق گوئی کی خاطر ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا - جب تک ہم اس بات کے لیے آمادہ نہ ہوں گے کہ بقول شیکسپیر :

"سچی بات کو جو ہمارے دل کے اندر ہے ڈنکے کی چوٹ کہہ دیں" نہ معاشرے کے خیالات کی اصلاح ہوگی نہ وہ قدامت پرستی کے پنجے سے چھوٹے گا - ہماری قوم میں بدقسمتی سے اس ذہنی جرأت کی بہت کمی ہے اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں جنہیں زبان خلق کا خوف نہ ہو اور اپنے سچے خیالات اور عقائد کو ظاہر کرنے سے نہ جھجکیں - یہی وجہ ہے کہ بہت سی معاشری اور اخلاقی خرابیاں جن کو لوگ اپنے دل میں برا سمجھتے ہیں بدستور قائم ہیں - حال میں زیادہ تر سیاسی اثرات کی وجہ سے لوگوں نے پہلے کی نسبت زیادہ دلیری کے ساتھ ان خرابیوں کے خلاف جنگ شروع کی ہے - لیکن محض اتنی بات کافی نہیں - جب تک ہمارے روزمرہ کے تعلقات اور کاروبار میں اس روش کا اظہار نہ ہوگا اور لوگ آزادی کے ساتھ تنقید کرنا اور خندہ پیشانی سے اس کو برداشت کرنا نہ سیکھیں گے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذہنی یا اخلاقی جرأت ہماری سیرت کا جزو ہو گئی ہے - ہماری تہذیب کی قدامت کی بدولت ہمارے یہاں رسوم و روایات کا بار اس قدر زیادہ ہوگیا ہے کہ اکثر لوگوں کی زندگی ' قول اور فعل دونوں کے اعتبار سے ' محض رسمی اور تقلیدی ہو کر رہ گئی ہے اور وہ کہیں بھی اس آزادی کا اظہار نہیں کرتے جو فطرت انسانی کا سب سے قیمتی عطیہ ہے -

حوصلے اور ہمت میں اضافہ ہو - قدیم سپارٹا کے مدبرین ' انگریز فلسفی جان لاک اور مشرق کے اکثر مفکرین جسم کو مضبوط کرنے اور اس کو قابو میں لانے کے لیے جو ریاضتیں تجویز کرتے ہیں وہ یقیناً ایک حد تک ضروری ہیں - لیکن اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ جسمانی آسائش اور آرام کی خواہش کو مارنا یا دبانا چاہیے - یہ خیال موجودہ نفسیات اور اخلاقیات دونوں کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے - لیکن ہم راحت جسمانی کو مقصود بالذات نہیں بنانا چاہتے کہ انسان بالکل نفس پرست اور آرام طلب ہو جائے ' سوائے اپنے عیش کے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہ رکھے یا اُن تمام باتوں سے احتراز کرے جن میں کسی قسم کی جسمانی تکلیف کا اندیشہ ہو - ہم جسم کو روح کا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان مقاصد کی تحصیل میں معین ہو جنھیں ہم عقلاً اور اخلاقاً مناسب سمجھتے ہیں - اسی وجہ سے آج کل ماہرین تعلیم ایسی جسمانی تربیت پر زور دے رہے ہیں جس کی بدولت بچوں اور نوجوانوں کو اپنے قوائے جسمانی پر پورا قابو حاصل ہو جائے ' اور ان میں جھجک اور بزدلی قائم نہ رہے - ہمارے خیال میں اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ تعلیم کا مطمح نظر بالکل تبدیل کردیا جائے اور وہ بجائے "سفید پوش شرفا" پیدا کرنے کے ' جو کسی قسم کی محنت سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوں ' ایسے مستعد مزدور یعنی آمادۂ عمل افراد پیدا کرے جو کمر ہمت باندھ کر ہر قسم کے مفید اور دولت آفریں کام کرنے کے لیے تیار رہیں -

اخلاقی اور ذہنی جرأت سے ہماری مراد ہے اپنے اصولوں اور

تہذیب و تمدن پر مسلط ہے - لیکن ان امور میں جن میں فعالی حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے ہندوستانی عموماً ناکام رہے اور مجموعی طور پر یہ افسوسناک نتیجہ نکلا کہ چین اور بعض اور ایشیائی ممالک کی طرح ہمارا ملک بھی ترقی کے دور میں مغربی ملکوں سے پیچھے رہ گیا - تعلیم کا فرض ہے کہ وہ قومی سیرت کی اس کمزوری کی اصلاح کرے اور ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے طلبہ میں ہمت، استقلال، مستعدی اور محنت کی عادتیں نشو و نما پائیں تاکہ وہ دنیا کی نظروں میں اپنی شخصی عزت اور قومی وقار دونوں کو قائم رکھ سکیں -

جرأت کو خواہ ہم ڈیوئی کی طرح قوت عمل کا جزو قرار دیں یا رسل کی طرح ایک مستقل اخلاقی قدر مانیں بہر صورت اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتے - شخصی اور قومی سیرت کی تکمیل کے لیے زندگی کے ہر پہلو میں جرأت کی ضرورت ہے - یعنی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی جرأت کی تربیت ہماری تعلیم کا ایک لازمی جزو ہونا چاہئیے - جسمانی جرأت گو بجائے خود اعلیٰ ترین جرأت نہیں لیکن اس کا ایک لازمہ ضرور ہے کیونکہ جو شخص ہر قسم کی جسمانی تکلیف سے ڈرتا ہے وہ ہرگز ایسا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا، جس میں دوسروں کی ناراضگی کا اندیشہ ہو، ہرگز ایسے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا جو رائے عامہ کے خلاف ہوں - ہندوستانی طلبہ میں مدرسے کے مشاغل، معاشری زندگی کی تنظیم، اور کھیلوں اور ورزشوں کے ذریعے جسمانی تکالیف برداشت کرنے کی عادت پیدا کرنی چاہئیے اور انہیں ایسے کٹھن اور مشکل کاموں میں لگانا چاہئیے جن سے ان کے

چارہ نہیں - اب ہم اپنے مدرسوں کی حالت پر نظر ڈالیں تو بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے معلموں کو عقلی اور علمی تربیت کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور وہ اپنی ساری کوشش اسی میں صرف کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اور ضروری چیزوں سے غافل ہوگئے ہیں - لیکن جیسا ہم کتاب کے دوسرے حصے میں بتا چکے ہیں انہوں نے نہ عقلی تربیت کا مفہوم صحیح سمجھا ہے نہ اس کے لیے مناسب ذرائع اختیار کیے ہیں اور موجودہ صورت حال کی اصلاح ان طریقوں پر ہونی ضروری ہے جن کی تفصیل ہم کر چکے ہیں -

تیسری صفت یعنی قوت عمل میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہیں اور انسان کو اپنے ارادوں اور مقاصد کو پورا کرنے میں مدد دیتی ہیں - مغربی قوموں کے مقابلے میں ہندوستانیوں میں قوت عمل کی بہت کمی ہے ' خواہ ہم قومی سیرت پر غور کریں خواہ افراد کی سیرت پر - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جو فلسفۂ زندگی رائج رہا ہے وہ فکر اور سکون ' عزت اور گوشہ‌نشینی کو زندگی کے جد و جہد اور کشمکش میں شریک ہونے پر ترجیح دیتا تھا - ہندو فلسفے میں ترک دنیا کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے - مسلمانوں میں بھی مذہباً تو نہیں لیکن ملکی حالات اور معاشرتی انحطاط کے اثر سے قناعت اور تقدیر پرستی بہت بڑھ گئی ہے - ان چیزوں کی وجہ سے ہندوستانیوں میں بعض قابل قدر صفات بھی پیدا ہوئیں اور وہ ایک حد تک اس مہلک مقابلے اور رقابت سے محفوظ رہے جو گزشتہ سو برس سے نہایت شدت کے ساتھ مغربی

کی ادائیگی سے پہلوتہی نہیں کر سکتا - اسی طرح زندگی کے کسی شعبے میں بھی ذہنی تربیت کے بغیر کام نہیں چل سکتا - مثلاً ہر نوجوان کو پیشے کے انتخاب کے مسئلے سے سابقہ پڑتا ہے - اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ طبقے کو جو الجھنیں اس مسئلے میں پیش آتی ہیں انہیں دور کریں تو ہمیں طلبہ کی عقلی تربیت میں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ وہ ملک کے اقتصادی امکانات اور وسائل معاش سے واقف ہوں تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ذاتی مفاد اور قومی فلاح کے لیے مناسب طریقے پر استعمال کر سکیں - اسی طرح ہمیں جو بےشمار اصلاحی مسائل درپیش ہیں ان سب کو خاطر خواہ حل کرنے کے لیے علوم کی اشاعت اور ذہنی بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے - بیماری کا انسداد، صفائی اور حفظان صحت کا انتظام، افلاس کا رفع کرنا ، جماعتی اختلافات اور فرقہ بندیوں کی اصلاح، یہ سب کام اسی وقت انجام پاسکتے ہیں جب شہریوں کی معقول ذہنی تربیت کے وسائل مہیا کیے جائیں - اسی کی بدولت ان میں ایسی قوت اجتہاد پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ ترقی کی راہیں نکالیں اور جس طرح دوسری قوموں نے علم کے ذریعے فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرکے بےاندازہ قوت، اور عظمت حاصل کی ہے اسی طرح وہ بھی سائنس کی تحقیقات اور ایجادات کی مدد سے اور اپنے ملک کے قدرتی وسائل کو کام میں لاکر ، اپنی قومی اور اجتماعی حیثیت کو بڑھائیں اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں جگہ پائیں - خواہ ہم انسانی سیرت کی تربیت کے متعلق کوئی نظریہ بھی اختیار کریں ہمیں عقلی اور ذہنی تربیت کی اہمیت تسلیم کیے بغیر

ارتقاء کی ہر منزل میں ذہنی تربیت کا محتاج رہا ہے لیکن قدیم زمانے میں وہ اپنے ماحول سے براہ راست بہت کچھ ذہنی اور عملی تربیت حاصل کر لیتا تھا اور یہ اس کو بہت سے کاموں میں مدد دیتی تھی - لیکن اب اس ضمنی تعلیم پر قناعت کرنا ممکن نہیں بلکہ تعلیمی اداروں کا ایک وسیع اور باقاعدہ نظام مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے ہر شہری کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے عام مدنی اور شخصی فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر سکے - ہمیں ہر ہر قدم پر ایسے مسائل پیش آتے ہیں جن کا کوئی مسلّمہ حل موجود نہیں - ہر روز ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جن میں مروجہ طریقے کام نہیں دیتے - بلکہ تربیت یافتہ عقل اور قوت فیصلہ کی ضرورت پڑتی ہے - کچھ زمانے کے بعد یہ بات اور زیادہ عام ہو جائے گی - مثلاً ہر شخص کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ اپنی رائے دہندگی کے حق کو کس طرح استعمال کرے' کس شخص یا کس پارٹی کے حق میں اپنا فیصلہ دے - اس کو یہ جاننے کی ضرورت ہو گی کہ ان پارٹیوں کے کیا کیا اصول ہیں اور ان میں کس بنا پر اختلافات ہیں' اور اگر ان میں سے کسی کی تجاویز کو عمل میں لایا جائے تو اس سے ملک کی حالت پر کیا اثر پڑے گا - اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو ان باتوں کا مفصل علم ہونا چاہیے یعنی ہر شخص کے لیے سیاست‌داں بننا ضروری ہے - لیکن یہ امر بدیہی ہے کہ عام سیاسی مسائل سے تھوڑی بہت واقفیت ہر شخص کے لیے لازمی ہے تاکہ وہ ان کے متعلق معقول رائے دے سکے اور ایک جمہوری ریاست میں کوئی شہری اس فرض

خیالات اور مقاصد رکھنے والے گروہوں کو ایک متحدہ معاشرے یا قوم میں تبدیل کرتا ہے - لیکن یہ احساس محض انفعالی نہیں ہونا چاہیے ' بلکہ جذبات کے جوش اور حرارت کی بدولت اس میں حرکت اور قوت عمل پیدا ہوجانی چاہیے - ہماری مذہبی تعلیم اور ہمارے تہذیب و تمدن میں اس احساس پر اِنتہائی زور دیا گیا ہے اور قدیم ہندوستانی معاشرے کی بنیاد سراسر اسی یکسجہتی اور باہمی وابستگی کے احساس پر قائم تھی جس کا کچھ اندازہ اب بھی کہیں کہیں دیہاتی زندگی کی شیرازہ بندی کو دیکھ کر ہو سکتا ہے -

اب رہا علم' تو اِس کو ہمارے مذاہب نے جو رتبہ دیا ہے وہ اِس بات سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم صدیوں تک مذہبی گروہوں کا مخصوص مشغلہ رہ چکی ہے یہاں تک کہ اِس پر مذہبی رنگ غالب آگیا اور اِس کے مقاصد اِس کی حدود' اس کا نصاب یہ سب چیزیں مذہبی عقائد کی پابند ہو گئیں - موجودہ زمانے میں ہمارے ملک کی علمی اور تعلیمی ترقی کی رفتار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے اور ہمارا علمی معیار بہت گرا ہوا ہے - اس امر کو تسلیم کرنے میں ہمیں باک نہیں ہونا چاہیے خواہ اس کے وجوہ ہم کچھ قرار دیں - لہذا یہ امر کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ علم یا ذہنی تربیت جس کو رسل ذہانت کہتا ہے ہمارے لیے بیحد ضروری ہے - سائنس اور صنعت و حرفت کی بےاندازہ ترقی نے زندگی کے نظام کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے کہ اس میں کامیابی کے ساتھ حصہ لینے کے لیے ہر فرد کی ذہنی تربیت لازم ہو گئی ہے - یوں تو انسان معاشرتی

ہم سب سے پہلے جذبات کی تربیت کو لیتے ہیں جس سے ہمارا یہ منشا ہے کہ طالب علم میں ایسا اجتماعی احساس پیدا کیا جائے کہ وہ معاشرتی اور تمدنی حالات سے مناسب طریقے پر متاثر ہو - یعنی اس میں وسیع‌ترین معنی میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوجائے - آج کل جو سیاسی حالات ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے اس جذبے کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے - یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہماری بیشتر سیاسی مشکلات اور معاشری خرابیاں اسی اِجتماعی احساس کی کمزوری کی وجہ سے ہیں - نہ مدرسے کی تعلیم ہمدردی کے اِس جذبے کی تربیت کرتی ہے ' نہ خانگی اور معاشری اثرات اِس کی نشو و نما میں مدد دیتے ہیں - اِس ہمدردی کو وسیع کرنے اور عملی جامہ پہنانے کے لیے تخیل کی ' یعنی علم اور جذبات میں ربط پیدا کرنے کی ' ضرورت ہے لیکن یہ تخیل بھی مفقود ہے - مدرسے کے نصاب میں اِجتماعی مسائل اور مضامین کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھی - اس لیے طلبہ کو اپنے تہذیب و تمدن اور معاشری ضروریات سے وہ واقفیت جو ہمدردی کی بنیاد ہے نہیں ہوتی ' یا ہوتی بھی ہے تو اِس قدر سطحی اور سرسری کہ اُن کے دل و دماغ پر اِس کا کوئی گہرا یا دیرپا اثر نہیں پڑتا اور اُن کی قوت متخیلہ اِس کو قوی احساس اور جذبات میں تبدیل نہیں کرسکتی - لہٰذا جہاں تک اخلاقی تربیت کا تعلق ہے ہماری تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ طلبہ میں اِس رشتے کا احساس پیدا کرے جو فرد اور جماعت کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور مختلف

کی تربیت پر زور دیا ہے - اس طرح دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ نوجوانوں میں جذبات کی صحیح تربیت نہایت ضروری ہے تاکہ اِن میں ہمدردی اور دوسروں کی امداد کرنے کی خواہش پیدا ہو کہ اس کے بغیر اجتماعی زندگی کا قیام ناممکن ہے - دونوں موجودہ زمانے کے حالات اور تعلقات کا خیال کرتے ہوئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمدردی کے اس جذبے کو جس قدر ممکن ہو وسیع کیا جائے تاکہ اس کے دائرے میں علاوہ اُن لوگوں کے جن سے ہمارا براہ راست تعلق ہے وہ لوگ بھی شامل ہو جائیں جن پر کسی نہ کسی طرح بالواسطہ ہمارے افعال و اعمال کا اثر پڑتا ہے - اور سائنس اور صنعت و حرفت کے اِس دور میں کون شخص ایسا ہے جس کی زندگی دنیا کے تمام اور سب لوگوں کے ساتھ بےشمار رشتوں میں مربوط نہ ہو؟

انسانی سیرت کے اس نصب‌العین کو جس کے خد و خال اِن ماہرین تعلیم نے دکھائے ہیں، ہم اپنے ملک کے مخصوص حالات کا لحاظ کرتے ہوئے کہاں تک قبول کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اِن صفات کا تعلق کسی خاص ملک یا قوم سے نہیں بلکہ یہ ہر انسان اور ہر جماعت کے لیے ضروری ہیں - اگر ہم اپنے سیاسی اور معاشری حالات کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری قوم کو خاص طور پر یہ صفات درکار ہیں - اور ہماری تہذیب اور فلسفۂ زندگی میں، جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل ہے، اِن کی اہمیت مسلم ہے - البتہ اِن کی ترتیب و تنظیم اور اضافی قدر و قیمت ہمارے یہاں کسی قدر مختلف ہوگی -

کی جائے جو ان میں جذبۂ تجسس کے ساتھ وسعت نظر پیدا کرے ' وہ نئے حقائق اور نئے نظریوں پر غور کرنے کے لیے تیار رہیں اور ان میں عقلی نشو و نما کی صلاحیت باقی رہے - اس طرح دونوں کے نزدیک صلاحیت عمل سیرت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے - ڈیوئی اس کو قوت یا کارکردگی کے نام سے موسوم کرتا ہے ' رسل اس کو قوت حیات کہتا ہے - ڈیوئی کے نزدیک قوت اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر اِنسان اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور جب تک اس میں استقلال ' حوصلہ اور محنت کی صفات نہ ہوں گی ' جو قوت کے مفہوم کا جزو ہیں ' وہ اپنے جذبات اور خیالات کو عمل میں نہ لا سکے گا - رسل بھی جسمانی قوت اور صحت کو لازم سمجھتا ہے لیکن وہ اس سے یہ کام لینا چاہتا ہے کہ طلبہ میں مسرت حیات کا احساس بیدار ہو اور وہ اپنی خودی کی قید سے نکل کر دنیا کی دوسری چیزوں اور مظاہر میں دلچسپی لینا سیکھیں اور ان جسمانی اور دماغی خرابیوں سے محفوظ رہیں جو کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً ضد ' بدمزاجی ' افسردگی ' بیماری وغیرہ - رسل جرأت کو ایک مستقل اور علحدہ صفت قرار دیتا ہے کیونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا میں بیشتر خرابیاں خوف کا نتیجہ ہیں اور جب تک لوگوں کا جسمانی اور ذہنی خوف رفع نہ ہوگا نہ اُنھیں اپنی ذاتی زندگی میں اِطمینان نصیب ہوگا ' نہ وہ اپنے معاشری فرائض کو عمدگی کے ساتھ ادا کرسکیں گے - ڈیوئی نے بھی جرأت کو قوت عمل کا لازمہ قرار دیا ہے اور اپنی تصانیف میں جا بجا اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس

تک اتفاق رائے ہے اور اگرچہ دونوں کے خیالات کی فلسفیانہ بنیاد الگ الگ ہے لیکن دونوں کو اخلاقی تربیت اور سیرت کے اس مفہوم سے اختلاف ہے جو صدیوں تک نہ صرف عملاً رائج رہا ہے بلکہ علمی نظریوں پر بھی مسلط رہا ہے۔ دونوں عقل و علم اور اخلاق کے قریبی تعلق کو تسلیم کرتے ہیں اور اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ عقل کو اخلاقی سیرت سے کوئی لازمی تعلق نہیں۔ فلسفۂ تعلیم اور تنظیم مدارس کے لیے اس جدید نقطۂ نظر کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ، جیسا ہم بتا چکے ہیں، مدرسوں میں عام طور پر علمی مشاغل اور اخلاقی تربیت میں حد فاصل قائم ہو گئی ہے۔ ان کی درسی زندگی اس طرح مرتب نہیں کی گئی کہ اس میں طلبہ کے کردار پر پائیدار اثر ڈالا جائے اور ان کی اخلاقی سیرت مستحکم کرنے کا اہتمام ہو۔ یہ ستم ظریفی دیکھیے کہ عملی طور پر تو معلم اپنا تمام وقت اور توجہ درسی علوم کے سکھانے میں صرف کرتے ہیں اور زبان سے ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ "اخلاق" یا "نیکی" کے سوا اور تمام چیزیں ہیچ ہیں۔ جدید نظریۂ تعلیم نے عقل اور اخلاق کے درمیان ایک لازمی رشتہ قائم کر دیا ہے۔ عقل اور ذہانت کے متعلق ان دونوں مفکرین کے نقطۂ نظر میں جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اتنا فرق ضرور ہے کہ ڈیوئی (Dewey) اس کے عملی استعمال پر زیادہ زور دیتا ہے اور اس طرح طلبہ میں قوت فیصلہ کی تربیت کرنا چاہتا ہے جو تحصیل مقاصد میں معاملہ فہمی میں، مشکلات سے عہدہ برآ ہونے میں مدد دے۔ رسل (Russell) کو زیادہ فکر یہ ہے کہ طلبہ کی ایسی ذہنی تربیت

مدت تک ملتوی کیا جا سکتا ھے - صنعت و حرفت کے
اِنقلابات کے بعد بھی مفلسی کا قائم رھنا محض لوگوں
کی متحدہ حماقت کا ثبوت ھے - احساس کی بیداری
سے لوگوں میں عام افلاس کو دور کرنے کی خواھش
پیدا ھوگی ' عقل ان کو راستہ دکھائے گی اور جرأت
اُنھیں اِس راستے پر ثابت قدم رکھے گی - کم ھمت
لوگ بالعموم تکلیف برداشت کر لیتے ھیں لیکن اِس
کو رفع کرنے کے لیے کوئی غیر معمولی کوشش کرنے پر
آمادہ نہیں ھوتے........بے خوف عورتوں کی ایک نسل
تمام دنیا میں انقلاب پیدا کر سکتی ھے کیونکہ ان کی
اولاد بھی جری اور بے خوف ھو گی اور ان کی فطرت مسخ
نہ ھونے پائے گی یہ لوگ راست باز ' صاف گو ' فراخ
دل ' محبت شعار اور آزاد ھوں گے - اُن کی جد و جہد
ظلم اور مصائب کے اس بوجھ کو اُتار کر پھینک دے
گی جس کو ھم محض اپنی سستی یا کم ھمتی یا
بے رحمی یا حماقت کی وجہ سے برداشت کرتے ھیں -
تعلیم کی خرابی ھی نے ھم میں یہ بری عادتیں
پیدا کی ھیں اور اسی کی اصلاح کر کے ھم اچھی
عادتیں پیدا کر سکتے ھیں - تعلیم نئی زندگی کی
کنجی ھے -" ۱

مکمل اِنسانی سیرت کے متعلق ان دونوں فاضل مفکروں کے
خیالات کا مقابلہ کرنے سے معلوم ھوتا ھے کہ ان میں بڑی حد

---

۱ — On Education صفحہ ۶۵-۶۶ -

ایک چھوٹا سا دائرہ ایسا بھی ہونا چاہئیے جہاں اجتماعی اثرات کو بہت کم دخل ہو یا نہ ہو، اور یہ اس کی مخصوص قابلیت کا میدان ہے - یعنی جس خاص علم یا فن یا شعبۂ عمل میں کسی شخص کو خاص مہارت ہو وہاں اس کو ذاتی غور و فکر اور آزادئی رائے سے کام لینا چاہئیے، اور اگر اس دائرے کے اندر کوئی ایسا معاملہ یا مسئلہ ہو جس میں اس کی رائے، رائے عامہ کی مخالف ہو تو اس کو جرأت کے ساتھ کھلم کھلا ظاہر کر دینا چاہئیے - باقی مسائل میں، بالخصوص علمی اور فنّی مسائل میں ہمیں ماہرین خصوصی کی رہنمائی قبول کرنی چاہئیے -

ان چاروں صفات کے مفہوم اور شرائط سے بحث کرنے کے بعد رسل اس معاشرے کا ایک تخیلی نقشہ کھینچتا ہے جو اس قسم کی تعلیم پا کر پیدا ہوگا اور جس کے افراد میں کسی نہ کسی حد تک یہ صفات پائی جائیں گی :-

" موجودہ معاشرے سے کس قدر مختلف ہوگی انسانوں کی وہ جماعت جس کے ہر مرد اور عورت میں قوت، جرأت، ذکاوت احساس اور ذہانت کی صفات اس حد تک موجود ہوں گی جس حد تک تعلیم اُن کو پیدا کرسکتی ہے! بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جو خوشی سے محروم ہوں - اس زمانے میں رنج اور بے اطمینانی کے سب سے بڑے اسباب بیماری، مفلسی اور صنفی زندگی کی ناقابل اطمینان حالت ہیں - یہ سب چیزیں مقابلتاً بہت کم ہو جائیں گی - صحت اور تندرستی بہت عام ہو سکتی ہے - بڑھاپے کی آمد کو

سے دنیا کے مسائل اور معاملات کے متعلق دیانت‌داری اور آزادی کے ساتھ رائے قائم کرتے ھیں جو عوام کی رائے سے مختلف ھوتی ھے - ان کو ھر طرح کی مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ھے لیکن وہ اپنی آزادی کی خاطر ان سب کو خوشی سے برداشت کرتے ھیں - بقول رسل (Russel) کے :—

" ذھنی آزادی کی زندگی اس قدر آرام‌دہ ' مرنجاں مرنج اور پر امن نہیں ھو سکتی جتنی وہ زندگی جو مروجہ عقائد کی پابندی کے حصار میں محفوظ ھو- صرف عقیدے ھی کی پناہ میں انسان کو وہ آرام و اطمینان نصیب ھوتا ھے جو کسی شخص کو ایک روشن آتش‌دان کے پاس بیٹھ کر حاصل ھوتا ھے جب کمرے کے باھر سردی کا زور ھو- "

اس بحث میں رسل (Russel) نے یہ مسئلہ بھی چھیڑا ھے کہ انفرادی زندگی کو کس حد تک اجتماعی زندگی کی پابندیوں سے آزاد ھونا چاھیے - ھم اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کر چکے ھیں اس لیے یہاں اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں - رسل (Russel) نے اس کے متعلق یہ رائے ظاھر کی ھے کہ عام طور پر ھر شخص کو دوسروں کے ساتھ مل جل کر اور ان کی رضاجوئی کا خیال رکھ کر کام کرنا چاھیے ورنہ لوگوں کے برتاو اور آداب معاشرت میں شائستگی پیدا نہ ھوگی اور جماعتوں کا قیام بہت مشکل ھو جائے گا - اس طرح دوسروں کے جذبات سے متاثر ھونا اور ان کو قبول کرنا مفید ھے بشرطیکہ جذبات کسی عقلمند شخص کی طرف سے کسی کم عقل شخص کی طرف منتقل ھوں- لیکن جہاں ایک بڑا دائرۂ عمل ایسا ھے جس میں اجتماعی اثرات کی حکمرانی ھے وھاں ھر شخص کے لیے

امور اور مسائل کی تحقیق و تفتیش کرے جو علمی اہمیت رکھتے ہیں - تجسس کا یہ ارتقاء فطرت انسانی کے مقتضا کے عین مطابق ہے اور ہمیں اس میں مدد دینا چاہیے تاکہ تجسس کی قوت ایسے کاموں میں صرف ہو جن کی اہمیت مستقل اور دائرہ وسیع ہے - لیکن اس ارتقا کے لیے شرط یہ ہے کہ طلبہ میں قوت مشاہدہ ' محنت اور مستقل مزاجی کی عادتیں پیدا کی جائیں اور ان کا یہ عقیدہ ہو کہ علم کی تحصیل کی کوئی حد نہیں۔ ورنہ ان عادتوں کے بغیر' تجسس کا اظہار نہایت ناقص اور بےکار طریقوں پر ہوگا یعنی اِدھر اُدھر کی فضول باتیں سننے کا شوق ' دوسروں کے بھید معلوم کرنے کی خواہش ' غیر متعلق چیزوں کا کھوج جن سے انہیں کوئی مستقل فائدہ نہیں ہو سکتا - عقلی تربیت کا ایک اور اہم جزو رسل کے نزدیک وسعت نظر ہے جس کی بدولت ہم نئے حقائق اور نئی تجاویز پر غور کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں اور اپنے پرانے اور پسندیدہ عقائد پر محض اسی وجہ سے اصرار اور ضد نہیں کرتے کہ ہم انہیں عرصے سے مانتے چلے آئے ہیں - اس وسعت نظر اور ذہنی دیانت کے لیے بھی جرأت اتنی ہی ضروری ہے جس قدر جسمانی بہادری کے لیے - کیونکہ اس کے بغیر ہم معاشرے کے رسم و رواج اور خیالات کی طرف سے بےپروا ہوکر اپنی ذاتی رائے اور عقیدے پر عمل نہیں کر سکتے۔ کمزوروں اور سہولت پسندوں کے لیے سیدھا راستہ یہی ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے انہیں خیالات اور عقائد کی پابندی کریں جو ان کے گرد و پیش عام طور پر رائج ہیں لیکن جن لوگوں میں اخلاقی جرأت اور عزت نفس ہوتی ہے وہ اپنی عقل کی مدد

وھی ھے جس کی طرف ھم نے ابھی اشارہ کیا ھے -

عقل کی جبلی بنیاد تجسس ھے جو انسانی طبیعت کے لوازمات میں سے ھے - حیوانوں میں اور چھوٹے بچوں میں اس کا اظہار بہت افراط اور شدت سے ھوتا ھے اور وہ ان کے اکثر اعمال و افعال کی محرک ھوتی ھے - لیکن بدقسمتی سے موجودہ تعلیمی اور معاشری حالات ایسے ھیں کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ھے عموماً اس کا شوق تجسس کم ھوتا جاتا ھے یہاں تک کہ ایک خاص عمر کو پہونچ کر ' جو مختلف افراد میں مختلف ھوتی ھے ' اس میں یہ صلاحیت ھی نہیں رھتی کہ وہ نئی چیزوں اور نئے خیالات سے دلچسپی پیدا کر سکے - اس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح سخت اور بے لوچ ھو جاتا ھے - اس میں یہ عادت جو سن کہولت کی مخصوص صفت ھے ' پیدا ھو جاتی ھے کہ وہ اپنے خیالات کی باگ " پرانے زمانے" کی طرف موڑ دیتا ھے' اسی کی تعریف کیا کرتا ھے اور نئی تحقیقات ' نئے نظریوں بلکہ نئے لوگوں سے بھی گھبراتا ھے اور ان سے کچھ سیکھنے کی خواھش نہیں کرتا - جب جذبۂ تجسس بالکل مردہ ھو جائے تو سمجھ لینا چاھیے کہ ذھانت کا بحیثیت ایک قوت محرکہ کے خاتمہ ھو گیا ھے اور انسان میں نشو و نما کی صلاحیت باقی نہیں رھی - لیکن اس کے ساتھ ھی یہ یاد رکھنا چاھیے کہ جیسا رسل نے بتایا ھے ' ممکن ھے تجسس کی شدت اور ھمہ گیری میں کمی آجائے لیکن اس کی نوعیت بہتر ھو جائے - یعنی ایک پختہ عمر کے انسان کو بچوں کی طرح جزئیات کے متعلق تجسس نہ ھو بلکہ کلیات سے دلچسپی پیدا ھو جائے اور وہ صرف ایسے

لازمی صفت قرار دیا ہے - عقل میں وہ دو چیزیں شامل کرتا ہے - ایک تو وہ علم جو ہم حاصل کر چکے ہیں جو گویا ہماری ملکیت بن گیا ہے - دوسرے وہ قابل قدر صلاحیت جس کے ذریعے سے ہم نیا علم حاصل کر سکتے ہیں - ان دونوں میں بہت قریبی تعلق ہے - کیونکہ جلد سیکھنے کی صلاحیت جو "ذہانت" کہلاتی ہے ایک حد تک ہمارے سابق علم پر منحصر ہے - جاہل آدمی کو کوئی نئی بات سکھانی بہت مشکل ہے - وہ آسانی سے اپنی ذہنی عادتوں اور اپنے خیالات کو تبدیل نہیں کرتا - اس میں عقیدہ تنقید اور تجسس کی جگہ لے لیتا ہے اور وہ ان نئی باتوں کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیتا ہے جو سائنس کی ترقی کی بدولت عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہیں - بر خلاف اس کے جس شخص کی تعلیم صحیح اصولوں پر مبنی ہوتی ہے، یعنی وہ جو علم حاصل کرتا ہے وہ اس کی ذہنی تربیت میں معین ہوتا ہے اور اس میں مزید علم حاصل کرنے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے ' اس کی ذہنی نشو و نما ہمیشہ جاری رہتی ہے- مفید اور مکمل زندگی بسر کرنے کے لیے یہ قابلیت اس درجہ اہم اور لازم ہے کہ بعض تعلیمی مفکرین نے اس کو تعلیم کا منتہا اور اخلاق کی بنیاد قرار دیا ہے- لہذا انسانی سیرت کی تشکیل میں عقل کا فرض اولین یہ ہے کہ ترقی' نشو و نما' اجتہاد ' نئی باتوں کو سیکھنے کی صلاحیت برقرار رکھے ' اور فرد کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے ارتقاء پذیر ماحول میں کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کر سکے - برگسان (Bergson) وغیرہ نے ارتقاے تخلیقی کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے لحاظ سے بھی حیات انسانی میں عقل کا مفہوم

متزلزل کرتا ہے - ایک بڑا تاجر جو اپنا منافع بڑھانے کے لیے اپنی منڈیوں میں غلے کی فروخت اور بر آمد کو روک دیتا ہے وہ نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کو فاقہ کشی میں مبتلا کرسکتا ہے - اس کا تدارک کرنے کے لیے تعلیم کا فرض یہ ہے کہ طلبہ میں تخیل اور ہمدردی پیدا کرے تاکہ وہ دوسروں کی حالت کو صحیح طریقے پر محسوس کریں اور اس ظلم اور بےانصافی کا خاتمہ ہو جو زیادہ تر عدم احساس کی وجہ سے رائج ہے - یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ذکی الحس ہونے سے محض یہی فائدہ نہیں کہ انسان دوسروں کے دکھ میں شریک ہو اور عمرانی فرائض کو ادا کرے بلکہ تہذیب نفس اور ذوق جمال کی تربیت میں بھی اس کو بڑا دخل ہے - خوبصورت چیزوں سے وہی لوگ محظوظ ہو سکتے ہیں جن میں احساس کی نزاکت ہو' جو لطیف نکتوں کو سمجھ سکیں' اور رنگ و بو اور شکل کے باریک فرقوں میں امتیاز کرسکیں جن کے دل میں مصور کی رنگ آمیزی' شاعر کی جادو بیانی' مغنی کی نغمہ طرازی مضراب بن کر ذوق حسن کے تاروں کو چھیڑ دے - یہ ذوق اس شخص میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک ایک چابک دست مصور کی تصویر' اور رنگ کے چند دھبوں میں جو کاغذ پر پڑ جائیں کوئی فرق نہ ہو' جو طبلے کی تھاپ اور ہتوڑے کی چوٹ کو ایک ہی چیز سمجھے ؟ بے شک اس حسن شناسی کے لیے فنی امور سے واقفیت ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ احساس کی ذکاوت اور جذبات کی لطافت درکار ہے -

رسل نے ذہانت یا عقل کو انسانی سیرت کی چوتھی

دکھ یا مصیبت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں بلکہ کسی اور ذریعے سے ہمیں اس کا علم ہو۔ اس وسعت اور احساس کے پیدا کرنے کے لیے تخیل کی تربیت ہونی چاہیے تاکہ ہمیں افسانوں اور تاریخوں، سرکاری رپورٹوں اور اعداد و شمار میں بھی وہی تصویر دکھائی دے جو واقعات کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر نظر آتی ہے تاکہ ہمارا ہمدردی کا جذبہ صرف اسی وقت مشتعل نہ ہو، جب مثلاً کسی جنگ میں خود ہمارا کوئی عزیز یا دوست زخمی ہو۔ بلکہ جب کبھی ہمیں معلوم ہو کہ قوموں کی ایک خون ریز جنگ میں لاکھوں آدمی مارے گئے ہیں اور زخمی ہوئے ہیں تو ہمارا دل دکھے اور ہم یہ محسوس کریں کہ یہ سب لوگ کسی نہ کسی کے دوست اور عزیز ہوں گے۔ ہمدردی اپنی پوری وسعت اس وقت حاصل کرتی ہے جب ایک شخص کے دل میں سارے جہاں کا درد جمع ہوجائے۔ رسل کے نزدیک یہ بات ناممکن نہیں ہے اور وہ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ :—

"اگرچہ سائنس نے ہماری قوتوں میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ ہم دور دراز کے ممالک کے لوگوں کی زندگی پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری ہمدردی میں اتنی وسعت پیدا نہیں ہوئی۔" [1]

ایک سائنس داں جو اپنے معمل یا کارخانے میں بیٹھ کر کیمیا کے تجربے کرتا ہے اور کوئی خوفناک بم کا گولہ یا زہریلی گیس ایجاد کرتا ہے تو وہ گویا تمام دنیا کے امن و امان کو

1— On Education صفحہ ۴۷ ۔

کے مناسب جذبات کا جوش پیدا نہ ہوگا تو وہ خود کو عمرانی مقاصد کے ساتھ کیسے متحد کر سکتا ہے؟ اس احساس کی تربیت میں کئی چیزیں شریک ہوتی ہیں - شروع میں بچے کی تحسین طلبی کی خواہش اپنا اثر کرتی ہے - وہ دوسروں کی خوشنودی اور تعریف کا خواہاں ہوتا ہے اور ان کی ملامت سے بچنا چاہتا ہے - اکثر لوگوں میں یہ محرک عمل تمام عمر باقی رہتا ہے- جہاں تک اس کی بدولت لوگوں میں خوش‌گوار تعلقات قائم ہوں اور خود غرضی کی روک تھام ہو اس کے مفید ہونے میں شبہہ نہیں لیکن جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں رائے عامہ کو عمل کا معیار اعلیٰ قرار نہیں دینا چاہیے - اس صفت کا دوسرا لازمی جزو ہمدردی ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں محض ایک جبلت ہے جو انسانوں اور دیگر حیوانات میں مشترک ہے - اس وقت اس کا تعلق دل سے زیادہ جسمانی کیفیت سے ہوتا ہے اور اس میں اور تقلید اور اثر پزیری میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے - ایک چھوٹا بچہ کسی دوسرے بچے کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگتا ہے - ذرا بڑی عمر میں شائد ہر شخص کو دیکھ کر یہ کیفیت پیدا نہ ہو لیکن اپنے قریبی‌عزیزوں اور دوستوں کے جذبات سے متاثر ہونا عام اور قدرتی بات ہے - اس ہمدردی کی تکمیل اور توسیع کے لیے رسل (Russel) کے خیال میں دو چیزوں کی ضرورت ہے - ایک تو یہ کہ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو کہ انسان علاوہ اپنے قریبی دوستوں اور عزیزوں کے اور انسانوں کے دکھ درد سے بھی متاثر ہو سکے - اس کی تفصیل پہلے کی جا چکی ہے - دوسرے یہ کہ ہمدردی کا جذبہ اس وقت بھی بیدار ہو جب ہم کسی

ہوتی ہے اور اُس کی بنیاد جبلت پر قائم ہوتی ہے - یہ محض منفی جرأت نہیں جو فطری جذبات کو دبانے سے پیدا ہو - اس قسم کی ثبوتی جرأت کو میں سیرت انسانی کی تکمیل کے لیے ایک بہت اہم عنصر سمجھتا ہوں"- ۱

سیرت انسانی کی تیسری صفت رسل (Russel) کے نزدیک ذکاوت احساس ہے یعنی انسان کا جذبات کے معاملے میں سریع الحس ہونا تاکہ ماحول کے مختلف محرکات اس میں مناسب جذبات پیدا کریں - جس شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گرد و پیش کی اچھی اور بری، خوش گوار اور ناگوار چیزوں سے مناسب طریقے سے متاثر ہو سکے وہ معاشری اور اخلاقی زندگی میں کامیابی کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتا - کیونکہ عمل کے محرک ہمیشہ جذبات ہی ہوتے ہیں یا کم از کم عمل کو مستقل اور مسلسل بنانے کے لیے وہ قوت محرکہ درکار ہے جو جذبات میں پوشیدہ ہوتی ہے - نفسیات نے انسانی عمل کے تین عناصر بتائے ہیں یعنی ادراک (Cognition) جذبہ (Emotion) اور فعل (Conation)- ان میں سے ادراک اور فعل دونوں میں تغیر اور تبدیلی ممکن ہے لیکن انسان کے مستقل جذبات ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور انہیں سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو اسے باوجود مشکلات کے ثابت قدم رکھتی ہے - بہر حال جذبات اور ان کی تربیت کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اگر کسی شخص میں، معاشری حالات اور ضروریات کو دیکھ کر یا ان کا خیال کر

۱- On Education صفحہ ۵۳-۵۴ -

اپنی زندگی یقیناً ایک ایسے مقصد کی خاطر بسر کی جس کو موت بھی تمام نہ کر سکی - اِس طرح ایک تیسری چیز آرٹ ہے - بلکہ دراصل یہ کہنا چاہیے کہ جس حد تک انسان اپنے جسم کے علاوہ خارجی چیزوں سے دلچسپی رکھتا ہے اسی حد تک اس کی زندگی غیر شخصی ہوتی جاتی ہے - گو بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس شخص کو بہت سی چیزوں سے قلبی تعلق اور دلچسپی ہوتی ہے اسے زندگی کو خیرباد کہتے وقت اس قدر تکلیف نہیں ہوتی جتنی اس بچارے شکّی دائم المرض آدمی کو جس کی دلچسپی اور توجہ ہمیشہ اپنی ہی بیماریوں اور تکلیفوں تک محدود رہی ہو - لہذا جرأت کی تکمیل اس آدمی کی شخصیت میں ہوتی ہے جو بہت سی دلچسپیاں رکھتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی "خودی" دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ خود کو حقیر جانتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بہت سی ایسی چیزوں کی قدر و احترام کرتا ہے جو اِس کی ذات کے ماورا ہیں - یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کی جبلتوں کو آزادی حاصل ہو اور اس کی ذہانت پوری طرح کام کرتی ہو - ان دونوں کے اتحاد سے جو ہمہ‌گیر وسعت نظر پیدا ہوتی ہے اس سے نہ تو تارک الدنیا راہب آشنا ہوتا ہے نہ نفس پرست عیاش - اس طبیعت کے آدمی کے لیے اپنی موت ایک بہت معمولی سا واقعہ ہے - یہ جرأت حقیقی اور ثبوتی

ارتقاے شخصیت کا جو نقطۂ نظر اس کتاب میں پیش کیا ہے وہ "نفی حیات" کے سراسر خلاف ہے اور اس کی رو سے اخلاقی تربیت کا نقطۂ آغاز یہی فطری خواهشات اور جبلتیں ہیں جن کو هم اپنے ماحول کے اثر اور تجربے کے ذریعے زیادہ وسیع اور منظم بناتے ہیں اور بلندتر مقاصد سے وابستہ کرتے ہیں - اس لیے غیر شخصی انداز طبیعت پیدا کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ هم بچوں میں مختلف قسم کے قابل قدر مقاصد سے دلچسپی پیدا کریں اور ان کو ان کی ذات کے محدود دائرے سے نکال کر ان علوم و فنون اور مشاغل سے روشناس کریں جن میں منہمک هو کر وہ حقیقی معرفت نفس حاصل کریں اور ان کی خودی اس درجہ وسیع هو جائے کہ وہ خارجی دنیا کے بہترین عناصر کو اپنے اندر سمیٹ لے - رسل نے بتایا ہے کہ وہ بہترین اور قابل قدر عناصر کیا ہیں جو انسان کی خودی کو وسعت بخشتے ہیں :—

> "فطرت انسانی میں بعض چیزیں ایسی ودیعت کی گئی ہیں جو بغیر کوشش کے همیں خودی کی تنگ چاردیواری سے باهر لے جاتی ہیں - ان میں سب سے زیادہ عام محبت کا جذبہ ہے خصوصاً والدین کی محبت جو بعض لوگوں میں ایسی وسیع شکل اختیار کر لیتی ہے کہ تمام بنی نوع انسان کو اپنی آغوش شفقت میں لے لیتی ہے - اسی قسم کی دوسری چیز علم ہے - هم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مشہور عالم فلکیات گلیلیو (Galileo) کو نوع انسانی سے کوئی خاص محبت تھی لیکن اس نے

جس شخص کی تمام اُمیدیں اور اندیشے اپنی ہی ذات کے ساتھہ وابستہ ہوتے ہیں' وہ اطمینان قلب کے ساتھ کسی خطرہ کا خصوصاً موت کا سامنا نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے نزدیک اپنی موت گویا تمام دنیا کا خاتمہ ہے - وہ نہیں سمجھ سکتا کہ کائنات میں بہت سی قوتیں' اور اجتماعی اور اخلاقی نظام ایسے ہیں جو فرد کی زندگی سے اہم تر' بلندتر اور بے نیاز ہیں اِس لیے اپنی ذات کو غیر معمولی اہمیت دینا ایک مضحکہ خیز حرکت ہے - اسے یہ احساس ہوتا ہے کی حیات انسانی کی بقا اور ترقی اسی جیسے انسانوں کے عمل پر منحصر ہے اور یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی کی زندگی کا چھوٹا سا ' ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ جائے لیکن اس کا نام کسی زبردست ادبی یا اخلاقی یا معاشری کارنامے کی بدولت ہمیشہ روشن رہے اور اسے زندۂ جاوید بنا دے - بہر حال جب تک انسان اپنی محدود ذات کی طرف سے بےتعلقی کی یہ شان پیدا نہ کرے اس میں حقیقی اخلاقی جرأت کا پیدا ہونا ممکن نہیں - لیکن اس انداز طبیعت کو پیدا کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ انسان نفس کشی اور ترک دنیا اختیار کرے اور بے سبب تکلیفیں اُٹھانے کو تزکیۂ نفس کا ذریعہ قرار دے - دنیا کے تمام مذاہب اور ملکوں میں ایسے لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے اس رہبانی فلسفۂ زندگی کو اختیار کیا ہے اور وہ نفی حیات کے ذریعے اپنی نجات کی کوشش کرتے ہیں بجاے اس کے کہ اپنی فطری خواہشوں اور قوتوں کی توسیع و تربیت کر کے ان کو اخلاقی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کریں - ہم نے

ایک تو خود داری یا عزت نفس کا احساس اور دوسرے ذاتی اغراض سے قطع نظر کر کے زندگی سے بذفسہ دلچسپی رکھنے اور اس کا غیر شخصی نظر سے مطالعہ کرنے کی صلاحیت - عزت نفس کا احساس اُنہیں لوگوں میں ہوسکتا ہے جن کی زندگی کا مرکز خود ان کی ذات کے اندر ہو ' اِس معنی میں نہیں کہ وہ تنگ نظر یا خود غرض یا نفس پرست ہوں بلکہ اس معنی میں کہ اُن کے خیالات اور مقاصد اور رائیں ان کے اپنے تجربے اور فکر کا نتیجہ ہوں اور وہ یہ سمجھیں کہ بحیثیت اِنسان کے ان کو آزادی فکر و عمل کا حق حاصل ہے جس سے کوئی شخص اُنہیں محروم نہیں کر سکتا - برخلاف اس کے جن لوگوں کے خیالات اور جذبات اور افعال محض دوسروں کی تقلید پر مبنی ہوتے ہیں ' جو ہر وقت دوسروں کی تحسین کے خواہاں رہتے ہیں ان میں حقیقی جرأت پیدا نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کہیں ایسا کام نہ کر بیٹھیں جس کی وجہ سے دوسرے لوگ انہیں برا کہیں یا حقیر سمجھیں - اس کمزوری کی وجہ سے اکثر لوگ فیشن کے ' یا عوام کے توہمات اور مہمل رسم و رواج کے غلام ہوجاتے ہیں اور جوہر انسانیت کی بے حرمتی کرتے ہیں - یا ان میں جھوٹا انکسار اور ریاکاری پیدا ہوجاتی ہے اور عزت نفس جو تمام فعالی نیکیوں کی بنیاد ہے جاتی رہتی ہے - لہذا تعلیم کے ذریعے طلبہ میں عزت نفس کے احساس کو اُبھارنے اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے - دوسری شرط جو اعلیٰ قسم کی جرأت پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اِنسان میں زندگی کو غیر شخصی نظر سے دیکھنے کی صلاحیت ہو -

بھی ایک وقت میں مفید ثابت ہوتا ہے لیکن سیرت کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب انسان ملامت کے خوف اور دوسروں کی رضاجوئی دونوں پر غالب آ جائے - لہذا سوال یہ ہے کہ سچی جرأت طلبہ میں کس طرح پیدا کی جائے ؟

اس جرأت کو پیدا کرنے میں صحت اور قوت دونوں کو دخل ہے - وہ اس وقت مستحکم ہوتی ہے جب اِنسان کو پر خطر موقعے پیش آئیں اور وہ دل کو مضبوط کرکے دانش مندی سے کام لے کر ان موقعوں پر کامیابی حاصل کرے - اس قسم کی جرأت کی ایک نہایت عمدہ مثال ایک انگریز افسانہ نویس "سیپر" (Sapper) نے اپنے ہیرو "بل ڈاگ ڈرمنڈ" (Bull Dog Drummond) کے کردار میں دکھائی ہے - اس میں غیر معمولی جسمانی قوت ہے جو اس کے دل کو قوی رکھتی ہے' اور جنگ عظیم کے ہولناک تجربات کی بدولت یہ قابلیت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ نہایت اطمینان کے ساتھ ' اپنے ہوش و حواس کو مجتمع کرکے کر سکتا ہے - بلکہ خطرہ اس کے حواس اور اس کے ذہن کو اور زیادہ تیز کر دیتا ہے - یہ جرأت در اصل جسمانی جرأت ہے جس میں ذہنی تربیت کے شریک ہو جانے سے کامیابی کا امکان بہت زیادہ ہوگیا ہے - لیکن ہمیں ایسے عام جذبۂ جرأت کی نشو و نما کرنی ہے جس کی بدولت انسان زندگی کی تمام مشکلات کو مردانہ‌وار برداشت کرے ' خواہ وہ خارجی ہوں اور جسمانی دلیری کی طالب ہوں ' خواہ داخلی جن کے مقابلے کے لیے ضبط نفس درکار ہے - اس جذبے کی تربیت کے لیے انسان میں دو گہری نفسی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے یعنی

نہیں ہوسکتی خصوصاً موجودہ زمانے میں جب زندگی پر مصلحت اور جد و جہد کا قانون حاوی ہے -

دوسری صفت ہے جرأت' یعنی خوف پر غالب آنے کی قوت - ہمیں نہ صرف اپنی ظاہری حرکات اور افعال کو خوف سے پاک رکھنا چاہیے بلکہ اپنے خیالات اور جذبات میں بھی اس کو راہ نہ دینی چاہیے - بچوں کے لیے یہ تعلیم' جس پر مثلاً انگریزوں کی تربیت مبنی ہے' کافی نہیں کہ وہ خوف کو ظاہر نہ کریں - کیونکہ اگر خودداری یا دوسروں کی شرم اور لحاظ کی وجہ سے وہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے ان ظاہری حرکات کو روکیں گے جن سے خوف کا اظہار ہوتا ہے اور جو عام طور پر معیوب سمجھی جاتی ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خوف دماغ کے غیر شعوری حصے میں پہنچ کر ان کے اطمینان اور سکون قلب کو غارت کردے گا اور زندگی بھر نئے نئے بھیس بدل کر عجیب و غریب شکلوں میں ظاہر ہوتا رہے گا - اس مسئلے پر ماہرین تحلیل نفسی (Psychoanalysts) نے اپنی تحقیقات کے ذریعے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خوف بلکہ ہر قوی جبلت کو دبا دینے سے کیا کیا خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں - علاوہ اس کے جسمانی خوف پر غالب آنے کی کوشش میں اکثر رائے عامہ کا یا دوستوں کی ناراضگی اور لعن طعن کا نیا خوف پیدا ہوجاتا ہے جو سیرت کی اعلیٰ تربیت میں حارج ہوتا ہے کیونکہ آئندہ عمر میں اِنسان اپنے ہر کام میں اُسی خوف ملامت کو اپنا راہبر بناتا ہے - ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اخلاقی سیرت کے تدریجی ارتقاء میں یہ محرک عمل

احتیاط سے کام لیا جائے تو یہ صفات بہت عام ہوسکتی ہیں - "

اس کے بعد رسل (Russel) نے ان چاروں صفات سے یکے بعد دیگرے بحث کر کے بتایا ہے کہ ان کا مفہوم اس کے ذہن میں کیا ہے اور یہ کس طرح انسانی سیرت کی تکمیل کرتی ہیں- پہلی دو صفات یعنی قوت اور جرأت ایک حد تک ڈیوئی کے یہاں "قوت عمل" میں شامل ہیں - لیکن رسل ان دونوں میں امتیاز کرتا ہے - قوت کا تعلق' اس کے خیال میں زیادہتر جسم سے ہے - اگر بچے کی جسمانی صحت اچھی ہے اور اس کے بدن میں طاقت ہے تو اس کو تکلیفیں مقابلتاً کم محسوس ہوں گی - اور وہ زندگی سے زیادہ لطف‌اندوز ہوگا - وہ اپنی ذات میں اتنا منہمک نہیں ہوگا کہ اپنے جسم کے سوا دنیا کی اور تمام چیزیں اس کو بےمعنی اور بےلطف معلوم ہوں - اسے گرد و پیش کے واقعات اور اشخاص اور خارجی چیزوں سے دلچسپی ہوگی اور وہ محنت سے جی نہیں چرائےگا - وہ دوسروں کی خوش حالی کو دیکھ کر حسد نہیں کرے گا کیونکہ حسد کمزوری اور بیماری کی نشانی ہے - وہ عام طور پر خوش اور بشاش رہے گا اور اپنے اوپر افسردگی اور بے دلی کو طاری نہیں ہونے دے گا - رسل اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ بعض صورتوں میں قوت کے نتائج برے بھی ہوتے ہیں اور بعض مستثنی حالتوں میں لوگوں نے اُس کے بغیر بھی بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں - لیکن بحیثیت مجموعی ہمیں یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ قوت سیرت کا ایک لازمی عنصر ہے اور جو تعلیم طلبہ میں قوت پیدا کرنے پر زور نہیں دیتی وہ اپنے مقصود میں کامیاب

والے ؛ کپڑا بُننے والے اور نان بائی بھی درکار ہیں - وہ
صفات جن کی بدولت انسان کسی خاص شعبۂ عمل
میں امتیاز حاصل کرتا ہے عموماً ایسی ہوتی ہیں کہ ان
کا سب کے لیے عام ہو جانا کچھ اچھا نہیں - شیلے
(Shelley) ایک شاعر کے فن ہنر کے کام کو اس طرح
بیان کرتا ہے :-

"وہ نور کے تڑکے سے جھٹپٹے وقت تک اس نظارے سے
لطف اٹھاتا ہے ؛ کہ سورج کی کرنوں کی جوت سے ساری
فضا جگمگا رہی ہے ؛ اور اس کی تہ میں سبز کائی کے
اندر شہد کی مکھیاں کھیلتی پھرتی ہیں - اس کی بلا
جانے یہ کون ہیں کیا ہیں !"

یہ عادت ایک شاعر کے لیے ضرور قابل تعریف ہے - لیکن
کسی اور شخص مثلاً چٹھی رساں کے لیے نہیں - لہذا
ہم ایسی تعلیم نہیں دے سکتے جو ہر شخص میں شاعرانہ
طبیعت کی نشو و نما کرے - مگر بعض صفات عام طور
پر مفید اور پسندیدہ ہیں اور ہم یہاں صرف انہیں سے
بحث کریں گے - ہمارے خیال میں چار صفات ایسی
ہیں جو مل کر بہترین سیرت کی بنیاد بن سکتی
ہیں :-

(۱) قوت، (۲) جرأت، (۳) ذکاوت احساس، (۴) ذہانت،

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ فہرست مکمل ہے لیکن میرا یہ
خیال ہے کہ چاروں چیزیں موجود ہوں تو بہت کافی
ہیں - اور مجھے یہ بھی پوری طرح یقین ہے کہ اگر بچوں
کی دماغی جسمانی اور جذباتی تربیت میں غور اور

ہمدردی ' اور فراخ دلی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر تمدنی اغراض و مقاصد سے آشنا ہوتا ہے اور اس کا شخصی نصب‌العین اجتماعی نصب‌العین سے ہم‌آہنگ ہو جاتا ہے - اس میں اخلاق کی وہ امتیازی شان پیدا ہو جاتی ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں بےجا فرق نہ کرے اور اپنی بھلائی اور بہتری اُن مشاغل میں تلاش کرے جن کا نتیجہ معاشری لحاظ سے قابل قدر ہو - انسانی ہمدردی کی وسعت اور گہرائی کے متعلق جو کچھ کہا جا چکا ہے وہ اس موقع پر بھی صادق آتا ہے -

اب ہم برٹرنڈ رسل کے خیالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے انسانی سیرت کے اہم ترین فضائل کیا قرار دیے ہیں - وہ کہتا ہے کہ یہ صفات ایسی نہیں ہونی چاہییں جو بعض لوگوں کے لیے موزوں ہوں اور بعض کے لیے نہ ہوں - ہمیں اُن عام صفات کی تلاش ہے جو ہر تربیت یافتہ انسان کے لیے مفید اور ضروری ہیں - وہ اس نقطۂ نظر کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہے[1] :—

" کچھ صفات ایسی ہیں جو سب انسانوں کے لیے نہیں بعض کے لیے مفید ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو سب کے لیے ضروری اور مطلوب ہیں - بیشک ہمیں صناعتوں کی ضرورت ہے ' سائنس دانوں کی ضرورت ہے ' بڑے بڑے مدبروں کی ضرورت ہے لیکن اسی کے ساتھ ہل چلانے

1- On Education -

Roscoe) کی شخصیت میں دکھائی ہے جس کا مقصد حیات یہی تھا کہ وہ زمین سے مٹی کا تیل نکال کر اپنی دولت میں اضافہ کرے اور اس راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہوں ان کو بلا تامل ہر امکانی ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کرے ۔ اس مقصد کے حصول کی دھن میں اس کے نزدیک انصاف ' دیانتداری ' مروت ' انسانیت یہ سب محض بےمعنی الفاظ تھے ' اور ظلم ' بےدردی ' رشوت ' بددیانتی ہر چیز جائز تھی ۔ اگر اس کا کوئی نصب العین تھا تو محض یہ کہ اس کا کام نہایت خوبی اور انتظام کے ساتھ چلتا رہے اور اس میں سے ہر قسم کے اسراف کو دور کردیا جائے ۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی جماعت میں تمام افراد ایسے ہی ہوں گے تو اس کا سارا کام بند ہو جائے گا ۔ " ہر شخص کا ہاتھ دوسروں کی مخالفت میں اُٹھا رہے گا " اور کسی شخص کو سوائے اپنی ذاتی اغراض کے کسی چیز سے دلچسپی نہ ہوگی ۔ لہذا معلم کا ' اور مدرسے کی تعلیم کا ' مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ کے جذبات کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں ذکاوت احساس پیدا ہو ' وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوں ۔ جب انہیں کسی اہم معاشری تحریک یا اخلاقی مسئلے سے سابقہ پڑے تو وہ اس کی طرف دل سے توجہ کریں اور اس پر محض اپنے شخصی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لحاظ سے غور کریں ۔ ہر کام میں اس بات کو مدنظر رکھیں کہ اس کا رد عمل دوسروں پر کیا ہوگا ' اس میں ان کی حق تلفی تو نہ ہوگی ' ان کے جائز جذبات کو ٹھیس تو نہیں لگے گی ۔ جب انسان کے نفس میں ذکاوت احساس کی بدولت

اثر پڑتا ہے اور اس میں معاملہ فہمی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس کی عقل اور قوت فیصلہ کی تربیت میں معین ہوتے ہیں - لہذا اس قوت کی نشو و نما میں صرف نصاب تعلیم کی اصلاح کو دخل ہے بلکہ اس کا انحصار بڑی حد تک طریقۂ تعلیم و تحصیل پر بھی ہے -

تیسری صفت جو عمدہ سیرت کا جزو ہے جذبات سے تعلق رکھتی ہے - اگر کسی شخص میں قوت عمل اور قوت فیصلہ دونوں موجود ہوں مگر وہ ذکاوت احساس سے محروم ہو تو وہ معاشرے کا مفید رکن نہیں بن سکتا - لوگ اپنی عقل اور علم کو نہایت قابلیت کے ساتھ صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور چونکہ ان میں قوت عمل ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں - تاریخ میں بہت سے ایسے بادشاہوں کی مثالیں ملتی ہیں اور خود ہم میں سے ہر ایک کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کو معاشری اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں ' جن کو اخلاق کے اصول بالکل مجرد اور دور از کار معلوم ہوتے ہیں ' جن میں روح انسانی کی بلندتر آرزوؤں کی مطلق حس نہیں - وہ گڑھیا کے مینڈک کی طرح اپنے محدود دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے - موجودہ صنعت و حرفت کے تمدن میں ایسی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں - اس کی ایک نہایت زبردست مثال ' سنکلئر (Sinclaire) نے اپنے ناول [1] میں جس کا اوپر ذکر آچکا ہے ورنن روسکو (Vernon

---

[1] - Oil—

قوت محض علم تک محدود نہیں بلکہ عقل اور اس کے استعمال کی صلاحیت پر منحصر ہے - جب جمع شدہ علم مربوط اور منظم ہو، جب وہ ذہن میں روشنی پیدا کرے، تکمیل مقاصد میں مدد دے، جب اس کی بدولت ہم میں معاملات کی سمجھ، احساس تناسب، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی پیدا ہو جائے اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم فیصلے کی قوت رکھتے ہیں - اس کی تشریح ایک مثال سے ہو سکتی ہے - ایک طالب علم تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کے حالات پڑھتا ہے اور اس کے ذریعے بہت سی معلومات حاصل کرتا ہے - مگر اس کا نتیجہ محض یہ ہو کہ اسے بہت سے نام اور تاریخی واقعات یاد ہو جائیں جن کو وہ مثلاً امتحان کے وقت بیان کرسکے تو اس کی معلومات بےجان رہیں گی اور ان سے اس کی قوت فیصلہ کی تربیت میں مدد نہ ملے گی - برخلاف اس کے اگر تاریخ کے مطالعے سے اس میں انسانی معاشرے کی ارتقاء کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے اگر وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کرے کہ موجودہ تمدن نے کس طرح رفتہ رفتہ ابتدائی مدارج سے ترقی کی ہے اور اس میں انسانوں کی متعدد کوششوں کو کس درجہ دخل ہے، اگر وہ اس علم کو اپنے عہد کی زندگی کے سمجھنے اور اس کے فرائض کو ادا کرنے میں استعمال کرسکے تو ہم یہ کہیں گے کہ اس میں تاریخ کے مطالعے سے قوت فیصلہ پیدا ہو گئی ہے یعنی اب وہ تاریخی واقفیت کو مدنی مسائل اور تمدنی معاملات کا فیصلہ کرنے میں استعمال کرسکتا ہے - یہی حال اور تمام علوم کا ہے - جب ان کے مطالعے سے تمدن کے طرز عمل پر

جامہ پہنایا جائے یہ صفات سب لوگوں میں یکساں نہیں ہوتیں - کسی میں زیادہ ہوتی ہیں کسی میں کم - لیکن ہر تندرست اور صحیح دماغ رکھنے والے بچے میں فطرتاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ کرکے دکھائے ' کسی طرح اپنے عمل کا سکہ اپنے ماحول پر جمائے - یہ وہی خواہش ہے جو چھوٹے بچوں کے کھیلوں میں ان کی تعمیر و تخریب میں ظاہر ہوتی ہے - اس تقاضائے عمل کی حقیقت کو سمجھنا ' اس کو ایسے مشاغل میں استعمال کرنا جو تعلیم و تربیت کے مقاصد میں معین ہوں ' اس کو حسب توقع ابھارنا اور راہ پر لگانا تاکہ بچے میں مفید عادتیں پیدا ہوں ' یہ مدرسہ اور معلم کا فرض ہے -

لیکن یہ ظاہر ہے کہ محض قوت عمل حسن سیرت کی ضامن نہیں ہوسکتی کیونکہ قوت ایک وسیلہ ہے جو اچھے برے دونوں طرح کے مقاصد کے لیے استعمال ہوسکتا ہے - ہمیں بےشمار مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں افراد اور جماعتوں نے اپنی قوت کو ایسے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے جو معاشری مفاد کے خلاف تھے اور اس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں - اس لیے قوت عمل کو قابل قدر اخلاقی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ معاشری نقطۂ نظر سے مفید کاموں میں صرف ہو - اس کے لیے دو اور صفات کا ہونا لازمی ہے یعنی قوت فیصلہ اور ذکاوت احساس -

انسانی سیرت کا عقلی یا ذہنی پہلو اس وقت مکمل ہوگا جب انسان کی قوت فیصلہ کی تربیت کی جائے - یہ

دیا ہے کہ اخلاقی تربیت میں لفظی اور زبانی تعلیم کے بجائے ایسے حالات اور مواقع پیدا کیے جائیں بالفاظ دیگر ایسا ماحول مقرر کیا جائے جس میں زندگی بسر کرنے سے اخلاقی سیرت کی تعمیر ہو سکے - اس امر پر ہم کتاب کے ابتدائی حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں - اب ہم اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اخلاقی سیرت کی تعمیر و تکمیل میں ہمیں کن صفات کو شعوری طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور اپنی بحث کی بنیاد زمانۂ حال کے دو جید مفکرین پروفیسر ڈیوئی اور برٹرنڈ رسل پر رکھتے ہیں -

پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اخلاقی سیرت کے تین اہم اور لازمی اجزا قرار دیے ہیں [1] :—

اول قوت عمل یا کارکردگی کی صلاحیت - ہم اکثر گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی سیرت بہت مضبوط ہے یا بہت پختہ ہے - اس سے ہماری یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں یہ قابلیت ہے کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو اس کے انجام دینے میں استقلال، محنت، جرأت اور حوصلے سے کام لیتا ہے - یہ فعالی صفات ہیں جو بحیثیت مجموعی ہماری سیرت کے اس رخ کو ظاہر کرتی ہیں جو ہمیں مشکلات پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور مایوسیوں اور شکستوں کا مقابلہ کر کے آخرکار کامیابی کی منزل پر پہنچتا ہے - ظاہر ہے کہ جس شخص کی طبیعت میں یہ عنصر نہ ہوگا وہ اپنے ارادوں کو عمل

۱—اس کی تفصیلی بحث انہوں نے Democracy and Education میں مختصر بحث School and Society میں کی ہے -

کام لیں گے تو ان کی تعلیم محض سطحی ہوگی اور ان کے اعمال اور سیرت پر کوئی دیرپا اثر نہ ڈالیں گی - اس لیے علم النفس کا یہ تقاضا ہے کہ معلم بہت غور سے بچوں کے آزادانہ افعال و مشاغل کا مطالعہ کرے کیونکہ ان کے جبلی رجحانات کا اظہار سب سے زیادہ خوبی اور وضاحت کے ساتھ ان کے کھیل کود اور ان کے کاموں میں ہوتا ہے جنہیں وہ اپنی پسند سے کرتے ہیں - یہ مشاغل نفسیات کے نقطۂ نظر سے بجائے خود اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنی انہیں " علامات " کے طور پر حاصل ہے اس لیے کہ ان کے معنی اور منشا پر غور کرنے سے طلبہ کی نفسی زندگی کے متعلق بہت مفید معلومات حاصل ہوتی ہے - معلم کو چاہیے کہ ان معلومات کی روشنی میں بچوں کے تعلیمی ماحول کو اس طرح منظم کرے کہ ان کے جبلی رجحانات پسندیدہ عادتوں میں تبدیل ہو جائیں اور عمدہ سیرت کی بنیاد بن جائیں - اسی جملے کے ان ابتدائی الفاظ کو "بچوں کے ماحول کو اس طرح منظم کرے " ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے - کیونکہ موجودہ نظریۂ تعلیم کا اصل اصول یہ ہے کہ ہم براہ راست اپنے عقائد اور جذبات اور معلومات بچوں میں منتقل نہیں کر سکتے اور نہ ان میں بلاواسطہ وہ عادات اور صفات پیدا کر سکتے ہیں جو معاشری زندگی کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری ہیں - ان عادات و صفات کی تعلیم میں ماحول کی وساطت لازم ہے یعنی تعلیم پانے والوں کے لیے ایسے حالات اور مشاغل مہیا کیے جائیں جن کی مدد سے وہ عملی طور پر ان معلومات اور صفات کو حاصل کر سکیں - اسی وجہ سے ہم نے بار بار اس بات پر زور

کی ترتیب کس تناسب سے کرنی چاہیے اور ان کی اضافی قدر و قیمت کیا ہونی چاہیے - ہمیں اپنے ذہن میں دوبارہ اس نفسی حقیقت کو تازہ کر لینا چاہیے کہ انسان کی سیرت ' اس کے اعمال و کردار سب ان جبلی رجحانوں پر منحصر ہیں جو اس کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں - انسان کا نفسی ارتقاء ایک مسلسل عمل ہے جو ابتدائی ' غیر مربوط حرکات اور فطری جبلتوں کے سادہ اظہار سے شروع ہوکر رفتہ رفتہ ماحول کے مختلف اثرات کے ماتحت عادتوں اور طبیعت کی خصوصیتوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے - ہمارے تمام اخلاقی اصول ' ہماری عقل اور ہمارا علم اسی بنیاد پر قائم ہے - اسی لیے معلم کے واسطے جو ذہن اور سیرت کی تربیت کرنا چاہتا ہے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ان نفسی رجحانات کا بغور مطالعہ کرے جو عمر کی مختلف منزلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور بچوں اور نوجوانوں کے مشاغل اور اعمال کے محرک ہوتے ہیں - اگر وہ ان کے تمام درسی اور غیر درسی مشاغل کی تنظیم اسی طرح کرے گا کہ ان میں ان نفسی رجحانات کو اظہار کا موقع ملے اور ان میں ربط و ترتیب قائم ہو تو طلبہ جو کچھ حاصل کریں گے ' خواہ اس کا تعلق علمی قابلیت سے ہو یا اخلاقی صفات اور عادات سے' وہ ان کی شخصیت کا جزو ہو جائے گا کیونکہ ان کے مشاغل کے محرک خود ان کی ذات ہوگی - برخلاف اس کے اگر ہم مدرسے میں طلبہ کے فطری شوقوں اور رجحانوں کی طرف توجہ نہ کریں گے اور ان کو نظرانداز کر کے خارجی محرکات مثلاً استاد کا خوف یا انعام کے لالچ یا باہمی رشک و مسابقت کے جذبے سے

باب ششم

اِخلاقی سیرت کی تعمیر

ہم نے گزشتہ ابواب میں اخلاق اور اخلاقی تربیت کے مفہوم سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مدرسے میں کون کون سے وسائل ایسے ہیں جو اخلاقی تربیت کے لیے اِستعمال ہو سکتے ہیں - اس باب میں ہم اخلاقی سیرت کے عناصر کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہم اپنی تربیت کے ذریعے افراد میں کیا صفات اور خصوصیات پیدا کرنا چاہتے ہیں - ضمناً ان صفات کا ذکر گزشتہ بحثوں میں آچکا ہے اور ہم نے کتاب کے پہلے حصے میں یہ بتایا ہے کہ جمہوری معاشرے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کس قسم کی سیرت کی ضرورت ہے - یہاں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان اہم‌ترین انسانی خصائص سے بحث کرنا چاہتے ہیں - جس کا کسی نہ کسی حد تک اخلاقی سیرت میں شامل ہونا ضروری ہے - ان کی تشریح میں ہمیں اس مسئلے کی دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا پڑے گا یعنی ارتقاے نفس کے اعتبار سے کن صفات کی نشو و نما ضروری ہے اور معاشری اور تمدنی حالات ' بالخصوص اپنے ملک کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان صفات

احترام پیدا کرتے ھیں - نو عمر بچے اور نوجوان ان کی مثال کی تقلید کرتے ھیں اور ھمدردی اور تاثیر خیال کی نفسی کیفیات کے ذریعے ان کی حرکات و سکنات اور ان کے جذبات اور خیالات کو اپنا بنا لیتے ھیں اور اس طرح آھستہ آھستہ غیر محسوس طریقے پر ان میں اُس فلسفۂ زندگی اور معیار عمل کی روشنی سرایت کر جاتی ھے جو معلموں کی شخصیت میں کارفرما ھے بشرطیکہ معلم نے اس پیشے کو مجبور ھو کر اور بد دلی سے محض روزی کمانے کے خیال سے اختیار نہ کیا ھو بلکہ وہ خود کو معاشرے کا اخلاقی نمائندہ اور بہترین عمرانی اقدار کا حامل سمجھے اور انھیں اپنے شاگردوں تک منتقل کرنے کو اپنا فرض منصبی خیال کرے -

———

جزو بنانے کے لیے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہییں کہ طلبہ کو عمل اور فعالیت کا موقع ملے' ان کے تعمیر و تخلیق اور خدمت اور اظہار خودی کے رجحانات کی تسکین ہو' انہیں مل جل کر کام کرنے کی عادت پڑے اور وہ اعتماد ذات احساس اور ذمہ داری کے ساتھ علم حاصل اور اس سے کام لینا سیکھیں - ان صفات اور عادات کو آئندہ معاشری زندگی میں کارآمد بنانے کے لیے مدرسے کی حکومت اور نظام ضبط و تادیب میں بھی اس کی اجتماعی روح کا اظہار ہونا چاہیے یعنی طلبہ کو موقع دینا چاہیے کہ وہ خود اپنے مشاغل کی تنظیم کریں' اپنے معاشری معاملات کا فیصلہ کریں اور ان کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لیے خود قوانین بنائیں اور جماعتی تائید اور تادیب کے ذریعے ان کی پابندی کرائیں - مطلب یہ ہے کہ مدرسے کے درسی اور معاشری مشاغل کی بنیاد یکساں اصولوں پر رکھی جائے تاکہ ایک طرف طلبہ میں تحصیل علم کے شغل میں ذمہ داری' اجتہاد اور اعتماد نفس کی صفات پیدا ہوں اور دوسری طرف غیر درسی مشاغل کی ترتیب اور معاشری معاملات کی تنظیم میں بھی اُن صفات سے کام لے سکیں جو حرکت' انقلاب اور جمہوریت کے اس دور میں انفرادی اور اجتماعی کامیابی کے لیے ضروری ہیں - تعلیم میں اس انقلاب عظیم کو پیدا کرنا معلموں کی جماعت کا کام ہے جو ایک طرف ان تمام وسائل کو استعمال کر کے طلبہ کے لیے ایک اخلاقی ماحول اور اخلاقی محرکات عمل مہیا کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنی شخصیت کے اثر سے ان میں براہ راست اخلاقی عادتیں اور اخلاقی اصولوں اور قوانین کا

کو اخلاقی تربیت کا گہوارہ بنائیں - اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس تمام عناصر کی نئے سرے سے تنظیم کریں - یہ عناصر کیا کیا ہیں ؟ اول' مدرسے کی روزمرہ کی زندگی بحیثیت ایک معاشری ادارے کے - دوم' طلبہ کے کام کرنے اور مطالعہ کرنے اور استادوں کے تعلیم دینے کے طریقے - سوم' نصاب تعلیم - چہارم' مدرسے کا نظام ضبط و تادیب اور اس کی عام فضا - پنجم' معلموں کی جماعت - ہم ان سب سے اس طرح کام لینا چاہتے ہیں کہ طلبہ میں عمرانی معاملات کی سمجھ ان کو انجام دینے کی قابلیت اور عمرانی اور اخلاقی مقاصد سے دلی لگاو پیدا ہو - ہم نے جو نقطۂ نظر مندرجۂ بالا صفحات میں پیش کیا ہے اس کی رو سے مدرسے کو ایک حقیقی اخلاقی ماحول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک معاشری جماعت میں تبدیل کر دیا جائے جس میں انہیں اصولوں کی کارفرمائی ہو اور وہی طریقہ ہائے عمل مروج ہوں جو بہترین انسانی معاشروں میں پائے جاتے ہیں - اس قسم کے محرکات عمل مہیا کیے جائیں جو بہترین انسانی کاموں کا باعث ہوئے ہیں یعنی تجسس اور تعمیر کا شوق' خدمت کا ولولہ' تکمیل شخصیت اور اظہار خودی کی خواہش وغیرہ اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ نصاب کے مضامین کی ترتیب اور ان کا انتخاب اس لحاظ سے کیا جائے کہ طلبہ کو اس ماحول سے پوری طرح واقفیت پیدا ہو جس میں انہیں اپنی زندگی بسر کرنا ہے اور اپنے فرائض ادا کرنے ہیں - اس نصاب کی تعلیم میں یعنی اس تمام علمی مواد کو کتابوں اور استادوں کے دماغ سے منتقل کر کے طلبہ کے ذاتی تجربے اور علم کا حقیقی

عقیدت کا اظہار ہوتا ہے تو وہ بھی خود بخود اس کا احترام کرنے لگتا ہے علاوہ اس درسی تعلیم کے معلم کا سب سے اہم اور مشکل فرض یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کو زندگی کے صحیح اصولوں اور قدروں سے روشناس کرے - اس مقصد کے حصول میں زبانی تعلیم و تلقین کو بہت کم دخل ہے نفسی زندگی کی تشکیل اور فلسفۂ حیات کی ترتیب میں سب سے زیادہ اثر عملی مثالوں کا ہوتا ہے خواہ وہ گزشتہ زمانوں کے مشاہیر کی ہوں جن سے طالب علم ادب اور تاریخ کے ذریعے روشناس ہوتا ہے یا اس کے اپنے بزرگوں اور اُستادوں اور دور حاضرہ کی بڑی بڑی شخصیتوں کی زندہ مثالیں ہوں جن سے اس کو بالواسطہ یا بلا واسطہ سابقہ پڑتا ہے - وہ معلم جس کو اخلاقی اصولوں اور قدروں پر پختہ ایمان ہے، جو اس ایمان کا محض زبانی اقرار نہیں کرتا بلکہ اپنے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام میں، ہر بات اور ہر خیال میں اس کا عملی اظہار کرتا ہے جس کی عادتیں ریاکاری اور تصنع سے پاک ہیں، جو ہر کام کو محنت اور دیانتداری سے کرتا ہے، جو ہر وقت دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی امداد کرنے کو تیار ہے؛ ایسا معلم غیر محسوس طریقے پر اپنی زندہ مثال کے ذریعے طلبہ کو ایک بہتر اور بلند تر معیار زندگی سے آشنا کرتا ہے اور ان کی خراب عادتوں اور ادنیٰ میلانات کو دور کر کے ایک اعلیٰ اخلاقی سیرت کا مالک بنا دیتا ہے - اب ہم اس تمام تفصیلی بحث کے نتائج پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈال کر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اخلاقی تربیت کے لیے ہمارے پاس کیا ذرائع ہیں اور ان سب کو استعمال کر کے ہم کن مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں - ہم چاہتے ہیں کہ مدرسے

ہوگا بلکہ جس طرح ہر انسان اپنے ماحول کے مختلف اثرات سے مستفید ہوتا ہے اسی طرح طالب علم اپنے اُستاد کا اثر قبول کرے گا - لیکن شرط یہ ہے کہ اُستاد ان خیالات کو جبر اور تحکم کے ساتھ ان پر عائد نہ کرے کیونکہ اس کا اثر اکثر اوقات اُلٹا ہوتا ہے - طلبہ میں اُستاد کی مخالفت اور نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اس کی ہر تجویز ' ہر مشورے کے برعکس عمل کرتے ہیں - کیونکہ تاثیر خیال کے عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی خیال جبراً عائد نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ معمول کی طبیعت میں بہت آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر اثر کرتا ہے - اکثر اُستاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو ادعائی انداز سے اپنے شاگردوں کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کی تقلید کریں گے حالانکہ ان کے ادعا اور تحکم کی وجہ سے تاثیر خیال کی ساحرانہ کیفیت بالکل جاتی رہتی ہے -

ادب ' تاریخ اور فنون لطیفہ کی تعلیم اور فلسفۂ زندگی کی ترتیب میں اُستاد اس قابلیت سے بہت کام لے سکتا ہے کیونکہ ان چیزوں میں عقلی دلائل کی گنجائش کم اور ذاتی اثر ڈالنے کا موقع زیادہ ہوتا ہے - جب ادب کا معلم کسی عمدہ نظم کو پڑھ کر جھومنے لگتا ہے یا جوش و خروش کے ساتھ کسی مستند ادیب کی تعریف کرتا ہے تو اس کے شاگردوں کے ادبی ذوق پر اس کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے - اسی طرح جب کوئی طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ معلم کسی خاص تاریخی شخصیت کا بہت احترام کرتا ہے اور اس کا ذکر کرتے وقت اس کے انداز بیان ' اس کے چہرے بشرے ' غرض اس کی ہر ادا سے خلوص اور

مل جل کر رهتے هیں ان کے خیالات اور عقائد ، ان کی راے ، ان کے فلسفۂ زندگی کا اثر غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے پر پڑتا هے خصوصاً جب اس جماعت میں مختلف عمر اور قابلیت اور تجربے کے لوگ هیں - اس لیے سوال محض یہ رہ جاتا هے کہ معلم اس اثر کو بغیر احتیاط اور انتظام کے طلبہ پر پڑنے دے یا اس بات کو محسوس کر کے کہ اس کی شخصیت تاثیر خیال کے ذریعے طلبہ کی شخصیت کو متاثر کر رهی هے - وہ اس سے فائدہ اٹھائے اور اس اثر کو ان کی تربیت کا ایک مفید عنصر بنائے - پہلی صورت میں اُستاد کا اثر ممکن هے اچھا پڑے ممکن هے برا - اسے اس عمل پر قابو کیا اس کی طرف توجہ تک نہیں هوگی - لیکن دوسری صورت میں اسے همیشہ یہ احساس رهے گا کہ اس کے خیالات و جذبات اسی کی ذات تک محدود نہیں بلکہ ان کا عکس طلبہ کی طبیعت میں جھلکتا هے - جب وہ کسی بات کے متعلق خلوص کے ساتھ پسندیدگی یا نفرت یا جوش یا بددلی کا اظہار کرتا هے تو یہ سب غیر محسوس طریقے پر اس سے متاثر هوتے هیں ؛ اس لیے اس کا فرض هے کہ هر وقت اپنے خیالات ، اپنی راے ، اپنے احساسات کا محاسبہ کرتا رهے تاکہ ان پر بالقصد اچھا اثر ڈالے - لہذا استاد کو یہ حق دینا چاهیے کہ وہ احتیاط کے ساتھ اس قوت کا استعمال کرے اور اپنے بہتر علم ، وسیع اور پختہ تر خیالات کو طلبہ کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ ان سے شعوری استفادہ بھی حاصل کریں اور غیر شعوری طور پر بھی متاثر هوں - اسی صورت میں آزادی خیال میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہ

اور باقاعدہ طور پر مرتب ہوتا ہے اُن کے بارے میں ہم دوسروں کی تاثیر خیال سے متاثر نہیں ہوتے -

تاثیر خیال کے لیے ہم نے جن صورتوں کو سازگار قرار دیا ہے وہ سب معلم اور شاگرد کے رشتے میں موجود ہیں - معلم عام طور پر جسمانی اور دماغی اعتبار سے اپنے شاگردوں پر فوقیت رکھتا ہے اور ان سے زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے اور اس کی منصبی حیثیت کی وجہ سے ان کے دل میں اس کی وقعت ہوتی ہے - برخلاف اِس کے اکثر معاملات میں بچوں کی اپنی معلومات محدود ہوتی ہے اور اس طرح مربوط اور منظم نہیں ہوتی کہ ایک مدلل عقیدے کی شکل اختیار کرلے اور وہ اس کی مدد سے ہر نئے خیال اور نئے عقیدے کی تنقید کر سکیں - اس حالت میں استاد اپنی تاثیر خیال کی صلاحیت کو بہت کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیے یا نہیں - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اُستاد ایسا کریں گے تو طلبہ کی ذہنی اور اخلاقی آزادی میں خلل پڑے گا اور وہ مختلف مسائل کے متعلق اپنی ذاتی رائے قائم نہیں کریں گے بلکہ محض انفعالی طریقے پر اس کے خیالات کو قبول کر لیں گے - اس لیے ان لوگوں کے خیال میں اُستاد کو تاثیر خیال سے کام نہ لینا چاہیے - بیشک اگر کوئی معلم اس قوت کا ' یا اپنی کسی قوت کا بھی ' بےجا استعمال کرے اور اس سے طلبہ کی ذہنی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہو تو اس کا نتیجہ خراب ہوگا - لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر معلم چاہے بھی تو اس تاثیر کو پوری طرح نہیں روک سکتا - جہاں کہیں لوگ

اپنی آنکھ سے روسی فوج کے دستوں کو گزرتے ہوئے دیکھا ھے - اس مثال سے معلوم ہوتا ھے کہ بعض خاص حالتوں میں تاثیر خیال کا امکان بہت زیادہ ہو جاتا ھے اور اس کی قوت بڑھ جاتی ھے - ماہرین نفسیات نے اِن حالات کا تجزیہ کیا ھے جو تاثیر خیال کے لیے سازگار ہوتے ہیں۔[1] ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ھے کہ تاثیر خیال کا اظہار اس وقت بہت زیادہ ہوتا ھے جب ہم عامل یا اثر آفریں شخص کی علمیت یا قوت یا وجاہت کے قائل ہوں - اور کسی خاص معاملے میں ہماری یعنی معمول کی واقفیت اور علم یا تو بہت ناقص ہو یا اچھی طرح مربوط اور منظم نہ ہو اور ہم اس کو کسی نئے خیال کی تنقید کے لیے استعمال نہ کرسکیں - دوسرے یہ کہ اگر عامل اپنے عقیدے اور خیال میں پختگی کا اظہار کرے اور اس خاص معاملے میں اپنی رائے کو بہت وثوق کے ساتھ ظاہر کرے تو ہم اسے بغیر عقلی تنقید اور غور و فکر کے تسلیم کر لیں گے - اس اظہار کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے خیال کو الفاظ میں بیان کرے - وہ اپنے عام انداز اور افعال سے بھی ایک خیال کو ظاہر کر سکتا ھے اور معمول پر اثر ڈال سکتا ھے - لیکن جن معاملات کے متعلق ہمارا اپنا علم یقینی

---

۱ —" تاثیر خیال " (Suggestion) کی نفسیات کا باقاعدہ مطالعہ گزشتہ چند سال ہی میں کیا گیا ھے - خالص علمی اور اصطلاحی تصانیف سے قطع نظر کر کے اس کے نفسی پہلو کو فرانسیسی عالم لے بون (Le Bon) نے اپنی تصنیف " Psychology of the Crowd " میں اور تعلیمی پہلو کو پروفیسر کیٹنگ (Keatinge) نے Suggestion in Education میں اچھی طرح پیش کیا ھے -

"لال خوروں" کو دیکھا ھے نہ " مومیائی " کو ' بلکہ ان میں سے اکثر تو اِن الفاظ کے مفہوم سے بھی ناواقف ھیں - اِس کی وجہ یہ ھوتی ھے کہ بالکل ناواقف اور خالی الذھن ھونے کی وجہ سے وہ اس قسم کی افواہ کو بغیر سوچے سمجھے بغیر تصدیق کیے قبول کر لیتے ھیں اور چونکہ یہ خبریں بہت جلد ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے شخص تک پہنچ جاتی ھیں اِس لیے ان میں ذرا سی دیر میں وہ قوت اور زور پیدا ھوجاتا ھے جو بہت سے لوگوں کی ھم خیالی کا نتیجہ ھے - اِس طرح جماعت کی تاثیر خیال افراد کو متاثر کردیتی ھے - اس کی ایک اور مشہور مثال وہ افواہ ھے جو جنگ عظیم کے زمانے میں انگلستان کے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں میں پھیل گئی تھی کہ اَسّی ھزار روسی سپاھی آئے ھیں تاکہ جرمنی کے خلاف انگریزوں کی مدد کریں [۱] اتنی بڑی تعداد کا دفعتاً ملک میں پہنچ جانا بالکل خلاف قیاس تھا - اس کے متعلق کوئی سرکاری اطلاع یا بیان شائع نہیں ھوا تھا - لیکن ملک میں خوف اور پریشانی کا دور دورہ تھا - لوگ کسی " غیبی امداد " کے خواھاں تھے اور خواھش سے خیال کو قوت پہنچتی ھے - یہ خبر خدا جانے کہاں سے اُٹھی اور آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گئی لوگوں کو اس کا اس درجہ یقین ھو گیا کہ بہت سے معتبر اور ثقہ لوگوں نے یہ بیان دیا کہ ھم نے

۱---اس واقعے کا ذکر علاوہ اور لوگوں کے لندن یونیورسٹی کے پروفیسر تعلیمات ڈاکٹر نن (Nunn) نے اپنی کتاب Education—its Data and First Principles میں کیا ھے -

پر ترجیح دیں لیکن اس خاص علم یا فن یا شعبۂ زندگی میں جہاں ہم ان کی فوقیت کے قائل ہیں ہم بعض اوقات اپنے ذاتی عقیدے اور راے کے خلاف بھی ان کی راے پر عمل کرتے ہیں - البتہ جس شعبے میں ہم دوسرے لوگوں سے زیادہ علم یا تجربہ یا مہارت رکھتے ہیں وہاں ان کی راے کو نظر انداز کر کے اپنی راے پر قائم رہتے ہیں - مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا عالم لباس یا خوراک یا تھئیٹر کے متعلق ایک جاہل کی راے کو صحیح سمجھ لیتا ہے بشرطیکہ اُس کو یہ خیال ہو کہ یہ شخص اس خاص معاملے میں زیادہ واقفیت رکھتا ہے - لیکن اگر یہی شخص اُس عالم کے سامنے کسی علمی معاملے کے متعلق اپنی راے ظاہر کرے جو اُس کی راے سے مختلف ہو تو وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا بلکہ اِس کا مضحکہ اُڑائے گا - یہ نفسی کیفیت نہ صرف افراد پر طاری ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ جماعتوں اور شہروں اور ملکوں پر طاری ہو جاتی ہے - اور اِس کی وجہ سے عجیب و غریب خبریں اور افواہیں مشہور ہو جاتی ہیں جنھیں لوگ بے سوچے سمجھے مان لیتے ہیں مثلاً بعض شہروں میں کبھی کبھی تین چار سال کے بعد یہ خبر اُڑ جاتی ہے کہ شہر میں "لال خورے" آئے ہوئے ہیں اور وہ بچوں کو پکڑ لیتے ہیں اور اُن کی "مومیائی" نکال کر لے جاتے ہیں - ہم نے دیکھا ہے کہ اچھے خاصے سمجھ دار اور باخبر لوگ اس بات کو یقین کر لیتے ہیں اور پریشان ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ پولیس جو تاثیر خیال کیا تخیل ہی سے محفوظ سمجھی جاتی ہے باقاعدہ تحقیقات شروع کر دیتی ہے - حالانکہ اُن لوگوں نے نہ کبھی

کے ساتھ ان انسانی اغراض و مقاصد کا مطالعہ کیا جائے جو موجودہ تمدن کی بنیاد ھیں - اگر معلم خود تنگ نظر اور قدامت پسند ہوگا اور ہر اہم معاملے پر بحث کرنے میں تامل کرے گا یا بیرونی اثرات اس کی آزادی میں حائل ہوں گے تو تربیت کا اہم‌ترین مقصد فوت ہوجائے گا -

ہمدردی سے ملتی جلتی دوسری نفسی کیفیت جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، تاثیر خیال ہے، جس کی وجہ سے ہم میں وہ خیالات اور تصورات راہ پاتے ھیں جو اثر آفریں شخص کے ذہن میں ہوتے ھیں - یہاں بھی اس کی ضرورت نہیں کہ جو شخص دوسرے کے خیالات کا اثر قبول کرے وہ عقل کی رو سے بھی ان کا قائل ہو جائے - اثر آفریں شخص کا خلوص اور اس کے عقائد کی پختگی خود بخود ہمارے اندر ان خیالات کو پیدا کر دیتی ہے- اس کی مثالیں بھی ہمیں ہر وقت اپنے چاروں طرف نظر آتی ھیں - اس کی ایک انتہائی صورت مسمریزم (Mesmerism) کے عمل میں پائی جاتی ہے جب معمول عارضی طور پر اپنی قوت اِرادی کو بالکل کھو بیٹھتا ہے اور عامل کے ہر خیال کو اپنا خیال سمجھ لیتا ہے - بےشک یہ تاثیر خیال کی انتہائی شکل ہے لیکن اس کو خرق عادت نہیں سمجھنا چاہیے - یہ ایک ایسی نفسی کیفیت کی انتہائی ترقی یافتہ صورت ہے جو ہم میں سے ہر ایک پر بارہا طاری ہوتی ہے - ہم بالعموم ان لوگوں کی باتوں اور خیالات کو آسانی سے مان لیتے ھیں جو علم یا دولت یا قوت یا کسی اور حیثیت سے ہم پر فوقیت رکھتے ھیں - یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کی ہر بات اور ہر خیال کو اپنے خیال

آزادی کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے کی ممانعت کرنا ، تعلیم
کو فرسودہ اور دور از کار معاملات اور مسائل تک محدود رکھنا
اور تمام زندہ مسائل کی طرف سے بے اعتنائی برتنا، یہ باتیں نہ
صرف روح تعلیم کے منافی ہیں بلکہ ان کی وجہ سے ان
بے انصافیوں اور زیادتیوں کے تدارک کی کوئی صورت پیدا نہیں
ہوتی جو ہمارے معاشری اور سیاسی نظام میں رائج ہو گئی
ہیں - بدقسمتی سے تقریباً دنیا کے تمام ملکوں میں اعلیٰ
تعلیم پر یہی تنگ نظری اور قدامت پسندی حاوی ہے -
جاپان اور اٹلی میں حکومت نے علی الاعلان ممانعت کر دی ہے
کہ " خطرناک خیالات " یونیورسٹی کی چاردیواری کے اندر
داخل نہ ہونے پائیں - دوسرے ملکوں میں اسی مقصد کو
حاصل کرنے کے لیے زیادہ پیچیدہ اور مصلحت آمیز طریقے
اختیار کیے جاتے ہیں لیکن مطلب سب کا ایک ہی ہے اور
وہ یہ کہ تعلیم گاہوں کے ذریعے ایسے خیالات کی اشاعت نہ
ہونے پائے جو بعض زبردست اقتصادی اور سیاسی جماعتوں کے
اغراض اور مفاد کے منافی ہوں - بقول حالی :—

بات سچی کہی اور انگلیاں اُٹھیں سب کی
سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

یہ بحث بظاہر معلم اور اخلاقی تربیت کے عنوان سے
بے تعلق معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اخلاقی تربیت
کا جو مفہوم پیش کیا ہے اس کے لحاظ سے یہ بات نہایت
ضروری ہے کہ طلبہ میں وسیع ترین انسانی ہمدردی پیدا کی
جائے اور اس مقصد کی راہ میں جو جہالت اور تنگ نظری
اور خود غرضی حائل ہے اس کو دور کرکے دیانت داری اور جرأت

جنگ چھڑی ہوئی ہے اور مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی - اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ہر قسم کے لوگوں کی ہمدردی کا دائرہ اس قدر محدود ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی جماعت کے اغراض و مقاصد کو سمجھ سکتے ہیں اور ان سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن دوسری جماعتوں کے مقاصد کو نہیں سمجھ سکتے - بعض دولت مندوں کو مزدوروں کے طبقے سے ایک قسم کی نظری ہمدردی ہے لیکن وہ بھی ان کے نقطۂ نظر کو نہیں سمجھتے اور انہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ لوگ بھی ہماری طرح انسان ہیں اور اپنے انسانی حقوق کی حمایت کے لیے جنگ کر رہے ہیں - اس نفسی کیفیت اور کشمکش کا نقشہ بہت سے لوگوں نے اپنی علمی تصانیف اور افسانوں میں کھینچا ہے لیکن غالباً سب سے سچی اور جیتی جاگتی تصویر امریکا کے مشہور افسانہ نویس اپٹن سنکلر (Upton Sinclaire) نے اپنے معرکۃالآرا ناول Oil (تیل) میں دکھائی ہے - جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے اس کا کچھ اندازہ پریم چند کے ناولوں چوگان ہستی اور گوشۂ عافیت کے مطالعے سے ہو سکتا ہے - اس صورت حال کی اصلاح اسی طرح ممکن ہے کہ مدرسوں کے تمام طلبہ میں عالم گیر اتحاد کا احساس، مشترک انسانی اغراض کا احترام اور ہمدردی کا وسیع‌ترین جذبہ پیدا ہو جائے - اور جب وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچیں تو وہاں جرأت اور دیانت‌داری کے ساتھ ان تمام نزاعی مسائل کا مطالعہ کریں جن کی وجہ سے مختلف جماعتوں میں آپس میں یہ جھگڑے پڑے ہوئے ہیں - تعلیم کے اعلیٰ مرکزوں میں

"ہرے بھرے جنگل کا ایک ذرا سا اثر ہمیں انسان اور نیکی بدی کے متعلق ایسے حقائق سکھا سکتا ہے جو دنیا کے تمام دانش مندوں کے ممکن نہیں" -

اسی طرح سعدی نے اہل نظر کو آگاہ کیا ہے :-

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن فطرت کی یہ سبق آموزی ہر شخص کے لیے عام نہیں - وہ انہیں کے لیے مخصوص ہے جن کے دل میں ہمدردی کا اتھاہ سمندر موجزن ہے - ہر معلم کو بچوں میں یہی ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے - اس کے ساتھ ساتھ معلم کو اپنی ذاتی مثال اور مدرسے کی تعلیمی اور معاشرتی مشاغل کی تنظیم کے ذریعے طلبہ میں باہمی ہمدردی پیدا کرنی چاہیے جو اشتراک عمل اور امداد باہمی کی بنیاد ہے - اگر اس کے ساتھ مدرسے اور بیرونی دنیا میں ربط اور تعلقات بھی قائم ہوں تو یہی ہمدردی وسیع تر انسانی ہمدردی کی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ معلم خود بھی کوشش کرے کہ طلبہ کی ہمدردی میں وسعت پیدا کرے اور وہ کسی خاص جماعت یا طبقے تک محدود نہ رہے بلکہ انہیں یہ محسوس ہونے لگے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی غم زدہ انسان ہے وہ ہمارا دوست اور عزیز ہے - جہاں کہیں لوگ کسی عمدہ انسانی مقصد کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں وہ ہمارے رفیق کار ہیں -

آج کل تمام تمدنی ممالک میں تفریق و اختلاف کا بازار گرم ہے - خصوصاً مزدوروں اور سرمایہ داروں میں بڑی سخت

مصور کے دل میں تھی پیدا نہ کر لیں - کسی کے دکھ درد کو پوری طرح محسوس نہیں کرسکتے جب تک ہمدردی کے وسیلے سے گویا وہی مصیبت خود ہم پر نہ گزر جائے -

چھوٹے بچوں کے مدرسے میں معلم کو اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی محبت اور ہمدردی انسانوں تک محدود نہ رہے بلکہ انہیں بےزبان جانوروں اور پودوں سے بھی لگاؤ پیدا ہو جائے - مدارس جدید میں مختلف پالتو جانوروں کے پالنے کی تاکید کی جاتی ہے اور ان کی نگہداشت کی ذمہ‌داری بچوں پر ہوتی ہے - اسی طرح وہ باغ‌بانی کرتے ہیں، اپنی اپنی کیاریوں میں پھولوں کے درخت اور ترکاریاں وغیرہ بوتے ہیں اور ان کی نشو و نما کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے سلسلے میں جن جن کاموں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی پانی دینا، کھاد ڈالنا، کھدائی کرنا وہ خود ہی انجام دیتے ہیں اس کا مقصد محض یہی نہیں ہوتا کہ بچے پودوں اور جانوروں کی عادتوں کا مطالعہ کریں اور اس طرح مفید معلومات حاصل کریں بلکہ اس ذریعے سے وہ عالم نباتات اور عالم حیوانات سے مانوس ہو جاتے ہیں - بعض لوگ جن میں احساس جمال زیادہ لطیف اور نازک ہوتا ہے اور جن کو زندگی کی لہر نہ صرف حیوانات میں بلکہ تمام عالم فطرت میں نظر آتی ہے پھولوں اور پودوں اور قدرتی مناظر کو بھی اپنے آغوش محبت میں لے لیتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ مثلاً بہت سے فطرت پرست شاعروں کو خوبصورت مناظر کے نظارے سے دلی اطمینان اور سکون نصیب ہوتا ہے اور اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں ورڈزورتھ (Wordsworth) نے کہا ہے کہ :—

مناسب ہوں گے۔ اگر وہ رنج و غم، رضامندی اور ناراضی، غصہ
اور رحم کا اظہار موزوں طریقے پر کرے گا تو اس کے شاگرد اس سے
متاثر ہوں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جذبہ سچا اور خالص
ہو، تصنع اور مبالغے سے پاک ہو کیونکہ بچے بناوٹ اور
ظاہرداری کو بہت جلد پہچان لیتے ہیں اور اس شخص کی
طرف سے بدظن ہو جاتے ہیں جس کے جذبات میں خلوص اور
قول اور فعل میں مناسبت نہ ہو۔ جذبات کی تربیت کا
سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اچھے لوگوں سے عقیدت اور احترام
پیدا کیا جائے۔ عمدہ چیزوں کی طرف رغبت اور خراب چیزوں
سے نفرت دلائی جائے۔ بچوں میں یہ ذوق پیدا کر دیا جائے کہ
خوبصورت اشیا اور مناظر ان کے دل کو لبھائیں اور بد صورت
چیزیں بری معلوم ہوں۔ جذبۂ عقیدت اور حسن ذوق بچوں
کے دل میں آسانی کے ساتھ نشو و نما پاسکتا ہے اگر معلم کے
اپنے جذبات سچے اور شائستہ ہوں اور اس کا مذاق پاکیزہ ہو،
کیونکہ بچے ان جذبات کو اکثر غیر شعوری طور پر قبول کرلیتے
ہیں اور انسانوں کی جانب ان کا فطری رد عمل بھی وہی ہو
جاتا ہے جو اُستاد کا ہے۔ معلم کا فرض یہ ہے کہ ان کا ہمدردی
کا جذبہ اس قدر وسیع کر دے کہ وہ ان کے تمام ماحول پر
محیط ہو جائے کیونکہ ہم حقیقی معنی میں کسی چیز یا
شخص کو اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے جب
تک اس کے ساتھ ہمیں اس درجہ ہمدردی نہ ہو کہ ہم گویا
اس کے دل میں اُتر جائیں اور اس کے جذبات کو اپنا بنالیں
ہم کسی خوبصورت نظم یا تصویر سے پوری طرح لطف اندوز
نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اندر وہی کیفیت جو شاعر یا

نفسیات کی اصلاح میں تقلید سے مراد مشابہت پیدا کرنے کا وہ عمل ہے جس کا تعلق زیادہ‌تر جسمانی حرکات اور عادات سے ہوتا ہے اور اس کے ذریعے بچہ بہت سے کام سیکھ لیتا ہے جن کا اثر بالواسطہ اس کی طبیعت اور مزاج پر پڑتا ہے لیکن اس کے علاوہ دو نفسی کیفیتیں ایسی ہیں جن کے ذریعے انسان براہ راست دوسروں کے خیالات اور جذبات سے متاثر ہوتا ہے - یہ نفسیات کے اصطلاح میں ہمدردی اور تاثیر خیال کہلاتی ہیں - کسی شخص سے ہمدردی کا احساس ہمارے دل میں وہی جذبات پیدا کر دیتا ہے جو اس کے دل میں ہوں - اس کی مثالیں ہر وقت ہمارے مشاہدے میں آتی رہتی ہیں کسی عزیز دوست کو ملول دیکھ کر ہم پر خود بھی رنج کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" بشرطیکہ اہل انجمن کو افسردہ دل سے کچھ ہمدردی بھی ہو - اگر ہم کسی خوش مزاج دوست کے پاس یا ایسے دوستوں کے حلقے میں چلے جائیں تو ہمارا غم غلط ہو جاتا ہے اور طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے - اسی لیے کہا گیا ہے کہ جذبات متعدی ہوتے ہیں اور گویا اُڑ کر ایک دوسرے کو لگ جاتے ہیں -

اس سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کے جذبات کا اثر خود بخود ہماری طبیعت پر ہوتا ہے اس کی ضرورت نہیں کہ ہم کوشش کر کے یا عقلی دلائل کے ذریعے اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کریں - معلم مدرسے میں اپنی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر اور طلبہ کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے تعلقات پیدا کرکے ان کے جذبات کو متاثر کر سکتا ہے - اگر اس کے جذبات موقع کے

کو چاہیے کہ فطرت اطفال کی اس خصوصیت سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے ذاتی نمونے اور مثال کے ذریعے انہیں آداب مجلس، تہذیب و شائستگی اور عمدہ معاشری عادات کی تعلیم دیں - کیونکہ سیر بھر عمل، من بھر زبانی تعلیم کے برابر ، - خصوصاً ابتدائی چند سال میں زبانی تعلیم کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے - اس وقت عملی مثال ہی کارگر ہوسکتی ہے کیونکہ اکثر بچے بہت سی باتیں بغیر پوری طرح سمجھے ہوئے محض عضلات کی تقلیدی حرکت کے ذریعے سیکھ لیتے ہیں بچوں کی تربیت کی پہلی منزل یہی بلاواسطہ تقلید کی منزل ہے - اگر معلم کا اور گھر کے لوگوں کا ذاتی نمونہ اچھا ہے تو اس کے اثر سے بچوں میں بہت سی ایسی عادتیں پیدا ہوسکتی ہیں جو اگر اخلاق کا جزو نہیں تو اخلاقی سیرت کی تعمیر میں بنیاد کا کام ضرور دیتی ہیں - لوگوں کے ساتھ خلق مدارات سے پیش آنا، لڑائی جھگڑے سے دور رہنا ۔ ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد کرنا؛ اپنا کام محنت اور استقلال کے ساتھ انجام دینا، وقت کی پابندی، صفائی کا اہتمام یہ تمام صفات ایسی ہیں جو تقلید اور مشق سے عادتوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں - اگر مدرسے میں طلبہ اپنے استادوں اور ساتھیوں میں یہ عادتیں پائیں گے تو وہ ان کی دیکھا دیکھی خود بھی ایسا ہی کرنے لگیں گے - بےشک جب طالب علم سن شعور کو پہونچتا ہے تو اسے بہت سی عادات اور رسوم و روایات اور اصولوں کے عقلی وجوہ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اوائل عمر میں تربیت کا ایک معقول حصہ تقلید کے ذریعے انجام پاسکتا ہے -

کی تربیت کرے اور اپنی ذات کو ان تمام خوبیوں کا زندہ نمونہ بناکر دکھائے جن کی وہ تلقین کرتا ہے - اس صورت میں طلبہ پر اس کا اخلاقی اثر بہت قوی اور دیرپا ہوگا - البتہ اس میں یہ احتیاط شرط ہے کہ اس کی اپنی شخصیت طلبہ پر اس درجہ غالب نہ آجائے کہ وہ ان کے ارتقاے نفس میں حارج ہو - کیونکہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اکثر والدین اور اُستاد جن کی طبیعت میں ' تحکم اور تسلط کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے بچوں کو زبردستی اپنے عقائد اور خیالات کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور انہیں آزادانہ نشو و نما کا موقع نہیں دیتے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے اکثر طبیعت اور ارادے کے کمزور' اور ہمت اور حوصلے سے عاری ہوتے ہیں وہ ہر بات میں اپنے بزرگوں کے محتاج رہتے ہیں اور اپنی قوتوں سے کام لینا نہیں سیکھتے ان کی مثال اُن چھوٹے چھوٹےکمزور پودوں کی سی ہے جو کسی بڑے درخت کے نیچے اگتے ہیں اور بڑھنے نہیں پاتے- اس شرط کے ساتھ ہم معلم کے ذاتی اثر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کا تجزیہ کرکے یہ معلوم کریں گے کہ یہ کن شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے -

معلم کئی طرح سے طلبہ پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالتا ہے - ان میں بچپن کے زمانے میں تقلید کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ اپنے دوستوں ' بزرگوں ' ہم جماعتوں غرض ان سب لوگوں کی جن سے ان کو سابقہ پڑتا ہے نقل اتارتے ہیں خصوصاً اپنے اُستادوں کی ہر بات میں تقلید کرتے ہیں - ان کی بات چیت کا طریقہ ' ان کا لباس ' ان کی عادتیں غرض کوئی چیز اس تقلید کے اثر سے خالی نہیں رہتی - اُستادوں

یہ بتا چکے ہیں کہ نوجوانوں کو تحکم اور دباؤ بہت ناگوار ہوتا ہے - اور اگر کوئی شخص ان سے کوئی کام کرانا چاہے تو فوراً اس کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں - لیکن اس عمر میں وہ شخصیت کے قدرتی اثر کو بہت جلد اور بڑی خوشی سے قبول کرتے ہیں - اگر انہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ کوئی شخص ان پر کسی لحاظ سے مثلاً قابلیت یا تہذیب یا مرتبے میں فوقیت رکھتا ہے اور اسے ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی بھی ہے تو وہ عقیدت اور وفاداری کے ساتھ اس کی پیروی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں - یہی زمانہ ہے جب وہ اپنی تاثیر تفوق سے پوری طرح فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور اگر اس میں تسخیر اور تالیف قلوب کا اتنا مادہ ہے کہ طلبہ اسے اپنا لیڈر مانیں اور اس کی ہمدردی اور نیک نیتی کے معترف ہوں تو مدرسے کے انتظامی معاملات اور ضبط و تادیب کے مسائل بہت کچھ حل ہو جاتے ہیں کیونکہ جب وہ اس کو اپنی جماعت کا سرگروہ تسلیم کرلیتے ہیں تو اس کی ناراضی ان کے لیے بہت بڑی سزا اور اس کی خوشنودی بہت بڑا انعام ہو جاتی ہے - اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اُستاد کو اپنے مزاج' طرز عمل اور عادات کے معاملے میں ہر وقت محتاط رہنے کی ضرورت ہے - کیونکہ اس کی تمام حرکات و سکنات' اس کے اصول زندگی' اس کا اخلاق سب اس کے شاگردوں کی طبیعت پر اثر ڈالتے رہتے ہیں - جس طرح یہ اس کا فرض منصبی ہے کہ وہ نفسیات اطفال اور جدید تعلیمی تحریکوں کا مطالعہ کرے اور اپنے علم اور استعداد کو بڑھاتا رہے اس طرح اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو پاکیزہ اور مہذب بنائے' اپنی شخصیت

شخصیت، اس کے فلسفۂ زندگی اس کے طرز عمل کا اثر بلاواسطہ ہوتا ہے - اس کا تعلق بچوں کی زندگی کے کسی خاص پہلو سے نہیں بلکہ ان کی زندگی کے تمام شعبوں سے ہے اور وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کی مجموعی سیرت کو متاثر کرتا رہتا ہے - اگر کسی ڈاکٹر یا انجینیر یا معمار کو اپنے کام کے موضوع سے محبت نہ ہو اور وہ اس کی انجام دہی میں مروت اور ہمدردی کا اظہار نہ کرے تو اس نقص کی وجہ سے اس کے کام میں کچھ ایسی خرابی واقع نہیں ہوگی - بےشک یہ صفات بجائے خود ہر شخص کے لیے مفید ہیں خواہ اس کا کوئی پیشہ ہو اور اسے انسانی فرائض کی ادائگی میں ہمیشہ ان کی ضرورت پڑتی ہے - لیکن ان کے نہ ہونے میں جو کچھ برائی ہے خود اس کی ذات کے لیے ہے اس کے کام یا فن کے لیے نہیں - بہ خلاف اس کے معلم کو ذی روح افراد سے سابقہ پڑتا ہے جو اپنے ماحول کے اثرات کو ہر وقت قبول کرتے رہتے ہیں - اور اس ماحول میں معلم کی ذات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے - کیونکہ ایک تو معاشرہ خود اسے طلبہ کے مقابلے میں برتر حیثیت دیتا ہے اور اسے ان کی نظر میں بہت عزت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے - دوسرے زیادہ قابل، زیادہ تجربہ کار اور پختہ کار ہونے کی وجہ سے معلم ان پر اپنا اثر ڈال سکتا ہے اور اس قوت سے کام لے سکتا ہے جو نفسیات کی اصطلاح میں "تاثیر تفوق"[1] کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے -

ہم عہد شباب کی بعض خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے

1- Prestige Suggestion -

کو قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی انجام کار اس پر عائد ہوتی ہے - یہاں بھی ہمارا منتہائے نظر یہی ہے کہ ہم طلبہ میں حکومت خود اختیاری قائم کریں اور مدرسے کی معاشری زندگی اور اس کے فرائض کی تنظیم کی ذمہ داری انہیں پر ڈال دیں - لیکن یہ حالت خود بخود پیدا نہیں ہو جاتی - اس کے لیے معلم کو ابتدا میں بہت غور اور کاوش اور تدبیر کی ضرورت ہے اور اس کے قائم ہوجانے کے بعد بھی اسے ہمیشہ بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا پڑتا ہے - کیونکہ نہ معلوم کس وقت اس مشین میں کوئی ایسی خرابی یا رکاوٹ پیدا ہو جائے جس کو طلبہ خود دور نہ کرسکیں اور اس کی درستانہ امداد اور مشورے یا مداخلت کے محتاج ہوں - لہذا موجودہ تعلیمی خیالات کی رو سے معلم کو نظام تعلیم میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے - اگرچہ اسے پہلے کی طرح طلبہ کے بجائے خود کام کرنا نہیں پڑتا اور وہ مطالعہ اور محنت کی ذمہ داری حتی الامکان انہیں پر ڈالتا ہے لیکن اس کی تعلیمی، معاشری اور اخلاقی ذمہ داریاں پہلے سے زیادہ اہم اور نازک ہوگئی ہیں اور زیادہ متنوع صفات اور صلاحیتوں کی طالب ہیں - موجودہ بحث کو مکمل کرنے کے لیے یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ علاوہ نصاب اور طریقۂ تعلیم وغیرہ کی تنظیم کرنے کے معلم بحیثیت ایک انسان کے اپنے طلبہ کی اخلاقی تربیت میں کس طرح حصہ لے سکتا ہے -

معلم کے پیشے کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو اسے تقریباً اور تمام پیشوں سے ممتاز کرتی ہے - اسے اپنے طلبہ کے دل و دماغ اور روح سے براہ راست سابقہ پڑتا ہے اور ان پر اس کی

باب پنجم

معلم کی شخصیت

ہم نے اب تک اخلاقی تربیت کے جن ذرائع سے بحث کی ہے ان سب میں معلم کی شخصیت کی اہمیت اور اس کے اثر کا اعتراف کرنا پڑا ہے - نصاب کی ترتیب اور اس کو معاشری ضروریات کے ساتھ ہم‌آہنگ بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ معلم کو فطرت اطفال اور نظام تمدن دونوں سے واقفیت ہو ' وہ ذہین ہو اور معاشری احساس رکھتا ہو - اس کے بعد نصاب کو طلبہ کے سامنے پیش کرنے کا اور اس کو ان کی زندگی کا جزو بنانے کا مسئلہ آتا ہے ' جو طریقۂ تعلیم سے متعلق ہے' اور اس کا انحصار تمام تر معلم کی ذات پر ہے - گو موجودہ نظریۂ تعلیم کے مطابق ہمارا مقصد اعلیٰ یہی ہے کہ طلبہ میں خود کام کرنے اور اپنی مشکلات آپ حل کرنے کی قابلیت پیدا ہو ' لیکن یہ مقصد بغیر معلم کے رہنمائی اور امداد کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہی مدرسے کے ماحول کو اس طرح منظم کرتا ہے اور اس میں ایسے محرکات عمل فراہم کرتا ہے کہ بچوں میں اعتماد ذات ' محنت اور حوصلے کی صفات ابھر آتی ہیں - اسی طرح مدرسے میں تادیب و ضبط کے نظام

پیدا ہوجائے کہ اس کی انجام دہی کے لیے اسے کوئی رشوت نہ
دینی پڑے - جب طالب علم بچپن کے حدود سے گزر کر
بلوغ کی منزل میں قدم رکھتا ہے اور اس کے احساس خودی
میں استحکام پیدا ہوتا ہے تو جسمانی سزائیں اور مادی
انعامات دونوں خلاف مصلحت ہو جاتے ہیں اور ان کا
استعمال نفسیات کی تعلیم کے سراسر منافی ہے - اس وقت
معلم کو طلبہ پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالنا چاہیے اور ان کے
ساتھ دوستی اور باہمی اعتماد کے تعلقات پیدا کر کے انہیں
بہتر اور بلندتر قدروں سے روشناس کرنا چاہیے -

انہماک پیدا نہیں ہوتا - اس لیے ہم نے ان سب کو بالکل موقوف کر دیا ہے - "[1]

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ بعض انعامات ایسے بھی ہیں جو کسی طرح قابل اعتراض قرار نہیں دیے جاسکتے - اُستادوں کی طرف سے پسندیدگی کا اظہار، مہربانی کا سلوک، ہمت افزائی جس سے طلبہ کو یہ معلوم ہو کہ وہ لوگ جن کی وہ قدر کرتے ہیں، ان سے خوش ہیں - یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے اس اطمینان و مسرت میں جو ادائے فرض سے نصیب ہوتی ہے، اضافہ ہو جاتا ہے - لیکن بہرحال سزا کا خوف، انعام کی تحریص، معلم یا جماعت کی خوشنودی یہ تمام چیزیں صرف ذرائع کے طور پر استعمال کرنی چاہییں - ان میں سے کسی کو بجائے خود مقصد بنا دینا اخلاقی نشو و نما کا خاتمہ کر دینا ہے - سزا کا منشا محض اسی قدر ہے کہ وہ طالب علم کے ذہن میں برے کاموں اور اس کے برے نتائج کے درمیان ایک تلازم قائم کر دے اور جب تک وہ شعوری طور پر ان سے احتراز کرنا نہ سیکھے، ایک عارضی مانع کا کام دیتی رہے - اسی طرح انعام کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ کو محسوس ہو کہ جب وہ کوئی کام قابلیت سے اور دل لگا کر کرتے ہیں تو سب لوگ اس کی قدر کرتے ہیں - مگر معلم کا منتہائے نظر ہمیشہ یہی ہونا چاہیے کہ رفتہ رفتہ طالب علم تہدید و تحریص دونوں سے بالاتر اور بےنیاز ہو جائے اور اسے اپنے کام میں اتنی دلچسپی

۱- The New Education in the Soviet Republic صفحہ ۲۰۰

کریں اور ایسے لوگ بہت ہیں جو نام پیدا کرنے کے لیے شور و غل مچا کر یا کسی نمائشی تحریک میں شریک ہو کر بہت جلد ''لیڈر'' بن جانے کی کوشش کرتے ہیں - اس خرابی کی اصلاح کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ مدرسوں میں انعام کا استعمال اور اس کی نوعیت بدل دی جائے اور معلم بھی اس معاملے میں اپنا طرز عمل بالکل تبدیل کر دیں - موجودہ حالات میں بے چارے معلم کا کام ہی یہ ہے کہ یا تو طلبہ کے قصوروں اور خطاؤں کی تلاش میں رہے اور انہیں سزا دے یا ان کی پست ہمت کو ابھارنے اور انہیں تعلیمی مشاغل میں زبردستی دلچسپی دلانے کے لیے انعام کا یا نمبر حاصل کرنے کا لالچ دے - جب بچے کو مدرسے میں آئے دن یہی تجربہ ہوتا ہے تو وہ بھی اپنے افعال و کردار کی قدر کا اندازہ اس معیار پر نہیں کرتا کہ وہ بنفسہ اچھے ہیں یا نہیں بلکہ سزا کے خوف اور انعام کے لالچ سے کام کرتا ہے اور اسے ہمیشہ دوسروں پر سبقت لے جانے کی فکر رہتی ہے - اس طرح معلم غیر محسوس طریقے پر طلبہ کے معیار قدر کو بہت پست کر دیتا ہے - پروفیسر پنکے وچ (Pinkevitch) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ روس میں جو تعلیم جدید انقلاب کے بعد سے رائج ہے اس میں ہر قسم کے ''نشان امتیاز'' کو ممنوع قرار دیا گیا ہے :—

''مختلف قسم کے نشان امتیاز مثلاً گریڈ' سرتیفکٹ' ڈگریاں وغیرہ دینے سے خراب قسم کی نمائش پسندی پیدا ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے طلبہ محض انعام کی خاطر محنت کرتے ہیں اور انہیں اپنے کام میں قدرتی شغف اور

زیادہ اور غلط طریقے پر کیا جاتا ہے اور اسی طرح انعاموں کا جائز استعمال بھی اُستادوں کو معلوم نہیں - طلبہ کا جذبۂ مسابقت کو اُبھارنے اور اُنھیں اپنے کام سے ایک قسم کی بالواسطہ دلچسپی دلانے کے لیے اُنھیں مختلف قسم کے انعامات' زیادہ تر مادی انعامات' دیے جاتے ہیں جن کو وہ بجائے خود باعث امتیاز سمجھتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان میں عادت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اس مصنوعی امتیاز کے حاصل کرنے میں اپنی ساری کوشش صرف کردیتے ہیں کسب کمال کی خواہش بنفسہ ان کے دل کو نہیں لگتی - یہ صورت حال ان کی اخلاقی تربیت پر بہت برا اثر ڈالتی ہے کیونکہ ان کی توجہ ضمنی اور غیر ضروری چیزوں میں پڑ کر منتشر ہو جاتی ہے اور ان میں اور ان کے کام میں وہ رشتہ پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے - جب مدرسے میں یہ عادت راسخ ہو جاتی ہے کہ بغیر کسی مادی لالچ کے کسی انعام کی توقع کے پوری محنت اور انہماک سے کام نہ کیا جائے' تو طالب علم عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد بھی اسی چیز کو مد نظر رکھتا ہے اور چونکہ موجودہ تمدن میں تقریباً ہر چیز کی قدر کا اندازہ دولت یا نمود اور شہرت کے معیار پر کیا جاتا ہے' اس لیے وہ ہر کام کرتے وقت یہی سوچتا ہے کہ اس میں مجھے کتنا مالی نفع ہوگا اور کس قدر شہرت حاصل ہوگی - اور اُن کاموں کو کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا جن میں خاموشی' نفس کشی اور بےغرضی کے ساتھ خدمت کرنے کی ضرورت ہے - یہی وجہ ہے (یا کم سے کم یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے) کہ ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی ہے جو ایثار اور خاموشی کے ساتھ قومی خدمت

تو باز ساعد شاہی بہ استخوان منگر

ہمائے ہمت خود را بلند دہ پرواز

اس بحث کا نتیجہ معلم کے لیے یہ نکلتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے شاگردوں کو اعلیٰ مقاصد سے روشناس کرے اور ان میں ایک ایسا معیار اقدار قائم کردے کہ وہ اپنے اعمال و افعال کی تدریجی تنظیم کر سکیں۔ ان کی طبیعت میں اعتدال اور سلامت روی کے قائم رکھنے کے لیے سزا اور انعام کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ اس کے بجائے ان کے دل میں اپنے پسندیدہ مقاصد کا اس قدر احترام پیدا ہو جائے کہ یہی مقاصد ان کے اخلاقی معلم اور نگراں بن جائیں اور ان کو غلط راستوں پر پڑنے سے روکیں۔ اگر کبھی مجبوراً اُستادوں کو یا والدین کو خود اپنے ہاتھ سے سزا دینی بھی پڑے تو انہیں یہ چاہیے کہ بچے کے ذہن میں سزا اور قابل اعتراض کام کے درمیان بلا واسطہ اور فوری تعلق قائم کر لیں تاکہ جب کبھی اسے اس کام کرنے کی دوبارہ تحریص ہو تو اس کے ناگوار نتائج کا خیال دل میں فوراً تازہ ہو جائے اور وہ اس سے باز رہے۔ اچھے معلم کی پہچان یہ ہے کہ وہ سزا کو ذاتی ناراضگی کے اظہار کے طور پر استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کو معاشری قانون اور اجتماعی مرضی کا نتیجہ بنا کر دکھاتا ہے اور اس طرح ایک فرد کے بجائے پورا معاشرہ ضبط و تادیب کا نافذ کرنے والا بن جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطمح نظر ہمیشہ یہی ہونا چاہیے کہ بچوں کے عمل کے محرک اعلیٰ ترین مقاصد ہوں اور ان کے حصول کا خیال ان کے اخلاق و کردار کی رہنمائی کرے۔

جس طرح مدرسوں میں سزاؤں کا استعمال حد سے

امر کی ہے کہ ہر نوجوان کے پیش نظر زندگی کا کوئی ایسا مقصد ہو جو اس کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے موزوں اور معاشری مفاد اور بہبود کے لحاظ سے قابل قدر ہو تاکہ وہ اس میں منہمک ہو کر ایک طرف تو اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکے' اپنے آپ کو اپنے کام میں کھو کر پاسکے کہ یہی "معرفت نفس" کا واحد ذریعہ ہے' اور دوسری طرف وہ شخصی اغراض کے تنگ دائرے سے نکل کر اپنی ذات کو وسیع تر عمرانی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرے - جب اِنسان کی نظر میں اس قدر وسعت اور رسائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے محدود ذاتی مقاصد کا رشتہ دائمی اور ابدی مقاصد کے ساتھ جوڑ لیتا ہے جن کی تکمیل میں کائنات کی ساری قوتیں مصروف ہیں اور اِس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قدرت کے سارے کارخانے میں ایک عظیم‌الشان ارتقا پذیر مقصد کی کارفرمائی ہے جس میں اسے بھی اپنی استطاعت کے مطابق شرکت کرنی چاہیے تو "ذرۂ صحرا دستگاہ و قطرۂ دریا آشنا" کی منزل آجاتی ہے جہاں مذہبیت کی سچی روح اپنا جلوہ دکھاتی ہے' انسان اخلاق اور انسانیت کے درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے - اسے انفرادی اور معاشری اغراض و حقوق کی جنگ' خارجی سزاؤں کا خوف اور خارجی جزاؤں کا لالچ بالکل بےمعنی اور حقیر معلوم ہوتا ہے اور وہ برائیوں اور "گناہوں" سے اس لیے نہیں بچتا کہ وہ "ممنوع" ہیں یا ان کے کرنے میں سزا کا خوف ہے' بلکہ اس لیے کہ ان میں پڑنا اُس کے نزدیک تضیع اوقات ہے' اس کی اعلیٰ خدا داد قوتوں کی توہین ہے - وہ اپنے دل میں کہتا ہے :—

جائے کہ اندیشہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں بزرگوں اور
اُستادوں سے بغاوت اور ناراضگی کے جذبات راسخ ہو جائیں گے ۔
جن معلموں نے اپنے شاگردوں کی نفسی کیفیات اور اعمال کا
مشاہدہ غور سے کیا ہے وہ اس صورت حال سے بخوبی واقف ہیں ۔
لہذا بچپن کے آخری دور میں اور بلوغ کے زمانے میں اس کی
ضرورت ہوتی ہے کہ طلبہ خود اپنے اعمال اور کردار کے ذمہ دار
بنائے جائیں اور ہدایت کا مرکز باہر سے اندر کی جانب منتقل
ہوجائے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کی قوت ارادی
کی تربیت کرنی چاہیے ۔ تاکہ ان میں ضبط نفس پیدا ہو
اور وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کرکے ان سے عمدہ طریقے پر کام لیں
اور اپنی زندگی کی تنظیم اس طرح کریں کہ اس پر اخلاقی
اصولوں اور اخلاقی معیار عمل کی حکمرانی ہو ۔ یہاں قوت
ارادی سے مراد ، جیسا ہم بتا چکے ہیں ، وہ جداگانہ قوت نہیں
جو قدیم نفسی عقیدے کے بموجب انسان کی خواہشات اور
فطری میلانات کی دشمن ہوتی ہے اور بطور ایک بیرونی
محافظ کے روک تھام کرتی رہتی ہے ۔ بلکہ قوت ارادی دراصل
خواہشات اور فطری رجحانات کی ترتیب و تنظیم سے عبارت
ہے جو ہمیں ان کی اخلاقی قدر و قیمت سے آگاہ کرتی ہے اور
ان میں سے بعض کو مقدم اور بعض کو مؤخر قرار دیتی ہے اور
جس کی وجہ سے ہم عمرانی اور اخلاقی مقاصد کو اپنی فوری
اور نفسانی خواہشات پر ترجیح دیتے ہیں ۔ جب ہم میں
شعوری طور پر انتخاب اور ترجیح کی قابلیت پیدا ہوجاتی
ہے تو ہم اپنی رہنمائی کا فرض خود ادا کرسکتے ہیں ۔ فورسٹر
نے جرمن فوج کو مخاطب کرکے جو الفاظ کہے تھے وہ تعلیم کے

سے اس کا کان کاٹ لیا - جب لوگوں نے اسے اس پر لعنت ملامت کی تو اس نے جواب دیا کہ اگر میری ماں بچپن ہی میں تنبیہ اور سرزنش کرتی جب میں اپنے ہمجماعتوں کی پنسلیں اور کاغذ چرایا کرتا تھا تو مجھے یہ دن دیکھنے کی نوبت نہ آتی - یہی حال اور بہت سی خراب عادتوں کا ہے مثلاً شراب خوری' بد دیانتی' جھوٹ بولنا - ممکن ہے کبھی ان کا نتیجہ جلد ہی ظاہر ہوجائے لیکن اکثر اوقات لوگ مدت تک یہ حرکتیں کرتے ہیں اور اس کی انتہائی سزا ان کو بہت عرصے کے بعد ملتی ہے جب انہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا -

غرض ہم قدرتی سزاؤں سے فائدہ ضرور اٹھا سکتے ہیں - خصوصاً بچپن کے ابتدائی چند سال میں ان کا استعمال مفید ہے - لیکن بچوں کی تادیب کو صرف انہیں پر منحصر نہیں رکھ سکتے بلکہ اکثر اس معاملے میں انسانی مداخلت کی ضرورت ہوتی ہے - چھوٹے بچے مختلف قسم کی بندشوں' اور بعض مستثنیٰ صورتوں میں جسمانی سزا کے ذریعے ایسے افعال سے روکے جاسکتے ہیں جو ان کے لیے مضر ہیں - لیکن جب ان کی عمر زیادہ ہوجاتی ہے اس وقت سزا کا مسئلہ زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہوجاتا ہے - اب ان میں عزت نفس اور احساس خودی کے جذبات زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں اور وہ اپنے معاملات میں دوسروں کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے - بہت سے قاعدے اور قانون بناکر یا سزاؤں کا ایک مفصل نقشہ تجویز کرکے انہیں شرارتوں اور بری حرکتوں سے باز رکھنا ممکن نہیں - بلکہ اگر اس قسم کی سزاؤں پر زیادہ زور دیا

بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُستاد اور والدین کے فوری غضب اور مزاجی کیفیت کو اس میں دخل نہیں ہوتا اور بچہ دو تین مرتبہ کے تجربے کے بعد ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ بعض حرکتوں کے ناگوار نتائج ناگزیر ہیں اگر وہ ان کا مرتکب ہوگا تو اسے ضرور تکلیف اٹھانی پڑے گی اور کوئی شخص اس کو اس خمیازے سے نہیں بچا سکے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی سزائیں ہر جگہ پر کام نہیں دیتیں۔ بچوں اور نوجوانوں کی زندگی میں بےشمار مواقع ایسے پیدا ہوتے ہیں جب انہیں اپنے برے یا قابل اعتراض افعال کی کوئی فوری اور قدرتی سزا نہیں ملتی۔ مثلاً اگر کوئی بچہ اپنے سے کمزور بچے کو بےوجہ مارے یا اس کی کوئی چیز چھین لے تو اُسے اِس زیادتی کا کوئی فوری خمیازہ نہیں اٹھانا پڑے گا جب تک کوئی دوسرا شخص اس میں دخل نہ دے اور ارادتاً اس کو کسی قسم کی سزا نہ دی جائے، خواہ سزا دینے والے والدین ہوں یا اُستاد یا خود طلبہ کی جماعت منتظمہ۔ علاوہ بریں بعض قدرتی سزائیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اثر فوراً ظاہر نہیں ہوتا بلکہ آہستہ آہستہ اپنا عمل کرتا ہے اور بچے کو اپنی حرکت کا پورا خمیازہ بہت مدت کے بعد بھگتنا پڑتا ہے جب اس کی بری عادت راسخ ہوجاتی ہے اور اصلاح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کی ایک مشہور مثال ایک قاتل کا قصہ ہے جس نے پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے یہ درخواست کی تھی کہ اسے اپنی بوڑھی ماں سے ایک بات کہنے کی اجازت دی جائے۔ حاکم نے رحم کھاکر اجازت دے دی۔ اس نے یہ کیا کہ ماں کے کان سے منہ لگایا گویا سرگوشی کرنا چاہتا ہے اور اپنے دانتیں

قابل اعتراض حرکات سرزد ہوتی ہیں -

سزا کا اصلی منشا یہ ہے کہ بچے کو کسی طرح یہ محسوس کرایا جائے کہ اس کی کسی خاص حرکت یا فعل کی وجہ سے نہ صرف دوسروں کو تکلیف پہنچی ہے ' جس کا ممکن ہے ابھی اسے پورا احساس نہ ہوسکے ' بلکہ وہ خود بھی اپنے بعض حقوق اور آسائشوں سے محروم ہوگیا ہے ' اور جب کبھی وہ ان حرکات کا اعادہ کرے گا اس کا یہی نتیجہ ہوگا - یہاں قدرتی تادیب کے طریقے سے کام لینے کی گنجائش ہے جس پر روسو اور اسپنسر نے زور دیا ہے - وہ دونوں اس بات کی مخالفت کرتے ہیں کہ اُستاد بچوں کو جسمانی سزا دیں لیکن قدرتی سزا کے حامی ہیں جس سے وہ تکلیف یا خمیازہ مراد ہے جو بچوں کو اپنی حرکات کی وجہ سے خود بخود ' بطور قانون قدرت کے رد عمل کے اُٹھانا پڑے - اگر بچہ آگ کو یا کسی بہت گرم چیز کو ہاتھ لگائے گا تو اس کا ہاتھ جل جائے گا اور وہ آئندہ احتیاط کرے گا - اگر وہ کسی دوسرے بچے سے کھلونا چھین لے گا تو مار کھائے گا ' اگر بےاحتیاطی سے کھلونا توڑ دے گا تو اسے دوسرا کھلونا نہیں دیا جائے گا - اگر وہ وقت پر ہوا خوری کے لیے تیار نہ ہوگا تو باہر جانے سے محروم رہے گا - اگر وہ شرارت سے اپنے کمرے کے شیشے توڑ ڈالے تو بقول روسو (Rousseau) کے " رات دن ٹھنڈی ہوا اس کے کمرے میں آنے دو اور اس کی کچھ پروا نہ کرو کہ اس کو زکام ہوجائے گا کیونکہ زکام ہوجانا اس سے بہتر ہے کہ وہ بےوقوف ہی رہے - اگر وہ تمھیں تکلیف پہنچائے تو اس کی شکایت نہ کرو بلکہ اسے خود بھی وہی تکلیف محسوس کراؤ " - اس طریقے میں

اور وہ نئی نئی سزائیں ایجاد کرنے میں اپنی تمام قوت اختراع صرف کردیتا تھا - اب بھی گو سرکاری اور انگریزی مدارس میں جسمانی سزائیں بہت کم ہوگئی ہیں لیکن مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں میں اکثر مولوی اور پنڈت اپنے شاگردوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لیے انہیں طرح طرح سے جسمانی یا روحانی ایذا پہنچاتے ہیں - سزا کا سب سے ادنیٰ اور سب سے زیادہ قابل اعتراض مفہوم یہ ہے کہ اُستاد، شاگردوں کی کسی غلطی یا حرکت پر غصے اور انتقام کے جذبات سے بےبس ہوکر اس کو جسمانی تکلیف پہنچاوے - بعض لوگوں نے سزا کی اس خاص صورت کی تائید کی ہے کیونکہ ان کے خیال میں یہ بات فطرت کے موافق ہے کہ انسان فوری غصے سے مغلوب ہوکر سزا دے - اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد سزا دینا ان کے نزدیک جائز نہیں - لیکن ہم اس خیال سے اتفاق نہیں کرسکتے - معلم اور اس کے شاگردوں کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے جس کا قیاس معاشری زندگی کے معمولی تعلقات پر نہیں کرنا چاہیے - اس میں اتنا تحمل اور بردباری ہونی چاہیے کہ وہ اپنے غصے کو ضبط کر سکے ' اور نفسیات اطفال سے اتنی واقفیت ہو کہ وہ ان کی غلطیوں اور قصوروں کی نفسی توجیہ کرکے یہ معلوم کرے کہ ان کے حرکات کی واقعی ذمہ‌داری کن اسباب پر عائد ہوتی ہے - اس طرح تحلیل نفسی کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ غلط طریقہ استعمال نہیں کرے گا - اور بجائے جسمانی سزا پر زور دینے کے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرے گا جو طلبہ کی تعلیمی یا اخلاقی تربیت میں حارج ہیں اور جن کی وجہ سے ان سے

کی اخلاقی آزادی اور ذمہ‌داری کے یہ معنی ہیں کہ ان قوانین کے اندر رہ کر جو عالم طبعی اور عالم معاشرت میں کارفرما ہیں ' اور جن سے رہائی حاصل کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں وہ اپنی شخصیت کی تکمیل خود کرسکتا ہے -

ہم یہاں انعام و سزا کے مسئلے پر تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کرسکتے لیکن چونکہ مدرسوں میں اور معلموں کے تعلیمی کار و بار میں اس کو صدیوں سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے اس لیے مختصر طور پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان کا صحیح منشا کیا ہے اور ان کو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے - اس زمانے میں جب جدید تعلیمی خیالات کا اثر آہستہ آہستہ ہمارے دور افتادہ مدرسوں تک پہونچ رہا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اب تک سزا خصوصاً جسمانی سزا کا جو زور رہا ہے اور کہیں کہیں اب بھی ہے وہ سراسر ناجائز اور خلاف عقل ہے - بےسمجھ اُستادوں نے مدتوں یہ سمجھا اور اب بھی ایسے جاہل ' عقل کے دشمن اُستاد موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جب کوئی بات بچے کی سمجھ میں نہ آئے یا وہ اسے یاد نہ کرسکے تو اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ اس کو زد و کوب کرکے اس سے دماغ اور حافظے کو تیز کیا جائے - خواہ طالب علم کی تعلیمی کمزوری کی وجہ کوئی جسمانی نقص یا صحت کی خرابی ہو یا کوئی فطری دماغی کمزوری ' یا توجہ کا انتشار ' یا گھر کے حالات کی ناسازگاری ' یا اُستاد کے طریقۂ تعلیم کی خرابی ان تمام صورتوں کے لیے اس کے پاس ایک ہی مجرب نسخہ تھا ' یعنی کسی قسم کی سزا

موزوں ہوتے ہیں اور جس طرح ایک شخص کے جذبۂ خودی
کی تسکین مثلاً جنگ و جدال کے مشاغل میں ہوتی ہے ،
بالکل اسی طرح کوئی دوسرا شخص ایک خوبصورت تصویر
بنانے میں ، یا پتھر کی ایک ٹھوس اور بے ہنگم ٹکڑے کو ایک
حسین مجسمے میں تبدیل کرنے سے ، یا قومی خدمت ، اور
مصیبت زدوں ، غریبوں مظلوموں کی دادرسی سے، اپنی جبلت
کو تسکین دیتا ہے ۔ اس اختلاف کا باعث بڑی حد تک
طبیعت کا فطری رجحان ہوتا ہے اور کسی حد تک ماحول
کا اثر اور تقلید ۔ لیکن تربیت اور ماحول کی اصل اہمیت یہ
ہے کہ سوائے ان غیر طبعی صورتوں کے جب کوئی شخص
نفسی امراض میں مبتلا ہو یا توارث کے بہت قوی اثرات کی
وجہ سے اس کی جبلتوں کا اظہار لازمی طور پر غلط طریقہ
اختیار کرے، ہر بچے کی جبلتیں ایسے مشاغل اور شوقوں کے ساتھ
وابستہ کی جاسکتی ہیں کہ وہ اُن کی اپنی ذات کے لیے اور
معاشری مشاغل کے لیے مفید ثابت ہوں ۔ مگر معلم کو ہر
صورت میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تشکیل سیرت کے ڈراما
میں ہیرو کا پارٹ خود بچے کی اپنی ذات کرتی ہے اور اس کی
جبلتیں ، اس کا وہ سرمایہ جو توارث جسمانی کے ذریعے حاصل
ہوتا ہے ، اور ماحول کی قوتیں اور مظاہر سب وسائل اور
ذرائع ہیں جن کو وہ استعمال کرتا ہے ۔ وہ ان کے بغیر کچھ نہیں
کرسکتا ۔ اس معنی میں وہ ضرور ان کا محتاج ہے ۔ لیکن وہ
ان کے ہاتھوں میں بےبس نہیں ہوتا کہ جس طرح کمہار گیلی
مٹی کو جس شکل میں چاہے ڈھال سکتا ہے اسی طرح یہ
تمام قوتیں اس کو جس سانچے میں چاہیں ڈھالیں ۔ اس

کسی خارجی ماحول کے نہیں ہوسکتی - اس لیے ان میں اور ماحول کے اثرات میں باہمی رد عمل کی ضرورت ہے - ہر جبلت بالعموم یہ ظاہر کرتی ہے کہ خاص حالت میں بچے کی طبیعت اور عمل کا میلان ایک خاص "سمت" میں ہوگا لیکن یہ بات ماحول کے اثر پر منحصر ہے کہ وہ میلان کس موقع پر کس "شکل" میں ظاہر ہوگا - مثلاً اظہار خودی کی جبلت کا تقاضا یہ ہے کہ بچہ اپنی قوتوں سے کام لے کر کسی طرح اپنی شخصیت کا سکہ اپنے ساتھیوں اور ماحول پر بٹھائے - یہ جبلت ہر بچے میں ہوتی ہے' بعض میں بہت قوی بعض میں کمزور - اس کے اظہار کی بےشمار صورتیں ہیں - اگر ماحول کا اثر اور ہم صحبت لوگوں کی مثال خراب ہے تو ممکن ہے بچہ اپنے سے کمزور بچوں کو مارے پیٹے اور اس طرح رعب جمانا چاہے - یا ضد کرکے اپنے سے بڑوں کو اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور کرے یا اور قابل اعتراض حرکات کرے جن سے دوسروں کی توجہ اس کی جانب مبزول ہو - یہ سب اظہار خودی کی ناپسندیدہ شکلیں ہیں اور ان کا تجربہ ہر معلم کو ہوتا رہتا ہے - لیکن اس جبلت کو عمدہ تربیت اور اثرات کے ذریعے بہترین عادات و صفات کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے - جہاں اظہار خودی کی ایک صورت دوسرے انسانوں پر جبر اور ظلم سے غلبہ حاصل کرنا ہے' وہاں اس کا اظہار خدمت کے ذریعے' عالم فطرت کی قوتوں کے ساتھ جنگ کرنے اور ان کو زیر کرنے کی شکل میں' علمی تحقیقات اور ادب اور آرٹ کی تخلیق میں بھی ہوسکتا ہے - مختلف لوگوں کی طبیعت کے لیے اظہار خودی کے مختلف طریقے

کو از خود سیکھنے کی خواہش ہوتی ہے جس کو وہ مثلاً
چلنے اور بولنے کی کوشش میں ظاہر کرتا ہے - اسی
خواہش کو تعلیم میں قوت محرکہ بنانا چاہیے -
(بچوں کی) تعلیم میں اُستاد کی قمچی کے بجائے اس
خواہش سے کام لینا ہمارے زمانے کی نہایت اہم تعلیمی
اصلاح ہے -" ۱

پس معلوم ہوا کہ اخلاقی تربیت کا صحیح نظریہ
قائم کرنے کے لیے ہمیں ان تمام عناصر کو پیش نظر
رکھنا چاہیے جن کے تعامل سے انسانی سیرت اپنا مخصوص
رنگ اختیار کرتی ہے - معلم کو اچھی طرح سمجھ لینا
چاہیے کہ بچوں کی ابتدائی جبلتوں میں بہت بڑی قوت
ہوتی ہے جس کو نظرانداز کرنا سخت غلطی ہے - اگر
ان جبلتوں کو تربیت دے کر اس طرح منظم نہ کیا جائے گا کہ
وہ علمی اور اخلاقی مقاصد میں معین ہوں تو وہ ہر ہر قدم پر
اس کی کوشش میں مزاحم ہوں گی اور اخلاقی تعلیم محض
الفاظ تک محدود رہے گی ' عمل کی شکل میں ظاہر نہ
ہوگی - کیونکہ عمل کی محرک ہمیشہ کوئی ایک جبلت
یا کئی جبلتیں ہوتی ہیں - لیکن جبلتوں کی تنظیم بغیر

بڑھے کو دیکھتا تو مارے ڈر کے پسینے پسینے ہو جاتا تھا - فاضل پروفیسر
نے اس "مشاہدے" سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ بچہ بالکل غبی اور احمق
ہے - (اس قصے سے پروفیسر موصوف کی حماقت صاف ظاہر ہو جاتی ہے -
لیکن دنیا میں انسانوں کے لاتعداد بچوں سے ان کے معلموں نے بالکل یہی
سلوک کیا ہے اور صدیوں کسی نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی !) -

۱ — On Education صفحہ ۲۹ -

اور بری بھی - ان کا اچھا یا برا ہونا زیادہ تر ماؤں اور
کھلائیوں کی عقل پر منحصر ہے کیونکہ اوائل عمر
میں بچوں کی طبیعت بےحد شکل پذیر ہوتی ہے -
اکثر بچوں میں اچھے شہری بننے کی صلاحیت بھی
ہوتی ہے اور مجرم بننے کی بھی - علم نفسیات
کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے میں
چھے دن بچوں کو زد و کوب کرنے اور ساتویں دن وعظ اور
تلقین کرنے کا دستور ان کو نیک بنانے کا صحیح طریقہ
نہیں - لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ
اخلاقی تربیت کی کوئی صورت ہی نہیں ہے - کسی
تندرست بچے کو خوش رکھنا مشکل نہیں اور اگر بچوں
کے جسم اور دماغ کی مناسب نگہداشت کی جائے تو وہ
بالعموم خوش رہتے ہیں بچپن میں خوش و خرم رہنا
بہترین قسم کا انسان بننے کے لیے بالکل لازمی ہے -
اگر بچے یہ محسوس کریں گے کہ تعلیم کے ذریعے وہ مفید
باتیں سیکھ رہے ہیں تو ان میں کاہلی کی وہ عادت پیدا
نہ ہوگی جس کو ڈاکٹر آرنلڈ اخلاقی عیب سمجھتے ہیں -
برخلاف اس کے اگر بچے کو جو علم سکھایا جاتا ہے وہ اسے
بےکار معلوم ہو اور اُستاد ظالم اور بےرحم نظر آئے تو اس
کی وہی حالت ہوگی جو چیخوف (Tchehov) کی کہانی
میں بلی کے بچے کی ہوئی تھی [1] - ہر صحت مند بچے

۱—چیخوف نے ایک کہانی میں ایک پروفیسر کا ذکر کیا ہے جو
اپنی بلی کے بچے کو مار مار کر چوہوں کا شکار کرنا سکھایا کرتا تھا - نتیجہ
یہ ہوا کہ بےچارہ بلی کا بچہ اس فطری فعل سے اتنا ڈرنے لگا کہ جب وہ کسی

اس مسئلے پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے کہ بچے کو اوائل عمر
میں اخلاقی اعتبار سے نہ اچھا کہہ سکتے ہیں نہ برا - اس کی
ابتدائی حرکات ، جو محض اس کی جبلتوں کا سیدھا سادہ
اظہار ہیں ، کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتیں یعنی کسی اخلاقی
معیار پر نہیں پرکھی جاسکتیں - اس کی مخصوص اور قوی
جبلتیں بھی مثلاً تجسس ، تعمیر ، اظہار خودی ، نقل وغیرہ
اپنی ابتدائی شکل میں اخلاق سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں -
اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوائے ان غیر طبعی صورتوں
کے جب آبائی توارث کے خراب اثرات جسمانی اور دماغی
کمزوریوں ، اور برے میلانات کی شکل میں ظاہر ہوں ، بچے
اوائل عمر میں خیر و شر سے بری ہوتے ہیں یعنی ہم ان کے
عمل پر کوئی اخلاقی حکم نہیں لگا سکتے ، نہ ان کو اپنے افعال
کا ذمہ‌دار ٹھہرا سکتے ہیں - لیکن یہ ضرور ہے کہ ان لا اخلاقی
جبلتوں اور رجحانوں میں خیر و شر دونوں کے امکانات
پوشیدہ ہیں اور یہ امر ماحول کے اثرات ، تعلیم ، تربیت اور
خود بچے کی اپنی کوشش پر منحصر ہے کہ یہ آئندہ چل کر
کیا رنگ اختیار کریں گے ، آیا اخلاق حسنہ کی شکل میں
ظاہر ہوں گے یا اخلاقی عیوب کی صورت میں - رسل (Russel)
اپنی کتاب میں اس بات کو بہت صاف اور واضح الفاظ میں
بیان کرتا ہے :—

" حقیقت یہ ہے کہ بچے فطرتاً نہ "اچھے" ہوتے ہیں نہ
"برے" وہ صرف چند اضطراری افعال اور جبلتیں لے کر
پیدا ہوتے ہیں - انہیں کی بنیاد پر ، ماحول کے اثر سے
عادتیں نشو و نما پاتی ہیں جو اچھی بھی ہو سکتی ہیں

آزادی دے دی کہ وہ ایک وسیع دائرے کے اندر جو چاہے کریں۔ یعنی اپنی فطرت کے مقتضا کے موافق جن مشاغل کو چاہیں، اختیار کریں۔ Miran Beg

یہ خیال بہت دل خوش‌کن معلوم ہوتا ہے اور اکثر نرم مزاج معلموں کے دل کو لگتا ہے ' اور دنیا کے بہت سے مصلحوں اور نوع انسانی کے ہمدردوں اور بہی خواہوں نے اپنی اصلاحی تجاویز کی بنیاد اسی پر رکھی ہے - لیکن واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے یہ خیال بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا وہ خیال کہ انسان بالطبع شر کی طرف مائل ہے - در اصل یہ دونوں نظریے تصویر کے دو مختلف رخوں کو دکھاتے ہیں اور جیسا کہ قاعدہ ہے مبالغے کے ساتھ اپنے اپنے نقطۂ نظر کو ظاہر کرتے ہیں۔ حقیقت ان دونوں کے وسط میں ہے یعنی ہمیں ایک طرف تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بچے فطرتاً شر کی طرف مائل نہیں، اور دوسری طرف یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں بعض ایسی جبلتیں ہیں جو غلط راہ پر پڑ کر اخلاقی خرابیوں کی شکل اختیار کر سکتی ہیں - بچے کو نہ تو بری جبلتوں کا غلام سمجھنا چاہیے جن کے ہاتھ وہ اتنا بےبس ہے کہ جب تک ان کو ریاضت اور نفس‌کشی کے ذریعے زیر نہ کرے نیک نہیں بن سکتا - نہ اس کو ماحول کی قوتوں کے ساتھ اس حد تک وابستہ تصور کرنا چاہیے کہ اس کی اصلاح اور تخریب دونوں ان پر منحصر ہیں - حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی حد تک خود اپنی سیرت اور اپنے کردار کا خالق ہے ' اور اپنی جبلی قوتوں اور ماحول کے وسائل اور اثرات سے کام لے کر اپنی زندگی کو بنانا اور بگاڑنا اسی کے اختیار میں ہے - موجودہ علم نفسیات

انہیں خیالات کو شاعرانہ پیرائے میں ورڈز ورتھ نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنی نظموں میں جا بجا بیان کیا ہے - بالخصوص اس کی مشہور نظم ''اوائل عمر میں حیات ابدی کے نشانات'' ۱ کا موضوع یہی مسئلہ ہے :—

''ہم بچپن میں آسمان سے جو ہمارا گھر ہے' اُترتے ہیں اور ہمارے پیچھے پیچھے روحانی عظمت و جلال کے بادل امڈے چلے آتے ہیں -''

اس نقطۂ نظر کی رو سے انسان میں کوئی فطری قوتیں ایسی نہیں ہوتیں جو اس کو برائی کی طرف لے جا سکیں - اس کی طبیعت کا میلان سراسر خیر کی جانب ہوتا ہے - اگر معاشرے کے خراب اثرات اس پر نہ پڑیں اور تربیت صحیح اصولوں پر کی جائے تو وہ بہت عمدگی اور آسانی سے ایک مفید شہری اور با اخلاق انسان بن جائے گا - اس سے مدرسے کے ضبط و تادیب کے متعلق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کو اور افراد کو بچوں کی نشو و نما میں کم سے کم مداخلت کرنی چاہیے اور اُنہیں جہاں تک ممکن ہو ان کی فطرت پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اس کے قوانین کے مطابق تربیت پائیں اور ماحول کے خراب اثرات کی وجہ سے ان کی نفسی اور اخلاقی ارتقاء میں رکاوٹ نہ پیدا ہو - جن معلموں نے روسو (Rousseau) وغیرہ کی پیروی میں اس اصول پر عمل کیا انھوں نے حتی الامکان مدرسوں' سے سزاؤں بندشوں اور بیرونی قواعد اور ضابطوں کو اُٹھا دیا اور طلبہ کو

---

۱ — Ode on the Intimations of Immortality especially in early childhood.

حد تک اچھی عادتوں پر دوسرے اس احساس پر جو عملی مثالوں کے ذریعے پیدا ہوتا ہے' کہ بعض اوقات انجام‌کار فائدہ اسی میں ہے کہ آئندہ نفع کے لیے موجودہ خواہش روک لی جائے - لوگوں کو ہمیشہ سے یہ بات معلوم ہے کہ کھیلوں میں اس قسم کا ضبط نفس آسانی سے حاصل ہوتا ہے - لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ تحصیل علم بھی اتنی دلچسپ بنائی جا سکتی ہے کہ اس میں وہی محرکات عمل کارفرما ہوں جو کھیلوں میں.........اس کا اصل اصول بہت واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ حقیقی ضبط بیرونی جبر اور دباؤ کے مرادف نہیں بلکہ ان ذہنی عادتوں پر منحصر ہے جن کی وجہ سے بچہ خود بخود برے اور ناپسندیدہ کاموں کے بجاے اچھے اور پسندیدہ کاموں کی طرف راغب ہوتا ہے" [1] -

اس خیال کے خلاف ایک لازمی رد عمل یہ ہوا کہ بعض معلموں اور مفکروں نے اس کے بالکل برعکس نقطۂ نظر اختیار کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ بچہ اوائل عمر میں تمام‌تر خیر و خوبی کا مجسمہ ہوتا ہے اور اس میں جو کچھ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ماحول کے اثر اور اپنے ساتھیوں اور بزرگوں کی بری مثال کا نتیجہ ہیں - روسو نے اس خیال کی نمائندگی کی ہے وہ کہتا ہے کہ :—

"ہر چیز جب خالق فطرت کے ہاتھوں سے نکل کر آتی ہے' اچھی ہوتی ہے لیکن انسان کے ہاتھ میں آکر خراب ہو جاتی ہے - "

1— On Education صفحہ ۲۹ -

کیلم کھلا ان بندشوں کی مخالفت کریں گے جن کی وجہ سے مدرسے میں استادوں اور شاگردوں میں ہر وقت ایک کشمکش رہے گی جو تعلیم کی کامیابی میں حارج ہوگی' یا انہیں کھلے بندوں مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی تو ان کی مخالفت درپردہ اور بھی گہری ہو جائے گی یعنی داخلی اور نفسی کشمکش کی کیفیت اختیار کرے گی جو دماغی اور اخلاقی صحت کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ صورت ہے - حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی دماغی اور اخلاقی صحت اور مدرسے کا ضبط و انتظام اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب طلبہ اپنے کام میں دلچسپی لیں' مدرسے کے قانون کو سمجھ کر اس کا احترام کریں' خود اس کے بنانے میں شریک ہوں اور اس کی پابندی کرنے اور کرانے کو اپنا ذاتی فرض تصور کریں - برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) ضبط کے اس مفہوم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"جب طلبہ ان کاموں میں مشغول ہوتے ہیں جو ان کو خود مرغوب ہیں تو بیرونی ضبط و تادیب کی ضرورت ہی نہیں پڑتی - چند سیدھے سادھے قاعدے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں کافی ہیں مثلاً یہ کہ کوئی بچہ دوسرے بچوں کے کام میں مداخلت نہ کرے' ایک وقت میں ایک سے زیادہ اپریٹس (apparatus) استعمال نہ کرے وغیرہ وغیرہ - وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ قاعدے مناسب اور قرین عقل ہیں - اس لیے ان کی پابندی میں دقت نہیں ہوتی - اس طرح بچے میں ضبط نفس پیدا ہوتا ہے جو دو چیزوں پر مشتمل ہے' ایک تو کسی

تھوڑا بہت دبائے رکھتی ھے -

فطرت انسانی کی اس تفسیر نے تعلیم اور تادیب کے نظام پر بہت گہرا اثر ڈالا ھے - اس کی رو سے نہ صرف بالغین کی بلکہ بچوں کی فطرت بھی قدرتاً شر کی طرف مائل ھے اور اس کی اصلاح کا طریقہ یہی ہو سکتا ھے کہ اوائل عمر ھی سے رکاوٹوں' بندشوں اور سزاؤں سے کام لیا جائے اور بچوں کی فطری میلانات اور خواھشات جو خرابی کی جڑ ھیں' ابھرنے نہ دی جائیں - ان کی روح کی نجات اسی میں ھے کہ وہ بے چون و چرا ان تمام قواعد اور احکام کی پابندی کریں جو والدین اور اُستاد ان پر عائد کرتے ھیں خواہ ان کا مطلب اور فائدہ ان کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے - ھر معاملے میں انھیں اپنی ذاتی خواھشات کو دبانا اور روکنا چاھیے کیونکہ خواھش کی راہ پر چلنا شیطان کو اس کے کام میں مدد دینا ھے - انگلستان کے مشہور فلسفی جان لاک (John Locke) کا نظریۂ تعلیم و تادیب بہت کچھ اس خیال کی نمائندگی کرتا ھے - اس کا تعلیمی اصول یہ تھا کہ :—

"بچے کی روح کو ھلاکت سے بچانے کے لیے اس کی خودی کو پامال کرو" -

لیکن صدیوں کے تجربے نے اس بات کو واضح کر دیا ھے کہ اگر ضبط و تادیب کی بنیاد محض خارجی خوف اور بیرونی بندشوں پر رکھی جائے گی تو اس کے نتائج بہت خراب ھوں گے - یا تو طلبہ میں عمل کا حوصلہ اور ولولہ بالکل نہیں رھے گا اور وہ اپنی قوت ارادی اور جذبات کو برے کیا اچھے کاموں کے لیے بھی استعمال نہ کر سکیں گے - یا وہ

ہیں - اکثر زبانوں میں، زیادہ‌تر مذہب کی تعلیم کی وجہ سے، یہ خیال رائج رہا ہے کہ انسان بالطبع شر کی طرف مائل ہے اور بہت کچھ مشکلیں اور تکلیفیں اٹھانے، اور اپنے نفس کو مارنے کے بعد، وہ ایک حد تک خیر کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے - مذہب عیسوی کے نظریۂ اخلاق و نجات کی بنیاد اسی عقیدے پر رکھی گئی ہے اور جہاں کہیں رہبانیت اور ریاضت کی تعلیم دی گئی ہے وہاں کسی نہ کسی شکل میں اسی خیال کی کارفرمائی پائی جاتی ہے - اس نظریے کے مطابق انسان کے نفس میں قوت ارادی اور خواہشات کے درمیان ہمیشہ جنگ رہتی ہے - خواہشات اس کو برائی اور بدی کی جانب لے جاتے ہیں اور قوت ارادی کا یہ کام ہے کہ وہ اس کو جبراً اس راہ پر چلنے سے روکے - گویا وہ ایک مستقل اور قائم بالذات قوت ہے جس کو فطری خواہشات اور میلانات سے کوئی اندرونی تعلق نہیں، سوائے اس بیرونی تعلق کے کہ ان کی مخالفت اور روک تھام کرے - یہ قوت ارادی "ضمیر" کہلاتی ہے اور انسان کا دل ایک "رزم‌گاہ خیر و شر" سمجھا جاتا ہے - یہاں شر کے معنی ہیں انسان کے جبلی میلانات اور "خیر" نام ہے اس قوت اردای یا ضمیر کا جو اسے نیکی کی طرف کھینچتا ہے - اس نقطۂ نظر کے مطابق سوائے خاص خاص لوگوں کے جو غیر معمولی اخلاقی قوت اور روحانیت رکھتے ہیں اور کوئی شخص ان بری خواہشات کو پوری طرح زیر نہیں کر سکتا - البتہ تادیب نفس کے ذریعے ایک حد تک انہیں قابو میں رکھ سکتا ہے، جس طرح معاشری زندگی میں پولیس مجرموں کا خاتمہ نہیں کر سکتی لیکن ان کو

میں مبتلا ہیں بلکہ مدرسوں کے معمولی طلبہ کے لیے بھی‘ جن کی دماغی اور اخلاقی حالت طبعی ہے‘ اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ کارآمد ہیں‘ کیونکہ ان طلبہ کو سابقہ خرابیوں اور کمزوریوں کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑتی بلکہ شروع ہی سے آزادی کی فضا میں ان کی تربیت کی صحیح بنیاد پڑ جاتی ہے اور وہ اپنی ذمہ‌داریوں اور فرائض کی بجا آوری میں اخلاقی اصول و قوانین کی پابندی کرنا سیکھ لیتے ہیں -

ہم نے حکومت خود اختیاری کے جو اصلاحی اور طبعی فوائد بیان کیے ہیں ان میں بہت اختصار سے کام لیا ہے اور بہت سی ایسی عملی مشکلات سے بحث نہیں کی جو اس کے دوران میں پیدا ہوتی ہیں اور بعض اوقات اس تجربے کو کامیاب نہیں ہونے دیتیں - لیکن ہم نے اپنی بحث قصداً اصولوں تک محدود رکھی ہے اور جہاں تک اس اصول کا تعلق ہے جس پر حکومت خوداختیاری کی بنیاد رکھی گئی ہے اس کی صحت اور مقبولیت میں شک و شبہے کی گنجائش نہیں گو اسے عمل میں لانے کے لیے بہت کچھ احتیاط اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے - ضبط و انضباط کا یہ نیا نظریہ جو آزادی اور ذمہ‌داری کے ستونوں پر قائم ہے اور دونوں کو برابر اہمیت دیتا ہے ادب و تادیب کے پرانے اصولوں سے بہت مختلف ہے - اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ہمیں پھر ایک بار اس غلط نفسی عقیدے کی تردید کرنا چاہیے جس کا ہم نے اس حصے کے باب اول میں ذکر کیا ہے اور جس کی وجہ سے اخلاق کے مفہوم کے متعلق غلط فہمیاں پھیل گئی

اُسے نافذ کرتے ہیں - اس لیے اس قانون کی مخالفت میں نہ انہیں کوئی لطف آتا ہے نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے - لہذا رفتہ رفتہ جماعتی زندگی کے اصول اور قوانین کو قبول کرکے بقول شخصے " جنگل کے چور ہی جنگل کے محافظ بن جاتے ہیں " اور کچھ عرصے کے بعد اس قابل ہوجاتے ہیں کہ ان کی اصلاحی بستیوں سے نکل کر معاشرے کی طبعی زندگی میں بحیثیت ذمہ‌دار شہریوں کے حصہ لے سکیں - اگر یہ لوگ ایسی فضا میں نہ رکھے جاتے جو اخلاقی تربیت کا وسیلہ ثابت ہوتی ہے تو وہ بھی معمولی مجرموں کی طرح جیل‌خانوں میں رہ کر مختلف قسم کی سزائیں اور معاشرے کی مخالفت برداشت کرکے عادی جرائم پیشہ بن جاتے اور تمام عمر معاشری اور اخلاقی قوانین کے خلاف‌ورزی کرتے رہتے - ان تجربوں کی نہایت دلچسپ اور سبق آموز تفصیل بہت سی جدید تعلیمی تصانیف میں بیان کی گئی ہے - جن میں سے ہومر لین (Homer Lane) کی کتاب "Little Commonwealth" اور امریکا کی ایک اصلاحی بستی "George Junior Republic" کے حالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں - اس کے نفسیاتی پہلو سے سرل برٹ (Cyril Burt) نے جو ایک انگریز عالم نفسیات ہیں، اپنی مستند اور قابل قدر کتاب "The Young Delinquent" (نو عمر مجرم) میں بحث کی ہے - علمی تحقیق اور عملی تجربات دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ حکومت خود اختیاری کے طریقے اور تجربات صرف انہیں طلبہ کے لیے مفید نہیں جو بعض خارجی یا خلقی اسباب کی وجہ سے دماغی کمزوریوں اور اخلاقی خرابیوں

باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے کی عادت پڑی جو اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے بہترین چیز ہے - جو اراکین جماعت ابتدا میں چند روز یا چند ہفتے تک اپنی پرانی عادتوں کی وجہ سے کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے ان کے لیے کوئی جسمانی سزا مقرر نہیں تھی لیکن انہیں اپنے ساتھیوں کی خیرات پر گزارہ کرنا پڑتا تھا جس سے زیادہ تکلیف‌دہ اور شرمناک محتاجی اور کیا ہوسکتی ہے ؟ چنانچہ اس کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا تھا کہ وہ خود ہی کام کرنا شروع کر دیتے تھے اور جماعت کے فرائض میں شریک ہو جاتے تھے - اس طرح اکثر نوجوانوں کے مجرمانہ رجحانات کی اصلاح بہت جلد ہوگئی اور ان میں وہ عادتیں پختہ ہونے لگیں جو کامیاب اور مفید شہری بننے کے لیے ضروری ہیں - اس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف تو محنت اور باقاعدہ کام کرنے کی ذمہ‌داری سے ان کی طبیعت کی اصلاح ہوتی اور دوسری طرف ان کی بہت سی عملی صلاحیتیں اور مفید حوصلے جن کو واقعات اور حالات نے دبا رکھا تھا اور اس وجہ سے ان کے نفس میں ایک مستقل اور مسلسل کشمکش رہتی تھی اب مناسب صورتوں میں ظاہر ہونے لگتے - آزادی اور ذمہ‌داری کی اس نئی فضا میں آنے والے افراد کو یہ محسوس ہوا کہ اب وہ کسی بیرونی اور خارجی طاقت سے بر سر پیکار نہیں جو ان کی مخالفت پر آمادہ ہے بلکہ اپنے ہی ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں جو کچھ عرصے پہلے انہیں کی طرح معاشرے اور اس کے قوانین سے باغی تھے لیکن اب اس جماعت کے ذمہ‌دار اراکین بن گئے ہیں جو خود قانون وضع کرتے ہیں اور خود ہی

افراد فرائض اور ذمہ‌داریوں کو آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی اپنے کام میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ خود اس سے بازپرس کرتے ہیں اور اس کے لیے سزا تجویز کرتے ہیں - علاوہ بریں اس انتظام میں ان طلبہ کو قیادت اور سرداری کے فرائض انجام دینے کا موقع ملتا ہے جو فطرتاً اس کے اہل ہوتے ہیں اور باقی سب مل جل کر احکام کی تعمیل کرنا سیکھتے ہیں -

حکومت خود اختیاری کے تجربات صرف عام مدارس ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ بعض ماہرین نفسیات اور معلموں نے انہیں نوعمر مجرموں کی اصلاح اور تعلیم میں بھی استعمال کر کے دیکھا اور بہت کامیاب پایا - ان کی تجویز یہ تھی کہ ان مجرموں کو جو بالعموم شہروں کی خراب اور گمراہ کرنے والے ماحول ہی میں بگڑتے ہیں وہاں سے نکال کر ایسی جگہ منتقل کیا جائے جہاں ان کو آزادی کی فضا ملے اور خود اپنی زندگی نئے سرے سے تنظیم کرنے کا موقع حاصل ہو - چنانچہ یہی ہوا اور یہ نوجوان اور بچے ان اصلاحی مدارس یا بستیوں میں رکھے گئے جہاں حکومت خود اختیاری کے اصولوں کی کار فرمائی تھی - یہ لوگ خود قانون بناتے تھے اور تمام ذمہ‌داریوں اور فرائض کو آپس میں تقسیم کر لیتے تھے - ان پر کوئی بیرونی تعزیر عائد نہیں کی جاتی تھی بلکہ جو افراد جماعت کے قانون کی خلاف‌ورزی کرتے تھے جماعت ان کو خود ہی سزا دے لیتی تھی - ان پر ایک بہت بڑا اصلاحی اثر یہ ڈالا گیا کہ ان کے لیے خود اپنی محنت سے روزی کمانا لازم کر دیا گیا اور اس طرح انہیں

میں اعتماد ذات پیدا ہوگا نہ باہمی مراعات و مفاہمت کی عادت ' جس پر تمدنی زندگی کا انحصار ہے - خصوصاً موجودہ زمانے کا جمہوری نظام ایسے افراد کا طالب ہے جن میں اعتماد ذات کے ساتھ دوسروں پر بھروسہ کرنے کی صلاحیت بھی ہو ' جن میں اجتماعی اتحاد اور شہریت کے فرائض کا پورا احساس ہو' جو موقع پر قیادت کا کام انجام دے سکیں اور ضرورت کے وقت خلوص اور وفاداری کے ساتھ اپنے قائد کی اطاعت کرنے کو تیار ہوں - ہماری تعلیم‌گاہیں ' جمہوری شہریت کے لیے موزوں افراد اسی حالت میں پیدا کرسکتی ہیں جب ان کی اندرونی تنظیم خود مختار جماعتوں کی سی ہو اور اس کے طلبہ کو ذمہ‌دارانہ طریقے پر انتظامی فرائض ادا کرنے کا موقع ملے - جن مدارس میں حکومت خوداختیاری کا تجربہ کیا گیا ہے اور مطالعہ کے کمروں' کھیل کے میدانوں اور دارالاقامہ میں طلبہ کو آزادی کے ساتھ ساتھ ذمہ‌داریاں بھی دی گئی ہیں وہاں بالعموم بہت عمدہ نتائج حاصل ہوئے ہیں اور ان کے طلبہ نے اعتما ذات' قوت عمل اور معاشری رواداری کا ثبوت دیا ہے - ان مدرسوں کے معلموں کو اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ہر وقت جاسوس کی طرح اپنے شاگردوں کی غلطیوں اور شرارتوں کی ٹوہ میں رہیں اور نکتہ‌چینی اور عیب‌جوئی کا ناگوار فرض ادا کرتے رہیں جس کی وجہ سے اکثر اُستادوں اور شاگردوں کے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں - وہاں ضبط و تادیب کے فرائض طلبہ خود انجام دے لیتے ہیں - معلموں کو اتنی مہلت ملتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت سے اس چھوٹے سے معاشرے کی عام فضا پر عمدہ اثر ڈالیں - اس کے

یورپ کے بعض ملکوں مثلاً انگلستان، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی میں اور امریکہ کے بہت سے مدرسوں میں طلبہ کی اجتماعی زندگی کا باقاعدہ مطالعہ کیا گیا ہے اور اسکی نفسی و معاشری پہلوؤں پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں جن کے مطالعے سے ہر سنجیدار آدمی کے تجربے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ آپس کے ان تعلقات کا طلبہ کی سیرت پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے اور اگر ان کو مناسب اصولوں پر منظم کیاجائے اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے تو معلم غیر محسوس طریقے پر طلبہ کی سیرت کو بہترین سانچوں میں ڈھال سکتا ہے اور اپنی طرف سے خواہ مخواہ دخل در معقولات کیسے بغیر معاشری ضبط و تادیب سے کام لے سکتا ہے جس کی مداخلت کو بچے اور نوجوان خوشی سے قبول کرتے ہیں۔

ماہرین تعلیم کا اس امر پر اتفاق ہےکہ مدرسے کے ماحول میں معاشرہ خود افراد کی تربیت میں بہت دخل رکھتا ہے لیکن اس سے پورا فائدہ اس وقت اٹھایا جاسکتا ہے جب معاشری زندگی کی تنظیم خود طلبہ کے ہاتھ میں ہو اور اسکول کی حکومت اور ضبط و نظم کی بنیاد ان کے معاشری احساس پر رکھی جائے۔ بالفاظ دیگر ان میں حکومت خود اختیاری قائم کی جائے اور اس چھوٹی سی ریاست کا انتظام، اور باہمی معاملات اور اختلافات کی گتھیوں کو سلجھانے کا کام انہیں کے سپرد کردیا جائے - جب تک انہیں معاشری معاملات میں آزادی عمل حاصل نہ ہوگی وہ باہمی مشورے اور اتفاق رائے سے زندگی کے مسائل کو طے کرنا اور اپنی غلطیوں اور تجربوں سے سبق حاصل کرنا نہیں سیکھیں گے، اور نہ ان

دلچسپی ہوتی ہے ان کے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد سے کوشش کرتے ہیں ' کلب اور انجمنیں بناتے ہیں ' انفرادی آزادی کو برقرار رکھنے اور اجتماعی نظم قائم کرنے کے لیے قاعدے بناتے ہیں تاکہ ہر فرد اور ہر گروہ اپنا اپنا کام بغیر خارجی مداخلت کے کرسکے خواہ اس کا تعلق درسی مشاغل سے ہو یا فرصت کے اوقات کی تخلیق و تعمیر سے اس طرح رفتہ رفتہ مدرسے میں معاشرتی روایات قائم ہوجاتی ہیں اور عمل کے اخلاقی معیار بن جاتے ہیں - اس میں ایک خاص " فضا " پیدا ہو جاتی ہے جس سے تمام طلبہ خود بخود متاثر ہوتے ہیں ہر نیا طالب علم بہت جلد ان روایات کو اور رائے عامہ کے احکام کو قبول کرلیتا ہے - اس قسم کی معاشرتی زندگی اور اس کے اثرات مدرسوں میں ہمیشہ سے چلے آتے ہیں لیکن اس کی اہمیت پوری طرح ابھی تک نہیں سمجھی گئی - البتہ جدید نظریۂ تعلیم نے اس کو مدرسے کی زندگی کا ایک لازمی عنصر مانا ہے اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ معلموں کو اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے - مدت تک استادوں نے طلبہ کے باہمی میل جول کی طرف سے یا تو بالکل بےاعتنائی برتی یا اس کو قابل اعتراض جان کر روکا کیونکہ وہ تو درسی تعلیم کے علاوہ ہر چیز کو مدرسے کے مقصد کے خلاف سمجھتے تھے - لیکن باوجود اس کے بچے اکثر اپنی فطرت کے مقتضا سے مجبور ہوکر مدرسوں میں معاشرتی زندگی کی بنیاد ڈال لیتے ہیں اور کھیلوں میں بالخصوص اس کا اظہار ہوتا ہے - مگر ہمارے معلموں نے اب تک اس کی باقاعدہ تنظیم کرکے اس سے اخلاقی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی -

باب چہارم

ضبط و تادیب کا نظریۂ جدید

طلبہ کی سیرت کی تشکیل میں مدرسے کے قواعد اور قوانین اور ضبط و تادیب کو بھی بہت کچھ دخل ہے - طریقۂ تعلیم کی بحث میں ہم نے بتایا ہے کہ طلبہ میں اعتماد ذات اور امداد باہمی کی عادت ڈالنی ضروری ہے - اور اگر یہ صحیح اصولوں پر مرتب کیا جائے تو درس اور تدریس کے ضمن میں ان صفات کی نشو و نما خود بخود ہو جائے گی - لیکن ان صفات کی ضرورت علاوہ علمی کاموں کے زندگی کے دوسرے تعلقات اور فرائض میں بھی پڑتی ہے - مثلاً معاشری مشاغل میں عمرانی فرائض کی ادائگی میں اور ہر قسم کے ذاتی مشکلات سے عہدہ‌برآ ہونے میں - معلم کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ان فرائض کے لیے طلبہ کو کس طرح تیار کرے - جب بہت سے ہم‌عمر اور ہم‌مقصد بچے ایک مدرسے میں جمع ہوتے ہیں ' ساتھ لکھتے پڑھتے ہیں ' اٹھتے بیٹھتے ہیں' کھاتے پیتے ہیں ' کھیلتے کودتے ہیں تو ان میں علاوہ علمی تعلقات کے بہت سے معاشری تعلقات بھی پیدا ہوتے ہیں - ان میں آپس میں دوستی ہو جاتی ہے ' جن مقاصد میں انہیں مشترک طور پر

لیکن اگر مدرسے کو محض رسمی درس کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہ ہو ' اور سیکھنے اور کرنے ' علم و عمل میں ربط قائم نہ کیا جائے تو سیرت کی تشکیل اور علم کی تحصیل میں کوئی تعلق پیدا نہ ہوگا اور اس کی وجہ سے دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ پر ناقص رہ جائیں گی اسی سبب سے اکثر ماہرین تعلیم نے اس بات پر زور دیا ہے کی دست‌کاری کو نصاب میں محض ایک جداگانہ مضمون کے طور پر داخل کرنا کافی نہیں بلکہ اس کو تمام مضامین نصاب میں ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیے - اگر معلم طریقۂ تعلیم کی اہمیت کو محسوس کریں اور مدرسے کے نصاب اور مشاغل اور تعلیمی طریقوں کو اس طرح منظم کریں کہ طلبہ میں مذکورہ‌بالا صفات پیدا ہوں تو تعلیم میں ایک انقلاب عظیم ہوجائے گا - مدرسے کی اخلاقی تربیت محض حلقۂ درس اور اوقات تعلیم تک محدود نہ رہے گی بلکہ وہ ہر وقت اور ہر کام کے ذریعے اس کام کو انجام دے گا - اس حالت میں طلبہ کے تمام مشاغل کی ایک اخلاقی اہمیت ہوگی اور ان سے ان کو اخلاقی سیرت کی تشکیل میں مدد ملے‌گی- تحصیل علم میں صحیح طریقۂ عمل اختیار کرنے‌کی بدولت جو صفات طلبہ میں نشو و نما پاتی ہیں وہ محض علمی اور ذہنی اعتبار سے نہیں بلکہ اخلاقی اور عمرانی لحاظ سے بھی نہایت قابل قدر ہیں- معاملات پر غیرجانبداری اور بےتعصبی سے غور کرنا' کام میں خلوص اور انہماک' وسعت نظر' استقلال‌اور حوصلہ'اجتماع توجہ' اعتماد ذات' احساس و ذمہ‌داری' یہ تمام چیزیں اخلاقی سیرت کا جزو لازم ہیں - جس شخص میں یہ صفات پائی جائیں‌گی وہ ہر کام کو' خواہ اس کا تعلق‌کسی شعبۂ زندگی سے ہو' ایمانداری اور قابلیت کے ساتھ انجام دے‌گا -

گہرائیوں میں ایک نئی شخصیت کی تشکیل میں مشغول ہو " ایسی شخصیت کا معلم کو خاص طور پر احترام کرنا چاہیے - کیونکہ علمی اور تخلیقی کاموں کے لیے عموماً اُنہیں صفات کی ضرورت ہے جو امتحانوں کی کسوٹی پر نہیں کسی جاسکتیں - تجارتی اور اقتصادی معاملات میں یقیناً مقابلے اور مسابقت کی بہت گنجائش ہے لیکن علمی مشاغل اور فنون لطیفہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اشتراک احساس اور اشتراک عمل کا قانون کارفرما ہے - اس لیے مدرسے میں ہمیں تمام درسی مشاغل کی تنظیم اسی قانون کے مطابق کرنی چاہیے اور ان مشاغل کو بچوں کے سامنے ایسے انداز میں پیش کرنا چاہیے کہ اُنہیں ان سے وہی خوشی حاصل ہو جو ایک محقق یا صناع کو اپنے کام سے ہوتی ہے - وہ خوشی نہیں جو محض عارضی تفریح کے مرادف ہے بلکہ وہ جو شوق اور انہماک کے ساتھ کام کرنے سے پیدا ہوتی ہے - مدرسے میں دست‌کاری اور عملی مشاغل رائج کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان میں اجتماعی مقاصد کے لیے کوشش کرنے کا موقع ملتا ہے اور طلبہ میں معاشری اتحاد اور یک‌جہتی کا احساس پیدا ہوتا ہے - بقول پروفیسر ڈیوئی کے :—

"ہر ایسے طریقۂ عمل کو مدرسے میں رائج کرنے سے، جو بچے کے عملی رجحانات کو اُبھارے اور اس کی قوت تعمیر و تخلیق کی تربیت کرے، ایسے مواقع پیدا ہوتے ہیں کہ اس کے اخلاقی احساس کا مرکز ذاتی اور خود غرضانہ مشاغل سے ہٹاکر معاشری خدمت کی طرف منتقل کردیا جائے۔" ۱

---

۱ Educational Essays صفحہ ۲۱ -

سے زیادہ نقصان اُن بچوں کو پہنچتا ہے جو فطرتاً زیادہ زود حس ہوتے ہیں ' جن کا رجحان طبع زیادہ تر غور و فکر کی طرف یا فنون لطیفہ کی طرف ہوتا ہے - وہ مثلاً کسی علمی کتاب یا مضمون کا مطالعہ کر کے اِس کے مطالب کو خوب سمجھ سکتے ہیں اور تحریر و تقریر میں اس پر بہت اچھی طرح بحث کرسکتے ہیں یا کوئی عمدہ نظم پڑھ کر اِس سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں یا مصوری یا دستکاری میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں - مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ امتحانوں میں بھی اچھے رہیں کیونکہ وہاں انہیں اپنے ذوق اور مطالعے کے بہترین نتائج فرصت اور دلجمعی کے ساتھ پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا - بلکہ کم سے کم وقت میں ایک خاص طرح کی واقفیت کا اظہار کرنا ہوتا ہے جس کا گر ہر شخص کو نہیں آتا - ان کی برتر اور لطیف‌تر صفات کا نہ کوئی امتحان ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے - گزوں سے ناپنے والا معلم اپنے سطحی پیمانے سے سوائے طول کے اور کچھ نہیں ناپ سکتا - طبیعت کی شائستگی اور گہرائی ' ذوق حسن ' معاشری احساس قیادت کی قابلیت ' اور اس قسم کی تمام اعلیٰ صفات کو نظرانداز کر دیتا ہے اور ایسے طلبہ کی قدر کرتا ہے جن کو وہ نمائشی اور سطحی لیاقت ہوتی ہے جس کا اندازہ ان امتحانوں کے ذریعے آسانی سے ممکن ہے - اسے یہ معلوم نہیں کہ انسان کی روح راز سربستہ ہے اور کیا عجب ہے کہ جس وقت طالب علم کی قوتیں بظاہر خوابیدہ معلوم ہوتی ہوں اور وہ اپنے درسی مشاغل اور معمول کی طرف سے بےتوجہی برتتا ہو ' بقول برگسان (Bergson) کے " وہ اپنی ہستی کی

نہیں پاتے نالائق یا سست یا کام چور سمجھ لیے جاتے ہیں -
انہیں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ ممکن ہے اس ناکامی کی وجہ
ان کے طرز تعلیم کی خرابی یا طلبہ کا اختلاف طبائع ہو -
اس کا اثر دونوں قسم کے طلبہ پر بہت برا پڑتا ہے - جو طلبہ
امتحانوں کے معیار سے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ایسی
تیاری کرسکتے ہیں جس سے خوب نمبر حاصل ہوں وہ اپنی
جگہ پر بالکل مطمئن ہوجاتے ہیں - ان کو اپنی قابلیت کا
غلط اور مبالغہ آمیز گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے لیے اور
زیادہ محنت کرنے اور قابلیت حاصل کرنے کی کوئی تحریص
نہیں رہتی - کسی شخص کو نوعمری ہی میں یہ خیال پیدا
ہو جانا کہ وہ معراج کمال پر پہونچ گیا ہے اس کی ذہنی
قوتوں کو بالکل معطل کردیتا ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس
قسم کے تیز طالب علم اپنی محدود کامیابی سے پوری طرح
مطمئن ہوجاتے ہیں اور ان کی آئندہ ترقی قطعاً مسدود
ہو جاتی ہے - برخلاف اس کے کمزور طلبہ میں یعنی ان طلبہ
میں جو امتحان میں نمبر نہیں پاسکتے احساس شکست
پیدا ہو جاتا ہے - ان کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے ، حوصلہ پست
ہو جاتا ہے اور کچھ مقابلے میں ناکامیاب رہنے سے ، کچھ استاد
کی دل‌شکن باتوں سے انہیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ان میں
کسی طرح کی قابلیت نہیں - یہ احساس کم‌مائگی
بھی انسان کے لیے بہت مضر ہے - کیونکہ یہ ترقی کی
خواہش اور حوصلے کی بالکل بیخ کنی کردیتا ہے اور طبیعت
پر مایوسی اور افسردگی چھا جاتی ہے - یہ خرابیاں تو تمام
طلبہ کے لیے مشترک ہیں لیکن اس نظام تعلیم میں سب

قابل اور ہوشیار سمجھتے ہیں نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں کہ درسی تعلیم میں طلبہ کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرائیں - ایک بیدار مغز ہیڈ ماسٹر کا مجھے ذاتی تجربہ ہے جس کا تعلیمی اصل اصول یہ ہے کہ ہر اُستاد روزآنہ ہر طالب علم کو نمبر دیا کرے تاکہ نمبر حاصل کرنے کی خواہش میں سب طلبہ محنت اور توجہ سے کام کریں ! ان تمام عقلمندیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ طلبہ میں خودغرضی اور نفسا نفسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور تقسیم عمل اور تعاون کے ذریعے بڑے بڑے کام انجام دینے کے بجائے وہ سب اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح امتحان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں اور استادوں کی نظر میں سرخ روئی حاصل کریں - گویا انسانی کامیابی کا معیار متحدہ خدمت نہیں بلکہ انفرادی برتری اور باہمی مسابقت ہے ! اُستاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنی تعلیم اور طلبہ کے محنت کے نتائج کو بالکل خارجی اور مشینی معیاروں پر جانچتے ہیں - مختلف استعداد اور طبیعت کے طلبہ میں امتیاز نہیں کرتے اور ان کی محنت کا اندازہ لگانے میں اور اس کی داد دینے میں وسعت خیال اور ہمدردی سے کام نہیں لیتے - ان کے نزدیک ذی روح افراد بھی گویا لکڑی کے پیمانے میں ناپے یا لوہے کی ترازو میں تولے جاسکتے ہیں - جو طالب علم مروجہ امتحانوں میں اچھا رہتا ہے وہ ان کے نزدیک ہر طرح قابل تعریف ہے اور اس کی کامیابی ان کے طریقۂ تعلیم کی کامیابی کی دلیل ہے - باقی طلبہ جو امتحانوں میں اچھے نمبر

جائیں گے اور ان پر جمود اور کاہلی غالب آجائے گی - اس لیے تربیت اخلاق کا مقتضا یہ ہے کہ طلبہ جلد سے جلد ان تعصبوں کے اثر سے آزاد ہوجائیں اور وہ جو کچھ کام مدرسہ میں کرتے ہیں اس کی حقیقی قدر کو پہچانیں اور یہ محسوس کریں کہ اس کا ان کی موجودہ اور آئندہ زندگی سے کس قدر قریبی تعلق ہے اور اس کو محنت اور خوش دلی سے انجام دینے سے انہیں نہ صرف اس وقت خوشی اور تقویت حاصل ہوگی بلکہ آگے چل کر بھی وہ بہت مفید ثابت ہوگا لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر ہر قدم پر ذاتی مفاد کے ساتھ معاشری مفاد بھی مد نظر رہے تاکہ ان میں خود غرضی اور نفس پرستی نہ پیدا ہونے پائے -

طریقۂ تعلیم کے اس معاشری پہلو کی اہمیت دو وجوہ سے بہت زیادہ ہے - اول تو یہ وہ پہلو ہے جس سے ہمارے مدرسوں میں بہت زیادہ غفلت برتی گئی ہے - یعنی نہ تو نصاب کی ترتیب میں نہ طریقۂ تعلیم کے تعین میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ بچوں کو اشتراک عمل اور امداد باہمی کے موقع دیے جائیں - دوسرے ہمارے ملک کی سیاسی اور عمرانی حالت کا تقاضا ہے کہ نوخیز نسلوں میں باہمی وابستگی ، اور اتحاد مقاصد کے اس احساس کو پختہ کیا جائے اور مدرسوں میں اتفاق و یکجہتی کے ساتھ کام کرنے کی عادت ڈالی جائے - کیا ہمارے مدرسے اپنے موجودہ طریقۂ تعلیم کے ذریعے سے یہ تقاضا پورا کر رہے ہیں ؟ ہرگز نہیں - جیسا ہم نے ابھی بتایا ہے وہ طلبہ سے کام لینے کے لیے اُن کے ادنیٰ جذبات کو اُبھارتے ہیں - بہت سے اُستاد جو اپنے آپ کو نہایت

رشتہ جوڑے جو ایک ھنرمند دستکار یا صناع اور اس کے فن میں ھوتا ھے یعنی کام کی محبت اور عزت اور اس سے قلبی اور روحانی تعلق - اگر مدرسے میں طلبہ کو یہ بات حاصل ھوجائے تو وہ باھر نکل کر عملی زندگی یعنی اپنے کاروبار یا پیشے یا ملازمت میں بھی اسے قائم رکھیں گے - اس مقصد کے حصول کے لیے جہاں یہ ضروری ھے کہ طلبہ میں اعتماد ذات اور ذھنی آزادی پیدا کی جائے وھاں یہ بھی لازم ھے کہ مدرسے میں ایسے مشاغل اور تعلیمی طریقوں کو رائج کیا جائے کہ وہ مل جل کر کام کرنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا سیکھیں اور ان میں معاشری خدمت کا ولولہ پیدا ھو - لیکن موجودہ صورت حال جس کا مختصر سا تذکرہ ھم پہلے کر چکے ھیں اس کے بالکل برعکس ھے - مدرسوں میں بچوں سے کام لینے کے لیے مختلف قسم کی خارجی تحریصیں استعمال کی جاتی ھیں یعنی امتحان میں پاس ھونے اور نمبر پانے کا لالچ اُستاد کا خوف یا لحاظ ' اپنے ساتھیوں کی رقابت وغیرہ - اخلاقی نقطۂ نظر سے اس قسم کی محرکات عمل کو استعمال کرنا نہایت قابل اعتراض ھے - جب بچے سالہا سال تک ان اغراض کی بنا پر کام کریں گے تو ظاھر ھے کہ ان کی طبیعت پر اس کا مجموعی اخلاقی اثر بہت برا پڑے گا - نہ وہ کام کو کام سمجھ کر اس کی قدر کریں گے نہ ان میں کسی قسم کا معاشری احساس یا جذبہ پیدا ھوگا بلکہ تمام عمر اپنے ادائے فرائض کے لیے اسی قسم کے سہاروں کے محتاج رھیں گے - اس کا نتیجہ یہ ھوگا کہ جب خارجی اثرات کارفرما نہ ھوں گے تو یا تو وہ برے راستے پر پڑ جائیں گے یا بالکل نکمے ھوکر رہ

میں جا کر چند گھنٹے کے لیے خود فراموشی خرید لیتے
ہیں - حقیقت یہ ہے کہ روزمرہ کے کام کا اور ان جذبات کا
جو اس کام سے وابستہ ہوں انسان کی تہذیب نفس اور اخلاق
پر بہت گہرا اور پائدار اثر پڑتا ہے - لوگوں کے روحانی
اضطراب اور ان کی اخلاقی خرابیوں کی اصل وجہ یہ نہیں
کہ وہ بہت معمولی قسم کے کام کرتے ہیں اور انہیں اس
میں بہت قلیل آمدنی ہوتی ہے - اس کا سبب یہ ہے
کہ ان کے کام ان کے لیے ناموزوں ہوتے ہیں اور انہیں ان
میں نہ دلچسپی ہوتی ہے نہ ہوسکتی ہے - اگر ایک خاکروب
کو بھی اس امر کا سچا اور پورا احساس ہوجائے کہ وہ اپنے روز
کے کام سے ایک نہایت اہم معاشری خدمت انجام دے رہا ہے
اور اس کے بغیر نظام معاشرت میں بہت بڑی خرابیاں واقع
ہوں گی تو اس کے کام کی نوعیت بالکل بدل جائے گی اور اسے
خوش دلی، خلوص اور انہماک کے ساتھ کرے گا - اگر اس کے
ساتھ ہی اور سب لوگوں میں بھی اس خدمت کی اہمیت کا
احساس پیدا ہو جائے تو ان کا رویہ بھی اس کی جانب سے بدل
جائے گا اور وہ اس کی اسی قدر عزت کرنے لگیں گے - لیکن جب
کوئی شخص کارلائل کے لوہار کی طرح "ہتھوڑے کی ہر چوٹ
پر خدا کے دس قوانین توڑ ڈالے" تو اس کو اپنے کام میں کوئی
مسرت نصیب نہیں ہوسکتی خواہ اس کی آمدنی اور
معاشری حیثیت کتنی ہی زیادہ ہو - مدرسے کا ایک نہایت
اہم اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ کے دل میں کام کا ہر مفید
اور دیانت دارانہ خدمت کا احترام پیدا کرے اور ان کی
شخصیت اور ان کی درسی اور معاشری مشاغل کے درمیان وہ

موجود ہوں، ہر طرح کے ضروری سامان اور آلات فراہم ہوں تاکہ وہ اپنے شوق سے علمی تعلیم حاصل کر سکیں - معلم کی حیثیت ایک دوست اور رہبر کی ہے جو راستہ دکھاتا ہے لیکن اس راستے پر چلنا طلبہ پر چھوڑ دیتا ہے - وہ خوف یا لالچ کے ذریعے بچوں کو زبردستی اپنے ساتھ نہیں کھینچتا - بلکہ کام کی نوعیت ایسی ہوتی ہے اور وہ پیش اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ خود بخود اس کی طرف کھینچتے ہیں اور اس میں منہمک ہو جاتے ہیں - جوں جوں انہیں مشاغل میں کامیابی حاصل ہوتی ہے انہیں خوشی کا احساس ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت عمل میں اضافہ ہو رہا ہے - کسی مفید کام میں دلچسپی لینا، اور اس کو پوری توجہ اور محنت سے کرنا، اپنی ذات کو کم سے کم کچھ عرصے کے لیے اس میں کھو دینا، اور ہر منزل کو طے کرنے کے بعد یہ محسوس کرنا کہ ہماری علمی اور عملی قوتیں بڑھ رہی ہیں، یہ ایسی صورت حال ہے جس کی اخلاقی قدر و قیمت کا پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا - کون کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں محض اسی سبب سے کس قدر ملال اور افسردگی، مایوسی اور ناکامی پائی جاتی ہے کہ اکثر لوگوں کو اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جس کو وہ مجبوراً روزی کمانے کے لیے کرتے ہیں؟ ان کو زندگی کا حقیقی لطف کبھی میسر نہیں ہوتا - وہ روزانہ کام کے اوقات میں اپنا آٹھ دس گھنٹے کا معمول بہت بد دلی کے ساتھ پورا کرتے ہیں اور اس کے بعد یا تو اس قدر تھک جاتے ہیں کہ کسی اور شغل میں حصہ ہی نہیں لے سکتے، یا نہایت ادنیٰ اور سستی تماشا گاہوں

اس دور میں انفرادی ترقی اور اجتماعی زندگی میں کامیابی
کے ساتھ حصہ لینے کے لیے ہمت، حوصلہ اور قوت اجتہاد کی
ضرورت ہے - اگر بچے ذہنی جمود میں مبتلا رہیں اور انہیں
دوسروں پر بھروسا کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی عادت
پڑ جائے تو وہ کشمکش حیات میں ناکامیاب رہیں گے - جہاں
تک مدرسے کے علمی مشاغل کا تعلق ہے فعالی صفات انہیں
تعلیمی طریقوں کے ذریعے نشو و نما پائیں گی جو طلبہ کی
تعمیری اور تشکیلی قوتوں کو اظہار کا موقع دیں تاکہ وہ
معلومات کو محض جذب نہ کر لیں بلکہ اسے مستقل طور
پر استعمال بھی کریں - فطرت اطفال کا منشا بھی یہی ہے،
کیونکہ ان میں قدرتاً یہ خواہش اور بے چینی ہوتی ہے کہ
وہ کام کریں، چیزیں بنائیں اور بقول فروبل (Froebel) کے
"جو کچھ ان کے اندر ہے اسے باہر لائیں" - جس قدر نئے
تعلیمی تجربے حال میں ہوئے ہیں، جن میں سے بعض کا
ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے، سب میں یہ امر مشترک
ہے کہ وہ فعالیت پر زور دیتے ہیں اور طالب علم کو یہ سکھاتے
ہیں کہ وہ اپنے آپ پر بھروسا کرے، مشکلات پر قابو پائے، جسم اور
دماغ کی قوتوں سے کام لے کر وسائل اور ذرائع کی تنظیم کرے
اور اپنے مقاصد کو تکمیل تک پہنچائے - میڈم مونٹسوری کے
طریقۂ تعلیم میں، طریق ڈالٹن اور گیری اسکیم (Gary Scheme)
میں اور دوسرے تعلیمی طریقوں میں جو انفرادی
نشو و نما کے اصول پر مبنی ہیں معلم کی کوشش یہی ہوتی
ہے کہ بچوں کے لیے ایک موزوں ماحول مہیا کرے جس میں
ہر نوع کے مشاغل کا امکان ہو، ہر قسم کے عمل کے محرکات

منظم ہو گئے ہیں اور ان کے بہت سے علحدہ شعبے کر دیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک میں کمال پیدا کرنے کے لیے ایک ماہر خصوصی کی ضرورت ہے - موجودہ تمدن کے بہت سے مشاغل ایسے ہیں جن کے لیے مخصوص قابلیت درکار ہے - اس وجہ سے موجودہ حالات میں یہی مناسب ہے کہ ایک شخص ثانوی تعلیم پانے کے بعد جو عام تہذیب کے لیے ناگزیر ہے' کسی ایک علم یا فن میں مہارت حاصل کرے یا چند ایسے علوم و فنون کا مطالعہ کرے جن میں بہت قریبی تعلق ہے' بجائے اس کے کہ وہ بہت سے مختلف قسم کے علوم میں سطحی واقفیت پیدا کرے - لیکن نصاب تعلیم کی وسعت محدود کرنا صرف اسی حالت میں جائز ہو سکتا ہے جب طریقۂ تعلیم میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ طلبہ میں ذہنی آزادی' اعتماد نفس اور ذاتی مطالعے کی قابلیت پیدا ہو اور وہ آئندہ زندگی میں اپنی ضرورت کے مطابق جس علم کو چاہیں حاصل کر سکیں - یہ صلاحیت معلومات کے اس ذخیرے سے بدرجہا بہتر ہے جن کو انسان ایک دفعہ غیر معمولی محنت اور کوشش کر کے جمع کرے لیکن آگے چل کر اچھی طرح استعمال نہ کر سکے - ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے یہ صلاحیت بہت قابل قدر ہے اور اسی وجہ سے موجودہ نظریۂ تعلیم میں طریقۂ تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے -

ہم نے کتاب کے حصۂ اول میں جن سیاسی اور معاشری انقلابات کا ذکر کیا ہے ان کی وجہ سے انسانی سیرت میں فعالی صفات کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے - جمہوریت کے

نہ تھی کہ ان علوم کی تحصیل کے لیے وہ خود اور ان کے شاگرد کیا طریقے اختیار کرتے ہیں - کومینیس (Comenius) اور اس کے ہم خیال معلموں کے ہمہ‌دانی پر مبنی نظام تعلیم کا ذکر ہم کر چکے ہیں - ان لوگوں کا زور تمام‌تر موضوع پر تھا، طریقۂ تعلیم پر نہ تھا اور ظاہر ہے کہ علوم کی تعداد اور وسعت اتنی ہے کہ ایسی حالت میں معلم کو طریقۂ تعلیم کی طرف سے خواہ مخواہ بےتوجہی کرنی پڑے گی اور تمام ذہنی قوتوں کو نظرانداز کر کے صرف حافظے سے کام لینا ہوگا - مشرقی ملکوں میں بالعموم اور خود ہمارے ملک میں بھی قدیم نظام تعلیم کی بنیاد اسی خیال پر تھی - اس کا منشا یہ تھا کہ جو طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں وہ مختلف علوم مثلاً فلسفہ، ریاضی، طب، قانون، اخلاق وغیرہ کی تکمیل کریں - اس نظام کی خرابی اور کمزوری تو ظاہر ہے لیکن ہم یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس زمانے میں جو لوگ طالب علم کا سچا شوق رکھتے تھے وہ اپنی تعلیم پر اتنی توجہ اور مدت صرف کرتے تھے کہ ان میں سے بعض مستعد اور قابل افراد مختلف علوم میں کمال پیدا کر لیتے تھے - لیکن جیسا ہم وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں جب سائنس اور دوسرے تجربی علوم نے جدید دور ارتقاء میں قدم رکھا تو علوم کی تعداد اور وسعت میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہونا شروع ہوا اور موجودہ زمانے میں کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ تمام علوم کا تو کیا ذکر ہے ان کے دسویں یا سویں حصے پر بھی عبور حاصل کر سکے - علاوہ اس کے یہ زمانہ خصوصی قابلیت کا ہے - علوم بھی پہلے سے بہت زیادہ

محفوظ ہے وہ ہمارے لیے کوئی اہمیت اور قدر نہیں رکھتا جب تک ہم اس کو اپنے تجربات کی شکل میں تحویل نہ کرلیں اور وہ ہماری زندگی اور عمل کا جزو نہ بن جائے - اس عمل تحویل کا ذریعہ طریقۂ تعلیم ہے - اگر وہ بچوں کی فطرت کے موافق ہے ' ان کو عمل کا موقع دیتا ہے ' اس کے اندر جدت پسندی اور ذاتی ذمہ‌داری کے ساتھ کام کرنے کی گنجائش ہے تو وہ جو کچھ سیکھیں گے ان کا جزو طبیعت بن جائے گا اور ان کی سیرت پر اثر ڈالے گا ورنہ ان کی تمام معلومات دماغ پر بار ہوکر رہ جائے گی اور ان کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ نہ لے گی - مجھے اپنے ایک پرانے سائنس ماسٹر کا یہ قول اکثر یاد آتا ہے کہ " تم ان چیزوں کو حفظ کر رکھو ' کسی وقت خود بخود کام آئیں گی " - یہ بیچارے طریقۂ تعلیم کی اہمیت اور اثر سے بالکل ناواقف تھے - انہیں یہ خیال کبھی نہیں گزرا تھا کہ جب بغیر چبائے ہوئے جسمانی غذا بھی ہضم نہیں ہوتی تو دماغی غذا کیسے کوئی مفید اثر پیدا کرسکتی ہے اگر وہ بغیر ہضم کئے حافظے میں تھونس لی جائے ؟ ان کی یہ غلطی کوئی غیر معمولی جہالت کی دلیل نہیں بلکہ ایک خاص تعلیمی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہے جس کی حکومت صدیوں تعلیم کی قلمرو پر رہی ہے اور جس نے نہ جانے کتنے غریب طلبہ کی تعلیمی زندگی برباد کی ہے - اُستادوں کی تمام کوششیں مدتوں اس مقصد کے لیے وقف رہیں کہ طلبہ کسی طرح وہ بےاندازہ معلومات حاصل کر لیں اور یاد کر رکھیں جو وہ اپنی سمجھ کے مطابق ان کے لیے مفید سمجھتے تھے - ان کو اس امر سے بحث

اخلاقی تربیت کے لیے بھی ضروری ھیں - ماھرین تعلیم کا اس امر پر اتفاق ھے کہ بچوں کی شخصیت کی نشو و نما اور تشکیل اس وقت تک نہیں ھو سکتی جب تک انہیں مسلسل عملی اور تخلیقی مشاغل میں شرکت کا موقع نہ ملے۔ شرط یہی ھے کہ ان کی تعلیم بالکل رسمی اور خشک نہ بنا دی جائے کہ بچوں کو سوائے چند کم و بیش مفید قاعدوں کو سیکھنے کے تخلیقی اظہار کا موقع نہ ملے - اس صورت میں نہ تو ان فنون کے سیکھنے سے بچوں میں معاشری احساس پیدا ھوگا نہ ایسے تعلیمی طریقے اختیار کیے جاسکیں گے جن میں اشتراک عمل باھمی ھمدردی اور ذھنی تعاون کی گنجائش ھو - ان میں بھی اسی رشک و خودغرضی اور باھمی مسابقت کی کار فرمائی ھوگی جو بد قسمتی سے دوسرے درسی مضامین میں داخل ھوگئی ھے - برخلاف اس کے اگر ان چیزوں کی تعلیم میں بچوں کے فطری میلانات اور دلچسپیوں کو پیش نظر رکھا جائے ' فعالیت کے اصول پر زور دیا جائے اور وہ اپنا کام آزادی کی فضا میں کریں تو ان میں اعتماد ذات ' تعاون عمل اور تخلیقی اظہار کی صفات پیدا ھونگی جو معاشری زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ھیں -

طریقۂ تعلیم اور معاشری تربیت

نصاب کی مندرجۂ بالا بحث میں ضمناً طریقۂ تعلیم کی بحث بھی آگئی ھے اور ھم نے اس بات پر زور دیا ھے کہ محض نصاب تعلیم کو باقاعدہ اور معقول طور پر مرتب کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ھمیں وہ تمام علمی اور اخلاقی نتائج حاصل ھوجائیں جن کی تفصیل اوپر کی گئی ھے کیونکہ جو علم کتابوں میں

ہے - اس کے ذریعے سے ہم ان تمام معاشری معاملات اور مسائل کو سمجھتے ہیں جو اعداد و مقادیر کی صورت میں ظاہر کیے جاسکتے ہیں - اس کے بغیر اس مادی دنیا میں ہماری بہت سی کوششیں یا تو بالکل ضائع ہو جاتی ہیں یا ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے - زراعت ' تجارت ' صنعت و حرفت' سائنس کی تحقیقات ' روزمرہ کے کار و بار میں ہمیں برابر حساب کی ضرورت پڑتی ہے اور وہی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں اور معاشری کار و بار کو ناپنے تولنے اور ان کا صحیح اندازہ کرنے میں کام آتا ہے - دوسری طرف حساب کی تعلیم میں ہمیں ہر ہر قدم پر صحت عمل ' نقد و تنقید اور ذہنی دیانت‌داری کی صفات درکار ہوتی ہیں کیونکہ یہ ان علوم صحیحہ میں سے ہے جن میں غلطی اور صحت کے مابین کوئی درمیانی راہ نہیں ہوتی - یہاں طالب علم الفاظ کی گنجلک کے ذریعے نہ اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہے نہ دوسروں کو مغالطے میں ڈال سکتا ہے - لہذا حساب کی صحیح تعلیم کے ذریعے جو ذہنی صفات اور عادتیں پیدا ہوتی ہیں وہ اخلاقی تربیت کا جزو بن جاتی ہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم انتقال قوت اکتسابی[1] کے غلط نظریے کو صحیح مانیں - دست‌کاری اور فنون لطیفہ کی اہمیت اور نصاب میں اس کی قدر و قیمت سے ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ وہ نہ صرف طلبہ کی جسمانی اور دماغی نشو و نما کے لیے مفید ہیں بلکہ

1- Transfer of Training -

ہم نے اخلاق کا جو مفہوم پیش کیا ہے اس کے مطابق سائنس سے عمرانی برکات کے علاوہ اخلاقی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ اس عقیدے سے بڑھ کر کون سی اخلاقی صفت ہو سکتی ہے کہ انسانی ترقی اور اصلاح خود انسان ہی کی کوشش سے ممکن ہے اور یہ کوشش صرف باہمی اشتراک عمل کے ذریعے کامیاب ہوسکتی ہے؟ اس عقیدے کے طفیل میں انسان عاجزانہ تقدیر پرستی سے نجات پاکر نظام عالم میں اپنی اہمیت اور اپنے فرائض کو پہچانتا ہے اور یہی خودشناسی خدا شناسی کی سیڑھی ہے - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سائنس قدرت کی کارسازی کے وہ حیرت انگیز کرشمے دکھاتی ہے اور دنیا کے لاتعداد اور بظاہر متضاد مظاہر میں قانون الٰہی کی حکومت کا ایسا بین ثبوت دیتی ہے کہ اگر ہم عقیدت اور احترام کے ساتھ چشم بصیرت سے اس کا مطالعہ کریں تو وہ ہمیں بلاواسطہ معرفت الٰہی کی منزل پر پہنچا دیتی ہے - [1] اگر گنجائش ہوتی تو ہم نصاب کے باقی مضامین سے بحث کر کے دکھا سکتے تھے کہ اخلاقی تربیت میں ان کا کیا حصہ ہے - بہر حال ان سب کی تنظیم میں شرط مشترک یہی ہے کہ ان کی تعلیم صحیح طریقے پر دی جائے - حساب جیسا خشک اور بظاہر بےروح مضمون بھی، جس کا بادی‌النظر میں اخلاقی تربیت سے کوئی رشتہ معلوم نہیں ہوتا، در اصل نہایت اہم اخلاقی اور عمرانی قدروں کا حامل

۱—سائنس کے فوائد اور برکات کی مفصل اور مکمل بحث کے لیے اسپنسر کی "فلسفۂ تعلیم" کا مطالعہ کرنا چاہیے -

ترقی نہیں کرسکتے اور خصوصاً اس زمانے میں جو حرکت اور تبدیلی کا زمانہ ہے وہ علمی اور معاشری ترقی میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکتے - ہندوستان میں اس قسم کے لوگ بہت ہیں جو قسمت پر شاکر رہنا پسند کرتے ہیں اور جد و جہد کے قائل نہیں - قومی سیرت کی تشکیل کا تقاضا یہ ہے کہ اس ذہنی کیفیت میں انقلاب پیدا کیا جائے - اس کا بہترین طریقہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یہی ہے کہ مدرسوں کے نصاب، میں سائنس کو معقول حصہ ملے اور طلبہ صحیح طریقے پر اس کا مطالعہ کریں تاکہ وہ معاشری زندگی کے ان شعبوں میں کامیابی کے ساتھ شریک ہو سکیں جن کی بنیاد سائنس کے علم پر ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) لکھتے ہیں :

" نصاب تعلیم میں بھی سائنس کا کام وہی ہے جو اس نے نسل انسانی کے لیے انجام دیا ہے یعنی تجربے کو اس کی مقامی اور عارضی پابندیوں سے آزاد کرنا اور عقلی ترقی کی ایسی راہیں کھول دینا جن میں شخصی عادات اور رجحانات کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو - اس طرح جب کوئی خیال اس مخصوص اور محدود دائرے سے جس میں وہ پیدا ہوا ہے نکال کر ایک مجرد تصور بنا دیا جائے اور اس کو زیادہ وسیع معنی دے دیے جائیں تو انفرادی تجربے کے نتائج سب لوگوں کے کام میں آسکتے ہیں اور انجام کار فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سائنس عمرانی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے " - [۱]

- Democracy and Education—۱

سب قوموں اور جماعتوں کا حصہ ہے اور جب تک تمام ماہرین سائنس اپنی اپنی علمی تحقیقات کے نتائج سے اپنے شرکائے کار کو مطلع نہ کریں اور ان میں نہایت قریبی اشتراک عمل نہ ہو سائنس ترقی نہیں کرسکتی - علاوہ بریں سائنس نے انسان کو سب سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز سبق یہ سکھایا ہے کہ وہ خود اپنی تربیت یافتہ عقل کے ذریعے اپنے معاملات کی ہدایت اور رہنمائی کر سکتا ہے اور اس کی قسمت کا انحصار نامعلوم اور خوفناک قوتوں کی مرضی پر نہیں ہے - وہ قدیم زمانے کے وحشیوں کی طرح جن کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ماحول کے تمام مظاہر ان کی مخالفت پر آمادہ ہیں، ہمت شکن توہمات اور خطرات کا غلام نہیں ہے - سائنس کی مدد سے انسان نے اپنے گزشتہ تجربات کو منظم کرکے انہیں آئندہ کی ترقی کا ذریعہ بنا لیا ہے اور اس خوف سے جو اس کے دل پر طاری تھا رہائی حاصل کرکے اپنے لیے آگے بڑھنے کی بےشمار راہیں کھول دی ہیں - اگر سائنس اس طرح انسانی تجربات کی تنظیم کر کے ان سے مفید نتائج نہ نکالتی تو یہ تجربات یا تو بالکل اکارت جاتے یا انسان کے دماغ کے لیے ایک بوجھ بن کر رہ جاتے - جن لوگوں پر سائنس کے مخصوص منہاج و نقطۂ نظر کا اثر نہیں پڑا وہ یا تو عادت اور روایات کے مطابق عمل کرتے ہیں یا تقدیر پر بھروسا کرکے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں - ان میں معاملے کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے اور اس کے موافق اور مخالف دلائل کو تولنے کی قابلیت نہیں ہوتی - اور وہ اپنے افعال کی ذہنی ذمہ‌داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے - ظاہر ہے کہ اس ذہنیت کے لوگ کبھی زیادہ

کی ذات میں ایک نئی وسعت اور گہرائی اور اس کے احساسات میں تیزی اور شدت پیدا ہوگئی ہے - اکثر لوگوں کو اس بات کا تجربہ ہوا ہوگا کہ جب وہ کوئی ایسی چیز پڑھتے ہیں جس سے دل پر چوٹ لگے تو کم از کم عارضی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نفس سے بہت سے ادنیٰ جذبات اور تعصبات دور ہوگئے ہیں اور طبیعت میں گداز اور نرمی اور محبت پیدا ہوگئی ہے - گویا بقول ارسطو کے ان کا روحانی تنقیہ [1] ہوگیا ہے - لہذا ایک صاحب نظر اور صاحب دل معلم کے ہاتھ میں ادب کی تعلیم تربیت اخلاق کا ایک نہایت اہم اور موثر ذریعہ بن جاتی ہے - بشرطیکہ اس کی غرض محض زبان سکھانا اور الفاظ کی مشق کرانا نہ ہو بلکہ اس میں انسانی جذبات اور تجربات کے مطالعے پر زور دیا جائے اور اس کی وساطت سے طلبہ کو بنی نوع انسان کے بہترین خیالات اور احساسات میں شرکت کا موقع ملے -

سائنس کی تعلیم جس کو عام طور پر محض مادی مفاد کے حصول اور صنعت و حرفت کی ترقی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے در اصل اس زمانے میں اخلاقی اور عمرانی تربیت کا جزو لازم ہوگئی ہے کیونکہ اس کی مدد سے ہم موجودہ تمدن کو سمجھتے ہیں جس کی بنیاد بڑی حد تک سائنس اور اس کے استعمال پر ہے اور اسی کے ذریعے سے ہم فطرت کی طاقتوں کو تسخیر کرکے انہیں اپنے مقاصد کے لیے کام میں لاتے ہیں - سائنس کے مطالعے سے ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انسان نے دنیا میں جس قدر مادی ترقی کی ہے اس میں

1—Catharsis -

حاصل کرتے ہیں (یہ تو ادب کا سب سے ادنیٰ فائدہ ہے) بلکہ قدیم اور جدید خیالات اور جذبات ' اور دنیا کے بہترین ارباب فکر کے شاہکاروں سے روشناس ہوتے ہیں - اس کے مطالعے سے ہماری نظر زیادہ وسیع ' ہماری ہمدردی زیادہ عام ' ہماری قدرشناسی کی حس زیادہ تیز ہو جاتی ہے - اعلیٰ‌ترین ادب ہمیں نہ صرف معاشری معاملات اور مسائل کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے ' نہ صرف اپنی سحر آفرینی سے گزشتہ زمانوں اور شخصیتوں کو دوبارہ زندہ کر دکھاتا ہے بلکہ ان صفات کو جو انسانیت کا جوہر ہیں نشو و نما دے کر اخلاقی تربیت میں معاون ہوتا ہے - وہ ہمیں براہ راست اخلاقی تلقین اور نصیحت نہیں کرتا بلکہ اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کرتا ہے اور واقعات اور افسانوں کو اس پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ ان کا مجموعی اثر ہمارے جذبات کی تہذیب کا باعث ہوتا ہے - جن تصانیف میں پند و نصیحت کا رنگ غالب آجاتا ہے اور مصنف اپنے فن لطیف کے اصول کو نظرانداز کر کے عمداً اخلاقی تعلیم کی کوشش کرتا ہے ان کا ادبی معیار بالعموم زیادہ بلند نہیں ہوتا - ناولوں ' ناٹکوں اور افسانوں میں بھی جب کبھی خیالات و عقائد کی تبلیغ کی خواہش آرٹ پر غالب آجاتی ہے تو ان کا اثر جاتا رہتا ہے - اس لیے ادب عالیہ کی پہچان اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طریقے پر طالب علم کے بہترین خیالات اور جذبات کو ابھارے اور خود بخود اس کی سیرت میں سرایت کرجائے - جس شخص میں ادب کا صحیح ذوق ہوتا ہے اسے ہمیشہ ایک اعلیٰ درجے کا مضمون یا نظم یا افسانہ پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس

سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ اس کے مطالعے میں معاشری اور انسانی پہلو مقدم رکھا جائے - تاریخ اور جغرافیہ دونوں میں انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے - فرق یہ ہے کہ تاریخ انسان کا تعلق وقت اور زمانے سے دکھاتی ہے یعنی اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ گزشتہ صدیوں میں اس کی زندگی اور تمدن میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں - جغرافیہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول کے تعلق سے بحث کرتا اور یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی نشو و نما کس حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہے - بہر حال دونوں کو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سروکار ہے - جغرافیہ کی اخلاقی اہمیت یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کے باہمی ربط کو ظاہر کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ وہ کیسے عالم طبیعی کے واسطے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور کس طرح اقتصادی اور مادی زندگی کی بقا اور اصلاح و ترقی کے لیے لوگوں کا باہمی تعامل ضروری ہے اور تقسیم عمل کے اصول پر زراعت، صنعت و حرفت اور مختلف پیشوں کی تنظیم لازم آتی ہے - اسی کے ساتھ جغرافیہ انسانی تخیل اور ہمدردی کا دائرہ وسیع کرتا ہے اور اس طرح طالب علم کی عمرانی تربیت میں مدد دیتا ہے -

اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ادب کی تعلیم صحیح اصول پر مرتب کی جائے تو وہ اخلاقی تربیت کا کس قدر موثر ذریعہ بن جائے گی - ادب انسانی خیالات اور جذبات انسانی آرزؤں اور اُمنگوں، انسانی کامیابیوں اور ناکامیابیوں کا ترجمان ہے اور انسان کے قلب و روح کی واردات اور جد و جہد کا آئینہ دار - اس کے ذریعے سے ہم نہ صرف مختلف قسم کی مفید معلومات

خاص پہلو نمایاں کرنے پڑیں گے - مثلاً ابتدائی زمانے کے وحشیوں کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوگی کہ اول اول انسان اور فطرت کس طرح ایک دوسرے کے حریف بنے ہوئے تھے اور کس طرح رفتہ رفتہ انسان نے فطرت کی طاقتوں کو مطیع کر کے ان کو بجائے دشمن کے دوست بنا لیا - قدیم آریوں کی زندگی کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوگا کہ انہوں نے کس طرح اپنی مخصوص ضروریات پوری کرنے کے لیے متمدن زندگی کے وہ ادارے قائم کیے جو آج زیادہ مکمل شکل میں موجود ہیں - اسی طرح مختلف قوموں کی تاریخ در اصل مختلف انسانی کمالات کے ارتقاء اور کامیابی کی داستان ہے - تاریخ روما کا مطالعہ سیاست اور ملک گیری کے کمال کا ' تاریخ یونان کا مطالعہ علوم و فنون لطیفہ کی ترقی و نشو و نما کا ' سلطنت مغلیہ کی تاریخ کا مطالعہ آئین سلطنت کی تنظیم اور فن تعمیر کی تکمیل کا مطالعہ ہے - بحیثیت مجموعی علم تاریخ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ موجودہ تمدن کے رنگا رنگ تار و پود کے ملنے سے کس طرح یہ جامہ تیار ہوا ' وہ کون سے محرکات تھے جو مختلف ایجادوں ' دریافتوں اور جغرافی سیاحتوں کا باعث ہوئے اور ان چیزوں نے کس طرح زندگی کے نئے نئے طریقوں کی بنیاد ڈالی - طالب علم کے دل میں اس عظیم‌الشان ارتقاء کا احساس پیدا ہونا اور اس کا معاشری معاملات اور مسائل کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنا اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے -

اسی طرح جغرافیہ چند اصطلاحوں اور ناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی معاملات اور ان کی باہمی وابستگی کو

لیے بعض اہم درسی مضامین کی تنظیم و ترتیب میں کیا تبدیلی لازمی آئے گی -

سب سے پہلے تاریخ کو لیجیے - اگر تاریخ محض پرانے واقعات اور بھولے بسرے افسانوں کا مجموعہ سمجھ کر پڑھی اور پڑھائی جائے ' جیسا بالعموم ہمارے مدارس میں ہوتا ہے تو اس سے نہ عمرانی تربیت میں مدد ملے گی نہ اخلاقی تربیت میں - لیکن فرض کیجیے ہم تاریخ کی تعلیم میں ارتقائی نقطۂ نظر اختیار کریں اور ماضی کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ اس سے موجودہ تمدنی اور سیاسی حالات پر روشنی پڑے تو تاریخ نظام معاشرت اور اس کے تمام پیچیدہ اور ترقی یافتہ اداروں کی تفسیر کا ذریعہ بن جائے گی - معاشری زندگی کے تمام شعبوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ان کی ابتدا بہت سادہ اور محدود ہوتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ اور وسیع ہوتے جاتے ہیں - تاریخ کا فرض یہ ہے کہ وہ اس عمل ارتقا کی تشریح کرے اور طلبہ کو یہ سمجھائے کہ انسانی جد و جہد سے تمدن کے ہر شعبے میں کس طرح ترقی ہوئی ہے - اگر طلبہ اس کا مطالعہ سمجھ بوجھ کر اور صحیح نقطۂ نظر سے کریں گے تو وہ انسانی ارتقاء کی نوعیت ' اس کی رفتار اور اس کے رجحانات کو پہچاننے لگیں گے - اور وہ اپنے عمرانی فرائض کو عمدگی سے پورا کریں گے اور اپنے حقوق سے اچھی طرح فائدہ اٹھائیں گے - نصاب تاریخ کے انتخاب میں جن امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ ہم بیان کرچکے ہیں - ان کے علاوہ ہمیں اس مضمون کی تعلیم میں انسانی معاشرت کی ارتقاء کے بعض

کے لیے لازم ہے کہ ہم مدرسۂ جدید کے نصاب کو معاشری ضرورت اور مقاصد کے مطابق تربیت دیں اور اس کے طریقۂ تعلیم کو عمرانی زندگی کے طریقۂ کار کے ساتھ ہم آہنگ بنائیں تاکہ طلبہ تمدنی زندگی کے اخلاقی اصول عملی طور پر سیکھ لیں۔

نصاب تعلیم کی اہمیت۔

مدرسے کا نصاب اخلاقی تربیت میں کیونکر معین ہو سکتا ہے اور اپنے طلبہ میں معاشری صلاحیت کس طرح پیدا کر سکتا ہے؟ نصاب تعلیم کی بحث میں ہم بتا چکے ہیں کہ نصاب بنانے والوں کو معاشری زندگی کے مختلف شعبوں سے ان بہترین اور اہم ترین عناصر کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کے مستقل اقدار و مقاصد کے حامل ہوں تاکہ ان کے مطالعے سے طالب علم کے ذہن میں نظام تمدن کو سمجھنے کی قابلیت اور بصیرت پیدا ہو اور وہ اپنی سیرت کو اس کے ساتھ ہم آہنگ بنا سکے۔ اگر نصاب کے تمام مضامین کا مطالعہ محض اس نظر سے کیا جائے کہ ان سے معلومات میں تھوڑا بہت اضافہ ہو اور امتحان میں کامیابی حاصل ہو جائے تو ان کی کوئی خاص اخلاقی یا عمرانی اہمیت نہ ہوگی۔ برخلاف اس کے اگر ان کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان سے طلبہ کو معاشری زندگی کے اصول و اساس سے واقفیت ہو اور بہتر زندگی بسر کرنے میں مدد ملے تو ان کی اخلاقی قدر میں کوئی شبہہ نہیں۔ اس کی تشریح کے لیے ہمیں درسی مضامین کی نوعیت کے متعلق اس تمام بحث کا اعادہ کرنا پڑے گا جو ہم ایک دوسرے سلسلے میں اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اس کا تو یہاں موقع نہیں۔ لیکن ہم اخلاقی تربیت کے نقطۂ نظر سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس مقصد کے

دائرہ ایک خاص جماعت یا طبقے تک محدود ہو کیونکہ اخلاق کی بنیاد کسی امتیازی خصوصیت مثلاً رنگ یا نسل یا وجاہت ظاہری یا تعلیم یا مالی اور معاشری حیثیت پر نہیں رکھی جاتی بلکہ انسانیت کے اس عنصر پر قائم ہے جو تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہے حقیقی اخلاق اور سچی تہذیب کی پہچان صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جن لوگوں کی سیرت میں اخلاق کے اصول محض ظاہری شائستگی اور آداب محفل کی سطح پر نہیں رہتے بلکہ تہ تک اُتر جاتے ہیں اُن کا خلق اور ہمدردی اور باران رحمت کی طرح ہر شخص کے لیے ہوتا ہے - اس میں امیر اور غریب ' جاہل اور عالم کا امتیاز نہیں ہوتا - اخلاق طبیعت کا ایک خاصہ ہے جو مشک کی خوشبو کے مانند ہر جگہ اور ہر موقع پر ظاہر ہوکر رہتا ہے - ہم اپنے مدرسوں میں اس اخلاق کی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس کے دائرے میں تمام عالم انسانی آجائے - یہ آرزو اُسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب مدرسے کی زندگی اور بیرونی زندگی میں اچھی طرح ربط ضبط پیدا ہو جائے اور ایک طرف مدرسے میں عمرانی زندگی کے بہترین عناصر اور مشاغل مہیا ہوں اور دوسری طرف طالب علم اپنی تعلیم و تربیت کے نتائج کو بیرونی زندگی میں استعمال کرے اور دیکھے کہ انصاف' تقسیم عمل' امداد باہمی' ادائے فرض' راست‌بازی' معاشری وفاداری کے اصول نہ صرف مدرسے کی زندگی میں ضروری ہیں بلکہ دنیا کے کاروبار کو کامیابی اور عمدگی کے ساتھ چلانے کے لیے بھی ناگزیر ہیں اور تمام نظام تمدن میں ان کی کار فرمائی ہے اور ہونی چاہیے - لہذا اخلاقی تربیت

نے ان اسکولوں میں تعلیم پائی ہے دوسرا وہ جو اس شرف سے محروم رہا ہے - وہ موخرالذکر طبقے کے لوگوں کو جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اپنے آگے حقیر جانتے ہیں اور معاشری معاملات میں انہیں اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے - ظاہر ہے کہ جمہوری معاشرے میں اس قسم کی سیرت قوم کے لیے مفید نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اُس تفریق کو اور مستحکم بناتی ہے جس کو دور کرنا جمہوریت کا اولین فرض ہے - ہمارے ملک میں یہ تفریق کسی قدر مختلف صورت میں پائی جاتی ہے - ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی زبان اور آداب معاشرت سیکھ کر گویا ایک نئی تہذیب اور نیا تمدن اختیار کر لیا ہے - یہ لوگ خود کو باقی تمام ابنائے وطن سے' جن کو یہ تعلیم یا کسی طرح کی تعیلم بھی نصیب نہیں ہوئی' بالکل مختلف اور ممتاز سمجھتے ہیں ان کا کام اور تفریح' ان کا طرز خیال اور طرز معاشرت' ان کے اغراض و مقاصد غرض سب چیزیں عام لوگوں سے مختلف ہو جاتی ہیں - تعلیم یافتہ طبقے اور جمہور کی یہ باہمی اجنبیت ملک و قوم کے اخلاقی' معاشری اور سیاسی مفاد کے لیے بہت مضر اور خطرناک ہے - اگرچہ گزشتہ بیس سال میں زیادہ‌تر سیاسی وجوہ سے اس میں مقابلتاً کمی واقع ہوئی ہے لیکن اب بھی کالجوں اور اسکولوں کے تعلیم یافتہ لوگوں اور ملک کی بےشمار دیہاتی آبادی کے درمیان ایک سد سکندری ہے جس کو دور کرنا قومیت کی نشو و نما کے لیے نہایت ضروری ہے - علاوہ اس کے ہم کسی ایسے نظام اخلاق کو مکمل نہیں مان سکتے جس کا

ہوجائیں کہ جب وہ مدرسے سے باہر نکل کر زندگی کے مشاغل
میں شریک ہوں تو ان صفات کا مناسب حال استعمال نہ
کرسکیں اور ان اصولوں کو سب لوگوں کے ساتھ نبھانے میں کامیاب
نہ ہوں یہ اندیشہ ایسی حالت میں زیادہ ہوتا ہے جب مدرسے
کی زندگی اور بیرونی زندگی میں کوئی زندہ رابطہ نہ ہو اور
طالب علم تمدنی زندگی کے مسائل اور محرکات سے بےتعلق
ہو کر مدرسے میں بالکل قلعہ بند ہوجائے جہاں نہ باہر کے
اثرات پہنچ سکیں' نہ باہر کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور اتحاد
اغراض و مقاصد پیدا ہو سکے - جن مدرسوں میں تاریخی حالات
کی وجہ سے خاص رسوم و روایات قائم ہو جاتی ہیں وہاں یہ
بےتعلقی بہت نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے - اس کی ایک
نہایت واضح مثال انگلستان کے پبلک اسکولوں میں ملتی ہے -
ان اسکولوں کی محدود چاردیواری میں ایک خاص قسم کی
فضا اور روایات پیدا ہوگئی ہیں جن کی بدولت وہ نہایت
کامیابی کے ساتھ ان عادات اور خصوصیات کو نشو و نما دیتے
ہیں جو ان کے نزدیک قابل قدر ہیں - اور اپنے طلبہ میں
ایک مخصوص سیرت کی تشکیل کرتے ہیں - لیکن ان کا
نقطۂ نظر اور تخیل دونوں تنگ ہیں - اس وجہ سے ان کی
تربیت ناقص اور نامکمل رہتی ہے - ان میں باہمی ہمدردی
یک جہتی اور تعاون کی جو صفات پرورش پاتی ہیں وہ اپنی
جماعت اور اپنے طبقے کے لوگوں تک محدود ہیں - ان کے
دائرے میں خود اپنی قوم کے کل افراد تک شامل نہیں ہوتے -
ان میں ایک " پبلک اسکول کی ذہنیت " پیدا ہو جاتی ہے
جو قوم کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیتی ہے - ایک وہ جس

خواہشات کے مطابق تحصیل علم میں ترقی کرتے رہیں۔ اس
مدرسے میں عمل پر، زندگی پر، فعالیت پر زور دیا جائے گا اور علم
اس طرح سکھایا جائے گا کہ بچے اس کی مدد سے ان مسائل
کو حل کر سکیں جو ان کے پسندیدہ مشاغل کے دوران میں
پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے جدید تعلیمی تحریکوں کی
کوشش یہ ہے کہ نصاب تعلیم میں بجائے غیر مربوط اور مجرد
اسباق کے مختلف قسم کے مسلسل عملی مشاغل داخل کیے
جائیں۔ ذہنی تربیت کے نقطۂ نظر سے تو ان کی اہمیت کو
واضح کر چکے ہیں لیکن اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بھی وہ
بہت ضروری ہیں۔ ان مشاغل کے دوران میں بچے جو
تخلیقی کوشش کریں گے اس میں ان کو نہ صرف جسم اور
دماغ کی ہم آہنگ تربیت کے موقع ملیں گے بلکہ مدرسے کی
ساری فضا میں اشتراک عمل اور عمرانی زندگی کے اصولوں کی
ر فرمائی ہوگی۔ بہت سی جدید تعلیمی تحریکیں مثلاً
ب میں دستکاری اور صنعت و حرفت کے عناصر کا شامل
نا؛ سائنس میں عملی کام کی اہمیت پر زور دینا؛ طلبہ
ں حکومت خود اختیاری کا اجرا ان سب میں یہ مقصد
مشترک ہے کہ طلبہ کو معاشری ضبط اور تربیت حاصل ہو
جو اخلاقی تربیت کی بنیاد ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مدرسے کے ماحول میں امداد باہمی
اور اشتراک عمل کے مواقع مہیا ہوں اور بچے مل جل کر
کھیلیں، کام کریں، رہیں سہیں، اور آپس میں ہمدردی
اور دوستی کا برتاؤ کریں لیکن ان کی یہ عادتیں اور صلاحیتیں
ایک مخصوص اور محدود ماحول کے ساتھ اس طرح وابستہ

درجہ ناقص ہوگئی ہے -

علم و اخلاق کی اس بحث سے مدرسے کی تنظیم کے متعلق کئی قابل قدر نتائج نکلتے ہیں - اگر ہم ان دونوں کے درمیان یہ رشتہ تسلیم کریں تو اس کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ مدرسے کو ایک عمرانی جماعت کی شکل میں مرتب کرنا چاہیے جس کے ہر شعبے میں معاشری اصول اور محرکات کی کارفرمائی ہو یعنی بچے ایسے مشاغل میں مصروف ہوں جو ایک دوسرے کی مدد سے تکمیل کو پہنچائے جائیں اور جن کی بدولت وہ معاشری معاملات کو سمجھنا اور اس میں دلچسپی لینا سیکھیں - وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں، کھیلیں، کودیں، کھائیں، پئیں اور مختلف قسم کی انجمنیں بنا کر فرصت کے اوقات میں اپنے اپنے پسندیدہ مشاغل سے لطف اور فائدہ اٹھائیں - اور اس طرح ان عمرانی اور اخلاقی اصولوں کی اہمیت اور مفہوم کو سمجھیں جن کا ذکر وہ کتابوں میں پڑھتے ہیں یا اُستادوں سے سنتے ہیں - اس تبدیلی سے مدرسے کا وہ پرانا مفہوم قائم نہیں رہے گا جس کے مطابق یہ محض ایک "جائے درس" سمجھا جاتا ہے جہاں بچے لکھنے پڑھنے آتے ہیں جس کو ان کی جبلتوں اور فطری دلچسپیوں اور بیرونی دنیا سے کوئی سروکار نہیں اس کے بجائے ہم مدرسے کو جیسا کہ ہم وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں، چھوٹے پیمانے پر جماعتی زندگی کا ایک نمونہ بنانا چاہتے ہیں جہاں طلبہ مشاہدات اور تجربات سے مالا مال اور راحت اور مسرت سے معمور زندگی بسر کریں جس میں ان کی مخصوص جبلتوں کو اظہار اور نشو و نما کا موقع ملے اور وہ اپنی ضروریات اور

کے کرسی پر بیٹھتا ہے یا بارش میں چھتری لے کر نکلتا ہے یا بیماری میں ڈاکٹر سے مشورہ کرتا ہے یا ان ہزاروں کاموں میں سے جو اس کا روزمرہ کا معمول ہیں کوئی کام کرتا ہے تو وہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ علم ایک خاص حالت کو پہنچ کر خود بخود عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے"۔ ۱

علم کی یہ خاص حالت اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان اس کو اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعے حاصل کرے اور وہ اس طرح اس کی طبیعت میں رچ بچ جائے کہ اس کو بھولنا یا اس کی طرف سے بے پروائی برتنا ممکن ہی نہ ہو بلکہ استعمال کے وقت اس کو شعوری طریقے پر سوچنے کی ضرورت بھی نہ پڑے - یہی اصول اخلاق پر، جو ہماری زندگی کی رہنمائی کرتا ہے، صادق آتا ہے اگرچہ اس کے حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے میں زیادہ مشکلات ہیں اور زیادہ عقلمندی کی ضرورت ہے - جب ہم خیر اور اخلاق کا مفہوم اور اپنے فرائض کی ادائگی کا سبق گھر کی عملی درس گاہ میں یا مدرسے کے منظم ماحول میں، یا بیرونی دنیا کی کشمکش میں سیکھتے ہیں اور خود ہمارے تجربات اور مشاہدات ہمارے معلم ہوتے ہیں تو یہ چیزیں ہمارے فلسفۂ زندگی کا جزو بن جاتی ہیں اور ہمارے محرکات عمل میں شامل ہو جاتی ہیں - یہاں علم و عمل، عقل و اِخلاق کی وہ تفریق مٹ جاتی ہے جس کی وجہ سے آج کل ہمارے مدرسوں کی تعلیم اس

۱- Democracy and Education صفحہ ۴۱۲ -

ہدایتیں جبراً ان پر عائد کی جاتی ہیں جن کو وہ بغیر سمجھے بوجھے محض خوف کی وجہ سے قبول کرلیتے ہیں - اس حالت میں بھی ان کے عمل کی ذمہ‌داری دوسرے لوگوں پر ہے - جب کبھی رائے عامہ کا دباو یا اُستاد کا اندیشہ دور ہوجاتا ہے تو اس کا اثر بہت خراب پڑتا ہے یعنی انسان کا اخلاقی توازن بالکل بگڑ جاتا ہے - چونکہ خود اس کے نفس میں کسی قسم کا اخلاقی ضبط نہیں ہوتا اور بیرونی اثرات جو اس کو ایک حد تک روکے ہوئے تھے ہٹ جاتے ہیں اس لیے وہ موقع پاتے ہی کھل کھیلتا ہے اور اخلاقی اصول اور قوانین کو پس پشت ڈال کر اپنی خواہشات اور خارجی تحریصات کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے - اس کے علم اور اخلاق کے درمیان کوئی ایسا مضبوط اور مستحکم رابطہ قائم نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذاتی ہدایت کی ذمہ‌داری اپنے سر لے سکے - یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مدرسے کے تعلیمی نظام کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ وہاں بچے جو کچھ سیکھیں، جو علم حاصل کریں اس کا اثر براہ راست ان کے طرز عمل پر پڑے - شوق اس کا محرک ہو اور تجربہ اور مشاہدہ اس کی بنیاد، اور اس طرح وہ عقیدے کی سی پختگی حاصل کرے اور خود بخود ہماری طبیعت میں اور ہمارے کاموں میں ظاہر ہو- روزمرہ کی زندگی میں ہم ہر وقت اس علم کو استعمال کرتے ہیں جو اس درجہ ہماری طبیعت اور سیرت کا جزو ہوگیا ہے کہ اسے نظرانداز کرنے کا خیال بھی ہمیں کبھی نہیں آسکتا - اس کی مثالیں ہر وقت ہمارے سامنے ہیں -

"جب کبھی کوئی شخص بجائے جلتے ہوئے چولھے پر بیٹھنے

ہونے کے برابر ہو ۔ مدرسے کے طلبہ جو باتیں کتابوں میں پڑھ کر یا استادوں سے سن کر یاد کرلیتے ہیں ان کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے، اور اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتا، کہ وہ ضرورت کے وقت ان باتوں کو دہرا دیں ۔ ان کی وجہ سے ان کی روزمرہ کی زندگی میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوسکتا ۔ علم کا یہ مفہوم صریحاً بہت ناقص اور محدود ہے اور اُستاد کو ہرگز اس قسم کا علم سکھانے پر قناعت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ ہرگز یہ توقع نہیں رکھ سکتا ہے کہ اس "علم" کو اخلاقی تربیت میں ذرا بھی دخل ہوگا ۔ تعجب یہ ہے کہ ایک طرف ہم تعمیر سیرت کو تعلیم کا اعلیٰ‌ترین مقصد قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف تعلیم کے عقلی پہلو کو جس میں مدرسے کا بیشتر وقت صرف ہوتا ہے ہم نے ایسے غلط اصولوں پر مبنی کیا ہے کہ اس سے اُس مقصد اعلیٰ کی تکمیل میں کوئی مدد ملتی ۔ اس دوئی کی وجہ سے اخلاقی تعلیم بالکل بےمعنی اور بےاثر ہو کر رہ جاتی ہے ۔ مدرسے کا معمول اپنی بندھی ٹکی چال‌چلتا رہتا ہے اور اس کو اخلاقی تربیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ البتہ بعض خاص موقعوں پر اُستاد اپنے طلبہ کو اخلاق اور فرائض کے متعلق چند باتیں بتا دیتے ہیں جن کو وہ کم و بیش بددلی کے ساتھ سنتے ہیں اور ضرورت ہو تو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں وہ اُستادوں یا بزرگوں یا معاشرے کی خاطر ان باتوں پر ایک حد تک عمل بھی کریں ۔ لیکن اس عمل کا محرک ان کی عقل یا ان کا ذاتی تجربہ نہیں ہوتا بلکہ ایک خارجی اثر ہوتا ہے ۔ کبھی صورت حال اس سے بھی بد تر ہوجاتی ہے یعنی اخلاقی

پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اخلاق کے نظریوں سے بحث کرتے ہوئے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ "علم" سے سقراط کی مراد سطحی واقفیت نہیں جو دوسروں کی وساطت حاصل ہو اور ذہن پر محض ایک بار ہو کر رہ جائے - اس کی رائے میں "نظری طور پر خیر کا مفہوم سمجھنا (یعنی اس کا حقیقی علم حاصل کرنا) اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان سالہا سال ضبط نفس اور عمل کی منزلوں میں سے نہ گزر چکا ہو - خیر کا علم ایسی چیز نہیں جو کتابوں سے یا دوسرے لوگوں سے ہاتھ آسکے - وہ طویل اور مسلسل تربیت کے بعد نصیب ہوتا ہے اور زندگی کے پختہ کارانہ تجربات کا ماحصل ہے" ۱ے

بات یہ ہے کہ "علم" کا ایک لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے - اس کے ایک معنی تو وہ ہیں جو افلاطون کے پیش نظر تھے - یعنی وہ مضبوط اور راسخ عقیدہ جو ذاتی تجربے اور تنقید کے بعد حاصل ہو اور انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے - یہ علم کا حقیقی اور گہرا مفہوم ہے - دوسرے معنی وہ ہیں جو بالعموم لوگوں میں اور بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں بھی رائج ہیں یعنی وہ سطحی واقفیت جو دوسروں کے واسطے سے حاصل ہوجائے' جس میں ہمیں ذاتی کاوش نہ کرنی پڑے اور ہمارے ذاتی تجربے اور مشاہدے کو دخل نہ ہو - اگر علم سے ہماری مراد یہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا اثر ہماری سیرت اور ہمارے طرز عمل پر یا تو بالکل نہ ہوگا یا اتنا کم کہ نہ

۱- Democracy and Eductaion صفحہ ۴۱۲ -

زندگی میں جدت اور تنوع کی کارفرمائی ہے - اس میں آئے دن نئے مسائل اور نئے مواقع پیش آتے رہتے ہیں - یہاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کسی ایک معمول کا دہراتے رہنا ہرگز کافی نہیں ہو سکتا - اسی لیے اور بھی عقل کی ضرورت ہے کہ وہ نئی گتھی کو سلجھاتی رہے - اگر ہمارے مشین نما "نیک آدمی" کو کوئی ایسا نیا موقع پیش آجائے جہاں وہ اپنے مقررہ طریقۂ عمل کو کام میں نہ لاسکے تو وہ بالکل بےبس ہو کر رہ جائے گا اور ممکن ہے وہ کوئی بہت خطرناک غلطی کر بیٹھے - اسی لیے کہا گیا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے -

علم اور اخلاق کے اس لازمی رشتے پر جس کا ہم نے ذکر کیا ہے ایک اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے - کہا جاتا ہے کہ علم بجائے خود حسن عمل کے لیے کافی نہیں- تجربہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں بات اچھی ہے اور فلاں بات بری ہے - لیکن وہ اس علم پر عمل نہیں کرتے اور اچھی باتوں کو چھوڑ کر بری باتوں کی طرف راغب ہوتے ہیں - لہذا ان کو "جاننے" سے کیا فائدہ ؟ یہ وہی اعتراض ہے جو ارسطو نے سقراط کے اس مشہور قول پر کیا تھا کہ علم "اور خیر ایک ہی چیز ہے اور کوئی شخص جان بوجھ کر شر کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ انجان پن کی وجہ سے ایسا کرتا ہے - بادی النظر میں سقراط کا یہ خیال بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم آئے دن یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ باوجود خیر کا علم ہونے کے شر کے مرتکب ہوتے ہیں - لیکن یہ اعتراض دراصل علم کے غلط مفہوم پر مبنی ہے -

ہم نے انسانی شخصیت کی تہ میں جس وحدت کو کارفرما تسلیم کیا ہے اس کے لحاظ سے ہم اس تضاد کو صحیح نہیں سمجھ سکتے - اگر بالفرض ہم اس "بےوقوف لیکن نیک" شخص کی نیک نیتی کے معترف بھی ہوں تب بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ایسا آدمی اپنے نیک ارادوں کو عمل میں نہیں لا سکتا کیونکہ ارادے کو فعل میں لانے کے لیے عقل اور علم درکار ہیں جو اس میں موجود نہیں - اول تو اس کے لیے یہی بہت مشکل ہے کہ زندگی کے پیچ در پیچ معاملات میں صحیح رائے قائم کر سکے اور سمجھ سکے کہ کس موقع پر کون سا طریق عمل نیک اور "اخلاق" کے مطابق ہے اور کون سا اس کے منافی - دوسرے اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیں کہ کسی خاص موقع پر وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے تو اس میں وہ مصلحت بینی' دور اندیشی اور مشکلات کو حسن تدبیر سے دور کرنے کی قابلیت کہاں سے آئے گی جو اخلاقی فعال کے لیے ناگریز ہے - اس لیے جس شخص کے افعال و اعمال علم و عقل کی ہدایت سے محروم ہوں گے وہ صحیح معنی میں اخلاقی زندگی بسر نہیں کر سکتا - یہ ممکن ہے کہ وہ ایک مشین کے پرزے کی طرح دوسروں کے اشارے پر چلے ان کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرے اور اس کے ہاتھ سے "اچھے" کام عمل میں آئیں لیکن اس قسم کے افعال کی وہ اخلاقی قدر نہیں ہو سکتی جو ایک سمجھ دار اور معاملہ فہم آدمی کے کاموں کی ہوتی ہے جس کے دل میں ذمہ‌داری کا احساس ہے اور جس کے اعمال کي محرک اس کی اپنی تربیت یافتہ ذات ہے - علاوہ بریں

ہے بلکہ اس کے جسم اور دماغ اور عادات سب کی نشو و نما ایسی ہم آہنگی کے ساتھ کرنی چاہیے کہ وہ اس کی زندگی کے انتہائی اخلاقی مقصد میں معین ہوں - اس لحاظ سے ایک طالب علم کو تاریخ ' ادب یا سائنس کی مناسب تعلیم دینا ' اس کی طبیعت میں فنون لطیفہ کا ذوق پیدا کرنا ؛ اسے علمی تحقیقات اور اختراع کا شوق دلانا اور اس کے طریقے سکھانا ' مادری زبان یا غیر زبانیں پڑھانا جن کے ذریعے سے وہ لوگوں کے خیالات اور جذبات خود سمجھ سکے اور اپنے خیالات دوسروں کو سمجھا سکے ' اس کی جسمانی نگہداشت کا اہتمام کرنا ' اس کے آنکھ اور ہاتھ کی اس طرح تربیت کرنا کہ وہ اپنے اندرونی جذبات اور میلانات کو کسی مرئی شکل میں ظاہر کر سکے ' اس کو محنت ' کوشش اور امداد باہمی کی عادتیں سکھانا ' یہ سب وسیع معنی میں اخلاقی تربیت کے اجزا ہیں بشرطیکہ بچہ ان تمام صلاحیتوں کو اس طرح استعمال کرے کہ ان سے نہ صرف اس کی ذات کو فائدہ پہنچے بلکہ عمرانی مقاصد میں بھی امداد ملے - اگر مدرسہ اپنے ہر کام میں اخلاقی مقصد کو مقدم رکھے گا تو وہ طلبہ کی شخصیت کو مستقل طور پر جیسا چاہیے متاثر کر سکے گا -

---

طرح ظاہر نہ ہوں - اس لیے اس کی شخصیت کی مکمل، متناسب اور ہم آہنگ تربیت اس وقت ہو سکتی ہے جب اس کے ماحول کے تمام اثرات کا رجحان ایک ہی ہو، جب مدرسہ اور گھر دونوں اس کو ایک ہی معیار اخلاق کے مطابق تعلیم دیں اور تعلیمی زندگی کا ہر پہلو، مطالعہ، کھیل، نصاب تعلیم، ضبط و تادیب اپنی اپنی جگہ پر اس کی سیرت کی صحیح تشکیل میں حصہ لے - مدرسے کے اس مجموعی نظام اور طلبہ کی معاشری زندگی کا اثر ان کی سیرت پر نہایت زبردست اور دیر پا ہوتا ہے - بشرطیکہ اس کے تمام عناصر یعنی استادوں کی سیرت اور شخصیت ان کا طرز تعلیم مدرسے کے تعلیمی مقاصد ان کی عام فضا یہ سب چیزیں بچوں کی اخلاقی تربیت میں مدد دیں اور ان کی ذہنی تعلیم ان کی روز مرہ کی زندگی کا جزو بنا دی جائے، اس سے اس طرح علحدہ نہ رکھی جائے جیسے اسے اخلاقی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں - ہم ابھی یہ بحث کریں گے کہ ان تمام عناصر کو اخلاقی تربیت میں کہاں تک دخل ہے - لیکن اس بحث کی ضرورت اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم اخلاق کے مذکورہ بالا مفہوم ذہن میں رکھیں - اخلاق کا اطلاق ان تمام کاموں اور باتوں پر ہوتا ہے جو ہم روز کرتے رہتے ہیں - جس طرح معاشری زندگی میں ایک بالغ آدمی کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں - اسی طرح مدرسے میں بچے کی مختلف حیثیتیں ہیں - اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ ان تمام حیثیتوں میں اپنے فرائض کو عمدگی کے ساتھ اصول اخلاق کے مطابق ادا کرے تو نہ صرف اس کے جذبات کی تربیت ضروری

میں اور مدرسے میں بچہ ایسے کاموں میں مشغول رہے جو اخلاقی اور عمرانی اہمیت رکھتے ہوں - نہ تیرنا ہوا میں تیراکی کے کرتب دکھانے اور اس کے گر یاد کرنے سے آتا ہے نہ اخلاقی سیرت کی تکمیل اس زبانی اور نظری تعلیم سے ہو سکتی ہے - جو طلبہ کی روز مرہ کی زندگی سے بالکل بےتعلق اور بےربط ہو - "مدرسہ اس وقت تک طلبہ کو معاشری زندگی کے لیے تیار نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنے گرد و پیش کے خاص خاص اہم‌ترین معاشری حالات کا نمونہ اپنے اندر مہیا نہ کر لے" کیونکہ کسی کام کے لیے تیاری کا موثر ذریعہ یہی ہے کہ اس کام میں عملاً شرکت کی جائے - اس لیے مدرسۂ جدید کا تمام نظام اس طرح مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے طلبہ کے محرکات عمل معاشری ہوں اور ان کے پڑھنے' لکھنے' کھیلنے' کودنے غرض تمام مشاغل میں امداد باہمی اور اشتراک عمل کا وہی اصول کارفرما ہو جس پر تمدنی زندگی کا دارومدار ہے -

ہم اس بات پر بار بار زور دے چکے ہیں کہ تعلیم کے ہر شعبے میں ہمیں اس وحدت کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو طلبہ کے نفس کی خصوصیت ہے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے مربوط اور سابقہ رکھتی ہے - ہم ان کی شخصیت کو عملاً دماغی' جسمانی' معاشری اور اخلاقی شعبوں میں تقسیم نہیں کر سکتے - وہ ہر کام اور ہر بات میں اپنی پوری شخصیت کا اظہار کرتا ہے گو، یہ ممکن ہے کہ ایک خاص وقت میں اس کا کوئی ایک پہلو. مثلاً عقلی یا اخلاقی پہلو زیادہ نمایاں ہو اور باقی سب پوری

بڑھی ہوئی خواہش کو جس کا آج کل دور دورہ ہے۔ اس لیے کہ جیسا ہم کتاب کے آغاز ہی میں بتا چکے ہیں مدرسے معاشرے کا ایک چھوٹا سا نمونہ تو ضرور ہے لیکن ایک عمدہ اور منتخب نمونہ ہے۔ لہذا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو بہترین معاشری حالات بیرونی دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ مدرسے میں پیدا کریں۔ اگر ہمارے مدرسے زندگی کی کشمکش اور اس کے رسم و آئین سے بےتعلق اور ناواقف رہیں گے، جیسے وہ آج کل بالعموم رہتے ہیں، تو نہ ان میں بچوں کی مکمل ذہنی تربیت ہو سکے گی نہ اخلاقی۔ ان کے پیش نظر جو مقاصد ہیں ان کا مطلب اور مفہوم واضح نہیں ہو سکے گا کیونکہ بچوں میں ہم جن قوتوں کو نشو و نما دینا چاہتے ہیں ان کو آئندہ معاشری زندگی کے مختلف شعبوں میں استعمال ہونا ہے۔ اگر ان قوتوں کی نشو و نما ایک مصنوعی ماحول میں ہو اور ان میں اور زندگی کے واقعی مشاغل میں ربط نہ پیدا کیا جائے تو ہم کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ مدرسے کی تربیت اس کے باہر بھی کام آئے گی؟ اس لیے مدرسے کے مشاغل کی اخلاقی قدر کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں معاشرے کے مشاغل کو معیار قرار دینا چاہیے۔ اور انہیں کو پیش نظر رکھ کر نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کا تعین کرنا چاہیے۔ یعنی مدرسے کو ایک زندہ معاشری ادارہ بنانا چاہیے جس میں مفید عادتیں اور رجحانات تربیت پائیں جس طرح تیرنا سیکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ آدمی پانی میں کود پڑے اور ہاتھ پاؤں مارے اسی طرح اخلاقی سیرت کی تعمیر بھی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ گھر

تربیت یافتہ صلاحیتیں جو معاشری اغراض و مقاصد کے
حاصل کرنے میں استعمال ہو سکیں" - [1] . . .

لیکن مدرسے کو اثرآفریں اخلاقی ماحول بنانے کے لیے ایک شرط نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا اور بیرونی دنیا کا تعلق برابر قائم رہے تاکہ وہ ایک قدرتی ماحول کی شکل اختیار کرے نہ کہ ایک بالکل مصنوعی ماحول کی جس میں بچے گرم خانے کے پودوں کی طرح نشو و نما پائیں - مدرسہ ایک ادارہ ہے جس کو معاشرے نے اپنی حیات اجتماعی کی بقا اور ترقی کے لیے قائم کیا ہے تاکہ جن اصولوں اور قدروں کو وہ عزیز رکھتی ہے اور اہم سمجھتی ہے وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کی جائیں - اسی وجہ سے مدرسے پر بہت بڑی اخلاقی ذمہ‌داری عائد ہوتی ہے - جس سے وہ اس وقت تک عہدہ‌برآ نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اندرونی تنظیم انہیں اصولوں کے ماتحت نہ ہو جو بیرونی دنیا میں کارفرما ہیں - اسے اپنے نوعمر طلبہ میں ایسے معاشری عادات اور جذبات پیدا کرنی چاہییں کہ جب وہ اس چھوٹے سے دائرے سے باہر نکل کر معاشرے کی زندگی کے وسیع میدان میں قدم رکھیں تو انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے ہیں - جہاں کے دستور و قوانین بالکل مختلف ہیں - اس سے یہ مراد نہیں کہ مدرسے میں معاشری زندگی کے خراب عناصر کو بھی جگہ دی جائے مثلاً افراد اور جماعتوں کی باہمی نزاع اور مسابقت کی حد سے

1- Educational Essays صفحہ ۴۷—۵۸ -

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے بعد ہمیں اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اخلاقی تربیت کا بہت بڑا حصہ معاشری زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور طلبہ کی تربیت اس طرح ہو سکتی ہے کہ وہ مدرسے کی معاشری زندگی، اس کی کشمکش اور جد و جہد میں پوری طرح حصہ لیں اور جو عملی مواقع وہاں بہم پہنچائے گئے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھائیں - جس تربیت کی بنیاد بچوں کے گوناگوں معاشری تجربات پر نہ رکھی جائے گی اس کا اثر بہت جلد زائل ہو جائے گا اور اس سے آئندہ زندگی کے معاملات میں کام لینا ممکن نہ ہوگا - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اخلاق اور معاشرت کے قریبی تعلق سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"اخلاقی تربیت کے متعلق ہمارے جو تصورات اب تک رہے ہیں وہ سب بہت تنگ اور محدود تھے اور ان کی بنا زیادہ‌تر رسم و دستور پر تھی اور ان کا تعلق محض معاشرت کی حالت مرض سے تھا - ہم نے اخلاق کے مفہوم کو چند مخصوص اعمال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے جن کو ہم "نیکیاں" کہتے ہیں اور انہیں باقی تمام مشاغل اور کاروبار سے بالکل علحدہ سمجھتے ہیں - یعنی اخلاقی اعمال، معاشری ماحول سے جدا کر کے دیکھے جاتے ہیں......حالانکہ درحقیقت انسانی زندگی میں سوائے اس کے اور کوئی اخلاقی محرکات اور اخلاقی قوتیں نہیں ہیں کہ انسان میں معاشری عقل ہو، یعنی معاشری معاملات اور حالات کا مشاہدہ کرنے اور ان کو سمجھنے کی قابلیت، اور معاشری قوت ہو، یعنی ضبط نفس کی

کے فرائض اور اخلاقی اصول اس کے متقاضی ہیں - نہ برے کاموں سے صرف اس وجہ سے پرہیز کرنا چاہیے کہ وہ معاشری اخلاق کے خلاف ہوں گے - مکمل اخلاق کا مقتضا یہ ہے کہ جب انسان بالکل تنہا ہو یعنی سوائے اپنی ذات یا اپنے ضمیر کے اس کا کوئی نگراں نہ ہو اس وقت بھی اس کے خیالات اور جذبات میں پاکیزگی پائی جائے اور وہ خیال میں بھی برے افعال کا مرتکب نہ ہو - وہ اس بات کو محسوس کرے کہ ایمان، دیانتداری، راستی اور پاکبازی نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ ان کی وجہ سے معاشری کار و بار اچھی طرح چلتے ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کے بغیر وہ اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتا اور عزت نفس کو برقرار نہیں رکھ سکتا - اس طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے خالق کے ساتھ محبت اور عبودیت کے وہ جذبات رکھے جو اس کی مختصر اور بظاہر بے معنی زندگی کو ابدی اور روحانی قدروں سے وابستہ کرتے ہیں اور اس کا رشتہ سرچشمۂ حیات سے جوڑتے ہیں، اگرچہ ان کا اثر براہ راست معاشری تعلقات پر نہیں پڑتا اور نہ ان کی جڑ معاشری زندگی میں تلاش کی جا سکتی ہے - یہ وہ مقام ہے جہاں اخلاق اور مذہب کی حدیں آکر مل جاتی ہیں اور انسان اپنے اعمال اور خیالات کا محاسبہ محض معاشری اخلاق کی بنا پر نہیں کرتا بلکہ احترام ذات اور قانون الٰہی کو اپنا رہبر بنا کر ان کی اصلاح کرتا ہے اور جہاں انسانی قانون کا دسترس نہیں وہاں بھی اپنے آپ کو ایک اعلیٰ‌تر قانون کا پابند جانتا ہے -

دوسرے حقوق العباد یعنی وہ حقوق جو ہمارے ابنائے جنس کو ہم پر حاصل ہیں اور جن کی وجہ سے تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھ ایک رشتہ میں مربوط ہیں - تیسرے حقوق النفس یعنی وہ حقوق جو خود ہمارے نفس کو ہم پر حاصل ہیں - انسان کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ تینوں قسم کے حقوق کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرے - وہ لوگ جو اخلاقی تربیت کو معاشری تربیت کا مرادف قرار دیتے ہیں محض حقوق العباد پر زور دیتے ہیں باقی دونوں قسموں کے حقوق کی پوری اہمیت تسلیم نہیں کرتے - ممکن ہے کہ نظری طور پر فلسفہ ان تینوں کو ایک ثابت کر دے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ یہ تمام حقوق و فرائض ایک دوسرے سے وابستہ اور مربوط ہیں، بالکل علحدہ اور بےتعلق نہیں - لیکن عمل کے اعتبار سے ان کی نوعیت میں فرق ہے - کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص اپنے معاشری فرائض ادا کرتا ہو لیکن حقوق اللہ اور حقوق نفس کی طرف سے بالکل غافل ہو؟ مثلاً وہ معاشری خدمت انجام دے، ہمسایوں اور شہر والوں کے حقوق ادا کرے - لیکن ان قدروں سے بےاعتنائی برتے جن کا حامل مذہب ہے - یا وہ اپنی جسمانی صحت اور تہذیب نفس کی مطلق پروا نہ کرے اور اسے اس کا احساس نہ ہو کہ خود اس کی ذات میں اعلیٰ درجے کی صلاحیتیں موجود ہیں جن کو قوت سے فعل میں لانا اس کا فرض ہے - علاوہ بریں جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اخلاق کی تکمیل کے لیے محض معاشری محرکات اور موانعات کافی نہیں یعنی کسی شخص کو اچھے کام محض اس لیے نہیں کرنے چاہییں کہ معاشرے

اور خلوص کو قائم رکھے - جہاں کہیں منصوبی طریقہ (Project Method) استعمال کیا گیا ہے وہاں بھی یہی تجربہ ہوا ہے کہ اس سے نہ صرف ذہنی بیداری اور قوت اجتہاد پیدا ہوتی ہے بلکہ شخصی ذمہ‌داری اور امداد باہمی کا احساس بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے جو اخلاقی سیرت کی تکمیل کے لیے بہت ضروری ہے - لہذا معلوم ہوا کہ اخلاقی تربیت کا سب سے موثر اور اہم وسیلہ یہ ہے کہ مدرسے کی معاشری زندگی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ طلبہ عملاً ان تجربوں کو حاصل کریں جن پر اخلاق کا انحصار ہے -

بعض ماہرین تعلیم بالخصوص امریکا کے تعلیمی مفکرین کا خیال ہے کہ اخلاقی اور معاشری تربیت بالکل ہم معنی ہیں اور ان دونوں کے حدود ایک ہی ہیں - یعنی اگر ہم کسی شخص کو معاشری زندگی کے تمام فرائض سکھا دیں اور اسے ان کی ادائگی کے لیے تیار کر دیں تو اس کی اخلاقی تربیت بھی مکمل ہو جائے گی - ہمیں اس نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق نہیں - یہ مانا کہ اخلاقی تربیت کا ایک بہت بڑا حصہ ان حقوق و فرائض پر مشتمل ہے جو معاشری زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اخلاق کا دائرہ ان تعلقات کی حدود سے بھی زیادہ وسیع ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں - مشرق کے معلمین اخلاق نے ان حقوق کو جو کسی فرد پر عائد ہوتے ہیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے - اول حقوق اللّٰہ یعنی وہ حقوق جو خالق کو اپنے بندوں پر حاصل ہیں اور جن کو پہچانے اور ادا کیے بغیر انسان اپنی پوری حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا -

اکثر بڑے بڑے کام کر جاتا ہے اور عارضی اور وقتی تحریصات پر غالب آجاتا ہے اس لیے موجودہ زمانے کے اکثر ماہرین تعلیم اس امر پر متفق ہیں کہ مدرسے کو ایک خوشگوار ماحول اور خوش اسلوب جماعت کی شکل میں مرتب کرنا چاہیے جس میں حقوق اور فرائض کی باقاعدہ تقسیم ہو ' جس کو تمام اراکین جماعت خوشی کے ساتھ قبول کریں ' اور جماعتی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے فرائض محنت اور شوق سے ادا کریں اور اپنے حقوق سے جائز طور پر فائدہ اٹھائیں - اس طرح وہ قدرتی طور پر اخلاقی مسائل اور مشکلات سے دوچار ہوں گے اور خود بخود ان کو حل کرنے کی کوشش کریں گے - ان کی کامیابی اور ناکامی ان کے لیے معلم کا کام دے گی اور وہ ایک مصروف ' عملی زندگی کے دوران میں بعض اہم‌ترین اخلاقی اصول سیکھ لیں گے - بہت سے جدید تعلیمی تجربے مثلاً مس ہیلن پارکھرسٹ ' (Helen Parkhurst) کا طریقہ ڈالٹن (Dalton Plan) اور میڈم منٹسوری (Montessori) کے مدرسے اسی اصول پر قائم ہیں کہ طلبہ میں احساس ' فرض اور انفرادی اور اجتماعی قوت عمل اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انہیں ابتدا ہی سے چھوٹے چھوٹے فرائض کی بجاآوری کی عادت ڈالی جائے جن کو وہ اپنی مرضی اور خوشی سے بغیر بیرونی مداخلت کے انجام دے سکیں - جن مدرسوں میں تقسیم فرائض کا یہ تجربہ کیا گیا ہے وہاں ثابت ہوا ہے کہ اس طرح طلبہ میں نہایت مفید اخلاقی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو انہیں عمر بھر کام دیتی ہیں بشرطیکہ معلم اپنی مثال اور شخصیت کے اثر سے ان میں جوش

اور وسائل مہیا کرنے چاہییں جن میں اخلاقی اصول و قوانین کی ضرورت پڑے اور نوعمر طالب علم بعض صورتوں میں ان کو نظری طور پر سمجھنے سے پہلے ہی ان پر عمل کرنے لگیں اور اس طرح ان میں اخلاقی عادتیں پختہ ہو جائیں - بعض ماہرین تعلیم اور ارباب فکر کا یہ خیال ہے کہ بچوں کی مطلق کوئی عادتیں ڈالنی ہی نہیں چاہییں - چنانچہ روسو (Rousseau) کا یہ مقولہ بہت مشہور ہے کہ :—

" امیل (Emile) صرف یہ عادت ڈالنی چاہیے کہ وہ کوئی عادت نہ ڈالے "۔

لیکن یہ خیال جو در اصل بعض خاص حالات کے خلاف رد عمل کے طور پر پیدا ہوا تھا ، غلط ہے اور نفسیات اطفال کا علم اس کی تائید نہیں کرتا - بچوں کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ اوائل عمر ہی میں مفید اور عمدہ عادتیں سیکھیں جو آئندہ چل کر ان کے لیے سہولیت کا باعث ہوں - اس معاملے میں مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمز (William James) کی رائے زیادہ صائب ہے - وہ کہتا ہے کہ عمدہ عادتوں کو بطور ایک سرمائے کے سمجھنا چاہیے - کہ جب ہم لمے جمع کر لیتے ہیں تو اس کا سود ہمیں عمر بھر ملتا رہتا ہے[1] ان عادتوں کی وجہ سے انسان اپنے روزمرہ کے معمول اور معینہ فرائض کو بغیر کسی دقت یا تامل کے پورا کرلیتا ہے اور جب کوئی نازک یا کٹھن موقع آ پڑتا ہے تو وہ ان عادتوں کے بل پر

۱—دیکھو اس کی مشہور تعلیمی تصنیف " Talks to Teachers " معلموں سے دو دو باتیں ۔

اسی صورت میں حاصل ہوگی جب بچوں کی خانگی اور مدرسے کی زندگی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ انہیں ہر روز امداد باھمی مبادلۂ خیالات اور تجربات میں شرکت کے مواقع ملیں اور عملاً ان کے دل میں اس جماعت یا گروہ کے ساتھ وفاداری کا احساس پیدا ہو جس کے وہ رکن ھیں اور جس کی رکنیت کی وجہ سے انہیں بہت سے حقوق اور اختیارات حاصل ہوتے ھیں - اگر ابتدائی زندگی میں انہیں مسلسل اس قسم کے واقعی تجربے حاصل ہوں گے تو جب وہ آئندہ بڑی جماعتوں کے رکن بنیں گے تو وہ قومیت اور شہریت کا صحیح مفہوم سمجھیں گے اور اس رشتے کی اھمیت کو پہچانیں گے جو فرد اور جماعت میں ربط پیدا کرتا ھے کیونکہ وہ دیکھ چکے ہوں گے کہ ان کی اپنی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی کامیابی اور قیام کے لیے ایسے ھی تعلقات کی ضرورت ھے - علاوہ بریں وہ ذہنی اور جسمانی عادتیں جو اس اجتماعی زندگی کے بسر کرنے سے قائم ہونگی آگے چل کر بہت کام آئیں گی اور ان کے راستے میں یہ رکاوٹ حائل نہ ہوگی جو عام طور پر پیش آتی ھے کہ ''دل تو آمادہ ھے لیکن جسم میں سکت نہیں''۔

اس مثال سے ایک اور اھم تعلیمی نتیجہ نکلتا ھے اور وہ یہ ھے کہ بچوں کو ایسے اخلاقی اصول اور قوانین نہیں بتانے چاھییں جن کی ضرورت انہیں ابھی اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوئی اور جن کا تعلق اُن حالات اور مواقع سے ھے جن سے بچوں کو سابقہ نہیں پڑا - بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ھیں کہ اگر مدرسے کو ایک اثر آفریں اخلاقی ماحول بنانا مقصود ھے تو اس میں بچوں کے لیے ایسی عملی مواقع

اس کی توضیح ایک مثال سے ہوسکتی ہے - فرض کیجیے آپ بحیثیت ایک معلم کے یہ سمجھتے ہیں کہ ایک نوجوان طالب علم کو وطن کی محبت اور وفاداری کا سبق سکھائیں اور یہ اصول اس کے ذہن‌نشین کریں کہ باہمی ہمدردی اور اشتراک عمل کے بغیر کسی قوم کا کام اچھی طرح نہیں چل سکتا - اس کا ایک پرانا اور مروجہ اصول تو یہ ہے کہ آپ اس موضوع پر لکچر دیں اور نظری طور پر یہ ثابت کر دکھائیں کہ محبت اور ہمدردی نہایت ضروری صفات ہیں جن کا اظہار ہر فرد کے عمل میں اور افراد کے باہمی تعلقات میں ہونا چاہیے - اگر طالب علم کی ذہنی نشو و نما اس حد تک ہو چکی ہے کہ وہ اس بحث اور ان دلائل کو سمجھ سکتا ہے تو ممکن ہے یہ باتیں اس پر اثر کریں اور وہ اس اصول پر عمل کرنے کی کوشش کرے - لیکن اس کوشش میں کامیابی بہت مشکل ہے - اول تو جب تک اس میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ان مطالب کی تعبیر اپنی ذہنی اور عملی زندگی میں کر سکے وہ ان کی پوری اہمیت کو سمجھ ہی نہیں سکتا - یعنی اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوم اور ملک اور اشتراک عمل وغیرہ کا تصور کرنے کے لیے اپنے گھر اور مدرسے کی زندگی اور اس کے مشاغل اور تعلقات کو پیش نظر رکھے - اور ان چیزوں کے اندر سے ان تصورات کی جھلک دکھائی دے - علاوہ بریں یہ اشتراک عمل کا اصول اس وقت تک اس کی عملی زندگی پر محیط نہیں ہوگا جب تک اسے بچپن اور جوانی کے زمانے میں چھوٹے پیمانے پر اس پر عمل کرنے کا موقع نہ ملے - لہذا مندرجۂ بالا مثال میں معلم کو پوری کامیابی

ڈھال دیں۔ یعنی اگر ہم کسی بچے کو اخلاق اور نیکی اور راست‌بازی کے متعلق چند باتیں بتادیں یا ایمانداری، سچائی، ہمدردی کی خوبیاں اس کے ذہن نشین کردیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خود بخود بااخلاق نیک اور راست‌باز بن جائے گا۔ یہ صفات اس کی سیرت کا جزو صرف اس صورت میں ہوسکتی ہیں جب اس کو روزمرہ کی زندگی میں اس کی مشق کرائی جائے کہ وہ بے‌ایمانی سے پرہیز کرے اور ایمان‌داری سے کام لے۔ جھوٹ سے بچے اور سچ بولے۔ اپنے دوستوں اور عزیزوں اور ضرورت‌مندوں کے ساتھ ہمدردی کرے اور کسی کا دل نہ دکھائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ذہنی تربیت کی طرح اخلاقی تربیت میں ذاتی اور بلاواسطہ تجربے اور اعادے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اخلاق کے دائرے میں بہت کم چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم محض دوسروں کے تجربے سے سیکھ سکتے ہیں۔ یہاں قدم قدم پر خود محسوس کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ بے شک والدین، اُستاد اور معاشرے کے دوسرے افراد بچوں اور نوجوانوں کو مختلف طریقوں سے اپنے تجربوں کے نتائج سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب انہیں خود سبق‌آموز اخلاقی تجربے حاصل نہ ہوں وہ ان کی نصیحتوں اور مشوروں کے معنی سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ سچ ہے کہ وہ ہر قسم کے تجربے خود حاصل نہیں کرسکتے لیکن کسی اخلاقی اصول کی تہ تک پہنچنے کے لیے اُنہیں اس نوعیت کے کچھ نہ کچھ تجربے ضرور ہونے چاہییں تاکہ وہ ان کی بنا پر دوسروں کے تجربوں اور ان کے بتائے ہوئے اخلاقی اصولوں کو معنی پہنا سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں۔

حفظان صحت سے کتنی ہی گہری اور وسیع واقفیت ہو۔ صحت کو قائم رکھنے کا علم یقیناً ضروری اور مفید ہے لیکن بجائے خود کافی نہیں جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے۔ یہی حال ذہنی تعلیم کا ہے۔ جب تک علم عمل کی کسوٹی پر نہ کسا جائے اور قوت سے فعل میں نہ آئے وہ ایک جسد بےجان ہے معلومات کا ایک جامد اور بےروح مجموعہ ہے۔ جس سے انسان مطلق فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اخلاقی تربیت پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ بلکہ اخلاق تو نام ہی عمل کا ہے۔ اس لیے یہاں یہ بات اور بھی زیادہ وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ بچوں کو بہترین اخلاقی اصول اور عقائد کا یاد کرا دینا اور سمجھا دینا اس بات کی ضمانت نہیں کہ وہ ان پر عمل بھی کریں گے۔ واقفیت اور سمجھ بجائے خود بہت اچھی چیزیں ہیں اور بالغ و راشد ہوجانے کے بعد انسان کو ہر کام سوچ سمجھ کر اس کی بھلائی برائی دیکھ بھال کر کرنا چاہیے ورنہ اس کی حالت بالکل ایک مشین کی سی ہوگی۔ لیکن محض واقفیت کافی نہیں۔ اس کے ساتھ قوت عمل کی بھی ضرورت ہے' جو مشق یا عادت اور جسم اور دماغ پر قابو حاصل کرنے سے پیدا ہوتی ہے' اور جوش جذبات کی بھی۔ جب تک یہ تینوں عناصر جمع نہ ہوں انسان ان طرح طرح کی ترغیبوں اور تحریصوں پر فتح نہیں پاسکتا جو اس کو راہ راست سے برگشتہ کر دیتی ہیں اور اس کی سیرت اخلاقی اصول و اقدار کے مطابق تشکیل نہیں پاسکتی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ خیالات میں بجائے خود یہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ افعال کو اخلاق کے سانچے میں

باب دوم

اخلاق اور عمل

اب اخلاقی تربیت کا مسئلہ بحیثیت مجموعی واضح ہوگیا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اخلاق کی حدود کس قدر وسیع ہیں اور ایک نوخیز شخصیت کو اخلاقی سیرت کی تحصیل و تکمیل میں کن منازل سے گزرنا پڑتا ہے - ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ ہے کہ مدرسوں میں اخلاقی تربیت کے کیا وسائل اور ذرائع موجود ہیں اور ان سے کس طرح کام لینا چاہیے - اس بحث کے آغاز ہی میں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ اخلاقی سیرت محض زبانی تعلیم و تلقین کے ذریعے مستحکم نہیں ہو سکتی - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی قسم کی تعلیم و تربیت بھی جس کا انحصار لفظی تعلیم و تعلم پر ہو موثر اور کامیاب نہیں ہو سکتی - جسم کی تربیت کے متعلق تو یہ بالکل ایک بدیہی امر ہے کہ جب تک ہم ورزش نہ کریں اور جسمانی صحت کو قائم رکھنے کےلیے مختلف مناسب ذرائع اور وسائل اختیار نہ کریں جسمانی نشو و نما کا امکان ہی نہیں خواہ ہمیں علم

نظام اخلاق کی تنقید اور احتساب کر سکیں اور ان تمام رسوم اور قوانین کے خلاف بغاوت کریں جو ان کے نزدیک افراد اور معاشرے کے لیے مضر اور انسانیت کے منافی ہیں اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم دنیا کے مختلف معاشروں کے نام لے کر یہ بتائیں کہ وہاں ایسے لوگوں کی کس قدر ضرورت ہے جو آزادی کے ساتھ اپنی عقل و ضمیر کے مطابق کام کریں اور لوگوں کی نکتہ‌چینی اور ملامت کی پروا نہ کریں - مثال کے طور پر اگر ہم اپنے ہی ملک کی حالت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی خرابیاں موجود ہیں اور اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہے - معاشرے میں عورتوں کا مرتبہ اور ان کی تعلیم' امیروں غریبوں کے باہمی تعلقات' محنت اور محنت کرنے والوں کے ساتھ تعلیم یافتہ طبقے کا رویہ' دولت کا بےجا استعمال' کاروباری دیانت کی کمی' تعصبات اور توہم پرستی' غرض ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو ہمارے قوم کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں - جب تک نئی تعلیم یافتہ نسلوں میں اتنی اخلاقی جرأت نہ ہو کہ وہ ان خرابیوں کے خلاف جہاد کریں اور لوگوں کی مخالفت اور ہنسی کو خاطر میں نہ لائیں عمرانی اصلاح ممکن نہیں - اس وجہ سے معلم کا ایک نہایت اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں اخلاقی جرأت پیدا کرے -

خواہ اسے اس فرض کی ادائگی میں اپنی جان جوکھم میں ڈالنا پڑے ۔ چنانچہ حضرت محمد نے ایسا ہی کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جنگجو قبیلے ایک زبردست منظم اور بااخلاق قوم بن گئے ۔ ان تمام مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص جو کسی قوم کے لیے مصلح بن کر آتا ہے محض مروجہ اخلاق کی اشاعت پر قناعت نہیں کر سکتا ۔

اس سے کم درجے پر یہی فرض ہر معلم پر عائد ہوتا ہے ۔ اس کو چاہیے کہ طلبہ میں ایسی صلاحیت پیدا کرے کہ وہ ضرورت کے وقت معاشرے کی قیود اور بندشوں سے آزاد ہو کر رائے عامہ کے خلاف ایسے کام کر سکیں جو ان کے نزدیک صحیح ہوں ۔ یہ سچ ہے کہ عام لوگوں کو ایسے مواقع آئے دن پیش نہیں آتے اور ممکن ہے بعض کو کبھی ایسا موقع پیش ہی نہ آئے لیکن یہ اخلاقی جرأت انسانی سیرت کا اعلیٰ زیور ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص انسانیت کی انتہائی بلندی پر نہیں پہنچ سکتا ۔ مندرجہ بالا مثالیں ایسے زمانوں کی ہیں جن میں معاشرے کی اخلاقی حالت خاص طور پر خراب ہو گئی تھی لیکن جو فرض وہاں ان مصلحین اعظم کا تھا وہ آج کل بھی ہر ملک اور قوم میں معلموں اور مصلحوں پر عائد ہوتا ہے ۔ دنیا میں کوئی معاشرہ ایسا نہیں جس میں اصلاح کی گنجائش نہ ہو، جس میں ایسے ادارے اور رسوم و قوانین نہ پائے جائیں جو ہر ذی‌حس اور انصاف‌پسند آدمی کے نزدیک قابل اعتراض ہیں ۔ لہذا ہر جماعت مین ایسے دل و دماغ کے لوگوں کی ضرورت ہے جو اس کے

اسی طرح مہاتما بدھ نے اپنی سیدھی سادھی پاک صاف تعلیم ہندوستان میں پھیلائی اس وقت معاشرے کی اخلاقی حالت بہت خراب ہو چکی تھی - مذہب مہمل رسوم میں مبتلا ہو کر اپنی معنویت کھو چکا تھا اور لوگ ذات پات کی بندشوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ انسان کی بطور انسان کے نہ کوئی حیثیت تھی نہ حقوق - اس زمانے میں بدھ کی تعلیم بہت خطرناک معلوم ہوتی ہوگی اور کہنے والوں نے یقیناً یہ کہا ہوگا کہ اگر ایسے خیالات دنیا میں پھیل گئے تو نظام تمدن برباد ہو جائے گا - لیکن انہوں نے اپنے نور باطن کی ہدایت پر عمل کیا اور معاشرے کے اخلاق میں انقلاب کر دکھایا -

اسی قسم کے اثر کی سب سے زبردست مثال عرب میں حضرت محمد رسول اللّٰہ کی ذات میں نظر آتی ہے جنہوں نے بیس پچیس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی قوم کی کایا پلٹ دی جس کے اندر ہر قسم کی اخلاقی خرابیاں اور عیوب صدیوں سے رچ گئے تھے - اس کی حالت کا جیتا جاگتا نقشہ حالی نے اپنی مسدس میں کھینچا ہے- اس کی زندگی کا شائد ہی کوئی اصول یا عقیدہ ایسا ہو جو ناانصافی، بد دیانتی اور بد اخلاقی پر مبنی نہ ہو - جب اس قوم کے سامنے حضرت محمد نے اپنی پاک تعلیم پیش کی تو لوگوں کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا دین و مذہب، تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں اور انہوں نے انتہائی شدت کے ساتھ اس نئی تعلیم کی مخالفت کی - لیکن پیمبر اور مصلح کا کام ہی یہ ہے کہ مخالفتوں کا مقابلہ کرے اور لوگوں کو راہ دکھائے

ھے کہ افراد میں اپنے اور دوسروں کے اعمال کا محاسبہ کرنے کی قابلیت ھو اور وہ ھر مروجہ عقیدے اور اصول کو آنکھیں بند کر کے تسلیم نہ کر لیں - اگر افراد کے نفس سے یہ صلاحیت جاتی رھے اور معاشرے کی حالت بہت ابتر ھو تو اصلاح کی صرف ایک صورت ھے اور وہ یہ ھے کہ کوئی انقلاب آفریں شخصیت پیدا ھو جو دلیری سے کام کر کے موجودہ نظام کو تہ و بالا کردے اور لوگوں کو بہتر معیار اور اعلی تر قدروں سے روشناس کرے - تاریخ میں بارھا ایسا ھی ھوا ھے - حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے رومی سوسائٹی کی کیا حالت تھی ؟ سب لوگ دولت پرستی اور عیش پسندی میں مبتلا تھے ' انسانوں میں مساوات اور ھمدردی باقی نہیں رھی تھی - لوگ قوت کو انصاف کا مرادف جانتے تھے - غریب ھونا انتہائی ذلت کا باعث تھا اور انسان کو اس کے انسانی حقوق سے محروم کر دیتا تھا - کیا اس مصلح اعظم نے ان خیالات اور حالات کے سامنے سر تسلیم کر دیا ؟ نہیں اس نے ھر قسم کی مخالفت کے باوجود اپنا انقلاب انگیز پیغام معاشرے کے سامنے پیش کیا اور اس فرض کے ادا کرنے میں نہ ذاتی مصیبتوں کی پروا کی نہ اپنے زمانے کے تعصبات اور عقائد کا پاس کیا اس وقت یہ معلوم ھوتا تھا کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم نظام اخلاق کو درھم برھم کر دے گی گویا " دیوانہ بکارگہ شیشہ‌گر رسید! " کا معاملہ ھو جائے گا - لیکن محض ان کی شخصیت اور بےخوف جد و جہد کا یہ اثر ھوا کہ لوگوں نے ایک ایسے معیار اخلاق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جو مروجہ اخلاق سے کہیں بلند اور برتر تھا -

نہیں ہوتا، نہ وہ اخلاقاً ان کے نتائج کے ذمہ‌دار ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے انسان ایک مکلف اور ذمہ‌دار ہستی ہے اور جب تک اسے یہ بات حاصل نہ ہو کہ ضرورت کے وقت معاشرے کی بندشوں سے آزاد ہوکر کام کر سکے اس کی ذمہ‌داری کوئی معنی نہیں رکھتی۔

تربیت کو معاشرے کی تقلید تک محدود رکھنے میں بہت بڑا عمرانی نقصان یہ ہے کہ نظام اخلاق میں ارتقاء اور اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی۔ تعلیم محض موجودہ حالت کو قائم رکھنے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس کا یہ مقصد اعلیٰ فوت ہو جاتا ہے کہ وہ "حیات برتر" کی کفیل ہو۔ ہم نے اس کتاب میں برابر تعلیم کے اس جامد مفہوم کی مخالفت کی ہے جس کی رو سے مدرسے کا فرض محض اتنا ہے کہ فرد اور ماحول میں مطابقت پیدا کی جائے۔ اخلاقی تعلیم کی بحث میں بھی ہم اس جامد نقطۂ نظر کو قبول نہیں کر سکتے کہ تعلیم مروجہ اخلاق کو اپنا منتہائے نظر سمجھ کر طلبہ کو اسی کے لیے تیار کرے۔ اگر ابتدائے تمدن سے یہ خیال کارفرما ہوتا تو شائد آج تک انسان اپنی قدیم وحشیانہ حالت سے آگے نہ بڑھ سکتا۔

اکثر قوموں اور جماعتوں پر ایسے زمانے گزرے ہیں کہ ان کی اخلاقی حالت بہت ذلیل ہوگئی تھی اور معاشرے نے خوبیوں کو برائیاں اور برائیوں کو خوبیاں سمجھ لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں نظام تعلیم کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ اس معیار اخلاق کو بچوں اور نوجوانوں میں رائج کرے۔ معاشری اخلاق کی صحت اور اصلاح کی ضمانت یہی

روح کو بہ راہ راست اپنے خالق سے تعلق ہے اور انسان خود اپنے اختیاری افعال و اعمال سے اپنی روح کو عظمت اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے یا ذلت اور پستی میں گرا دیتا ہے اس کو خارجی طاقتوں کے ہاتھ میں بےبس سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے -

" ہم نے انسان کو بنایا اور اسے اختیار دیا کہ خواہ وہ (ہماری دی ہوئی نعمتوں کا) شکر ادا کرے (یعنی ان کو صحیح مصرف میں لائے) یا کفران نعمت کرے (یعنی ان کا غلط استعمال کر کے ان کو ضائع کردے) "

(قرآن شریف)

اگر ہم انسانی روح اور انسانی شخصیت کی اس قدر مطلق کو تسلیم کر لیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان پوری طرح آزاد اور تربیت یافتہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے اعمال کی پوری ذمہ‌داری خود قبول کرے اور اس کی سیرت اخلاقی کمال پر اس وقت پہنچتی ہے جب وہ اپنے اہم فرائض کو اپنے علم اور اپنی پسند سے انجام دے نہ اس وجہ سے کہ معاشرے کی نظر میں اچھا سمجھا جائے - ورنہ محض دوسروں کی تقلید میں یا ان کی خوشنودی کے خیال سے تو حیوان بھی بہت سے کام کرتے ہیں - بعض جانور مثلاً کتے' بندر' گھوڑے وغیرہ اس طرح سدھائے جاتے ہیں کہ وہ اپنی طبعی حرکات میں تبدیلی کر کے ایسے کام سیکھ جائیں جو انسان کے لیے مفید یا مرغوب ہوں لیکن اس " سدھانے " میں اور انسان کی " اخلاقی تربیت " میں بڑا فرق ہے - جانوروں کو اپنے ان کاموں کی غرض اور غائت سے کوئی سروکار

استعمال کرتا ہے مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کی روح
آزاد ہے اس کو اپنی بھلائی برائی کا اختیار ہے اور وہ خود اپنی
قسمت کو بناتا یا بگاڑتا ہے - نفسیات کا نظریہ یہ ہے کہ ہر
ذی حیات ہستی میں انفرادیت کی شان اور اپنی رہنمائی
آپ کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور اس کی صحیح نشو
و نما صرف اسی حالت میں ہوسکتی ہے جب تمام تعلیمی
تدابیر اور وسائل اور ماحول کے اثرات اس کی انفرادیت کو
ظاہر ہونے کا موقع دیں اور اسے تقویت پہنچائیں - فلسفہ بھی
کانٹ کی زبان سے اس خیال کی تصدیق ان الفاظ میں
کرتا ہے -

''ہر انسان بجائے خود ایک مقصد ہے محض ذریعہ
نہیں ہے''۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر ایسے نظام یا ادارے کو
ناقص اور خلاف انصاف سمجھتا ہے جو افراد کو محض
دوسرے لوگوں کے مقاصد اور اغراض کا آلۂ کار بنا دے - اس میں
شک نہیں کہ ایک لحاظ سے ہر شخص ذریعے کا کام کرتا ہے -
وہ ان مشترک اغراض کی تحصیل میں کوشاں ہوتا ہے جو
معاشرے کی مادی یا ذہنی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہیں
اور اس طرح اپنے آپ کو اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے -
لیکن اُس صورت حال کو ہم کسی طرح اخلاق کی رو سے جائز
قرار نہیں دے سکتے جو مثلاً لاتعداد انسانوں کو محض
کارخانوں کا مزدور بنادے اور ان کے تمام انسانی حقوق اور
صلاحیتوں کو بالکل نظرانداز کردے - اسی طرح تمام بڑے بڑے
مذاہب نے مختلف پیرایوں میں یہ تعلیم دی ہے کہ انسانی

بڑھ کر معاشری معیار اخلاق کو ذاتی طور پر پرکھیں اور معاملات کے متعلق اپنے ضمیر کی روشنی میں آزادی سے فیصلہ کرسکیں۔ اس لیے مدرسے کا یہی فرض ہے کہ ان کو معاشرے کے بہترین اخلاقی اصول اور عمل سے روشناس کرے اور ان کے کردار کو اخلاق کی معمولی سطح سے نیچے نہ گرنے دے۔

لیکن اس صورت حال کو ہم اپنا مطمح نظر بناسکتے۔ ہمارے نزدیک وہ اخلاقی تربیت ہرگز مکمل نہیں جس کا مرکز ثقل دوسرے لوگوں کی رائے اور ان کی خوشنودی ہو؛ جس میں انسان کے اپنے ضمیر کو کوئی دخل نہ ہو بلکہ ہر معاملے میں معاشری روایات اور تعصبات کی پیروی کی جاتی ہو۔ تاریخ کے اوراق میں ہمیں جو مثالیں اعلیٰ‌ترین انسانوں کی، بالخصوص مذہبی رہنماؤں کی ملتی ہیں، ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت انسان کی ارتقاء کا کمال یہ ہے کہ انسان نہ صرف اپنی نفسانی خواہشات اور فوری اغراض کی کشمکش سے بلند ہوجائے بلکہ اس کے اندر اتنی قوت، اعتماد نفس اور بصیرت پیدا ہوجائے کہ اپنے نور باطن کو اپنا رہنما بنائے اور جب کوئی ایسا اہم اور نازک موقع آپڑے کہ ضمیر کی آواز اور حق کا مقتضا معاشرے کے مطالبے کے خلاف ہو اور ضمیر کی پیروی کرنے میں ساری دنیا کی ناخوشی کا اندیشہ ہو تو انسان اپنے آرام و آسائش، دنیاوی اغراض اور معاشرے کی پسندیدگی کو ٹھکرا کر اپنے عقیدے پر عمل کرے اور اس راستے پر چلے جو اس کے نزدیک سیدھا اور صحیح ہے۔ نفسیات فلسفہ اور مذہب تینوں کی تعلیم یہی ہے گو ان میں سے ہر ایک اس حقیقت کے اظہار میں مختلف انداز بیان اور اصطلاحیں

سامنے خواہ مخواہ بڑھ بڑھ کے اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔
ہر بات میں ان کی مخالفت اور ان کے بتائے ہوئے راستے سے
ہٹ کر چلتا ہے - مگر یہی نوجوان اپنے ہمعمروں اور دوستوں
کے سابقے میں ہر معاملے میں مروجہ رسم اور دستور کی تقلید
اور حمایت کرکے ان کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے -
ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ارتقائے نفس کا یہ دور مفید یا اہم
نہیں ہے کیونکہ کسی شخص کی اخلاقی سیرت اس وقت
تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ منزل سے نہ گزرے -
ہر معاشرے کے اخلاقی اصول و اقدار اور معیار عمل صدیوں کی
جد و جہد اور تجربے کے بعد قائم ہوتے ہیں اور اس کے افراد
کی طبیعت اور زندگی میں سرایت کرتے ہیں - کوئی شخص
آسانی سے ان تمام موثرات کی تفصیل اور ان کی نشو و نما کو
بیان نہیں کرسکتا جن سے کسی قوم کی اخلاقی زندگی کی
تشکیل ہوتی ہے - لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ یہ اخلاقی
زندگی ہر بچے کو ابتدا ہی سے اپنے اثر میں لے لیتی ہے - اگر
معاشرے کی عام اخلاقی حالت قابل اطمینان ہے تو ایک
نوخیز ہستی کی تربیت کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ وہ اس
ماحول میں زندگی بسر کرے اور اس کے اخلاقی اصولوں کو
جذب کر کے ان پر عمل کرنے لگے - یعنی ایک طرف تو ذاتی
مطالعے اور مبادلۂ خیالات کے ذریعے گھر میں اور مدرسے میں،
ان اصولوں کو نظری طور پر سمجھے اور ان کے حسن و قبح پر غور
کرے اور دوسری طرف اپنے کردار میں ان کو عملی جامہ پہنائے -
چونکہ بعض لوگوں میں فطری کمزوریوں یا ماحول کی خرابی
کی وجہ سے یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ اس منزل سے آگے

و کردار پر فوری خواهشات اور حفظ نفس کی حکمرانی ہوتی ہے- ان کی اخلاقی حالت بچوں کی سی ہوتی ہے بلکہ اس سے بدتر - کیونکہ بچوں کے لیے تو یہ چیز فطرت کے موافق ہے اور ان غلطیوں اور کمزوریوں میں بھی معصومیت کی ایک شان پائی جاتی ہے - لیکن یہ لوگ جن کی اخلاقی نشو و نما مسدود ہو جاتی ہے نہ اپنی عقل سے کام لیتے ہیں نہ تجربے سے' سوائے اس ابتدائی اور فطری تجربے کے جو انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہے اور انہیں بعض صریحاً مضر اور مہلک چیزوں سے بچاتا ہے - وہ دوسروں کی خوشنودی اور معاشرے کی رائے کا بھی خیال نہیں کرتے - بعض لوگ اس حالت سے آگے بڑھ کر اخلاق کی درمیانی منزل تک پہنچ جاتے ہیں - جس میں دوستوں اور ہمچشموں یا اپنے سے بہتر لوگوں کی تقلید اور رضاجوئی کی خواہش زندگی پر حاوی ہوتی ہے ان کی بات چیت' چال ڈھال' وضع قطع' ادب آداب' غرض سارے ذاتی اور معاشرتی معاملات کا معیار یہی ہوتا ہے کہ کوئی بات ایسی نہ کریں جو دوسروں کی نظر میں کھٹکے - اس قسم کے لوگ سراسر رسم پرست اور تقلید پرست ہوتے ہیں اور معاشرے کے بےبس غلام بن کر رہ جاتے ہیں - ایک عجیب بات یہ ہے کہ نوجوانوں کی نفسی زندگی میں جہاں ایک طرف اظہار خودی اور نمود کی خواہش بہت نمایاں ہوتی ہے وہاں بعض باتوں میں وہ معاشرے کے دستور کا حد سے زیادہ لحاظ رکھتے ہیں اور کم سے کم اپنے ہمچشموں کی مخالفت کرنے میں بہت جھجکتے ہیں- ان متضاد رجحانات کا اکثر یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ نوجوان اپنے بزرگوں اور استادوں کے

اور ان کی مدد سے زندگی کے سارے مرحلے طے کرے بلکہ بلوغ کے
زمانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکثر نوجوان محض اظہار
خوشی کے لیے اس شاہراہ سے ہٹ کر جس پر دوسرے چلتے
ہیں اپنے لیے نئے راستے کرتے ہیں تاکہ خود انہیں اور دوسروں
کو یہ محسوس ہو کہ وہ ایک آزاد شخصیت کے مالک ہیں۔
لیکن یہ مبالغہ آمیز اظہار خوشی محض ایک علامت ہے
جس سے ہمیں یہاں بحث نہیں - ہمارے پیش نظر وہ مضبوط
اور مستحکم اخلاقی سیرت ہے جو اپنے اصولوں کی خاطر آرام و
آسائش کو قربان کرنے اور تکلیفیں اٹھانے کے لیے تیار ہو اور
محض دوسروں کی خوشنودی یا تعریف کی خاطر اس طرز
عمل کو نہ چھوڑے جو اس کے نزدیک انصاف و صداقت کا تقاضا
ہو - یعنی اس منزل میں پہنچ کر نئے سرے سے انسان کی
وعملاً اس کی اپنی ذات ہو جاتی ہے لیکن اب یہ ذات پہلے
کی طرح خارجی اور فوری خواہشوں کی غلام نہیں ہوتی بلکہ
تربیت اور تہذیب کی بدولت اخلاقی اقدار مقاصد سے آشنا
ہو جاتی ہے - اب وہ ہر بات کا فیصلہ محض جسمانی راحت
اور تکلیف کی بنا پر نہیں کرتی بلکہ اس کا معیار بہت بلند
ہو جاتا ہے اور وہ اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کو اپنی شخصیت
کے اظہار اور عزت نفس کی تسکین کا ذریعہ بنا لیتی ہے۔
یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اخلاقی تربیت کی ان
تینوں منزلوں سے گزر کر اپنی سیرت کی تکمیل کرے - بلکہ
واقعہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ پہلی ہی منزل میں رہ جاتے
ہیں اس سے آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے - وہ اپنی ساری
عمر اس ادنیٰ اور پست سطح پر بسر کرتے ہیں جہاں اعمال

مروجہ اخلاق کا جزو ہیں ۔ وہ عملاً یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر فرد کو اپنی نشو و نما کے لیے معاشرے کی اداروں اور انتظامات سے فائدہ اُٹھانے کا حق حاصل ہے لیکن اس حق کے بدلے میں معاشرے کی طرف سے اس پر فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کی پابندی اس کے لیے ضروری ہے مثلاً یہ فرض کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرے لیکن ان کے مشاغل میں بےجا مداخلت سے باز رہے - ممکن بلکہ اغلب ہے کہ ہمدردی، اشتراک عمل ' معاشری کارکردگی کا نظری مفہوم ابھی تک اس کی سمجھ سے باہر ہو لیکن عمل کے ذریعے وہ اُن عادتوں کو پختہ کرلیتا ہے جن پر اخلاقی زندگی کی بنیاد ہے - اگر اوائل عمر میں ان عادتوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی جائے تو آگے چل‌کر انسان کو اپنی ساری توجہ اور محنت ان جزئیات کی اصلاح میں صرف کرنی پڑتی ہے اور وہ اعلیٰ تر اخلاقی مقاصد کا حق ادا نہیں کرسکتا -

اس کے بعد اخلاقی تربیت کی تیسری منزل آتی ہے جب طالب علم بچپن کی حدود سے نکل کر شباب کی سرحد میں قدم رکھتا ہے اور نہ صرف جسمانی اور ذہنی اعتبار سے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھتا ہے - اب وہ اپنے ہر فعل کو اس معیار پر نہیں پرکھتا کہ اس سے مجھ کو آرام و آسائش حاصل ہوگی یا نہیں اور نہ یہ سوچتا ہے کہ اگر میں فلاں کام کروں گا تو میرے دوست اور عزیز میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے - اس وقت تک وہ اپنے ہدایت کے لیے کچھ اصول اور قاعدے معین کر چکتا ہے اور اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنی راہ چلے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلبہ کو اس اخلاقی معیار سے کس طرح روشناس کیا جائے کہ وہ ان کی زندگی میں ایک اثر آفریں قوت بن جائے -

ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ ابتدا میں بچے کی ناپسند اور ناپسندیدگی کا انحصار اس کی اپنی ذات کی نشو و نما اور آرام و آسائش پر ہوتا ہے - یہ اخلاق کی سب سے پہلی منزل ہے - اس کے بعد اسے گرد و پیش کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ اپنے والدین کو پہچاننے اور ان سے محبت کرنے لگتا ہے ، اپنے عزیزوں کے ساتھ رہتا سہتا ہے ، ہمسایوں اور پڑوسیوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے ، مدرسے میں اپنے ساتھیوں سے ملتا جلتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کے خیالات اور جذبات ، ان کی بود و باش ، ان کی رسوم و روایات کو اپنا بنا لیتا ہے- اس معاشری تجربے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اب وہ اپنے اعمال اور افعال کو معاشرے کی پسندیدگی کے معیار پر پرکھنے لگتا ہے - اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے ہم‌عمروں اور بڑوں کی خوشنودی حاصل کرے - ان کی ناراضگی اس کے لیے تکلیف کا باعث ہوتی ہے اور اس کے احساس خودی کو کمزور کرتی ہے اور ان کی خوشنودی سے اس کے نفس میں احساس قوت پیدا ہوتا ہے - گویا اس کی ذات روز بہ روز وسیع ہوتی جاتی ہے اور اپنے محدود دائرے سے آگے بڑھ کر اپنے متعلقین کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتی ہے - اس طرح اس کے لیے ایک نیا معیار قائم ہوجاتا ہے جو ابتدائی معیار سے بلند تر ہے - اس کے اثر سے اس کو عمرانی زندگی کے اصولوں سے انس اور مناسبت پیدا ہوتی ہے اور وہ بہت سی ایسی باتیں سیکھ لیتا ہے جو اس کے معاشری ماحول کے

محض اس خیال سے نہ کرے کہ اس سے اس کا نفس حیوانی " آرام " پاتا ہے ' نہ کسی کام سے محض اس لیے پرہیز کرے کہ اس میں محنت اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے بلکہ وہ اپنی زندگی کی راہ کو کسی ایسے نصب‌العین کی روشنی سے منور کرے کہ اس کو سفر کی صعوبتوں اور تکلیفوں کی پروا نہ رہے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نفس کش زاہدوں کی طرح آرام کی خواہش ہی نہ کرے یا تکلیف اٹھانے کو فی نفسہ باعث ثواب سمجھے - البتہ اسے جسمانی آسائش اور جسمانی خواہشات کی تشفی کو بھی اعلیٰ تر ' مقاصد میں معین بنانا چاہیے - جہاں کہیں جسمانی آسائش کے مطالبات ارتقاے شخصیت کے مطالبات سے برسر پیکار ہوں اسے جسمانی آسائش کو ترک کر دینا چاہیے - اس کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ صحت جسمانی کا لحاظ اور خورد و نوش کا اہتمام اسی حد تک ضروری بلکہ اخلاقی فرائض میں شامل ہے جہاں تک اس سے انسان کو اس کام میں مدد ملتی ہو جو اس کا مقصد حیات ہے - جسم روح کا خادم اور آلۂکار ہے اس لیے اس کی خبرگیری اور نگہداشت لازم ہے - لیکن تربیت جسمانی کو مقصود بالذات بنا لینا اور بعض جسم پرستوں کی طرح اس خبط میں مبتلا ہوکر زندگی کے اور تمام فرائض اور مطالبات سے غافل ہوجانا سراسر ناجائز ہے- اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے برتر کو کمتر پر قربان کر دیا ہے اور وسیلے کو مقصد بنا لیا - اخلاقی تربیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ طلبہ وسیلے اور مقصد میں تمیز کرسکیں اور مختلف مقاصد میں باعتبار ان کی اخلاقی قدر و قیمت کے ترتیب قائم کر سکیں-

سا روپیہ لگانے سے میری شخصیت کو استحکام اور تقویت پہنچے گی - اس صورت میں میں اپنی تمام کوششوں کو اس مقصد کے لیے وقف کر دوں گا - ہر اس چیز کی جو اس میں معین ہوگی دل سے قدر کروں گا اور باقی تمام چیزوں کو اپنے لیے نقصان دہ اور باعث انتشار سمجھوں گا - لیکن اگر کل میرا خیال یہ ہو جائے کہ ملک میں مدرسے قائم کرنا نہایت ضروری ہے اور اس سے بڑھ کر اور کوئی مفید کام نہیں تو میں اپنے روپیے کو بے دریغ اس کار خیر میں صرف کروں گا اور میری نظر میں دولت کی حیثیت صرف اتنی ہوگی کہ وہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی افعال کا محرک ہمیشہ وہی ایک جذبہ ہوتا ہے یعنی شخصیت کا فروغ اور استحکام یا عزم القوۃ - لیکن وہ اغراض و مقاصد جن کے لیے انسان جد و جہد کرتا ہے ' اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے ' اپنی قوتیں اور وسائل استعمال کرتا ہے ' بدلتے رہتے ہیں -

اخلاقی تعلیم کا منشا اور منتہا یہ ہے کہ بچوں کے تمام کاروبار اور مشاغل کا رشتہ اعلیٰ ترین اقدار اور مقاصد سے جوڑے تاکہ وہ انہیں کو حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کریں ان کے اندر اپنی شخصیت کو مستور کردیں اور اس طرح اس کو زیادہ قابل قدر بنا کر دوبارہ حاصل کریں - بالفاظ دیگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچے کی توجہ کو اس کی ذات کی فوری اور عارضی ضروریات سے ہٹا کر مستقل اور بلندتر اجتماعی ضروریات کی جانب مائل کریں جن کو پورا کرنے میں اسے تکمیل نفس اور اظہار خودی کے بہترین مواقع مل سکیں - وہ کسی کام کو

یہ اصول انسانی فطرت کے نہایت مستحکم اور اٹل قوانین میں سے ہے - آگے چل کر اس کی شکل بدل جاتی ہے' اس کے استعمال کا طریقہ دوسرا ہو جاتا ہے لیکن انسان کی پسند اور ناپسندیدگی میں شخصی رنگ کی جھلک؛ یعنی فلاں کام یا فلاں شخص میرے لیے کیسا ہے' مجھے کیسا معلوم ہوتا ہے؛ اس کی شخصیت کی ہر ارتقائی منزل میں پائی جاتی ہے - جب انسان کی عقل اور تجربے اور وسعت نظر میں ترقی ہوتی ہے تو اس کے نزدیک تکلیف اور آرام' رنج اور خوشی کا مفہوم اور ان کے محرکات بھی بدل جاتے ہیں - اس کو بعض نئی چیزیں پسند آتی ہیں اور بعض چیزیں جو پہلے مرغوب تھیں ناگوار معلوم ہونے لگتی ہیں - لیکن ہر حالت میں وہ ان کے متعلق جو رائے یا طرز عمل رکھتا ہے اس کی بنا اسی پر ہوتی ہے کہ آیا ان سے اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے یا رنج - لیکن نفسیات کی اصطلاح میں خوشی اور رنج کا حقیقی مفہوم وہ نہیں جو عیش طلب لوگ سمجھتے ہیں - خوشی نام ہے اس احساس یا جذبے کا جو شخصیت کی توسیع اور ترقی سے انسان کے دل میں پیدا ہو - ہر وہ چیز جو میری شخصیت کو قوت پہنچاتی ہے' اس میں استحکام اور گہرائی پیدا کرتی ہے' میری خوشی کی باعث ہوگی خواہ اس کے حصول میں مجھے کتنی ہی محنت کرنی اور تکلیف اٹھانی پڑے - برخلاف اس کے جو چیز میری شخصیت کو محدود اور کمزور کرتی ہے وہ رنج پہنچاتی ہے خواہ بہ ظاہر مجھے اس سے آرام اور فائدہ محسوس ہوتا - فرض کیجیے آج میرا خیال ہے کہ کسی کاروبار میں بہت

آتے ہیں - فرد اور ماحول کے اس باہمی تعامل سے اس کی
قوتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہونا اور ایک منظم صورت
اختیار کرنا شروع کرتی ہیں - تکلیف اور آرام کا احساس جو
اس کو مختلف چیزوں اور کاموں سے حاصل ہوتا ہے اس کے
دل میں اپنے ماحول کے مختلف اجزا اور عناصر کے متعلق
ایک احساس قدر پیدا کرتا ہے یعنی بعض کو وہ پسند کرتا
ہے اور ان کو حاصل کرنے یا ان کے قریب پہنچنے کی کوشش
کرتا ہے - بعض کو ناپسند کرتا ہے اور ان کو دور کرنا یا ان
سے دور رہنا چاہتا ہے - اس طرح اوائل عمر ہی میں ایک
قسم کا ابتدائی اور فطری معیار اقدار مرتب کر لیتا ہے، جو
زیادہ‌تر محض اس کے ذاتی تاثرات پر منحصر ہوتا ہے یعنی
جس چیز سے اس کے نفس کو تکلیف پہنچتی ہے اس کو
"برا" سمجھتا ہے جس سے خوشی حاصل ہوتی ہے اسے "اچھا"
سمجھتا ہے - مثلاً ڈاکٹر جو بچے کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے
اس کا نام اس کی فہرست میں نہایت ناپسندیدہ لوگوں
میں لکھا جاتا ہے اور بیوقوف نوکر جو اس کو وقت بے‌وقت
مٹھائی کھلائے وہ اس کے نزدیک سب سے بہتر شخص ہے -
اس طرح جو شخص بھی اس کو اس کے پسند کے برے اور
مضر کاموں سے جنہیں وہ کرنا چاہتا ہے روکے وہ اس کو برا
معلوم ہوتا ہے اور جو شخص اس کی ضدوں کو پورا کرے وہ
اسے محبوب ہوتا ہے - ممکن ہے ان مثالوں پر غور کرنے سے
کسی کو یہ خیال ہو کہ یہ معیار بہت ہی ناقص اور ادنیٰ
ہے اور محض ذاتی تاثر کی بنا پر چیزوں اور آدمیوں کی قدر
و قیمت کا اندازہ کرنا بڑی غلطی ہے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ

بتا چکے ہیں انسان کے نفس میں بہ حالت طبعی ہم‌آہنگی ہوتی ہے - اس کثرت مشاغل اور افعال میں جو اس کی زندگی میں نظر آتی ہے ایک خاص وحدت پوشیدہ ہے - اس کی تمام جسمانی اور دماغی' علمی اور اخلاقی قوتیں ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوسطہ ہیں - ان کو ایک دوسرے کا حریف سمجھنا غلطی ہے کیونکہ ان سب کی ابتدا انہیں سادہ اور جبلی رجحانات سے ہوتی ہے جو تمام افراد کی فطرت میں پائے جاتے ہیں - نفسیات ہمیں سکھاتی ہے کہ انسان کی تمام اعلیٰ قوتیں رفتہ رفتہ ان اضطراری افعال' جبلتوں اور صلاحیتیوں کے تعاون اور تعامل سے وجود میں آتی ہیں جو بچے کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں - یہی وہ سرمایہ ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے - اور انہیں چیزوں کی صحیح نگہداشت اس کی آئندہ دماغی اور اخلاقی تربیت کا دار و مدار ہے -

ابتدا میں یہ مختلف قسم کی حرکات بالکل غیرشعوری ہوتی ہیں اور محض ماحول کے رد عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں - انہیں سے شیرخوار کی ابتدائی منزل میں بقاے حیات کا کام انجام پاتا ہے - لیکن ابھی تک اس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ ان حرکات کے ذریعے اپنے جسم کو سنبھالے اور اس کی حفاظت کرے یا اپنے ماحول پر قابو حاصل کرے اور گرد و پیش کے معاملات اور مسائل کو سمجھ سکے - لیکن جوں جوں بچے کو مختلف قسم کے تجربات پیش آتے ہیں وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے' اس کے مظاہر اور خواص کو سمجھتا ہے اسے روزمرہ نئی مشکلات اور نئے مسائل پیش

کہانی بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کے لیے جو تدابیر اکثر خود طلبہ اختیار کرتے ہیں وہ کس قدر موثر اور کارگر ہوتی ہیں خواہ استادوں اور والدین کے سنجیدہ نقطۂ نظر سے وہ قابل اعتراض ہوں -

تعلیم اخلاق کے متعلق جو غلط فہمیاں رائج ہیں ان میں سے بہت سی ایک غلط نفسیاتی عقیدے پر مبنی ہیں جس کی درستی کیے بغیر ہم اخلاقی تربیت کے اصول قائم نہیں کر سکتے - لوگوں میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ انسان کے نفس میں دو جداگانہ قوتیں ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے بر سر پیکار رہتی ہیں ایک طرف اس کی جبلتیں، اس کے جذبات اور اس کی خواہشیں ہیں جو اسے اپنی جانب کھینچتی ہیں اور دوسری طرف اس کی عقل ہے جو ایک مستقل اور آزاد قوت ہے - یہ اس کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتی ہے اور اسے جذبات اور جبلتوں کے فریب سے بچانے کی کوشش کرتی ہے - انسان اور حیوان میں عموماً یہی چیز ما بہ الامتیاز قرار دی جاتی ہے کہ انسان عقل کا تابع ہوتا ہے اور حیوانات اپنی خواہشوں کے بندے ہوتے ہیں - انسان کی کامیابی اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنی عقل کی ہدایت سے فائدہ اٹھا کر اپنی خواہشات اور جذبات کو زیر کرے بلکہ اگر ہو سکے تو انہیں بالکل مٹا دے - گویا عقل و ارادہ اور دوسری قوتوں میں لازمی کشمکش ہے اور اخلاقی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ عقل باقی تمام قوتوں پر غالب آ جائے - لیکن نفسیات کی جدید تحقیقات اس خیال کی تردید کرتی ہے - جیسا ہم ابھی

کیا جائے - تاکہ طلبہ اس کے نشیب و فراز سے واقف ہو کر خود اس نتیجے پر پہنچیں کہ حقوق کے ساتھ فرائض بھی وابستہ ہوتے ہیں اور اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ اسے اپنے مشاغل کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو تو اسے دوسروں کے مشاغل میں بےجا مداخلت نہیں کرنی چاہیے ورنہ وہ بھی اس کے کاموں میں دست اندازی کریں گے - انفرادی حقوق اور ان کی حدود کی یہ معرفت محض اُستاد کے بیان سے حاصل نہیں ہو سکتی - اس کے لیے بچے کو پڑھائی کے کمروں میں ' بورڈنگ ہاؤس کی زندگی میں ' کھیل کے میدان میں اور تمام مشترک مشاغل کے دوران میں اپنے ہم‌عمر اور اپنے سے چھوٹے بڑے ساتھیوں کے ساتھ تعاون عمل کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ساتھی براہ راست اپنے مخصوص طریقوں سے یہ سبق اچھی طرح ذہن نشین کرا دیتے ہیں - اگر کوئی طالب‌علم مدرسے کے بن لکھے قوانین اور روایات کی خلاف‌ورزی کرتا ہے تو طلبہ خود مجرم کو قرار واقعی سزا دیتے ہیں اور اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ عام روایات اور طریقۂ عمل کی پیروی کرے - یہ سزا اسے ناگوار نہیں ہوتی یا کم سے کم اتنی ناگوار نہیں ہوتی جتنی استاد کی سزا ' جو اکثر مبہم وجوہ پر مبنی ہوتی ہے جن کو سمجھنے سے وہ قاصر ہوتا ہے کپلنگ (Kipling) نے پبلک اسکول کی زندگی کے متعلق جو دلچسپ اور مشہور کتاب ''سٹاکی اینڈ کو'' (Stalky and Co.) لکھی ہے اس میں اس حقیقت کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ دکھایا ہے - خصوصاً ایک باب میں جس کا عنوان ''اخلاقی مصلحین'' ہے اس نے ایک سبق‌آموز

ساتھ آتا ہے کہ اخلاق کی تعلیم کو وسیع اور جامع یعنی طلبہ کی پوری زندگی پر حاری ہونا چاہیے اور اس کی بنیاد ان کے ماحول اور مشاغل اور ان کی فوری ضروریات اور فطری خواہشات پر رکھنا چاہیے - اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ تعلیم ایسی ہو جو بلا تفریق و امتیاز ان کی کل خواہشات پوری کرے یا ان کی روزمرہ کی زندگی اور مشاغل کی سطح سے بلند نہ ہونے پائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ، اخلاقی تعلیم تمام‌تر عملی ہو یعنی وہ طلبہ کی زندگی کے گوناگوں تجربات اور مشاغل کو پیش نظر رکھ کر ان میں بہتر تنظیم و ترتیب قائم کرے اور ان کو اخلاقی اصولوں کے تحت میں لائے نہ یہ کہ ان کی عملی ضرورتوں سے قطع نظر کر کے ان پر زبردستی مجرد اخلاقی اصول عائد کردے - اس لیے مدرسے میں ہر اصول اور قاعدے کی تشریح ' ہر قانون کی مثال طلبہ کی زندگی میں سے مہیا کرنی چاہیے - مثلاً فلسفۂ اخلاق کا ایک نہایت اہم اصول یہ ہے کہ معاشرتی زندگی اس وقت تک نہیں چل سکتی اور نہ افراد کو آزادی عمل حاصل ہو سکتی ہے جب تک لوگ اس کے عادی نہ ہوں کہ ایک دوسرے کے ساتھ رعایت اور رواداری برتیں ' اپنے حقوق اور فرائض پہچانیں اور دوسروں کے کام میں بےجا مداخلت کرنے سے باز رہیں - طلبہ کو محض اس اصول کا زبانی سمجھا دینا کافی نہیں کیونکہ جب تک یہ ان کے ذاتی تجربے کی مستحکم اور پائدار بنیاد پر قائم نہ ہو ' ان کی اپنی کامیابی اور ناکامی کی مثالوں سے اخذ نہ کیا گیا ہو ان کے عمل کی رہبری نہیں کرسکتا - اس کے لیے ضروری ہے کہ مدرسے میں ایک معاشرتی ماحول مہیا

اخلاقی احساس پیدا کر دیتے ہیں اور غیرشعوری طریقے پر ان کے معیار فکر و عمل، ان کے مذاق اور اخلاق کو بلند اور برتر کرتے رہتے ہیں - خال خال ایسے روشن دماغ معلم بھی مل جائیں گے جن کو شعوری طور پر یہ معلوم ہے کہ اخلاقی تربیت کے اصول کیا ہیں اور اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہییں - لیکن ان مستثنیٰ صورتوں کو چھوڑ کر اخلاقی تربیت کی عام کیفیت وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے - اس میں مطلق مبالغہ نہیں ہے - اس بےتوجہی اور بےاصولی کا نتیجہ صرف یہی نہیں کہ معلموں کا مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی غلط کوششوں سے، گو وہ نیک نیتی پر مبنی ہوں، بچوں کی قدرتی نشو و نما میں حارج ہوتے ہیں اور اپنی مداخلت سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتے ہیں - ان کی نام نہاد اخلاقی تعلیم کو بچوں کی روزمرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - انہیں اس کا موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ اس تلقین کو عملاً اپنی زندگی کا جزو بنائیں- اس لیے اخلاقی نصیحتیں اور مقولے صرف ان کے کانوں تک پہنچ جاتے ہیں ' دل میں نہیں اترتے ' عمل کی شکل نہیں اختیار کرتے - وہ ان کو طوطے کی طرح رٹ لیتے ہیں اور جب ضرورت ہو فرفر سنا دیتے ہیں لیکن قول اور فعل کی علحدگی ان میں بلا ارادہ ریاکاری پیدا کرتی ہے اور مدرسے کی اخلاقی تعلیم سطحی، مصنوعی اور غیرموثر رہ جاتی ہے - خود مدرسے کی چاردیواری میں بھی اس کا کوئی خاص اثر ظاہر نہیں ہوتا اور مدرسے کو چھوڑنے کے بعد تو وہ بالکل ہی بےکار اور فضول ثابت ہوتی ہے-

اس بحث سے ہمیں اخلاقی تربیت کا پہلا بنیادی اصول

ہے بالکل پاک و صاف ہے لیکن وہ نہ سچ بولتا ہے، نہ جائز
ذرائع سے حصول معاش کرتا ہے، نہ اپنے خاندان والوں اور
ہمسائیوں کے حقوق ادا کرتا ہے تو ہمیں اس کو یقیناً بد اخلاق
کہنا چاہیے۔ لہذا ان دونوں معنوں کو چھوڑ کر ہمیں اخلاق
کا وسیع مفہوم اختیار کرنا پڑے گا جو زندگی کے تمام مشاغل اور
معاملات کو محیط ہو۔

مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خارجی زندگی کے
خیالات اور عقائد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چونکہ
مسیحیت نے اخلاق کا مفہوم غلط سمجھ لیا ہے اس لیے مغرب
میں بھی اخلاق سے متعلق ایک بہت محدود اور تنگ نقطۂ
نظر رائج ہو گیا ہے اور اخلاق اور زندگی کے گہرے رابطے کو
فراموش کر دیا گیا ہے۔ مدرسوں میں "اخلاقی تربیت" کے یہ
معنی لیے گئے ہیں کہ بچوں کو چند اخلاقی اصول بتا دیے
جائیں۔ بہت سے اساتذہ کو تو اس کی فرصت ہی نہیں
ملتی یا صرف یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اخلاقی تعلیم کا
کوئی بندوبست کریں لیکن جن معلموں کو اس کا خیال ہوتا
بھی ہے ان میں سے بھی اکثر اس بات پر قناعت کرتے ہیں
کہ طلبہ کو اچھے اچھے مقولے اور اخلاقی نصیحتیں سنا دیں
اور ان پر عمل کرنے کی تاکید کردیں۔ بعض جو زیادہ ایماندار
اور مستعد ہوتے ہیں اور احساس فرض کے بوجھ سے دبے جاتے
ہیں وہ ان اصول کی تشریح و تفسیر بھی کردیتے ہیں۔ اتنا
کرکے وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اخلاقی تربیت کی مہم سر
ہوگئی۔ بیشک بعض معلم ایسے بھی ہیں جو اپنی مثال
اور شخصیت کے مقناطیسی اثر سے طلبہ کی زندگی میں سچا

ایک با اخلاق شخص کی گفتگو میں شیرینی اور اس کے برتاؤ میں حفظ مراتب کا خیال بھی ہونا چاہیے لیکن اگر یہ صفات اس کی تہذیب نفس کا نتیجہ نہیں ہیں تو پھر محض اوپری چیز ہیں جن کو ہم کوئی وقعت نہیں دے سکتے - بہت ممکن ہے کہ ایک بد باطن اور بد کردار شخص لوگوں کو فریب دینے کے لیے اس قسم کا جھوٹا اور نمائشی "اخلاق" ظاہر کرے - ہمیں روزمرہ کی زندگی میں اکثر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو باوجود اس سطحی "اخلاق" میں ماہر ہونے کے نہایت درجہ ذلیل اور بد اخلاق ہوتے ہیں - ممکن ہے کہ بعض لوگ جو وسیع تجربہ اور غائر نظر رکھتے ہیں ان کی ریاکاری کو پہچان سکیں اور کھرے اور کھوٹے سکے میں تمیز کرسکیں لیکن عام لوگ دھوکے میں آجاتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں - اس لیے ہمیں اخلاق کے اس سطحی مفہوم کو یک قلم مسترد کر دینا چاہیے - اسی طرح جو لوگ اخلاق کو جنسی تعلقات کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں اور "بااخلاق" کے لفظ کا اطلاق ان لوگوں پر کرتے ہیں جن کی زندگی کا صرف یہ پہلو قابل تعریف ہوتا ہے وہ بھی کل کے بجائے جزو پر قانع ہو جاتے ہیں - اس میں شک نہیں کہ یہ بھی اخلاق کا ایک نہایت اہم حصہ ہے لیکن اس کو اخلاق کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ انسان پر زندگی کی گوناگوں کشمکش میں مختلف قسم کے فرائض عائد ہوتے ہیں - اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو ادا کرے اور باقی کی طرف سے بےاعتنائی برتے تو ہم اس کو اخلاقی اعتبار سے اچھا نہیں سمجھ سکتے - مثلاً اگر کسی شخص کا کردار جنسی تعلقات کے لحاظ

ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عملی حیثیت سے بہت کم لوگ
ایسے ہیں جن کی شخصیت میں ہم آہنگی پائی جائے اور
بالعموم اکثر لوگ اپنی زندگی کو مختلف اور غیر مربوط حصوں
میں تقسیم کر لیتے ہیں - مگر یہ تعلیم و تربیت کی خرابی
کا ثبوت ہے - ہم اس ناقابل اطمینان صورت حال کو اپنا
منتہائے نظر نہیں بنا سکتے - صحیح تربیت کا تقاضا یہ ہونا
چاہیے کہ وہ افراد کی شخصیت میں یہ انتشار پیدا ہونے
نہ دے اور ان کی تمام علمی اور عملی قوتوں کو اس طرح مربوط
اور منظم کر دے کہ وہ اعلیٰ ترین اخلاقی نصب العین کے حصول
کے لیے استعمال ہو سکیں جو زندگی کے ہر شعبے میں یکساں
طور پر شمع ہدایت کا کام دیتا ہے - لہذا ہمارے نقطۂ نظر سے
اخلاق کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں اور تمام مشاغل کو محیط
ہے اور اخلاقی سیرت کا اظہار انسان کے ہر کام میں ہونا چاہیے
خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو یا تجارت سے یا محنت اور
مزدوری سے یا مذہب سے - اخلاق کا یہ مفہوم اس مروجہ مفہوم
سے کہیں زیادہ وسیع اور پر معنی ہے جو آداب نشست و
برخواست اور طریقۂ کلام و طعام تک محدود ہے یا کبھی کبھی
جنسی تعلقات کے لیے استعمال ہوتا ہے - عام طور پر جب
لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا اخلاق اچھا ہے - تو ان کا
مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی بات چیت اور برتاؤ میں
شائستگی پائی جاتی ہے اور وہ آداب محفل سے واقف ہے
لیکن اخلاق کے لفظ کو اس قدر محدود معنی میں استعمال
کرنا ایسا ہے جیسے ہم بیچ سمندر میں غوطہ لگانے کے بجائے
محض اس کی سطح کو چھونے پر قناعت کریں - بے شک

کہ زندگی بہت سے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے -
کاروباری، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی وغیرہ - گویا ہر انسان بہت
سی مختلف اور غیر مربوط شخصیتوں کا مجموعہ ہے جن کو
وہ بہ مشکل ایک ساتھ تو رکھ سکتا ہے لیکن ہم‌آہنگ نہیں
بنا سکتا - یہ سچ ہے کہ اس ناقص اور نا مکمل دنیا میں
اکثر لوگوں کی حالت ایسی ہی ہے کہ ان کے نفس میں تفریق
اور انتشار پایا جاتا ہے - ہر شخص اپنے نفس کے مشاہدے
اور دوسروں کی سیرت کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق
کر سکتا ہے - چونکہ زیادہ تر لوگوں کے نفس میں یہ تفریق
دماغی جنوں کی حد تک نہیں پہنچتی اس لیے وہ اس
کی طرف توجہ نہیں کرتے لیکن جب وہ اسے انتہائی صورت
میں دیکھتے ہیں مثلاً سٹیونسن (Stevenson) کے مشہور
افسانے "ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ" (Dr. Jekyll and
Mr. Hyde) میں نفس کی دوئی کی داستان پڑھتے ہیں
تو انہیں تعجب ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی غیر
طبعی چیز ہے جس کو صحیح‌العقل انسانوں کے روزمرہ کے
تجربات سے کوئی تعلق نہیں - حالانکہ اس شخص میں جو
دو بالکل متضاد طبیعتیں رکھتا ہے، اور معمولی آدمیوں میں
فرق محض کمیت کا ہے کیفیت کا نہیں - وہ بھی دنیاوی
کاروبار اور تجارت میں ایک اصول رکھتے اور برتتے ہیں اور
مذہبی امور یا خانگی زندگی میں بالکل دوسرے اصول اور
طرز عمل کے تابع ہوتے ہیں - انگریزی کی ایک ضرب‌المثل
اس مروجہ تقسیم کو اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ "ہفتے میں
چھ دن دنیاداری کے ساتواں دینداری کا" - غرض یہ بات تو

ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں ڈالتے اور معلوم ان میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ تدابیر اور وسائل سوچ سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ انتظام جو مثلاً جسمانی تعلیم کے لیے کیا جاتا ہے محسوس یا غیر محسوس طور پر طلبہ کی دماغی اور اخلاقی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اس طرح مدرسے میں جو وسائل ہم طلبہ کی علمی اور اخلاقی تربیت کے لیے اختیار کرتے ہیں وہ ان کی اخلاقی سیرت کی تشکیل میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ مروجہ اخلاقی تعلیم کی خرابی کی ایک بڑی وجہ جس کی توضیح ہم آئندہ چل کر کریں گے یہ ہے کہ بالعموم لوگوں نے اخلاقی تربیت کا جو مفہوم اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے وہ بہت محدود اور ناکافی ہے۔ در اصل اس میں علم اور عقل دونوں کو بہت بڑا دخل ہے۔ اس لیے طلبہ کی علمی اور عقلی تربیت کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان کی سیرت اور طرز عمل میں تغیر واقع ہو۔ اس وجہ سے ہم نے اب تک فی نفسہ اخلاقی تربیت کے مسئلے کو نہیں چھیڑا لیکن گذشتہ بحثوں میں ضمنی طور پر بار بار اس کا ذکر آچکا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ مدرسے کے تمام کار و بار اور مشاغل کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیں کہ وہ کس حد تک اخلاقی تربیت میں معین یا مزاحم ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے ان کی تنظیم کس طرح کرنی چاہیے۔

سب سے پہلے ہمیں اخلاق کے صحیح مفہوم اور اس کی حدود کو سمجھ لینا چاہیے۔ لوگوں نے عام طور پر اخلاق کو انسانی زندگی کا ایک شعبہ سمجھ رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے

کی بحث میں ہم نے جو تقسیم قائم کی ہے وہ نفس امر کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اظہار خیال میں سہولت پیدا کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے - تمام تعلیمی مباحث میں ہم نے اس اصول کو پیش نظر رکھا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ طالب علم کی شخصیت اور تعلیم کے عمل دونوں میں ایک اندرونی وحدت اور ربط ہے جس کو نظرانداز کرنا بہت بڑی غلطی ہے - اصل میں ہم انسان کی ہستی کو الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کرسکتے - یہ نہیں کہہ سکتے کہ جسم اور دماغ' عقل اور اخلاق' روح اور مادہ بالکل مختلف چیزیں ہیں جن کو ایک دوسرے سے سروکار نہیں اور جن کی تربیت اور نشو و نما کے لیے بالکل جداگانہ تدابیر درکار ہیں - جس طرح آرٹ کے ہر بڑے شاہکار میں ایک مرکزی خیال یا جذبہ کارفرما ہوتا ہے جو اسے ایک مخصوص وحدت (Unity) یا بقول ڈاکٹر نن (Nunn) کے "انفرادیت" (Individuality) بخشتا ہے' اس طرح انسان کی زندگی اور اس کی ذات میں جو قدرت کا سب سے بڑا شاہکار ہے ایک وحدت پائی جاتی ہے جو اس کے مختلف اعمال و افعال' اس کے مختلف عناصر کو باہم مربوط رکھتی ہے - اس خصوصیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کا عمل بھی ایک سالم عمل ہے جس کو جسمانی تعلیم' ذہنی تعلیم' اخلاقی تعلیم وغیرہ میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا - گو ہم اپنی آسانی کے لیے اور ایک وقت میں کسی خاص پہلو کو نمایاں کرنے کی غرض سے اس تقسیم سے کام لیتے ہیں' لیکن ہمیں یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ تعلیم کے یہ مختلف پہلو واقعی مستقل وجود رکھتے ہیں اور

تحت میں لاکر مہذب اور منظم کرنا اور اسے اپنی قابلیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دشوار ہے - لیکن یہ کام جس قدر مشکل ہے اسی قدر ضروری ہے اور معلم کو جو گویا ایک انسان برتر کی تخلیق میں مصروف ہے اس فرض کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے اور اس کی بجا آوری میں پوری کوشش کرنی چاہیے - یہاں اسے انسان کی نہایت قدیم اور بنیادی جبلتوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کے خیالات اور افعال پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہیں اور جب تک وہ بہت احتیاط اور ہوشیاری سے ان قوتوں کو راہ پر لگا کر اپنا معین و مددگار نہ بنائے گا اسے کامیابی نہیں ہو سکتی - اس لیے اسے نفسیات اطفال سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ ان قوتوں کو صحیح طور پر سمجھ کر رہنمائی کرے - لیکن محض علم‌النفس سے واقف ہونا اس کے لیے کافی نہیں کیونکہ اس کے ذریعے سے تو اسے صرف اسی قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ اسے کس مواد سے کام لینا ہے - یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ کس منزل کی طرف اپنا قدم بڑھائے ' کس نصب‌العین کے حاصل کرنے کی کوشش کرے - مقصد کے تعین کے لیے اسے اخلاقیات اور عمرانیات سے مدد لینے کی ضرورت ہے - اور یہ جاننا لازم ہے کہ وہ کون سے اخلاقی اور معاشرتی اصول زندگی ہیں جن کو بہترین علما اور حکما نے تسلیم کیا ہے ' تاکہ وہ اپنے طلبہ کو ان سے روشناس کرے اور انہیں ان پر عمل کرنے کی عادت ہو -

ہمیں اس موضوع پر نظر ڈالنے سے پہلے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ ذہنی اور اخلاقی تربیت

نہیں ہے - اس کے خلاف یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ وہ طلبہ کو موجودہ تمدنی زندگی کی ضرورتوں کے لیے تیار نہیں کرتی اور اس نے اب تک ان جدید تحریکوں اور اثرات کی اہمیت کو نہیں سمجھا جنھوں نے موجودہ زمانے کی معاشرت اور سیاست ' اس کے نظام صنعت و حرفت ' اس کی علمی جد و جہد کے رجحان کو بدل دیا ہے - تعلیم اور تمدنی رجحانات کو ہم‌آہنگ بنانے اور مدرسے کے ماحول میں افراد کی تربیت کے لیے بہترین محرکات اور اثرات مہیا کرنے کے لیے ماہرین تعلیم نے ' نفسیات اور تمدنی علوم سے فائدہ اُٹھا کر ' جدید تعلیمی تجربوں اور طریقوں کو رواج دیا ہے جن میں سے چند اہم تجربات کا ذکر ہم کرچکے ہیں -

اب ہم اس مسئلے کے دوسرے پہلو کی طرف رجوع کرتے ہیں - ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ تعلیم سے مراد صرف علم سکھانا نہیں بلکہ عرف عام میں یہ لفظ مجموعی تربیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے انسان کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کا ابھارنا ' سنوارنا اور منظم کرنا - اس لیے تعلیم کے عملی پہلو سے بحث کرنے کے بعد ' جس کا تعلق زیادہ تر ذہنی نشو و نما سے ہے ' ہمارے سامنے یہ اہم اور نازک مسئلہ در پیش ہے کہ طلبہ معاشرتی زندگی میں حصہ لینے اور اپنے ملک اور زمانے کی بہترین اخلاقی قدروں اور اصولوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے کس طرح تیار کیے جاسکتے ہیں - واقفیت اور علم میں اضافہ کرنا آسان ہے لیکن انسان کے اصول زندگی پر اثر ڈالنا ' اس کے جذبات اور حیات کو ایک عمدہ اور اعلیٰ نصب‌العین کے

حصہ سوم

باب اول

اخلاق کا حقیقی مفہوم

ہم نے اس کتاب کے دوسرے حصے میں مدرسۂ جدید کے تعلیمی اصولوں سے بحث کی ہے اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید تعلیمی نظریوں کی رو سے مدرسے میں نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو کس طرح مرتب کرنا چاہیے کہ طلبہ کی ذہنی تربیت اور جسمانی نشو و نما بہ خوبی ہوسکے - اس ضمن میں ہم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارے مدارس کے مروجہ نصاب اور تعلیمی طریقوں میں بہت سے ایسے نقائص ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے طلبہ کی شخصیت کی تربیت صحیح طریقے پر نہیں کرسکتے - ان کی ذہنی صلاحیتیں اکثر افسردہ ہوکر رہ جاتی ہیں ' ان کے دل میں علمی اور عملی دلچسپیاں پیدا نہیں ہونے پاتیں اور وہ زندگی کے گوناگوں امکانات سے پوری طرح لطف اور فائدہ نہیں اٹھاسکتے - علاوہ اس امر کے کہ مروجہ تعلیم انفرادی نشو و نما کی ضامن

سمجھنے لگیں - ہمارے نزدیک جسمانی تربیت کی تکمیل کے معنی یہ ہیں جب انسان تندرست اور طاقتور ہو اور اپنی طاقتوں کو اپنے مقاصد زندگی کی تحصیل میں استعمال کرسکے' اسے اپنے اعضا اور حواس پر پورا قابو ہو' اور وہ ان کے ذریعے سے اپنے ماحول کے ساتھ رابطہ قائم رکھے اور اس سے حسب ضرورت کام لے سکے اور بالخصوص اسے اپنے ہاتھوں کی حرکت پر پوری قدرت ہو اور وہ ان کے بےشمار امکانات عمل میں سے بعض کو مشق کے ذریعے ظاہر کرسکے - جب ہم جسمانی تربیت کا یہ وسیع مفہوم اختیار کرتے ہیں تو اس سے محض جسم کی پرورش مراد نہیں ہوتی بلکہ ان تمام جسمانی قوتوں اور امکانات کی نشو و نما جن سے ہماری دماغی اور عقلی تربیت میں مدد ملتی ہے اور ہم ان تعمیری اور تخلیقی مشاغل میں شریک ہوتے ہیں جو انسان کی خلّاق طبیعت کا اظہار ہیں اور جن کے ذریعے وہ بعض اہم‌ترین جبلتوں کو تسکین دیتا ہے -

---

کے بجائے عملی کاموں کے مواقع نصیب تھے، ان کی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑتا تھا اور ان کی صحت اور تندرستی کو دیکھ کر لوگ رشک کرتے تھے - جسمانی ورزش اور کھیلوں کے علاوہ اس مدرسے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں دست کاری کی تعلیم بہت احتیاط کے ساتھ منظم کی گئی تھی - بانی مدرسہ خود اس کے متعلق لکھتا ہے :-

"جسمانی ورزش کی تکمیل اس قسم کی دست کاریوں کے ذریعے ہوتی ہے جیسے ٹوکریاں بنانا، برتن اور گتے کی چیزیں بنانا، جلد سازی، مجسمہ سازی، لکڑی اور لوہے کا کام وغیرہ - یہ سب طالب علم کی جسمانی اور دماغی نشو و نما کے نہایت قابل قدر ذریعے ہیں ان سے نہ صرف طلبہ کو اس ذوق عمل کی تسکین ہوتی ہے جو ان کی عمر کا خاصہ ہے، بلکہ مشاہدے، موازنے اور تخیل کی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں اور ایجاد و جدت کی خواہش ابھرتی ہے...... چھوٹے بچوں کو کاغذ اور گتے کی چیزیں بنانا، ڈرائنگ اور ماڈلنگ سکھائی جاتی ہے - ان کے بیرونی کاموں میں باغ کے روشوں کی صفائی، کیاریوں کی کاشت اور پالتو جانوروں مثلاً مرغیوں، خرگوشوں کی نگہداشت شامل ہے - دس سال کی عمر کے بعد وہ بڑھئی کا کام بھی سیکھتے ہیں اور جو زیادہ مضبوط ہوتے ہیں وہ لوہار خانے میں کام کرتے ہیں......"

ہم نے اس باب میں جسمانی تربیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کا خلاصہ کیا ہے؟ ہم یہ نہیں چاہتے کہ سب طلبہ پہلوان بن جائیں اور اپنے جسم کی پرداخت کو مقصود بالذات

نے اپنے قائم کیے ہوئے مدرسے کو ایک ایسے ماحول میں تبدیل کردیا تھا جہاں تربیت جسمانی کے لیے بہترین ذرائع اور وسائل مہیا کیے گئے تھے - بیرجس (Bierges) کا یہ مدرسہ جس کا تذکرہ ہم پہلے بھی کرچکے ہیں بلجیم کے ایک معلم واسکونسلو (Vasconcellos) نے قائم کیا تھا - یہ شہروں کے شور و غل اور کشمکش سے دور ایک دیہاتی علاقے میں واقع تھا جہاں طلبہ کو فطرت کے گوناگوں مناظر سے لطف اندوز ہونے اور ان کے سکون بخش اثرات سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا تھا - لیکن باوجود اس تنہائی کے وہ صنعتی زندگی اور شہروں کے کاروبار سے ناواقف نہ تھے کیونکہ ان کے استاد انھیں اکثر گرد و نواح کے کارخانوں اور صنعت حرفت کے مرکزوں میں لے جاتے تھے جہاں وہ براہ راست مزدوروں کی زندگی اور تقسیم عمل کا مطالعہ کرتے تھے - مدرسے کے نصاب میں ان مشاغل کو بہت اہمیت دی جاتی تھی جن میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے اور وہاں بھی دیگر مدارس جدید کی طرح عملی سائنس کے لیے معمل، لوہاری اور نجاری کے لیے کارگاہیں، جلد سازی، ڈرائنگ اور مجسمہ‌سازی اور آرٹ کے لیے کمرے موجود تھے - پرندوں، مچھلیوں اور بہت سے مفید پالتو جانوروں کی رہائش کا انتظام تھا - مدرسے کی عمارت کے چاروں طرف جنگل اور باغات تھے - اور کاشت کے لیے زمین چھوٹی ہوئی تھی جس میں طلبہ باغبانی کرتے، ترکاریاں بوتے، اور انھیں اپنے باورچی خانے میں استعمال کرتے تھے - پھر کیا عجب ہے کہ اس مسرت بخش اور صحت افزا ماحول میں رہ کر، جہاں ان کو محض کتابوں کے مطالعے میں دیدہ‌ریزی کرنے

ہوجاتی ہے - ایک وہ زمانہ جب وہ شیرخوارگی سے لڑکپن میں
داخل ہوتا ہے اور اس کی عمر چھ یا سات سال کی ہوتی ہے
اور دوسرا جب وہ لڑکپن کے زمانے سے گزر کر بلوغ کی منزل میں
قدم رکھتا ہے - ان دونوں زمانوں میں اس کی طبیعت کا توازن
ڈانواں ڈول ہوجاتا ہے - کیونکہ اس کی زیادہ تر قوت جسم کی
نشو و نما میں صرف ہوتی ہے اور وہ اپنے تعلیمی مشاغل کی
طرف پوری توجہ نہیں کرسکتا - اس وقت فطرت شناس معلم
کا فرض ہے کہ وہ اس نفسی ارتقاء کے عمل کو پہچانے اور درسی
کاموں پر زیادہ زور نہ دے - اکثر اوقات ہندوستانی طلبہ کی
صحت اس وجہ سے بہت خراب ہوجاتی ہے کہ اس خاص زمانے
میں جب جسمانی ورزشوں کھیلوں اور کھلی ہوا کی ضرورت
ہوتی ہے وہ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے لیے حد سے زیادہ
دماغی محنت کرتے ہیں جس سے ان کی جسمانی نشو و نما
رک جاتی ہے اور ان کو بسا اوقات اعصابی امراض لاحق ہوجاتے
ہیں - تعلیمی حکام کا یہ فرض ہے کہ وہ علاوہ مندرجہ بالا
تدابیر اختیار کرنے کے جن کا تعلق صحت کے قائم رکھنے سے ہے
طبی معائنہ اور علاج کا معقول انتظام کریں اور وقتاً فوقتاً یہ
معلوم کرائیں کہ کس قدر طلبہ آنکھ، کان، ناک اور حلق وغیرہ کے
امراض میں مبتلا ہیں - والدین اور استادوں کو ان بیماریوں
کے علاج میں مستقل کوشش کرنی چاہیے کیونکہ یہ نہ صرف
جسمانی صحت کی بیخ کنی کرتی ہیں بلکہ طلبہ کی
تعلیمی ترقی میں بھی حارج ہوتی ہیں - اس بحث کو ہم
ایک ایسے مدرسے کے ذکر پر ختم کرتے ہیں جہاں بغیر حکم
یا پبلک کی کسی خاص امداد کے ایک دھن کے پکے معلم

خوراک ، سیر و سیاحت وغیرہ کا کوئی معقول انتظام نہیں ' غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ یہ تمام باتیں ہندوستان جیسے مفلس ملک کے لیے اسراف میں داخل ہیں گو مغربی ممالک میں یہ نظام تعلیم کا جزو بن گئی ہیں - سچ پوچھیے تو اس قسم کی تعمیری اور اصلاحی کوششوں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت انہیں ممالک میں ہوتی ہے جو افلاس اور جہالت اور امراض کا شکار ہیں اور ان کے لیے یہ تعمیری کام ہرگز فضول خرچی میں شامل نہیں - لہذا جسمانی تربیت کا مسئلہ ایک وسیع مسئلہ ہے جس کے بہت سے پہلو ہیں - اس کے لیے طلبہ کی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عام معاشری بود و باش کی اصلاح درکار ہے - لوگوں کے ماحول کو زیادہ صحت افزا بنانے کی ضرورت ہے یعنی گاؤں اور قصبوں میں صفائی اور حفظان صحت کا انتظام کرنے کی اور بڑے شہروں میں علاوہ صفائی کے اہل شہر کے لیے تازہ اور کھلی ہوا مہیا کرنے کی ضرورت ہے جہاں وہ اپنی تنگ و تاریک گلیوں اور گھروں سے نکل کر تفریح کرسکیں اور بچوں کو کھیلنے کودنے بھاگنے دوڑنے کے لیے جگہ ملے - مدرسوں کی تعلیم میں عملی اور فعلی عنصر کا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے جسم اور دماغ دونوں سے کام کرنا سیکھیں اور دستکاریوں کے ذریعے ان کے ہاتھ کی تربیت ہو - جو تعلیم حاصل کرنے کا ایک نہایت اہم ذریعہ ہے - طلبہ کے لیے کھیل اور ورزش کا بھی مناسب انتظام ہونا چاہیے تاکہ عمر کے اس نازک زمانے میں ان کی جسمانی نشو و نما معطل نہ ہونے پائے - درسی زندگی کے دوران میں دو منزلیں ایسی آتی ہیں جب طلبہ کی نشو و نما خاص طور پر تیز

سے زیادہ مقامی حکام اور بلدے پر عائد ہوتی ہے - اسی لیے ہم نے یہاں حکومت کے لفظ کو اس کی عمومی معنی میں استعمال کیا ہے جس میں یہ سب جماعتیں شامل ہیں - ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ان جماعتوں نے اس کام کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں کی - توجہ ضرور کی ہے اور کہیں کہیں ان باتوں کا انتظام بھی کیا گیا ہے لیکن کسی بڑے پیمانے پر کوئی ایسی تحریک نہیں اُٹھائی گئی کہ اتنے بڑے ملک کے شایاں شان ہوتی جس میں حکومت اور جمہور دونوں متفق ہوکر اس زبردست مسئلے کو بحیثیت مجموعی حل کرنے کی کوشش کرتے - تعلیمی حکام اور معلموں نے مدرسے کے امکانات سے فائدہ نہیں اُٹھایا - ایک تو انھوں نے نصاب تعلیم کو اس قدر مجرد اور نظری بنا دیا ہے کہ جیسا ہم نے اوپر بتایا ہے بچوں کو وہاں اپنی جسمانی نشو و نما کا موقعہ نہیں ملتا - اس میں عملی اور تخلیقی مشاغل کی بہت کمی ہے اور دستکاری' جس کے بہت سے تعلیمی فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ان کو صحت افزا کام میں لگاتی ہے ' اس میں بطور ایک اہم عنصر کے شامل نہیں ہے - دوسرے اکثر مدرسوں میں کھیلوں اور ورزشوں کا کوئی مناسب اہتمام نہیں ہے اور باوجود اس تاکید کے جو آج کل کھیل کے متعلق کی جاتی ہے واقعہ یہ ہے کہ بہت سے مدرسوں میں طلبہ باقاعدگی کے ساتھ کھیلوں میں حصہ نہیں لیتے - صرف چند طلبہ جو اچھے کھلاڑی ہوتے ہیں وہ نمائشی اغراض کے لیے کھیلتے ہیں باقی سب کھڑے تالیاں بجاتے ہیں ' یا گپ شپ میں وقت ضائع کرتے ہیں - پھر محکمۂ تعلیم کی طرف سے طبی معائنہ غریب بچوں کی

کو اسی وجہ سے بہت نمایاں اہمیت دی گئی ہے کہ ان میں جسم و دماغ کے اتحاد عمل کا امکان بہت زیادہ ہے اور باقی تمام مضامین کی تعلیم میں بھی مختلف قسم کے کاموں کو جو بچے کے اظہار خودی میں مدد دیتے ہیں مثلاً نقشہ کشی' ڈرائنگ ' تحریری مشقوں وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے -

ہندوستان میں تربیت جسمانی کا مکمل اہتمام کرنے کے لیے والدین ' استادوں ' حکومت اور تعلیمی حکام کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے اور جب تک وہ سب ایک مفید مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس عظیم‌الشان تعمیری تحریک میں حصہ نہ لیں گے کامیابی ممکن نہیں کیونکہ موجودہ صورت حال ان سب کی غفلت اور بےتوجہی کا نتیجہ ہے - طلبہ کی بیشتر تعداد ایسے مفلس اور نادار گھروں سے آتی ہے جہاں نہ انہیں مناسب غذا ملتی ہے ' نہ ان کے آرام و تفریح کا انتظام ہے ' نہ اصول حفظان صحت کی پابندی ہوتی ہے - لیکن اس کی وجہ محض افلاس نہیں' جہالت اور عدم احساس بھی ہے ورنہ غریبوں کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے مکانوں کو ایک حد تک صاف رکھیں اور مقابلتاً زیادہ مقوی اور زود ہضم غذائیں استعمال کریں - اس صورت حال کے پیدا کرنے میں حکومت کی ذمہ‌داری یہ ہے کہ اس نے وہ تدابیر اور وسائل اختیار نہیں کیے جو دوسرے ملکوں میں صحت عامہ کے تحفظ کے لیے استعمال کیے گئے ہیں یعنی لوگوں کی تفریح اور بچوں کے کھیلنے کے لیے پارک اور میدان بنانا ' شہروں اور گاؤں کی صفائی کے لیے اہتمام اور پرچار کرنا ' بیماریوں کے انسداد کے لیے تدابیر سوچنا - ان فرائض کی ذمہ‌داری مرکزی حکومت

جسمانی اعضا اور ان کی حرکات و افعال سے کوئی تعلق نہیں- ادب ' جغرافیہ ' تاریخ اور سائنس وغیرہ کا مطالعہ اس حصے میں شامل کیا جاتا ہے اور مطالعے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ طلبہ کتابوں کو پڑھیں' اُستاد کا لکچر سنیں اور اس طرح یہ ''علوم'' براہ راست ان کے دماغ میں منتقل ہوجائیں - اس تعلیمی پروگرام کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ زندگی کی عملی کشمکش میں بےبس رہتے ہیں اور اپنے جسم و دماغ کی قوتوں کو اپنے عملی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال نہیں کرسکتے - اس حالت کی اصلاح کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ مدرسے میں ایسے تعلیمی وسائل مہیا کیے جائیں جو طلبہ کی جسمانی اور دماغی قوتوں کو بیک وقت دعوت عمل دیں اور ان کو ایسے مشاغل میں لگائیں جو ان کی خصوصیات جبلی مثلاً تجسس' خواہش تعمیر و تخلیق اور اشتراک عمل کو اظہار کا موقع دیں کیونکہ ان کی تسکین کے لیے بچوں کو عملی کام کرنے پڑتے ہیں جن میں ہاتھ اور دماغ کے درمیان ایک مستقل رشتہ قائم ہو جاتا ہے اس کی تفصیل ہم تعلیمی مشاغل کی بحث میں کرچکے ہیں- یہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جسم اور دماغ کی تربیت ایک دوسرے سے بےتعلق رہ کر نہیں ہو سکتی - جسم کو دماغ کا آلۂکار سمجھنا چاہیے جس کی وساطت سے وہ مادی دنیا کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کرتا ہے اور اس کو اپنے قابو میں لاتا ہے - حواس خمسہ اور اعضاے جسمانی کا یہ کام ہے کہ وہ انسانی تجربے کے ارتقاء کی رہنمائی اور اس کے اعمال اور مقاصد میں مطابقت پیدا کریں - مدارس جدید میں سائنس' عملی کام اور دستکاری

حاصل کرتا ہے وہ محض دوسروں کی باتیں سن کر یا ان کے کام دیکھ کر نہیں سیکھتا بلکہ وہ اپنے گرد و پیش کے دلچسپ اور گوناگوں مشاغل میں حصہ لیتا ہے ' ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے ' ضرورت کے مطابق اپنے حواس کے ذریعے مشاہدات اور معلومات جمع کرتا ہے ' اپنی دماغی استعداد کے بموجب فکر اور عقل سے کام لیتا ہے ' اپنی غلطیوں اور تجربوں سے سبق سیکھ کر اپنے طریقۂ عمل کی اصلاح کرتا ہے - اس طرح وہ جن مقاصد یا ضروریات کو پورا کرنا چاہتا ہے ان کے لیے اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام حواس و اعضا اور دماغ مل جل کر کام کرتے ہیں اور وہ نہ صرف ان مخصوص مقاصد کو حاصل کرتا ہے بلکہ اس کی عام دماغی اور جسمانی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے - اگر مدرسے میں بھی یہی تعلیمی اصول اختیار کیا جائے جس پر بچے اپنی جبلت کے تقاضے سے عمل پیرا ہوتے ہیں تو اس کی تعلیم اس طرح مصنوعی اور بےجان نہ رہے جیسی آج کل ہے - لیکن بد قسمتی سے معلموں نے طلبہ کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جس میں باہم کوئی ربط نہیں - ان کے نزدیک کچھ کام تو ایسے ہیں جن میں محض حواس و اعضا بالخصوص ہاتھ اور کان اور آنکھوں کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً لکھنا یا ڈرائنگ یا لکڑی کا کام - ان کے لیے کچھ ایسی مشقیں مقرر کردی گئی ہیں جن کو طلبہ بغیر کسی دلچسپی کے اور بغیر ان کا مقصد سمجھے دہراتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اُن خاص حرکات کو بطور ایک معمول کے سیکھ لیتے ہیں جن کی مثلاً لکھنے وغیرہ کے لیے ضرورت ہوتی ہے - باقی کاموں میں "دماغ" کی ضرورت پڑتی ہے جن کو ان معلموں کے خیال میں

حواس کی تربیت بھی مناسب طریقے پر نہیں ہوتی کیونکہ طلبہ ان کو اپنے پسند کیسے ہوئے مقاصد کی تکمیل کے لیسے اپنے دماغ کی نگرانی اور ہدایت میں استعمال نہیں کرتے - استاد اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مختلف حواس گویا علم کو دماغ تک پہنچانے کی نالیاں ہیں - علم کتاب میں موجود ہے اور آنکھ کے ذریعے طالب علم کے دماغ میں پہنچ جاتا ہے - یا وہ الفاظ میں پوشیدہ ہے اور کان کے ذریعے ان کے ذہن میں سرایت کر جاتا ہے ہم نے علم کا جو مفہوم اس کتاب میں پیش کیا ہے وہ اس خیال کے بالکل خلاف - علم اس طریقے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا جس طرح کوئی پیاسا آدمی نل کی ٹونٹی کھول کر اس میں جمع کیا ہوا پانی پی لیتا ہے - بلکہ اس کو اپنے جسم اور دماغ کی محنت اور کاوش کے ذریعے زمین سے کھود کر نکالنا پڑتا ہے - کبیر نے اپنے ایک دوہے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے جو سارے اصول تعلیم کا نچوڑ ہے :—

پد جوڑے ' ساکھی کہے سادھن پری گئی اوس
کاڑھا جل پیوے نہیں ' کاڑھ پین کی ہوس

(پد جوڑتا ہے ' ساکھی کہتا ہے ' اس کی عادت پڑ گئی ہے ' بھرا ہوا پانی نہیں پیتا ' بھر کر پینے کی ہوس ہے)

حواس علم کو ماحول سے دماغ تک اور دماغ سے ماحول تک لے جانے کا بنا بنایا ذریعہ نہیں ہے تحصیل علم اور تربیت حواس دونوں کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ طالب علم کسی با معنی اور دلچسپ شغل میں حصہ لے - بچہ اپنی زندگی کے ابتدائی چند سال میں جو مفید اور پائدار علم

دماغ تک اور دماغ کے احکام اعضاے جسمانی تک پہونچتے ہیں ' اور دوسری طرف دماغ کو ایسے مواقع ملتے رہیں کہ وہ جسمانی افعال کی نگرانی اور نگہداشت کر سکے - جو لوگ بچپن اور نوجوانی میں کھیلوں میں حصہ نہیں لیتے ' کسی قسم کی دستکاری یا عملی مشاغل میں شریک نہیں ہوتے وہ بڑے ہوکر نہ صرف جسمانی حیثیت سے " بے دست و پا " ہوکر رہ جاتے ہیں بلکہ اکثر عملی معاملات اور کار و بار میں جو دنیاوی زندگی کا جزو اعظم ہیں ' ان کا دماغ بھی اچھی طرح کام نہیں دیتا خواہ وہ کتنے ہی عالم اور پڑھے لکھے کیوں نہ ہوں - اس وجہ سے زمانۂ حال کے تعلیمی مفکرین " علم " اور " عمل " جسم اور دماغ جاننے اور کرنے کے باہمی تعلق کو تسلیم کرتے ہیں اور مدرسوں کی تعلیم میں ایسے مشاغل کو نمایاں اہمیت دیتے ہیں جن میں جسم اور دماغ کی نشو و نما ساتھ ساتھ اور ہم‌آہنگ طریقے سے ہوسکے -

تربیت جسمانی کے وسیع‌تر مفہوم میں انسانی حواس کی تربیت بھی شامل ہے اور جیسا ہم اوپر بتا چکے ہیں حواس کی صحیح تربیت کے بغیر دماغی تربیت ناقص رہ جاتی ہے - ہمارے مروجہ مدارس میں بھی ' باوجود اس بات کے کہ تعلیم بالکل انفعالی طریقے پر دی جاتی ہے ' طلبہ کو اپنے حواس سے کام لینا پڑتا ہے مثلاً معمولی درسی کاموں میں آنکھ اور کان دونوں ہر وقت کام آتے ہیں اور لکھنے میں ڈرائنگ اور نقشہ کشی میں' دستکاری میں ہاتھ کو استعمال کرنا پڑتا ہے - لیکن مدرسے کا کام جن اصولوں پر منتظم ہے ان کی وجہ سے ان

اور ذہن کے درمیان دماغ کا واسطہ نہ ہوتا تو ہمارے افعال و
اعمال اور ماحول کے درمیان وہ تعلق ہرگز قائم نہ ہو
سکتا جس کی وجہ سے ایک طرف ہم ماحول پر قابو
حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف خود اپنے افعال کو
منظم کرتے ہیں - اس کی توضیح کسی دستکاری کے
ذریعے ہوسکتی ہے - فرض کیجیے ایک طالب علم کسی لکڑی
کے ٹکڑے کا ایک قلمدان بنانا چاہتا ہے - وہ اس مقصد کی
تکمیل کے لیے پہلے لکڑی کاٹتا ہے - اس کو چھیل کر ہموار
کرتا ہے، پھر مختلف شکلوں اور لمبائی کے ٹکڑے کاٹ کر
ان کو جوڑتا ہے - اس شکل کے دوران میں دماغ برابر افعال
و حرکات کے درمیان "واسطے" کا کام دیتا ہے - ہر ہر قدم
پر حواس کے مشاہدات اور تاثرات کی مدد سے وہ محسوس
کرتا رہتا ہے کہ اب لکڑی کس حالت میں ہے اور اس کے
ساتھ کیا کرنا چاہیے - اس علم کی بنا پر وہ آگے بڑھتا ہے اور
مختلف اوزاروں کو استعمال کر کے لکڑی کی شکل بدلتا ہے -
ساتھ ہی وہ اپنے افعال سے لکڑی میں جو تبدیلیاں کرتا ہے ان
کی وجہ سے حواس کے مشاہدات بھی بدلتے جاتے ہیں - پہلے
لکڑی کھردری تھی، اب ہموار ہوگئی - پہلے ٹکڑا لمبا تھا
اب گول ہوگیا ہے وغیرہ - ان نئے مشاہدات کے مطابق وہ آگے
بڑھتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے افعال میں تسلسل
قائم رکھنا اور ان میں حالات کے مطابق تبدیلی کرنا دماغ کا
کام ہے جس کو وہ اسی صورت میں انجام دے سکتا ہے جب
ایک طرف نظام اعصاب کی صحیح تربیت کی جائے - کیوں
کہ اسی کے ذریعے ماحول کی خبریں حواس کی وساطت سے

لہذا ہم جسمانی تربیت کے متعلق کوئی ایسا نظریہ قائم نہیں کرسکتے جس کا تعلق محض جسم کی تربیت سے ہو بلکہ ہمیں قدیم یونانی عقیدے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کے مطابق جسم کی موزوں تربیت عقلی اور روحانی تربیت کے لیے لازم ہے - اس خیال کو حال کی تحقیقات سے بہت تقویت پہنچتی ہے اور نفسیات اور علم‌الاجسام دونوں کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نفسی اور جسمانی اعمال کا ایک دوسرے سے بہت قریبی اور گہرا تعلق ہے - اِس بحث کی تفصیل کی گنجایش نہیں - یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہے کہ نفسی اعمال کا انحصار بڑی حد تک جسم کے اُس حصے سے ہے جس کو دماغ کہتے ہیں اور یہ دماغ نظام اعصاب کے ذریعے باقی تمام جسم کی حرکات اور اعمال پر کچھ اس طرح حاوی ہے جس طرح بجلی گھر کا بٹن تختۂ شہر کی تمام روشنی پر حاوی ہوتا ہے - اگر نظام اعصاب کی مناسب اور موزوں تربیت نہ کی جائے گی تو دماغ جسمانی حرکات کی نگرانی بہ خوبی نہیں کر سکتا - دماغ کا کام یہ ہے کہ وہ جسمانی افعال اور ان محرکات کے درمیان رابطہ قائم کرے جو حواس کے ذریعے ماحول سے حاصل ہوتے ہیں - مثلاً ہم سڑک پر جا رہے ہیں کہ سامنے سے ہمیں ایک موٹر آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے - ہماری قوت باصرہ موٹر کی شکل کو جو ماحول کا ایک جزو ہے محرک عمل بنا کر نظام اعصاب کے ذریعے دماغ تک پہنچاتی ہے - وہاں سے دماغ ہمارے اعضا کو (اس خاص موقع پر پیروں کو) یہ حکم بھیجتا ہے کہ وہ ہمیں موٹر کے راستے سے ہٹا کر ایک طرف کر دیں - اگر جسم

برابر کا دخل ہے - یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے کہ تجربہ مثل ایک نقش کے ہے جو خارجی ماحول ہمارے دماغ پر براہ راست ' بغیر جسمانی افعال کے واسطے کے ' ثبت کر دیتا ہے - تجربے کے لیے ہمیشہ یہ شرط ہے کہ ہم کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اپنے ماحول کی اشیا کے ذریعے کوئی کام کریں - اس عمل میں دماغ ہمارے جسمانی افعال کی رہنمائی کرتا ہے اس کو انجام دینے میں ہمیں ماحول کی مزاحمت اور اشیا کے قدرتی خواص سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کا رد عمل ہمارے جسم اور دماغ دونوں پر ہوتا ہے - اس رد عمل کا نام تجربہ ہے - اس کی مثال ایک بڑھئی کے کام سے مل سکتی ہے مثلاً وہ ایک کرسی تیار کرنے کے لیے لکڑی کاٹتا ہے' اس کو صاف کرتا ہے ' اپنے اوزاروں کے ذریعے مناسب شکل کے ٹکڑے کاٹتا ہے ' ان کو جوڑتا ہے اور اپنی تیار کی ہوئی کرسی کا مقابلہ کرسی کے ذہنی تصور یا نمونے کی کرسی کے ساتھ کرکے اس میں ترمیم یا تبدیلی کرتا ہے - اس تمام سلسلۂ افعال میں اسے مفید تجربات حاصل ہوتے ہیں جن کی تحصیل میں جسم اور دماغ دونوں شریک ہیں - اس طرح اس کو لکڑی کے خواص کا جو علم ہوتا ہے وہ بےجان اور بےکار نہیں ہوتا جس کو وہ استعمال نہ کر سکے بلکہ اس کے ذریعے وہ اوزاروں سے کام لینے میں زیادہ ماہر ہو جاتا ہے ' آئندہ کرسیاں بنانے میں اُسے زیادہ سہولت ہوتی ہے اور اس کی سمجھ میں اضافہ ہوتا ہے - کس قدر کمزور اور بےفیض ہے اس کے مقابلے میں وہ علم جو ایک بچہ مدرسے میں " اسباق اشیا " (Object lessons) کے ذریعے حاصل کرتا ہے !

اسباق ، نہ مرتب علوم بلکہ وہ ذاتی اور فعالی تجربات ہیں جو ہم اپنی زندگی کے دوران میں حاصل کرتے ہیں اور جن میں جسم اور دماغ دونوں کی بیک وقت ضرورت ہوتی ہے - تجربے سے ہماری مراد ہے کوئی ایسا کام جس کا ہم پر ایک خاص اثر ہو اور ہم اس اثر کو قبول کریں اور اس کی وجہ سے ہمارے رویے اور اعمال میں کوئی ترمیم یا تبدیلی ہو جائے - اس کی وضاحت ایک معمولی سی مثال سے ہو سکتی ہے - اگر کسی بچہ کی اُنگلی میں ایک کانٹا چبھ جاتا ہے تو اسے تکلیف محسوس ہوتی ہے - یہ تکلیف یا تکلیف دہ "تجربہ" اس کے علم اور عمل دونوں کو مستقل طور پر متاثر کرتا ہے - آئندہ جب کبھی وہ اس قسم کے کانٹے کو دیکھے گا تو اس کی جانب اس کا رویہ پہلے کی طرح بےپروائی کا نہ ہوگا بلکہ اس کی نظر میں کانٹے میں ایک نئی اہمیت اور نئے معنی پیدا ہو جائیں گے - اس طرح اسے جس قدر مختلف تجربات کانٹوں کے متعلق ہوں گے اسی قدر وہ ان کے خواص اوو اثرات کو بہتر سمجھے گا اور اس کا یہ حقیقی علم اس کے رویے پر اثر ڈالے گا - جب ہم کہتے ہیں کہ تجربہ بہترین معلم ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں اپنے افعال اور ان کے نتائج کا تعلق سمجھ میں آجاتا ہے - جب ہم کسی طرح اپنے ماحول پر کوئی عمل کرتے ہیں تو ماحول کی طرف سے ہم پر اس کا رد عمل ہوتا ہے جس کا نتیجہ ہمارے دماغ میں محفوظ رہتا ہے اور اس طرح ہم نئی باتیں اور نئے کام سیکھتے ہیں - پس معلوم ہوا کہ تجربہ محض ذہنی یا دماغی چیز نہیں بلکہ جسم اور دماغ دونوں کو اس میں

بالکل خاموش اور بےحس و حرکت بیٹھے رہیں - یہاں تک کہ اُستاد کی صورت پر آنکھیں جمائے بت کی طرح خاموش بیٹھا رہنا توجہ اور انہماک کی علامت سمجھا جاتا تھا - لیکن یہ اصول تعلیم بچوں کے جبلی رجحانات کے بالکل خلاف ہے - کیونکہ جب بچہ مدرسے میں آتا ہے تو اپنا جسم اپنے ساتھ لاتا ہے اور اسے کام کرنے ' نقل و حرکت کرنے ' چیزوں کے توڑنے اور بنانے کی خواہش ہوتی ہے - لیکن مدرسوں کا معمول یہ چاہتا ہے کہ وہ بےحس و حرکت اپنی جگہ پر بیٹھا لکھتا پڑھتا رہے - اس لیے بچے کے نفس میں ہر وقت ایک کشمکش رہتی ہے - اس کی فطرت میں ولولۂ عمل اور اظہار خودی کی خواہش ہوتی ہے اور اُستاد یہ چاہتے ہیں کہ وہ اسے دبا کر رکھیں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے مقررہ کام پر پوری توجہ نہیں کرتا - اس کا دماغ پریشان اور منتشر رہتا ہے اور اس میں انہماک کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی - یہ صورت حال سب بچوں کے لیے مضر ہے' کیونکہ جو ان میں سے فطرتاً زیادہ تیز اور چلبلے ہوتے ہیں وہ اکثر اس خلاف فطرت ضبط سے گھبرا کر موقع پاتے ہی اپنی خواہش عمل کا اظہار ایسی شرارتوں میں کرتے ہیں جن کی وجہ فرض شناس اُستادوں کی سمجھ میں نہیں آتی - رہے وہ بچے جن کی طبیعت مقابلتاً سکون پسند اور خاموش ہوتی ہے وہ اس جمود اور انفعالیت کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ان کا ولولۂ عمل ہی پژمردہ ہو جاتا ہے اور وہ کوئی ہاتھ کا کام یا جسمانی فعل اعتماد اور خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں کر سکتے - حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کا سرچشمہ نہ کتاب ہے ' نہ درسی

کرسکتا ھے - مدرسین اور ماھرین تعلیم دونوں نے عرصے تک اس تعلق کو تسلیم ھی نہیں کیا بلکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رھے کہ جسم ایک حد تک دماغی تربیت کے راستے میں حائل ھے - اس کا اثر مدرسے کی تعلیم پر بہت برا پڑا - اس کی وجہ سے نہ صرف جسمانی تربیت کے طرف سے غفلت برتی گئی بلکہ درسی اور دماغی تعلیم بھی بہت ناقص اور ناکامیاب رھی' کیونکہ انھوں نے علم حاصل کرنے کو محض ایک دماغی یا ذھنی فعل سمجھ لیا جس کا جسمانی افعال سے کوئی تعلق نہیں - وہ "علم" کو ایک خاص منطقی تربیت کے ساتھ' کتابوں اور سبقوں کی شکل میں' طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے جو ان کے خیال میں کسی نا معلوم دماغی عمل کے ذریعے اس کو "حاصل" کر لیتے تھے - واقعہ یہ ھے کہ اگر وہ اس "تحصیل" میں کسی طرح کامیاب بھی ھو جاتے تھے تو محض اس حد تک کہ وہ تمام معلومات کو ایک انفعالی طریقے پر اپنے حافظے میں جمع کر لیتے تھے - اس تحصیل کے دوران میں کوئی حقیقی "تجربات" حاصل نہیں ھوتے تھے جو ان کے افعال و کردار پر مستقل اثر ڈالیں - وہ جسمانی اعمال کی اھمیت کو نہیں پہچانتے تھے اور ان کو یہی خیال تھا کہ دماغ ایک مستقل اور قائم بالذات چیز ھے جو عقل اور علم کا گھر ھے اور اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں - اور جسم ایک مادی چیز ھے جو اکثر علم اور معرفت حاصل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ھے - اس خیال کا عملی اظہار اس طرح ھوتا تھا کہ اُستاد ھمیشہ طلبہ کو تنبیہ کرتے رھتے کہ وہ مدرسے میں کوئی شور و غل نہ کریں' بلکہ آواز بھی نہ نکالیں -

عزم کو اس قدر واضح بنائے کہ باوجود جسم کی کمزوری کے وہ اپنے مقاصد کی تحصیل میں لگا رہے - لیکن ایسا صرف خاص خاص اور مستثنیٰ صورتوں میں ہو سکتا ہے ؛ عام لوگوں کے لیے جسمانی تربیت ناگزیر ہے -

ہم نے تعلیم کا جو مفہوم اس کتاب میں پیش کیا ہے اس کی رو سے معلم کو صرف بچوں کی دماغی نشو و نما ہی سے سروکار نہیں بلکہ اسے ان کی پوری شخصیت کی تربیت کرنی ہے جس میں جسم اور دماغ اور روح سب شامل ہیں کیونکہ ان سب کا ایک دوسرے سے نہایت قریبی تعلق ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ انسان کی ہستی کے ' جس میں وحدت کی کارفرمائی ہے ' مختلف رخ یا پہلو ہیں - لہذا تربیت کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسان کے جسم کی تربیت الگ کی جائے اور اس کے دماغ کی الگ اور اس کی روحانی تسکین کے ذرائع علیحدہ فراہم کیے جائیں - یہ تو گویا تین جداگانہ مسئلے ہو جائیں گے - تربیت کا مسئلہ ایک ہے اور اس کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا - وہ مسئلہ یہ ہے کہ مدرسے میں اور معاشری دنیا میں ایسے انتظامات کیے جائیں کہ ایک ہی وقت میں بچے کے جسم اور دماغ اور روح کی تربیت ہو یا یوں کہنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک کی تربیت دوسروں کی تربیت میں معین ہو ؛ رکاوٹ پیدا نہ کرے - اس وجہ سے معلم کے لیے جسم اور دماغ کے صحیح تعلق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ انسانی تربیت کے متعلق کوئی صحیح تصور یا نظریہ قائم نہیں کر سکتا اور نہ درسی مشاغل کی صحیح تنظیم

کی خرابی صحت کی ذمہ‌داری مدرسوں پر بھی عائد ہوتی ہے - بالعموم جو طلبہ ہائی اسکول یا کالج سے فارغ‌التحصیل ہوکر نکلتے ہیں ان کی صحت بالکل خراب ہو جاتی ہے - زرد رنگ ' دھنسی ہوئی آنکھیں ' وقت سے پہلے ضعیفی کے آثار ' بدن میں خون کی کمی' پست ہمتی' افسردہ دلی ' محنت اور ہاتھ کا کام کرنے سے جی چرانا ' زندگی کے معرکوں میں شریک ہونے سے تامل ' یہ تمام باتیں آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں- بنگال کے طلبہ کے متعلق سیڈلر کمیشن کو یہی شکایت تھی - جسمانی نشو و نما کے معطل ہو جانے سے قومی سیرت اور ذہانت پر جو تباہ کن اثر پڑا ہے اس کا پورا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ قوت برداشت ' اور قوت حیات جس کو برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) انسانی سیرت کا جزو لازم قرار دیتا ہے ہندوستانیوں میں بہت کم ہوگئی ہے اور ان میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہی کہ وہ بڑے بڑے کاموں کو ہمت اور حوصلے کے ساتھ کریں اور ان کے راستے میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی اور مستعدی کے ساتھ برداشت کریں - موجودہ زندگی جد و جہد اور جفا کشی کی طالب ہے اور اس میں کامیابی کے لیے حوصلہ اور استقلال شرط ہے - ان تمام صفات کی تربیت کا ایک اہم جزو جسمانی نشو و نما اور صحت ہے - اگر لوگوں کی صحت عام طور پر خراب ہوگی یا ان میں جسمانی طاقت نہ ہوگی تو وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے اور اُن کے سامنے ہمت ہار دیں گے - ممکن ہے کوئی شخص اپنی قوت ارادی کو اس قدر مضبوط ' اپنے

باوجود تمام مشکلات کے بچوں کی صحت خراب نہیں ہونے پائی بلکہ باقاعدہ علاج اور صحت افزا مقامات میں رہنے کی بدولت ان بچوں کو جو جنگ کے زمانے میں مفلسی اور ناداری کی وجہ سے اپنی صحت اور تندرستی بالکل کھو چکے تھے، گویا نئی زندگی حاصل ہوگئی -

لیکن اسی زمانے میں جب دوسرے ملکوں میں برابر ترقی ہوتی رہی ہے ہمارے ملک میں لوگوں کی صحت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے - اس کی طرف نہ تو پبلک نے کماحقہ توجہ کی ہے نہ حکومت نے - اور اسی وجہ سے اس شدید خطرے کے تدارک کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا - ہمارے سامنے کسی تعلیمی کمیشن کی تحقیقات کے نتائج اور اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن سے یہ بات ثابت کی جاسکے کہ قوم کی جسمانی حالت کیا ہے - لیکن تجربے اور مشاہدے کی شہادت اور باخبر اشخاص کی رائے اس بارے میں اس قدر واضح ہے کہ ہمیں اعداد و شمار کی ضرورت نہیں - اگرچہ ہمارے ملک میں ابھی تک صنعت و حرفت کے مضر نتائج اس حد تک ظاہر نہیں ہوئے جس حد تک مغرب میں ہوئے ہیں اور اب بھی ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ گاؤں اور دیہات میں رہتا ہے اور کاشتکاری وغیرہ میں مصروف ہے - لیکن قومی صحت کا زوال برابر جاری ہے - دیہاتوں کی صحت کی خرابی کی وجہ زیادہ‌تر ان کی جہالت اور ان کے طریقۂ بود و باش کی گندگی ہے جس کی بدولت ان میں آئے دن بیماریاں پھیلتی رہتی ہیں اور بچوں کی صحت بالعموم خراب رہتی ہے - لیکن شہریوں اور بالعموم تعلیم یافتہ طبقے

ان کی جسمانی صحت یعنی وزن ' قد ' حواس خمسہ اور عام صحت کے متعلق اعداد و شمار فراہم کیے گئے تو معلوم ہوا کہ اوسطاً ہر لحاظ سے ۱۹۲۵ع میں طلبہ کی صحت ۱۹۱۴ع کے مقابلے میں بہتر ہے حالانکہ اس دس سال کے عرصے میں ملک ' جنگ یورپ کے خوفناک دور سے بھی گزر چکا تھا جس میں بعض اوقات غریبوں کے بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا اور کھلی ہوا میں کھیلنا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا - اس جسمانی ترقی کا سہرا صرف مدرسوں ہی کے سر نہیں ' کیونکہ اس میں حکومت کے قوانین حفظ صحت کو اور کارخانوں وغیرہ کے ماحول کی درستی کو بھی بہت دخل ہے ' لیکن اس میں شک نہیں کہ مدرسوں میں علمی اور اور فعالی تعلیم کے اثر سے ' کھیلوں پر زور دینے اور بچوں کو کھلی ہوا میں رکھنے کی وجہ سے اور جسمانی امراض اور کمزوریوں کی مناسب نگہداشت اور روک تھام کی بدولت انگریزوں نے باوجود صنعت و حرفت کے ناساز ماحول کے اپنی قوم کی جسمانی حالت کو نہ صرف سنبھال لیا ہے بلکہ اس میں برابر ترقی ہو رہی ہے اور یہی حال کم و بیش دوسری مغربی قوموں اور جاپان کا ہے جنھوں نے جسمانی تربیت کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کے لیے مناسب تدبیریں اور ذرائع اختیار کیے ہیں جرمنی میں جنگ یورپ کے بعد ہمارے دیکھتے دیکھتے اس خاص شعبے میں بڑا انقلاب ہو گیا ہے اور جرمنوں نے فوجی تعلیم کے بجائے جس کی انھیں ممانعت ہوگئی تھی ' اپنے مدرسوں میں کھیل ' ورزش سیر و سفر اور کھلی ہوا میں رہائش کو اس قدر رواج دیا ہے کہ

پیدا ہی کم ہوتی تھیں اور جب ہوتی بھی تھیں تو ان کی طرف فوراً توجہ کی جاتی ہے۔ لیکن تعلیمی حکام نے مسئلہ اس منفی نقطۂ نظر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حتی المقدور ہر طرح سے بہتر سمجھے گئے اور بہت سے ایسے وسائل اختیار کیے جن کے ذریعے بچوں کی صحت بہتر ہوسکے اور انکی جسمانی نشو و نما میں کوئی رکاوٹیں حائل نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ تمام مدارس میں حفظانِ صحت کا انتظام شامل کیا گیا۔ ملک میں جا بجا بچوں کے شفاخانے قائم کیے گئے؛ نادار طلبہ کی خوراک کا انتظام کیا گیا؛ کھیلوں اور ورزشوں کے لیے میدان مہیا کیے گئے؛ چھوٹے بچوں کے لیے تربیت گاہیں اور مریضوں کے لیے کھلی ہوا کے مدرسے قائم کیے گئے جن میں دستکاری ورزش اور صحت افزا مشاغل کو کتابی تعلیم کی نسبت بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ۱۹۴۴ء کے تعلیمی ایکٹ میں، جو مسٹر بٹلر [illegible] کے نام سے منسوب ہے اور جس کو انگلستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک معرکۃ الآرا حیثیت حاصل ہے، ان سب چیزوں کی ضرورت کو صراحت کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے اور اگرچہ مالی مشکلات کی وجہ سے تمام تجاویز پر فراخ دلی کے ساتھ عمل نہیں ہو سکا لیکن حکومت اور پبلک کی متفقہ کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ انگلستان کی نئی نسلوں کی صحت گذشتہ صدی کی نسبت کہیں بہتر ہو گئی ہے۔ اس کا ایک نہایت قطعی اور یقینی ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جب ۱۹۳۹ء میں لندن کاؤنٹی کاؤنسل کی تحریک پر وہاں کے تمام ابتدائی مدارس کے طلبہ کا طبی معائنہ کیا گیا اور

رھتے ھیں بلکہ اُن کی جسمانی صحت اور طاقت اور
اخلاقی قوت ضبط بھی زائل ھو جاتی ھے -"[۱]

ابتدا میں لوگ صنعت و حرفت کے نئے کمالات اور
مادی ترقی سے اس قدر مرعوب اور مسحور تھے کہ انھوں نے
اس کے تباہکن نتائج کی مطلق پرواہ نہ کی لیکن رفتہ رفتہ
اس کے مجموعی اثرات اس قدر بڑھے کہ لوگوں کو ادھر توجہ
کرنی پڑی - خصوصاً جس زمانے میں فوجی حکام بوئروں کی
جنگ کے لیے والنٹیر بھرتی کر رھے تھے انھیں یہ اندازہ ھوا کہ
قوم کی صحت اور جسمانی طاقت بالکل تباہ ھوگئی ھے[۲]
اس صدی کے آغاز میں ایک شاھی کمیشن مقرر کیا گیا
جس کا کام یہ تھا کہ وہ تربیت جسمانی کے مسئلے پر غور کرکے
اپنی تجاویز پیش کرے- اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس
امر پر زور دیا کہ قومی صحت اور قوت کے قیام کا بہترین طریقہ
یہی ھے کہ مدرسوں میں بچوں کی تربیت جسمانی کا
مناسب انتظام کیا جائے اور یہ رائے دی کہ بچوں کے طبی
معائنے اور علاج کا اھتمام نہایت ضروری ھے - طبی معائنے کا
انتظام کرنے سے ایک فائدہ یہ ھوا کہ انگلستان کے مدرسوں میں
اب بہت سی وہ بیماریاں نہیں پائی جاتیں جو پہلے بچوں
میں بہت عام تھیں اور انکی جسمانی اور دماغی تربیت
میں حائل ھوتی تھیں، مثلاً آنکھ کان ناک اور گلے کی بیماریاں-
اول تو عام حالت کی درستی کی وجہ سے یہ بیماریاں

۱- Schools and the Nation

۲- Mackenzie : Problems of National Education

مدتک کے صنعت و حرفت کے لیسے نظام نے عوام کی زندگی پر بہت انقلاب آفریں اثر ڈالا تھا جیسا ہم باب چہارم (حصہ اول) میں بتا چکے ہیں اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے وہ حالات بالکل بدل گئے ہیں جن میں مزدور پہلے کام کرتے تھے - زراعت اور کاشتکاری کو چھوڑ کر بیشتر لوگوں نے کارخانوں اور صنعت و حرفت کے بڑے بڑے مرکزوں میں کام کرنا شروع کردیا - صفائی اور آب و ہوا کے لحاظ سے ان کا یہ ماحول نہایت ہی مضر بلکہ مہلک تھا اور اس میں ان کی تندرستی کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی - بجائے کھلی ہوا اور فطرت کے صحت افزا ماحول میں کام کرنے کے وہ تمام دن اور بعض اوقات تمام رات تنگ و تاریک مکان اور کوٹھریوں میں بند رہتے تھے پھر کام کی نوعیت بھی ایسی تھی جو ان کی جسمانی صحت، ان کے اعصاب اور نظر بلکہ ان کی دماغی صحت کے لیے بھی مضر ثابت ہوتی تھی - اس پر طرہ یہ کہ عورتیں اور نوعمر بچے بھی اسی مصیبت میں گرفتار تھے اور اس طرح نئی نسلوں کی صحت خراب ہوتی جاتی تھی - اس انقلاب کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ لوگ بجائے دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں رہنے کے بڑے بڑے صنعتی علاقوں میں آکر بس گئے اور وہاں آبادی کا اس قدر ہجوم ہوا کہ لوگوں کو رہنے کے لیے مناسب مکانات نہیں ملتے تھے - اس کا اثر عام صحت اور اخلاقی حالت پر بہت برا پڑا - بقول کرشن سٹائنر (Kershensteiner) کے :-

"اس زمانے کے شہروں میں ہزاروں، لاکھوں آدمی نہ صرف فطرت کی پر اسرار زندگی سے ناواقف اور بے تعلق

میں بہت سی صحت افزا ورزشیں اور کھیل مروج تھے مثلاً کشتی، پھری گتکا، مگدر، شمشیر زنی اور نیزہ بازی - ان میں لوگ بہت خوشی کے ساتھ شریک ہوتے تھے انہیں اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھتے تھے - مگر جب تنزل انتہا کو پہنچ گیا تو درباریوں اور امرا اور ان کی دیکھا دیکھی عام لوگوں نے بھی ان مردانہ ورزشوں کو ترک کرکے مرغ‌بازی، بٹیر بازی، اور پتنگ بازی کو اپنا مشغلۂ تفریح بنا لیا - جس وقت مغربی تعلیم کا ہندوستان میں رواج ہوا ہے اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مذہبی جماعتوں اور علما نے تعلیم کو محض مذہبی علوم تک محدود کردیا تھا - اور جسمانی تربیت کی طرف سے نہ صرف بےپروا بلکہ اس کے مخالف تھے اور عام طور پر مردانہ ورزشوں اور کھیلوں کا رواج اٹھ چکا تھا اور اس قسم کا ''لہو و لعب'' رائج ہوگیا تھا جو صریحاً زوال پسندی کی علامت ہے اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی لوگوں کی بالخصوص شہر میں رہنے والوں کی صحت اور جسمانی حالت خراب ہونی شروع ہوئی اور اس کا کوئی بروقت تدارک نہیں ہوسکا -

مغربی ممالک میں بھی بعض حالات کی وجہ سے گزشتہ صدی میں یہی صورت پیش آئی تھی اور عام لوگوں کی جسمانی صحت بہت خراب ہونی شروع ہوگئی تھی - اگر اس خرابی کو دور کرنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو وہاں کی حالت ہندوستان سے بھی بدتر ہوتی - ہمارے لیے ان حالات کا مطالعہ مفید ہے کیونکہ اس سے ہمارے اپنے مسائل پر روشنی پڑتی ہے - انگلستان میں مثل دوسرے

تو روحانی ریاضت کرنے والے راہبوں کی تعلیم تھی جس میں
نہ صرف جسمانی تربیت کو نظر انداز کیا جاتا تھا بلکہ
جسمانی خواہشات اور ضروریات کو بھی دبانے کی کوشش ہوتی
تھی اور کم سے کم اصولاً پوری توجہ دماغی اور روحانی تربیت
پر صرف کی جاتی تھی۔ دوسری طرف جنگجو سورماؤں
کی تعلیم تھی جس میں ذہنی تربیت کو تقریباً بالکل
نظرانداز کرکے سارا وقت جسمانی تربیت اور فوجی ورزشوں میں
صرف ہوتا تھا۔ اسلامی تہذیب میں ابتدا ہی سے جسمانی
تربیت کی اہمیت ایک مسلمہ امر سمجھی گئی۔ اول تو
اسلام کی نشو و نما ایک ایسے متحارب ماحول میں ہوئی
تھی کہ مسلمانوں کو شروع ہی سے اپنے بقائے حیات کے لیے
جنگ و جدال کرنی پڑی جس کی خاطر ان کو فنون جنگ
سے واقف ہونا اور اپنی جسمانی طاقت کو قائم رکھنا ضروری
تھا۔ دوسرے مذہب کی حیثیت سے بھی اسلام روح اور جسم
کے تضاد کا قائل نہیں بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کا معین
اور شریک کار سمجھتا ہے۔ چنانچہ جب تک اسلامی تہذیب
کے عروج کا زمانہ رہا، مسلمانوں نے کبھی جسمانی تربیت
کو حقیر و ذلیل نہیں سمجھا۔ البتہ جب زوال کا دور آیا اور
تعلیم تنگ خیال مذہبی گروہ کے ہاتھ میں آگئی تو اس نے
جسم اور روح کے قدیم تناقض کو دوبارہ زندہ کیا اور لوگوں کو یہ
تعلیم دی کہ انہیں جسم کی طرف توجہ نہیں کرنی
چاہیے کیونکہ وہ نفسانی خواہشات کا مرکز ہے اور روحانی
ترقی کے راستے میں حارج ہے۔ لیکن باوجود اس کے
ہندوستان میں عہد مغلیہ کے آخر تک شرفا کے طبقے

ہم‌آہنگ نشو و نما نہ ہوگی انسانی سیرت میں پختگی نہیں آ سکتی اور انسان اپنی قوتوں کو فعل میں نہیں لاسکتا - ارسطو کا یہ نظریہ تھا کہ انسان کی شخصیت ایک مکمل وحدت ہے جس کے دو پہلو ہیں، جسم اور دماغ، اور ان دونوں کی تربیت ہم‌آہنگ ہونی چاہیے - اسی وجہ سے یونانیوں نے جسمانی تربیت کو بھی ایک فن لطیف بنا دیا تھا اور ان کی نظر میں ایک مریض یا کمزور، یا بےڈھنگے قسم کا آدمی بھی اتنا ہی ذلیل تھا جیسا ایک جاہل اور بےوقوف آدمی! قدیم روما میں بھی جسمانی تربیت کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی لیکن رومیوں کے یہاں، خاص ملکی حالات کی وجہ سے اس کا مقصد کچھ اور ہوگیا تھا یعنی وہ عام انسانی تربیت کا جزو نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ تندرست شہریوں کو کامیاب اور جنگ‌جو سپاہی بنانے کا ذریعہ بن گئی تھی - قدیم ہندو تہذیب میں ایک حد تک تربیت جسمانی کی ضرورت کا احساس موجود تھا چنانچہ چھتریوں کے لیے جسمانی اور فوجی ورزش لازمی قرار دی گئی تھی - لیکن ان کے یہاں سوسائٹی مختلف طبقوں میں تقسیم تھی اور ہر ایک طبقے کے لیے جداگانہ تربیت تجویز کی گئی تھی یعنی برہمنوں کے لیے مذہبی اور ذہنی، چھتریوں کے لیے جسمانی اور فوجی تربیت، اور ویشوں کے لیے کاروباری - اس نظام تعلیم میں اگر صریحاً نہیں تو ضمناً، جسم اور دماغ کا وہ تناقض تسلیم کیا گیا ہے جس کو موجودہ نظریۂ تعلیم نے مسترد کر دیا ہے - قرون وسطیٰ میں، جب یورپ میں نظام جاگیرداری کا زور تھا تو وہاں بھی اسی قسم کی تقسیم رائج تھی - ایک طرف

باب پنجم

"تربیت جسمانی"

تعلیم جدید نے مدرسوں میں جو مختلف تبدیلیاں پیدا کی ھیں ان میں سے ایک نہایت اہم تبدیلی تربیت جسمانی کے نظریے کی ھے - اب یہ امر دوبارہ تسلیم کرلیا گیا ھے کہ انسان کی مکمل تربیت اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے جسم کی مناسب نگہداشت اور نشو و نما کا انتظام نہ کیا جائے اور اس کو ذہنی اور روحانی اعمال کے لیے ایک مستعد خادم اور مفید آلۂ کار نہ بنایا جائے - ہم نے "دوبارہ" کا لفظ اس لیے استعمال کیا ھے کہ تقریباً تمام ملک اور تمام تہذیبیں ایک ایسے دور سے گزر چکی ھیں جب جسم کی اہمیت پورے طور پر محسوس کی جاتی تھی اور اس کی پرداخت کا باقاعدہ انتظام ھوتا تھا - قدیم یونانی تعلیم میں تربیت جسمانی کو وھی اہمیت حاصل تھی جو عقلی اور اخلاقی تربیت کو - جمناسٹک (جسمانی ورزش) اور موسیقی یونانی نظام تعلیم کے دو اہم ترین عناصر شمار ھوتے تھے - یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک جسم کی مکمل اور

اور معلموں دونوں کا فرض ہے کہ وقتاً فوقتاً مدرسوں کے نصاب پر تنقیدی نظر ڈال کر اس میں حسب ضرورت ترمیم کرتے رہیں -

---

زیادہ مفید ہے اور اس نقطۂ نظر سے مروجہ نصاب میں ترمیم اور تبدیل کرتے رہنا چاہیے - دوسری طرف فطرت اطفال کا مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم ان مضامین کو کس ترتیب اور اسلوب سے طلبہ کے سامنے پیش کریں کہ وہ ان کے روزمرہ کے تجربات کا جزو بن کر ان کی ذہنی تربیت میں معین ہوں - لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب معلموں کی تربیت میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وہ علوم کے باہمی تعلق کو پہچانیں اور ان سب کو انسانی زندگی کی تفسیر اور تشریح کا ذریعہ سمجھیں - نصاب خواہ کتنا ہی عمدہ ہو لیکن اگر معلم اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ ہر علم بجائے خود ایک مستقل چیز ہے جس کو نظری حیثیت سے حاصل کرنا طالب علم کا فرض ہے خواہ وہ اس کا مقصد اور مفہوم سمجھے یا نہ سمجھے تو نہ درسی مضامین میں ربط قائم ہوگا نہ ان سے زندگی کے مسائل پر روشنی پڑےگی بلکہ تعلیم جیسی خشک اور بےجان ہے ویسی ہی رہےگی - یہ ظاہر ہے کہ مضامین نصاب کی اضافی قدر و قیمت کا انحصار ہر قوم اور ہر تمدن کے اپنے اپنے معیار اقدار پر ہے لیکن انسانی اغراض و مقاصد اور تمدن کی ضروریات بہت کچھ مشترک ہیں اور ہم نے اس باب میں جن علوم سے بحث کی ہے وہی ہر ملک میں نصاب کے اہم‌ترین عناصر سمجھے جاتے ہیں - لیکن اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ نصاب کے مسئلے کا کوئی دائمی حل نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ہر نسل اور ہر زمانے میں از سر نو حل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور تعلیم کے متعلق نظری بحث کرنے والوں

مزدے کی داستان نہیں رہتی بلکہ حال کے زندہ مسائل
کی تفسیر بن جاتی ہے - ہمارے تمدن کے جو عناصر
ہمارے نصاب کا موضوع بن گئے ہیں ان کو تخیل کے
کرشمے سے اس طرح طالب علم کے ذاتی تجربے کا جزو
بنایا جا سکتا ہے کہ وہ قابلیت اور سلیقے کے ساتھ ہر
قسم کی انسانی ضروریات اور آرزوؤں کو سمجھ سکے - اور
ان تمام چیزوں کی قدرشناسی کرے جو زندگی کو معنویت
اور حسن کی دولت سے مالامال کرتی ہیں - جمہوری
سوسائٹی میں تہذیب کا صحیح مفہوم یہی ہے - تعلیم
کا جمہوری نصب‌العین یہ نہیں کہ ہر شخص کو کسی
ایک کام کے قابل بنادیا جائے بلکہ یہ ہے کہ ہر شخص
زندگی سے پوری طرح لطف‌اندوز ہو جس کا ترجمہ سیاست
کی اصطلاح میں یہ ہوگا کہ فرد کو زندگی' آزادی اور لطف
و مسرت کا حق حاصل ہو" - [1]

مختصر یہ کہ نصاب کی تدوین اور درسی مضامین کی
تنظیم و ربط کا مسئلہ تنگ اور اصطلاحی معنی میں تعلیمی
مسئلہ نہیں بلکہ اس کا تعلق علوم کی ماہیت اور سوسائٹی
کے تہذیب و تمدن اور فلسفۂ زندگی سے ہے - اس میں ہمیں
مختلف تمدنی اور نفسیاتی مسائل کو پیش نظر رکھنا
ضروری ہے - ایک طرف تو تمدن کی اہم ترین ضروریات کا
تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ کن مضامین اور علوم کا
مطالعہ نئی نسل کے بچوں اور نوجوانوں کے لیے سب سے

---

1. Modern Education Theories— صفحہ ۲۱۲ -

گی - برخلاف اس کے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس بات
کو تسلیم کریں کہ نصاب کا ہر مضمون زندگی کے ساتھ
وابستہ ہے اور ہمارا مقصد یہ ہو کہ اس کا اور انسانی
تجربے کا وسیع‌تر تعلق ظاہر کریں کہ اس اصول کی
رو سے تعلیم کے فن کی نوعیت اور منشا بالکل مختلف
ہو جاتا ہے - اگر ریاضی کو محض اعداد کے مجرد علاقے
ظاہر کرنے کے لیے نہ پڑھایا جائے بلکہ اس کے ذریعے یہ
بات طلبہ کے ذہن نشین کی جائے کہ ریاضی کا عملی
معاملات سے کیا رشتہ ہے اور اس کا تعلق ان بڑی بڑی
علمی تحقیقات اور انکشافات سے کیا ہے جنہوں نے ہمارے
تصور عالم میں انقلاب پیدا کر دیا ہے، اگر ریاضی کی
تعلیم اس طرح پر دی جائے تو اس کی نوعیت محض
فنی اور صوری نہ رہے گی بلکہ طلبہ کو اس سے دلی تعلق
پیدا ہو جائے گا - جب طلبہ کے سامنے سائنس کو اس
طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ جد و جہد کے اس مسلسل
عمل کو سمجھ سکیں جس کے ذریعے انسان نے فطرت کو
مسخر کیا ہے اور توہمات، تعصب اور تنگ‌نظری کی
بندشوں سے رہائی پائی ہے تو وہ محض عالم فطرت کی
کہانی نہیں رہتی بلکہ ارتقائے انسانی کے زبردست ڈراما
کا قصہ سناتی ہے - جب تاریخ کے ذریعے یہ حقیقت
منکشف ہوتی ہے کہ انسانوں نے کن مقاصد کی خاطر
جنگیں کی ہیں اور جانیں دی ہیں اور وہ تمام پیچ در
پیچ اغراض و حالات کیا تھے جن کی بنیاد پر موجودہ
تمدن کی عمارت تعمیر ہوئی ہے تو وہ ماضی کے ٹکڑے

اور اشتراک عمل کی گنجائش ہو - اس اصول کی تفصیل کے لیے ادب اور زبان کے تعلیمی طریقوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ایک دانش‌مند معلم کس طرح پڑھنے کو ایک اجتماعی اور دلچسپ شغل بنا سکتا ہے -

اس بحث کا خاتمہ ہم پروفیسر بوڈ (Bode) کی مندرجۂ ذیل عبارت پر کرتے ہیں جس میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ یہ سمجھایا ہے کہ نصاب کے مضامین کی تعلیم کس نقطۂ نظر سے دینی چاہیے تاکہ وہ زندگی کے معاشرتی مقاصد میں معین ہوں :—

" (لوگوں میں) صحیح قسم کے خیالات اور مقاصد پیدا کرنے کے لیے ہمیں کسی اصول ہدایت یا معاشرتی نصب‌العین کی ضرورت ہوتی ہے - اس بات کو مدنظر رکھ کر درسی مضامین پڑھانے میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے ؟ ہر مضمون کو پڑھانے کے دو مختلف طریقے ہوسکتے ہیں - ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اس کی تعلیم اس طرح دیں گویا وہ ایک مخصوص اور جداگانہ چیز ہے جو اور تمام چیزوں سے بےتعلق ہے - اس صورت میں ہمارا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ اس خاص علم کے اندر جو معلومات ' قواعد ' اور قوانین ہیں ان کو استعمال کرنے میں طلبہ کو مہارت اور دسترس حاصل ہوجائے - اس قسم کی تربیت کے ذریعے ہم ماہرین خصوصی یا عملی کاری‌گر تیار کر سکتے ہیں ' اور اگر طلبہ کی تربیت میں سختی کے ساتھ اسی قاعدے کی پابندی کی جائے تو تعلیم محض کاری گری کے گروں کا مجموعہ ہوکر رہ جائے

عقل‌مند معلم اور سمجھ دار مصنف کا فرض ہے کہ وہ تمام خلاف قیاس باتوں کو نظرانداز کر کے ایسے معاملات کی طرف توجہ کرے جن میں طلبہ کو فطرتاً دلچسپی ہے اور ان کے ذریعے سے انہیں حساب سکھائے - علیٰ ھذا القیاس مدرسۂ جدید میں لکھنا بطور ایک مخصوص فن کے نہیں سکھایا جاتا کہ طلبہ کو مدتوں حروف اور ان کے مرکبات کی مشق کرائی جائے جن کا مطلب یا منشا سمجھ میں نہیں آتا - بلکہ اس کے لیے اُس فطری خواہش سے محترک کا کام لیا جاتا ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے سے مبادلۂ خیالات کرنے پر مجبور کرتی ہے - مثلاً ایک طالب علم اپنے کسی دوست یا عزیز کو خط لکھنا چاہتا ہے تاکہ اپنے مدرسے کے کھیلوں کا یا کسی اور دلچسپ شغل کا حال بیان کرے - لیکن وہ خط اُس وقت تک نہیں لکھ سکتا جب تک وہ حروف کی شکلوں سے واقف نہ ہو اور ان کو ملا کر الفاظ کے نقش بنانے کی مشق نہ کرے - جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس فن کی معاشرتی غرض اور فوائد کو سمجھ کر اسے سیکھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے - اسی طرح پڑھنے کو موجودہ طریقۂ تعلیم نے بجائے ایک ناگوار فرض کے ایک دلچسپ مشغلہ قرار دیا ہے جس کے ذریعے طالب علموں کو مل جل کر عالموں اور ادیبوں کے خیالات اور جذبات سے آگاہ ہونے اور لطف اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے بچوں کے مطالعے کے لیے ایسا مواد فراہم کرنا چاہیے جو اعلیٰ درجے کی ادبی حیثیت رکھتا ہو اور اس سے تمدنی معاملات اور مشاغل پر روشنی پڑتی ہو - اور اس کو ایسے طریقوں سے پیش کرنا چاہیے جن میں امداد باہمی

کو زیادہ دخل حاصل ہے - لیکن اس تحریک کا اثر کسی نہ کسی حد تک نصاب کے ہر شعبے پر پڑا ہے - یہاں تک کہ ابتدائی تعلیم کے مروجہ "عناصر ثلاثہ" یعنی لکھنے پڑھنے اور حساب کی تعلیم میں بھی آج کل یہی کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کو بھی دلچسپ اجتماعی مشاغل کے طور پر سکھایا جائے نہ بطور فنی مشقوں کے جو بچوں کو با دل ناخواستہ کرنا پڑتی ہیں - اس وجہ سے ریاضی کی جدید کتابوں میں سوالات، مشقوں اور رسائل کے لیے بچوں کی معاشرتی زندگی اور تجربات سے مواد حاصل کیا جاتا ہے - ان سے بعید از قیاس اور مہمل سوالات حل نہیں کرائے جاتے جن کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں کہ بچے اس بہانے سے اعداد کے باہمی علاقوں کو سمجھیں - مثلاً جمع یا ضرب یا تقسیم سکھانے کے لیے چند بیلوں اور بکریوں کو چند مربع ایکڑ کے گھاس کے قطعے میں نہیں چھوڑا جاتا جہاں وہ مشین کی طرح ایک مقررہ رفتار سے مسلسل گھاس چرتے رہیں اور بیچارے بچوں کو یہ معلوم کرنا پڑے کہ کتنے دن میں وہ قطعہ بالکل صاف ہوجائے گا - اس کے بجاے وہ مسائل پیش کیے جاتے ہیں جو روزمرہ طلبہ کے تجربے اور مشاہدے میں آتے رہتے ہیں انہیں آئے دن ایسی ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں مثلاً وہ کسی کھیل کے میدان کی پیمائش کرنا چاہتے ہیں یا مدرسے میں سیونگ بنک کھولنا چاہتے ہیں یا انہیں اپنا گھر بار کا حساب رکھنا پڑتا ہے یا بازار سے سودا خریدنا پڑتا ہے - اس قسم کے معاملات میں ہر طرح کے حسابی قاعدوں اور اصولوں کو سمجھانے کے لیے بےشمار مواقع ہیں -

میں انسان کو مسلسل جد و جہد اور کاوش کرنی پڑی ہے اور اس کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں بہت سے ملکوں اور قوموں کی متحدہ کوشش کو دخل ہے - اگر سائنس داں ایک دوسرے سے بےتعلق ہوکر کام کرتے اور خود غرضی کی بنا پر اپنی اپنی تحقیقات کے نتائج کو ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھتے تو سائنس ہرگز اس قدر ترقی نہ کر سکتی جتنی اس نے اب تک کی ہے - سائنس اشتراک عمل کا یہ سبق بہت وضاحت اور خوبی کے ساتھ سکھاتی ہے بشرطیکہ معلم کو اس بات کا احساس ہو اور درسی کتابوں میں اس پر زور دیا جائے - لیکن کتنی درسی کتابیں ایسی ہیں جو اس شرط کو پورا کرتی ہیں ؟ اسی طرح سائنس کے نصاب اور درسی کتب میں اس بات کی توضیح کی ضرورت ہے کہ موجودہ صنعت و حرفت ' زراعت اور تجارت ' حفظان صحت ' علاج امراض ' غرض نظام معاشرت کی بیشتر آسائشوں اور سہولتوں کا دار و مدار سائنس پر ہے - طلبہ کو ہر ہر قدم پر ان کے ذہنی استعداد اور قابلیت کے مطابق یہ بتانا چاہیے کہ جو باتیں وہ سائنس کے نام سے پڑھ رہے ہیں وہ محض امتحان پاس کرنے یا معلومات کا ذخیرہ بڑھانے کے لیے مفید نہیں بلکہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی ہیں اور انہیں کی وساطت سے انسان نے اپنے ماحول کو مسخر کیا ہے -

معاشرتی تنظیم کے اصول بعض مضامین میں بوجہ ان کی نوعیت کے ' زیادہ کامیاب ہوئے ہیں اور بعض میں کم مثلاً تاریخ ' جغرافیہ ' سائنس ' دستکاری وغیرہ میں ان

مدارس میں جس قسم کی درسی کتابیں بالعموم رائج ہیں وہ تعلیمی ترقی اور تعلیمی اصلاح کے راستے میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہیں - جب کبھی کسی نئے تعلیمی تجربے مثلاً طریق ڈالٹن کو رائج کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کے خلاف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اول تو کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بہت ناقص اور نامناسب ہیں اور علاوہ اور بہت سی خرابیوں کے وہ اپنے موضوع کے معاشرتی پہلو کو نمایاں نہیں کرتیں - بیشک تاریخ' یا جغرافیہ یا سائنس کے معاشرتی پہلو کو واضح کرنے میں طریقۂ تعلیم و تحصیل کو بہت دخل ہے لیکن اگر درسی کتابیں اس طرح لکھی جائیں کہ ان علوم کی تمدنی قدر و قیمت پر روشنی پڑے تو معلم کے لیے تعلیم کی معاشرتی تنظیم آسان ہوجائے گی - مثال کے طور پر سائنس کو لیجیے مدرسوں میں سائنس کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں (اور بالعموم علاوہ استادوں کے پڑھائے ہوئے سبق کے طلبہ کا تمام دار و مدار ان میں سے کسی ایک پر ہوتا ہے) وہ ایسے خشک اور اصطلاحی انداز میں لکھی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کا ذہن سائنس کے معاشرتی پہلو کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا - حالانکہ جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس میں بےشمار امکانات موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر ہم طلبہ کے معاشرتی احساس کو مستحکم کر سکتے ہیں مثلاً ہم مشہور سائنس دانوں کے سوانح حیات کو دلچسپ اور موثر طریقے پر پیش کرکے سائنس کے ''انسانی'' رخ پر روشنی ڈال سکتے ہیں - اس طرح طلبہ کے دل میں بتدریج یہ احساس مستحکم ہوجائے گا کہ سائنس کی ترقی اور تدوین

نے خود اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ہر مضمون کا نصاب
تیار کیا ہے اور بجائے اس کے کہ ایک ہی نصاب ہر سال
پڑھاتے رہیں وہ اپنے تجربے اور طلبہ کے ذہنی اور عمل کے مطابق
اس میں ترمیم اور تبدیلی کرتے رہتے ہیں - طریق ڈالٹن
(Dalton Plan) کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ
نصاب میں ترمیم اور تبدیلی کی گنجائش رکھنی چاہیے
اور ہر مضمون کے معلم کو اپنے تجربے اور معلومات کے مطابق
ہر ہفتے اور ہر مہینے کے کام کے لیے نصاب کے خاکے تیار کرنے
چاہییں اور اگر وہ عملاً کامیاب ثابت نہ ہوں تو ان میں
تبدیلی کرکے دیکھنا چاہیے کہ کیا نتیجہ ہوتا ہے -
اس طرح کے آزمائشی نصاب کی ایک بہت عمدہ مثال
امریکا کی ریاست ونتکا (Winnetka) کے مدرسوں کی دی
جا چکی ہے جہاں استاد خود ہر مضمون کا نصاب معاشری
ضروریات اور طلبہ کے نفسی رجحانات کو پیش نظر رکھ کر
مرتب کرتے ہیں اور اس کو درسی کتابوں کی شکل میں
چھپوانے کے بجائے ٹائپ کرا لیتے ہیں اور طلبہ میں تقسیم
کر دیتے ہیں - اس ٹائپ میں لکھے ہوئے تعلیمی مواد کو ان
کے مطالعے کا مرکز یا بنیاد سمجھنا چاہیے جس کے ذریعے
وہ ہر موضوع کے متعلق ایک صحیح اور دلچسپ نقطۂ نظر
قائم کرلیتے ہیں - اس کے بعد اپنی واقفیت کو بڑھانے اور
علم میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لیے وہ مختلف
کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن کا حوالہ ان کے اس نصاب میں
موجود ہوتا ہے یا جن کو استاد تجویز کرتے ہیں - یا وہ خود
اپنے شوق سے لائبریری سے کتابیں لے کر پڑھتے ہیں - مگر ہمارے

ہوتی ہے - برخلاف اس کے جن علوم و فنون کا تعلق خاص
جماعتوں یا مخصوص پیشوں کی ضروریات سے ہے اُن کی اہمیت
مقابلتاً کم ہے - لہذا تعلیم کو اولاً عام انسانی ضروریات اور
مقاصد کا خیال کرنا چاہیے اور اس کے بعد مخصوص پیشوں
کے مشاغل کا - اسی وجہ سے بعض علوم و فنون مثلاً زراعت
اور باغبانی کی اہمیت جبر و مقابلے سے اور دستکاری کی
اہمیت ٹائپ نویسی سے کہیں زیادہ ہے - کیونکہ زراعت یا
باغبانی یا دستکاری نہایت قدیم انسانی مشاغل ہیں جن
کا تعلق تمدن کی تاریخ اور تشکیل سے بہت گہرا ہے اور جن
میں ہر زمانے کے بیشتر افراد نے حصہ لیا ہے برخلاف اس کے
جبر و مقابلے یا ٹائپ نویسی کی اہمیت بہت محدود ہے اور
یہ صرف خاص خاص کاموں اور پیشوں کے لیے مفید ہیں -
اگر اس طرح ہم تمام مضامین کو تعلیم کے مرکزی مقصد کے
لحاظ سے دیکھیں تو ان میں یہ انتشار باقی نہیں رہے گا بلکہ
خود بخود ربط قائم ہو جائے گا - اس تحریک کی تفصیل
کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے
کہ اس کا ایک عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام درسی کتابوں کو
از سر نو جدید اصول پر لکھنا پڑے گا - مغربی ممالک میں
گزشتہ پچاس سال کے اندر درسی کتابوں میں بہت ترقی
ہوئی ہے مختلف علوم کی درسیات کی تصنیف تجربہ‌کار اور
قابل لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو نہ صرف ان علوم میں مہارت
رکھتے ہیں بلکہ نفسیات اطفال سے بھی کم و بیش واقف
ہیں - بعض مدرسوں میں جہاں ایک مستقل اور مقررہ نصاب
طلبہ کی تعلیمی ترقی میں حارج سمجھا گیا ہے، معلموں

بتا چکے ہیں - نصاب کی یہ تنقید اور محاسبہ اس لیے ضروری ہے کہ وہ اکثر ضروریات زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتا اور اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے ترقی کی منزلوں میں تمدن کا ساتھ نہیں دیتا یعنی جو اقتصادی اور معاشرتی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا لحاظ نہیں رکھتا - گزشتہ صدی میں سائنس اور قدیم علوم اور زبانوں میں جو جنگ جاری رہی اور اس زمانے میں نظری اور عملی تعلیم کے مطالبات میں جو کشمکش ہے وہ اسی وجہ سے ہے - ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہے کہ ان چیزوں کو مقدم اور لازم سمجھیں جو معاشرے کی بقا اور ترقی کے لیے اہمیت رکھتی ہیں اور جو چیزیں محض نمائشی یا آرائشی ہیں ان کو ثانوی حیثیت دیں - مضامین نصاب کی اضافی قدر و قیمت کا مسئلہ دو اصل تہذیب کے مفہوم سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق ابھی تک خود معلموں اور تمدنی مفکروں کے خیالات واضح نہیں ہیں - کیونکہ ایک طرف موجودہ زندگی کے نئے مطالبات ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسری طرف تہذیب کا قدیم تصور جو مختلف حالات میں پیدا ہوا تھا ان کے ذہن پر مسلط ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) وغیرہ نے اس مسئلے پر بلکہ تعلیم کے تمام مسائل پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا ہے کہ ایک جمہوری معاشرے کے لیے کس قسم کی تعلیم اور کس قسم کے نصاب کی ضرورت ہے - ان کا خیال ہے کہ اس لحاظ سے نصاب میں ان مضامین اور مشاغل کو ترجیح اور اہمیت دینی چاہیے جن کا تعلق افراد اور معاشرے کے مشترک تجربات سے ہے یعنی وہ تجربات جن میں زیادہ سے زیادہ تعداد لوگوں کی شریک

تجربات سے کام لینا پڑتا ہے اور جب تک نصاب کی تدوین میں ہم اس بات کو پیش نظر نہیں رکھیں گے ہمارے لیے اپنے علم کی تنظیم اور اس کا استعمال بہت مشکل ہوجائے گا - نصاب کے مضامین کو صحیح معنوں میں مربوط کرنے کے لیے ان کی باہمی وابستگی کو ظاہر کرنے کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نقطہ تلاش کیا جائے جو ان سب کا مرکز ہے اور ان میں سے ہر ایک کا تعلق اس کے ساتھ دکھایا جائے- وہ مرکز ظاہر ہے کہ نظام معاشرت اور بچوں کی فطرت کا اجتماعی رجحان ہے - تمام مضامین کی ترتیب میں ہمیں تعلیم کے معاشرتی اغراض اور تمدنی زندگی کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ ہم طلبہ پر یہ بات واضح کرسکیں کہ ان کے اغراض اور ضروریات کے پورا کرنے میں یہ مضامین انہیں کس طرح مدد دے سکتے ہیں - امریکا میں اس تعلیمی تحریک نے مدرسوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم، نصاب تعلیم اور ضبط و تادیب کے نظام وغیرہ کو مندرجۂ بالا مقصد کے مطابق مرتب کیا جائے وہاں کے معلموں نے اس کے لیے "مدرسوں کی تنظیمِ معاشری" [1] کا نام تجویز کیا ہے - نصاب کے معاملے میں اس تحریک نے دو باتوں پر زور دیا ہے ایک تو یہ کہ تمام مضامین اور مشاغل ایسے ہوں جو طلبہ کے تمدنی احساس اور معلومات میں اضافہ کریں - دوسرے یہ کہ ان تمام امور کو نصاب سے خارج کردیا جائے جو تمدنی زندگی سے کوئی مفید اور معقول تعلق نہیں رکھتے - جیسا ہم اوپر

1- "Socialization of Education"

مضامین سے شامل کی جائیں جن سے اس کے مطالب پر
مختلف پہلوؤں سے روشنی پڑے اور وہ زیادہ مکمل طریقے پر
طلبہ کی سمجھ میں آجائیں - سائنس کے مضامین کا نصاب
بنانے میں اس طرح ایک دوسرے سے مدد لینا خاص طور پر
ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ "بےجان ، بے زبان اور بیکار"
ہوکر رہ جاتے ہیں - جب ہم سائنس کے ذریعے مظاہر فطرت کی
تسخیر کرنا یا اس کو تمدنی مقاصد کے لیے استعمال کرنا
چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کی کوئی ایک شاخ کافی نہیں
ہوتی بلکہ مختلف شاخوں سے کام لینا پڑتا ہے - طبیعیات ،
کیمیا ، حیاتیات وغیرہ کو نظری طور پر سمجھنے اور ان سے
عملی طور پر کام لینے کے لیے ان کی باہمی وابستگی اور تعامل
کا سمجھنا ضروری ہے ورنہ وہ اپنے ماحول کے مناظر اور مظاہر
کی صحیح تسخیر نہ کر سکیں گے - اس کی تشریح واسکونسلو (Vasconcellos)
نے ایک مثال سے کی ہے - وہ کہتا ہے کہ اگر
علم حیوانات کے کسی سبق میں ہمیں سانس کی آمد و رفت
کو بیان کرنا ہو تو اس کی ضرورت پڑے گی کہ ہم کیمیا کی
طرف رجوع کریں اور کاربن اور آکسیجن کے متعلق واقفیت
حاصل کریں - اسی طرح اگر ہم انسان کے جسم کے ڈھانچے کی
ساخت کو سمجھانا چاہتے ہیں تو ایک طرف طبیعیات سے
مدد لےکر بیرم (Lever) کا اصول بتانا ہوگا جس کے بغیر ہڈیوں
کی حرکت سمجھ میں نہیں آسکتی اور دوسری طرف کیمیا
کی مدد سے ہڈیوں کی ماہیت پر روشنی ڈالنی پڑے گی - ان
مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ایک علمی یا تمدنی مسئلے
کو سمجھنے کے لیے بھی ہمیں مختلف علوم و فنون اور

فائدہ اُٹھانے کے لیے کسی دوسرے مضمون سے مدد لینے کی ضرورت نہیں - نصاب میں بعض مضامین تو ایسے ہیں جن کو اپنی نوعیت اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے صریحی تعلق ہے مثلاً جغرافیہ اور تاریخ جن کا مشترک موضوع انسان اور اس کی اجتماعی زندگی ہے اور دونوں اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اس پر روشنی ڈالتے ہیں - اس اشتراک موضوع کی وجہ سے ان دونوں مضامین میں ہر ہر قدم پر ربط پیدا کرنے کا امکان اور ضرورت ہے - تاریخ انسانی کا ارتقا اسی عالم آب و گل میں ہوا ہے جس میں بےشمار طبعی قوتیں کام کرتی ہیں جن کو سمجھنا اور سمجھانا جغرافیہ کا کام ہے - جغرافیہ کے مظاہر اور فطرت کی قوتیں انسان کی آزادی کو محدود بھی کرتی ہیں اور اس کو اس کے مقاصد کے حصول میں مدد بھی دیتی ہیں اس لیے ہم تاریخی واقعات کو اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک ان جغرافی حالات سے واقف نہ ہوں جنھوں نے ان پر اثر ڈالا ہے اور ان کی تشکیل میں حصہ لیا ہے - اسی طرح تاریخ کی حقیقی اہمیت اور اس کی روح کو سمجھنے کے لیے ادب کے مطالعے کی ضرورت ہے اس لیے کہ ادبی تصانیف میں ان انسانی آرزوؤں اور حوصلوں اور کوششوں کی تفسیر نظر آتی ہے جن کی عملی تعبیر تاریخ کے واقعات کے ذریعے ہوتی ہے اِسی طرح سائنس اور ریاضی میں ادب، تاریخ، جغرافیہ اور دستکاری میں نفس مضمون کے اعتبار سے ربط قائم کرنے کے امکانات موجود ہیں جن سے اُستاد کو فائدہ اُٹھانا چاہیے - علاوہ بریں اس تحریک کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر مضمون کے نصاب میں بعض مناسب چیزیں دوسرے

بڑھاتے اس پر مشقت، صبر اور استقلال کے ساتھ کام کرتے
یہاں تک کہ اس کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا - سائنس کے
مختلف شعبوں میں جہاں اکثر مسلسل اور طویل تجربات
اور مشاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے یہ طریقہ خاص طور پر
مفید ہے - کیونکہ اس کی وجہ سے طلبہ کو اتنا وقت اور
فرصت مل جاتی ہے کہ وہ بغیر کسی کی مدد کے اپنے بل پر
کام کریں اور اپنی غلطیوں کی تصحیح اپنی کوشش اور سعی
سے کریں - اس اصول پر عمل کرنے سے "خیالات میں گہرائی
پیدا ہوتی ہے اور ہر مضمون کے مختلف شعبوں اور مظاہر کے
باہمی تعلقات کے مطالعے کا موقع ملتا ہے اور اس کے ساتھ
ہی ہمارے علم کی وسعت بڑھتی ہے اور ہم مختلف مضامین
کی معلومات کو باہم مربوط کر سکتے ہیں" یہ طریقہ
" اجتماعی مطالعہ " کہلاتا ہے -

ہر مدرسے میں اس طریقے پر عمل کرنا مشکل ہے کیونکہ
جب تک نصاب کی ترتیب و تنظیم قابل استادوں کے ساتھ
میں نہ ہو اور ان کو امتحانوں کی بندشوں سے ایک حد تک
آزادی نہ حاصل ہو وہ نصاب کی تدوین اور طریقۂ تعلیم میں
ترمیم اور اصلاح نہیں کر سکتے - لیکن مضامین میں ربط
قائم کرنے کا ایک دوسرا طریقہ ایسا ہے جس پر ہمارے موجودہ
مدارس میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے حالانکہ ان میں نئے
تعلیمی تجربات کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں حائل
ہیں - وہ طریقہ یہ ہے کہ مدرسے میں کوئی مضمون اس طرح
نہ پڑھایا جائے گویا وہ بجائے خود ایک مکمل اور مستقل
حیثیت رکھتا ہے اور اس کو سمجھنے یا اس سے پوری طرح

بہار میں سائنس کے شعبے میں سے علم حیوانات اور علم نباتات کا مطالعہ کیا جاتا کیونکہ وہ زمانہ اس کے لیے مقابلتاً زیادہ مناسب ھے - طبیعیات اور کیمیا کی طرف اس زمانے میں کم توجہ کی جاتی تھی - بلکہ اُن پر جاڑے اور خزاں کے موسم میں زیادہ زور دیا جاتا تھا - اس تقسیم کی وجہ سے طلبہ منتخب شدہ مضامین کا مطالعہ زیادہ دلچسپی' گہرائی اور انہماک سے کرتے تھے - مگر یہ اصول صرف انتخاب مضامین ھی تک محدود نہ تھا بلکہ ھر مضمون کے مخصوص موضوع کا انتخاب بھی اسی اصول پر کیا جاتا تھا - ھر روز طلبہ یا تو کسی مضمون کی ایک خاص شاخ کا مطالعہ کرتے تھے یا کئی ایسی شاخوں کا جن سے ایک دوسرے کے مسائل اور مباحث پر روشنی پڑے - اسی طرح ھر موضوع کے مطالعے میں گہرائی پیدا ھوجاتی ھے اور اس پر مختلف پہلوؤں سے اچھی طرح غور کیا جا سکتا ھے - مثلاً کسی روز طلبہ اپنے وقت کا زیادہ‌تر حصہ فرانسیسی زبان کے مطالعے میں صرف کرتے تھے - ان کو یہ مجبوری نہ تھی کہ ھر گھنٹے کے بجنے پر اپنے کام کو نامکمل چھوڑ کر اپنی توجہ کو دفعتاً ایک مضمون سے کسی بالکل مختلف مضمون کی طرف منتقل کریں جس سے نہ صرف وقت ضائع ھوتا ھے بلکہ ذھن منتشر ھوجاتا ھے - اس خیال سے کہ طبیعت کسی کام کو کرتے کرتے اُکتا نہ جائے وہ مضمون کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کرتے تھے - مثلاً اگر فرانسیسی کا دن ھے تو وہ اس زبان کی کتابیں پڑھتے' اس کی قواعد سیکھتے ' اس میں مضمون لکھتے ' گفتگو کرتے - اس طرح وہ جس مضمون یا موضوع کو

ہیں - بعض ماہرین تعلیم نے اس طریقے کی تائید کی ہے کہ ایک وقت میں صرف چند مضامین پر توجہ کی جائے' ان کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کیا جائے - لیکن یہ مضامین ایسے ہوں جن کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے تعلق ہے - چنانچہ بلجیم کے مدرسۂ جدید کا بانی واسکونسلو (Vasconcellos) اسی اصول پر زور دیتا ہے - اس کا خیال ہے کہ اگر ایک وقت میں بچے کی توجہ بہت سے مضامین میں منتشر رہے تو نہ صرف اس کی عام دماغی تربیت کو نقصان پہنچے گا بلکہ تحصیل علم میں بھی رکاوٹ پیدا ہوگی۔ کیونکہ وہ ایک ہی وقت میں بہت سے ایسے مضامین کا مطالعہ کرے گا جن میں کوئی لازمی نفسی رابطہ نہیں اور اس وجہ سے اس کا دماغ پریشان اور پراگندہ ہوجائے گا - اپنے مدرسے کے نصاب بحث سے کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے :—

" ایک ہی دن میں ریاضی ' لکھنا پڑھنا ' تاریخ ' جغرافیہ ' طبیعیات وغیرہ کا مطالعہ کرنا ممکن ہے ایک جرأت آزما مہم کہی جا سکے لیکن اس کا (تعلیمی) نتیجہ صفر ہوگا کیونکہ ان مضامین کے موضوع میں کوئی ربط یا تعلق نہیں ہے - " ۱

اس خرابی سے بچنے کی غرض سے اس نے اپنے مدرسے میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ہر میقات (ترم) کے لیے چند ایسے مضامین منتخب کر لیے جاتے تھے جو ایک حد تک موسم سے مناسبت رکھتے تھے - مثلاً موسم گرما اور موسم

۱—A New School in Belgium صفحہ ۷۷ -

میں ہوتا ہے اور وہ مدرسے کا کام بےدلی کے ساتھ رسمی طریقے سے کرنے لگیں گے - لہذا مدارس جدید میں یہ التزام ہے کہ نصاب کی ترتیب و تدوین میں خصوصاً چھوتے بچوں کے نصاب میں مضامین کی کوئی قطعی اور مصنوعی تقسیم نہ کی جائے بلکہ ان کے گرد و نواح کی زندگی اور ان کے پسندیدہ مشاغل اور تجربات کو مطالعے کا موضوع بنایا جائے اور اس مطالعے کو رفتہ رفتہ مرتب اور منظم کیا جائے - یہاں تک کہ انہیں خود بخود یہ خیال پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے مختلف قسم کے تجربات میں نظم و ترتیب قائم کریں تاکہ ان سے پوری طرح مستفید ہوسکیں - اس ضرورت کا احساس دلانے اور اسے پورا کرنے کے لیے استادوں کی مدد بہت مفید ہے لیکن ابتدا میں یہ خواہش خود طلبہ میں پیدا ہونی چاہیے - استاد کا کام یہ ہے کہ وہ ان کے مطالعے اور طریقۂ تحصیل کو بتدریج ایسے راستوں پر ڈالے کہ وہ ترتیب و تقسیم کے فائدے خود بخود محسوس کریں -

کسی قدر ترمیم کے ساتھ اسی اصول پر اونچے درجوں میں بھی عمل کیا جاتا ہے - ابتدائی درجوں میں تو مضامین کی مصنوعی تقسیم کو بالکل ہی مٹا دینا چاہیے - لیکن جب طالب علم اونچی جماعتوں میں پہنچتا ہے جن کے نصاب میں مضامین کی تقسیم قدرتی طور پر قائم ہو جاتی ہے اس وقت بھی استاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نصاب کی ترتیب اور اپنی تعلیم کے طریقے میں ان کی باہمی وابستگی اور تعلق کو پیش نظر رکھے اور طلبہ کو بھی سمجھاتا رہے - اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے جاتے

از کم ابتدائی چند سال میں بچوں کے ذھن میں نہ اس قسم کی تقسیم پائی جاتی ھے، نہ اس کو پیدا کرنے کا امکان ھے - اگر جبریہ تقسیم کو ان کے ذھن پر عائد کیا جائے تو ان کی قدرتی نشو و نما میں حرج واقع ھوگا - ان کے لیے زندگی ایک مسلسل اور لامتناھی تجربہ ھے جس کے تمام عناصر اور کیفیات ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ھیں اور اس کے لیے بہترین تشبیہ وھی ھے جو مشہور عالم نفسیات ولیم جیمز (William James) نے دی ھے - یعنی بچے کی شعوری زندگی کی مثال ایک بہتے ھوئے دریا کی سی ھے جس کے مختلف تجربات لہروں کی مانند ھیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جاسکتیں - وہ اپنے روزمرہ کے گوناگوں تجربات کو تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ریاضی، ادب وغیرہ کی اصطلاحوں میں تحویل نہیں کرتا - اس کے لیے مینھ کا برسنا اور زمین پر چھوٹے چھوٹے ندی نالے بہا دینا جن میں وہ کشتی چلا سکتا ھے، یا خود اس کا مٹی کے گھروندے بنانا یا اپنی ماں سے کہانیاں سننا سب ایک مسلسل زندگی کا حصہ ھیں جو تجربات سے پر ھے جن کے ذریعے وہ اپنے ماحول کی واقفیت حاصل کرتا ھے اور اس سے حتی الامکان کام لیتا ھے - اگر ھم ان تجربات کو قبل از وقت ایک دوسرے سے علحدہ کر کے مختلف باضابطہ مضامین میں تقسیم کرنا چاھیں اور مدرسے میں ھر گھنٹے بچوں کی توجہ اور دلچسپی کو ایک شغل سے دوسرے شغل کی طرف منتقل کرتے رھیں تو ان کی حقیقی اھمیت ضائع ھوجائے گی - بچوں کو وہ شوق اور انہماک نہ رھے گا جو اپنے آزاد اور پسندیدہ مشاغل پر

جن کا مطالعہ بہت وسیع اور متنوع ہوتا تھا اور جو اپنی زبردست علمیت سے اپنے شاگردوں کی شخصیت اور ان کے نظریۂ حیات کو متاثر کرتے تھے - لیکن اس زمانے میں جب زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم بھی قواعد اور ضوابط کی پابندیوں میں جکڑ دی گئی ہے اور معلم کی فنی تربیت کے لیے آٹھ نو مہینے کی قلیل مدت کافی سمجھی جاتی ہے یہ صفت استادوں میں بہت کمیاب ہے - ان کی ذہنی دلچسپیوں میں تنوع اور زندگی نہیں پائی جاتی اور وہ اپنے طلبہ میں بھی یہ بات پیدا نہیں کرسکتے - البتہ اب بھی وہ نامور علمی محققین جنھوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے ذریعے اپنے علوم میں انتہائی قابلیت حاصل کرلی ہے اور نہ صرف ان کے فنی پہلو پر حاوی ہیں بلکہ ان کے معاشرتی اور فلسفیانہ نتائج سے بھی واقف ہیں' یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ زندگی کا مطالعہ ایک مربوط اور منظم کل کی حیثیت سے کرسکیں - اس امر کو سمجھانے کے لیے اور زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں کہ عملی زندگی کی ضروریات اور انسان کی ذہنی ترقیات دونوں کے اعتبار سے درسی مضامین کی مصنوعی تقسیم بہت مضر ہے - مدرسے کی تعلیم ختم کرنے کے بعد لوگ جو کچھ علم حاصل کرتے ہیں وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں اور اس کے مختلف عناصر ایک دوسرے کے ساتھ پیوست اور مربوط ہوتے ہیں اور وہ اسی شکل میں اسے استعمال بھی کرتے ہیں - بچوں کے نصاب میں اس قسم کی تقسیم رائج کرنا اور بھی زیادہ قابل اعتراض ہے کیونکہ عام تجربے اور نفسیاتی تحقیقات دونوں کی تعلیم یہی ہے کہ کم

کا ذکر نہ کرے جن کا حال بہت سے یا کم سے کم بعض طلبہ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا ؟

انگلستان کے مشہور معلم اور ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں - اس نے اپنے مدرسے میں مضامین کی مصنوعی تقسیم بڑی حد تک مٹا دی تھی تاکہ طلبہ مختلف علوم کی باہمی وابستگی اور زندگی سے ان کے تعلق کو سمجھیں - جب وہ خود کسی مضمون پر گفتگو کرتا، خواہ جماعت کے کمرے میں یا سائنس کے معمل میں یا گرجا گھر میں، تو اس کے خیالات کی رو میں ادب، فلسفہ، انسانی ارتقا کی تاریخ، اخلاقیات کے مسائل سبھی کچھ آجاتا تھا - تاریخ کی تفسیر میں وہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور اس کے نتائج سے بحث کرتا، سائنس کی اہمیت سمجھانے کے لیے وہ تاریخ تمدن پر نظر ڈالتا اور ہر مضمون کا تعلق تمدنی زندگی کے وسیع تر مسائل اور مقاصد سے دکھاتا - اس طرح اس سے طلبہ ہر سبق کے بعد زندگی کے متعلق ایک زیادہ وسیع، زیادہ باریک نقطۂ نظر لے کر اُٹھتے اور یہ محسوس کرتے کہ انھوں نے جو کچھ اس گفتگو میں سیکھا ہے وہ ان کے حافظے پر بار نہیں ہے بلکہ ان کے خیالات اور ان کی زندگی میں گھل مل گیا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی دلچسپی کا دائرہ بہت بڑھ گیا ہے اور وہ اپنے درسی مضامین کا ربط پہلے سے بہتر سمجھ سکتے ہیں - یہی بات رگبی پبلک اسکول کے ہیڈ ماسٹر آرنلڈ (Arnold) کے تاریخی درس کے متعلق بیان کی جاتی ہے - اور یہ شان ہندوستان کے مشہور قدیم معلموں میں بھی پائی جاتی تھی

پڑ جاتی ہے - وہ طلبہ میں ذوق اور انہماک پیدا کردیتا ہے اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ علم چند درسی مضامین کا نام نہیں جن کو امتحان کی خاطر پڑھنا پڑتا ہے بلکہ زندگی کی ایک مربوط اور مسلسل تفسیر ہے جس سے انسان نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا ہے اور وہ خود بہت فائدہ اُٹھا سکتے ہیں - برخلاف اس کے جس استاد میں علم یا تخیل کی کمی ہوتی ہے یا یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ مختلف قسم کے واقعات اور معلومات میں ربط پیدا کرے اور کسی ایک مسئلے پر مختلف سمتوں سے روشنی ڈال سکے اس کی تعلیم ہمیشہ بےلطف اور بےجان ہوتی ہے - طلبہ جو کچھ علم حاصل کرتے ہیں اس کو ان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں پیدا ہوتا - ہمیں اکثر ایسے اُستادوں سے سابقہ پڑتا ہے جو پڑھاتے وقت گویا گھوڑوں کی طرح آنکھوں پر اندھیری لگا لیتے ہیں یعنی اگر وہ کوئی ادبی کتاب پڑھا رہے ہیں تو اس کے دوران میں انہیں یہ خیال تک نہیں آئے گا کہ کسی تاریخی یا جغرافی واقعے کا حوالہ دیں جس سے ممکن ہے مضمون کی دلچسپی کئی گنی زیادہ ہو جائے - یا وہ جغرافیہ پڑھا رہے ہیں اور مثلاً کسی نئے ملک کا حال شروع کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ بات نہ آئے گی کہ طلبہ میں اس ملک کی طرف سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ان کی عام واقفیت سے کام لیں یا کسی ایسے امر کی طرف اشارہ کریں جو جغرافیے کے رسمی مفہوم میں داخل نہ ہو - فرض کیجیے کوئی اُستاد مصر کا جغرافیہ اپنے طلبہ کو پڑھانا چاہتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ وہ مصر کی قدیم تہذیب اور اس کی یادگاروں، مصر کے مشہور عالم اہرام اور ان جدید انکشافات اور دریافتوں

رکھتے ہیں - اگر ان تمام دلچسپیوں میں مناسب تنظیم قائم
رکھی جائے تو یہ ان کے مخصوص علمی مشاغل میں مخل
نہیں ہوں گی بلکہ ان میں مدد دیں گی کیونکہ وہ اپنے کام
کو وسیع نقطۂ نظر سے یہ سمجھ بوجھ کر انجام دیں گے کہ اسے
زندگی کے دوسرے مسائل سے کیا تعلق ہے - ان کے دماغ کی
مثال ایک مکمل اور پیچیدہ مشین کی سی ہے جو بہت سی
کلوں کو چلاتی ہے اور ان سے حسب ضرورت کام لیتی رہتی ہے -
برخلاف اس کے اکثر ہمیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو
بہت کچھ معلومات رکھتے ہیں لیکن اسے ضرورت کے وقت
استعمال نہیں کر سکتے - اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی
معلومات میں ربط اور نظم اور حرکت نہیں ہوتی -

ہر قابل معلم کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جب کوئی
مضمون پڑھاتا ہے مثلاً کسی تاریخی یا ادبی مسئلے سے بحث
کرتا ہے تو وہ اپنے درس کو محض تاریخ یا ادب ہی کے دائرے
میں محدود نہیں رکھتا بلکہ اپنی عام معلومات اور ذاتی
تجربے سے مدد لے کر بہت سی ایسی چیزیں مثال کے طور پر
یا مقابلے اور تشریح کے لیے پیش کرتا ہے جن سے زیر بحث
مسئلے پر روشنی پڑتی ہے - وہ تاریخی مسائل کے ضمن میں
دنیا کے مختلف قوموں اور ملکوں کے تمدنی اور معاشرتی حالات،
بنی نوع انسان کی جد و جہد کامیابیوں اور ناکامیوں اور آرزوؤں
کا ذکر کرے گا، اس طرح نہیں کہ وہ غیر متعلق مباحث معلوم
ہوں بلکہ اس طرح کہ وہ خاص مسئلہ جس کا مطالعہ طلبہ
کر رہے ہیں انسانی تاریخ کے عظیم‌الشان سلسلے میں اپنے
مناسب مقام پر نظر آئے - اس طرح اس کی تعلیم میں جان

کسی کا تعلق تعلیم سے ھے ' کسی کا شہر کی مالی حالت سے' کسی کا حفظان صحت سے' کسی کا شہر کی عمارات سے - ان تمام امور کے متعلق معقولیت کے ساتھ راے دینے کے لیے ہمیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم علحدہ علحدہ علوم سے مدد لیں جو ایک دوسرے سے بےتعلق ہیں بلکہ اپنی مجموعی معلومات ' واقفیت اور تجربے کی بنا پر ہم ایک راے قائم کرتے ہیں مثلاً اگر زیر غور مسئلہ صحت عامہ سے تعلق رکھتا ھے اور اس کو سمجھنے اور اس کا حل سوچنے میں ہمیں ایک حد تک اس واقفیت سے مدد ملے گی جو ہمیں اپنی درسی تعلیم کے دوران میں علم حفظان صحت کے مطالعے سے حاصل ہوئی تھی- اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے عام تجربے اور مشاہدے سے کام لینا ہوگا جو روزمرہ کی زندگی میں حاصل ہوتا ھے اور اس میں مدرسے کی تعلیم کو کوئی خاص دخل نہیں- علاوہ بریں مجوزہ تجویز کا ایک مالی پہلو بھی ہوگا جس پر غور کرنے میں ہمارا تجربہ اور مخصوص اقتصادی واقفیت کام آئے گی - یہی صورت ہر شخص کو روزمرہ کے کاروبار میں پیش آتی ھے - یہاں تک کہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین خصوصی بھی جن کو بظاہر علم کے ایک خاص شعبے سے تعلق ہوتا ھے اپنا کام اُس وقت تک عمدگی سے نہیں کر سکتے جب تک انہیں دوسرے متفقہ علوم سے کافی واقفیت نہ ہو اور وہ اپنے عام تجربات اور مشاہدات سے فائدہ نہ اُٹھائیں - اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ارباب فکر کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ھے کہ ان کی واقفیت اور دلچسپی صرف اپنے مخصوص علم تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسرے علوم و فنون اور عملی مشاغل سے بھی ذوق

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تفریق نہ
صرف علوم کی تاریخی ارتقاء کے لحاظ سے غلط ہے بلکہ تعلیمی
نقطۂ نظر سے نہایت مضر ہے - اس صورت حال کی اصلاح کے
لیے ماہرین تعلیم نے مختلف کوششیں کی ہیں جن کو
مجموعی طور پر "ربط مضامین نصاب" کی تحریک کہا
جاتا ہے - اس کا منشا یہ ہے کہ نصاب کو معاشرتی زندگی کے
ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لیے مضامین کی قطعی اور مصنوعی
تقسیم کو مٹا کر وہ ربط و تعلق پیدا کر دیا جائے جو ان میں
قدرتی طور پر موجود تھا - اگر اس اصول کے جانچنے کے لیے ہم
وہی معیار اختیار کریں جس سے ہم نے پہلے کام لیا ہے یعنی
مدرسے کے باہر تمدنی زندگی کے کاروبار پر نظر ڈالیں تو ہمیں
معلوم ہوگا کہ وہاں علم کی ایسی تقسیم نہیں پائی جاتی جیسی
مدرسوں میں تنگ نظر معلموں اور تعلیمی منتظموں نے اپنی
آسانی کی غرض سے رائج کر رکھی ہے - جب ہم اپنے مختلف
تمدنی اور معاشرتی فرائض انجام دیتے ہیں یا صنعت و
حرفت، تجارت، زراعت اور دوسرے پیشوں میں مشغول
ہوتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں کام کے لیے تاریخ کے
علم کی ضرورت ہے فلاں کے لیے جغرافیہ کی، فلاں کے لیے
ضی کی - ہمیں ان مشاغل میں مختلف قسم کی معلومات
د واقفیت درکار ہوتی ہے اور ہم حسب ضرورت بغیر کسی
نطقی تسلسل کے ان سب علوم و فنون سے کام لیتے ہیں
نہیں ہم نے حاصل کیا ہے - مثلاً ایک شخص اپنے شہر کی
نسپل کمیٹی کا ممبر ہے اور وہ اس کے جلسے میں شریک
ہوتا ہے - وہاں مختلف قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں -

مشاغل میں ربط پیدا ہوجائے گا تو اس سے دونوں کو فائدہ پہنچے گا - طلبہ اپنے اختیاری مشاغل کے انتخاب میں ان کی تعلیمی قدر کا لحاظ رکھیں گے یعنی انھیں مشاغل کو پسند کریں گے جو ان کی تعلیم میں بلا واسطہ یا بالواسطہ مدد دیتے ہوں اور جب طلبہ ان مشاغل کو اپنی خوشی اور اپنے شوق سے انجام دیں گے تو ان کی عام ذہنی بیداری اور قابلیت کا معیار بلند ہوگا اور اس کا اثر ان کے درسی مشاغل پر پڑے گا - ہر سمجھدار معلم کو اس بات کا تجربہ ہوگا کہ جب کوئی طالب علم کوئی کام اپنے شوق سے انجام دیتا ہے اور اسے اس میں کامیابی ہوتی ہے تو اس میں اعتماد نفس زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنا روزمرہ کا کام بھی پہلے سے زیادہ انہماک اور مستعدی سے کرنے لگتا ہے - لہذا معلموں کی متفقہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مدرسے کے تمام درسی مضامین اور دوسرے مشاغل کو ایک دوسرے کے ساتھ ربط دیں تاکہ ان کے ذریعے طلبہ کی شخصیت کی مکمل اور ہم‌آہنگ تربیت ہو سکے -

اسی طرح مروجہ درسی مضامین میں بھی ربط اور تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس ربط کی اہمیت موجودہ زمانے میں خاص طور پر زیادہ ہو گئی ہے کیونکہ کل علوم جو مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں سائنس کی مثال سے متاثر ہو کر مختلف شعبوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ہر شعبے کی حدبندی اس طرح کی گئی ہے کہ نہ صرف بچوں کے خام‌کار دماغوں کو بلکہ اکثر استادوں کو بھی وہ اپنی جگہ پر مکمل اور دوسرے مضامین سے بےتعلق معلوم ہوتا ہے - لیکن ہم نے علم اور زندگی کی باہمی وابستگی کی بابت جو بحث کی ہے

علحدہ کرنا نہایت سخت غلطی ہوگی - نفسی اعتبار سے ان سب میں نہایت گہرا اور لازمی تعلق ہے کیونکہ وہ سب ایک ہی فرد کی علمی اور عملی تربیت کے وسائل ہیں اور ان کے مجموعی اثر سے اس کے دماغ اور اس کی صلاحیت عمل کی نشو و نما ہوتی ہے - اس لیے معلم کو ان کے درمیان ربط اور تعلق قائم رکھنا چاہیے یعنی درسی مضامین اور دستکاری کی تعلیم میں کوئی حد فاصل نہیں ہونی چاہیے بلکہ دستکاری کی خواہش اور شوق سے درسی مضامین کے پڑھانے میں کام لینا چاہیے- مروجہ مضامین میں سے کوئی مضمون بھی ایسا نہیں جس میں دستکاری اور فنون لطیفہ سے کام لینے کے مواقع موجود نہ ہوں- ادب کی تعلیم میں مصوری' ڈرائنگ اور موسیقی' اور تاریخ کی تعلیم میں نقشہ‌کشی' مصوری' عمارتوں' لباس جغرافیہ اور سامان کے نمونے تیار کرنا ' سائنس میں آلات کے نقشے کھینچنا' عملی تجربوں کے لئے سامان تیار کرنا' یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کے ذریعے نہ صرف بچوں کے جذبۂ تخلیق کا اظہار ہوگا بلکہ انہیں اپنے درسی مضامین سے پہلے سے کہیں زیادہ دلچسپی اور رغبت پیدا ہو جائے گی - علیٰ ہذا القیاس تیسرے شعبے میں ہم نے جن مشاغل کا ذکر کیا ہے ان کو مدرسے کے واقعی کاموں سے بے تعلق نہیں سمجھنا چاہیے - جیسا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ان میں سے اکثر کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ کوئی اثرآفریں معلم طلبہ میں اپنے مضمون کے کسی خاص پہلو سے گہری دلچسپی اور ذوق پیدا کر دیتا ہے اور وہ اس کی تسکین کے وسائل تلاش کرتے ہیں اور اسے تکمل تک پہنچاتے ہیں - اگر درسی تعلیم اور ان آزاد

روزمرہ کے تجربات اور دلچسپ مشاغل کو تحریر میں لانے کے لیے مدرسے کا میگزین نکالیں - پھر اس اشاعت کے ضمن میں اور بہت سے کام نکل سکتے ہیں مثلاً خبروں کی فراهمی ' انجمنوں کی رپورٹیں لکھنا' میگزین کی کتابت یا طباعت کا انتظام کرنا' اس کے لیے سرمائے کا فراہم کرنا وغیرہ وغیرہ - ان سب کاموں کو باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دینا بہت بڑی علمی اور عملی تربیت ھے جس کا بدل درسی مضامین کی تعلیم نہیں ھوسکتی - ھمارے مدارس میں اول تو اس قسم کے مشاغل رائج ھی نہیں اور اکثر استاد ان کو تضیع اوقات سمجھتے ھیں اور جہاں کہیں خال خال پائے جاتے ھیں وھاں ان کا مقصد بالعدوم نمائش یا انسپکٹر کو خوش کرنا ھوتا ھے - ایسی حالت میں ان سے پورا تعلیمی فائدہ ھرگز نہیں اُٹھایا جاسکتا کیونکہ وہ اُستاد کی طرف سے کم و بیش جبراً عائد کیے جاتے ھیں ' طلبہ کی روزمرہ زندگی سے خود بخود پیدا نہیں ھوتے اور ان کے جبلی شوقوں کو ظاھر نہیں کرتے - مدرسۂ جدید کے اس پہلو کی تنظیم کے لیے استادوں میں تخیل اور بیدار مغزی اور اشتراک عمل درکار ھے اور جب تک وہ سب ان مشاغل کی اھمیت کو نہ سمجھیں اور انھیں فروغ دینے کی کوشش نہ کریں ان کے مدرسے میں زندگی اور عمل کی فضا پیدا نہیں ھوسکتی - اس بحث کے ضمن میں ھمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاھیے کہ نصاب کی یہ تقسیم محض مضامین اور مشاغل کی نوعیت کے اعتبار سے کی گئی ھے - دوران تعلیم میں اس کو قطعی سمجھ کر ان شعبوں کو ایک دوسرے سے

وہ ان شوقوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے اہتمام سے مدرسے میں جماعتیں اور انجمنیں قائم کرلیں - مثلاً اگر تاریخ کا معلم اپنے مضمون میں ذوق اور قابلیت اور انہماک رکھتا ہے اور اپنی تعلیم کے دوران میں طلبہ کو اس کے معاشری پہلو سے آگاہ کرتا ہے' تاریخی عمارتوں سے دلچسپی دلاتا ہے' مشاہیر کی شخصیت اِن کے سامنے جیتے جاگتے الفاظ میں پیش کرتا ہے تو یقیناً جماعت کے بعض طلبہ پر اُس کا اثر ضرور پڑے گا - ممکن ہے کہ ان میں سے چند کو فن تعمیر سے دلچسپی پیدا ہو جائے اور وہ اس کا محنت اور شوق کے ساتھ مطالعہ کرنے لگیں - تاریخی عمارتوں کو دیکھیں' ان کے نقشے بنائیں' مختلف زمانوں کے فن تعمیر کا مقابلہ کریں اور اپنی واقفیت سے نہ صرف خود مستفید ہوں بلکہ استاد کی تھوڑی سی ہمت افزائی سے اپنے ہم‌جماعتوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچائیں - اسی طرح ممکن ہے کسی طالب علم کو کسی بڑی تاریخی شخصیت مثلاً اکبر' یا اشوک یا علاءالدین کے حالات سے خاص دلچسپی پیدا ہوجائے اور وہ کتب‌خانے کی کتابوں سے مدد لے کر اس کے متعلق کوئی مبسوط اور قابل قدر مضمون لکھے - یا چند طلبہ مل کر تاریخ کے کسی عہد کا مطالعہ اس طرح کریں کہ اس کے مختلف شعبوں کو آپس میں تقسیم کرلیں اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے بعد ایک تاریخی مقالہ تیار کریں - اس طرح اگر مادری زبان کے تعلیم دینے والے استاد طلبہ میں تحریر کا صحیح مذاق پیدا کردیں اور دوسرے اساتذہ ان کے ساتھ تعاون کریں تو یقیناً ان میں یہ خواہش پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور اپنے

ان مضامین کی تعلیم پر زیادہ زور دینا پڑے گا -

تیسرے وہ بہت سے مشاغل ہیں جو براہ راست نصاب سے تعلق نہیں رکھتے لیکن ان کے ذریعے طلبہ اپنے فرصت کے وقت میں خواہ مدرسے میں یا گھر پر ' اپنے شوقوں کو جو اکثر نصابی مشاغل کے دوران میں پیدا ہوتے ہیں پورا کرتے ہیں - اس قسم کے مشاغل میں' جو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں' طلبہ کو نہایت قابل قدر تربیت اور واقفیت حاصل ہوتی ہے - اس میں اعتماد ذات ' صلاحیت عمل اور ذوق سلیم پیدا ہوتا ہے اور وہ مل جل کر تقسیم عمل کے اصول پر کام کرنا سیکھتے ہیں - ہر اچھے مدرسے میں اس قسم کے بہت سے مشاغل خود بخود بچوں کے اپنے شوق اور اہتمام سے رائج ہو جاتے ہیں- مثلاً مدرسے کا میگزین نکالنا ' مختلف قسم کی علمی اور ادبی انجمنیں قائم کرنا' تعلیمی سیر و سفر کا اہتمام کرنا ' مجلس مباحثہ کو چلانا ' حکومت خود اختیاری کا انتظام ' فرصت کے اوقات میں دستکاری کا مشغلہ ' اپنے شوق سے فنون لطیفہ میں سے کسی فن کی مشق -

ایک زندہ مدرسے کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کے طلبہ اپنے شوق سے کتنے مشاغل جو نصاب سے باہر ہیں یا اس میں محض ضمنی طور پر شامل ہیں رائج کر سکتے ہیں اور انہیں استقلال کے ساتھ جاری رکھ کر مدرسے کی زندگی کو خوش گوار' مفید اور عملی بناتے ہیں- نصاب کی تدوین کرنے میں معلم اس قسم کے مشاغل کو بالارادہ پیش نظر نہیں رکھتا لیکن اس کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ وہ ہر مضمون کی تعلیم اس طرح دے کہ طلبہ کے شوق مختلف صورتوں میں ظاہر ہوں اور

کر چکے ہیں :—

اول درسی مضامین جن میں زیادہ تر وہ مروجہ علوم
ہیں جو اب بھی مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں مثلاً
سائنس، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، مادری زبان، قدیم
زبانیں، انگریزی وغیرہ۔ ان مضامین کا نصاب بالکل وہی
نہیں ہوگا جو اب ہے گو نام یہی رہیں گے۔ ان کے مواد کی
اچھی طرح تنقید کرنی ہوگی اور غیر ضروری چیزوں کو نکال
کر زندہ مسائل اور دلچسپ مباحث شامل کیے جائیں گے
جو طلبہ کے ذہنی معیار اور میلان کے مطابق ہوں اور ان کو
معاشرتی زندگی کے نظام سے آگاہ کریں۔

دوسرے وہ مضامین اور مشاغل جن کا تعلق جذبے اور تخیل
کی تربیت سے ہے اور جن کے ذریعے قوت تخلیق اور حسن ذوق
پیدا ہوتا ہے یعنی مختلف قسم کی دستکاریاں، مصوری،
موسیقی اور ادب بحیثیت ایک فن لطیف کے۔ ہمارے مروجہ
نصاب میں یہ شعبہ بہت ناقص ہے۔ اکثر مدارس میں تو
ان مضامین کی تعلیم کا بالکل ہی انتظام نہیں ہے اور اس
نقص کی وجہ سے طلبہ کی تربیت نامکمل اور یک طرفہ رہتی
ہے بعض مدارس میں صرف ڈرائنگ یا کہیں کہیں لکڑی کا کام
نصاب میں شامل کیا گیا ہے لیکن اس کے واقعی مفہوم اور
اہمیت کو خود معلمین نے بھی نہیں سمجھا۔ کیونکہ وہ اس
کو محض ہاتھ کا ہنر سمجھ کر سکھاتے ہیں نہ اس طرح سے
کہ طلبہ کو تخلیق کے ذریعے اپنی شخصیت کے اظہار کا موقع
ملے۔ اگر ہم مدرسے کو بجائے ایک غیر دلچسپ "درسگاہ" کے
بچوں کی "تربیت گاہ" بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس میں

تعلیمی محکموں نے تسلیم کرلیا ہے اور سوائے چند جمود پسند یونیورسٹیوں کے تقریباً سب جگہ ہائی اسکولوں کی تعلیم صوبے کی زبان یا زبانوں میں دی جاتی ہے - اور غالباً چند سال کے اندر اندر کوئی یونیورسٹی ایسی نہ رہے گی جہاں ثانوی تعلیم انگریزی کے ذریعے دی جائے - لیکن اس کے بعد دیسی زبانوں کو ایک اور تعلیمی جہاد کرنا پڑے گا جس کا مقصد کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تسخیر ہوگا - اس جہاد کی ابتدا بھی ہو چکی ہے اور کہیں کہیں سرکاری طور پر تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کی گئی. ہیں کہ وہ اس معاملے کے ہر پہلو پر نظر ڈال کر رپورٹ پیش کریں - اسی قسم کی ایک کمیٹی جو ناگپور یونیورسٹی کی طرف سے مقرر ہوئی تھی اس کی رپورٹ بحیثیت مجموعی اس اصول کی مؤیّد ہے کہ کالجوں میں طلبہ کی مادری .زبان میں تعلیم دی جائے اور گو اس پر ابھی تک عمل در آمد نہیں ہوا لیکن بطور ایک علامت کے اس کی بہت اہمیت ہے- اور اس سے ہوا کے رخ کا اندازہ ہوسکتا ہے - پنڈت مدن موہن مالویا نے حال ہی میں بنارس یونیورسٹی کے ایک اہم اجلاس میں اس بات کا اعلان کیا ہے کہ عنقریب وہاں انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم ہندی میں دی جائے گی -

اب یہ امر واضح ہو گیا کہ یہ نصاب جدید جس کے اہم عناصر سے ہم بحث کر چکے ہیں مدرسے کے مروجہ نصاب سے بہت زیادہ وسیع اور متنوع ہوگا اور اس میں طلبہ کی مکمل تربیت کے بہت زیادہ امکانات ہوں گے - ان کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں جن کی تفصیل ہم پہلے بیان

ہیں - عام طلبہ کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اس بوجھ سے سبکدوش
ہو کر اپنی مادری زبان اور مادری ادب کی طرف زیادہ توجہ
کر سکیں گے اور اس کے ذریعے نہ صرف ان کی علمی استعداد
بڑھے گی بلکہ ان میں ذوق ادب بھی پیدا ہوگا - کیونکہ ظاہر
ہے کہ ان کے لیے اس زبان کے ادبی نکات اور خوبیوں سے لطف
اندوز ہونا قدرتاً زیادہ آسان ہے جو گویا بچپن سے ان کی گھٹی میں
پڑی ہے اور جس کے اصول سے وہ غیر محسوس طریقے پر باتوں
باتوں میں واقف ہوجاتے ہیں علاوہ اپنی زبان اور اپنے ادب میں
طلبہ کو ایسے جذبات اور خیالات ایسے واقعات اور مناظر ملتے
ہیں جو ان کے تجربے کے اندر ہیں یا جن کو وہ اپنے تخیل
کی مدد سے بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں اس لیے انہیں قدرتی
طور پر اس سے زیادہ دلبستگی ہوتی ہے - خود قومی زبانوں
کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ جب وہ یونیورسٹی میں دوسرے علوم
و فنون کی ہیولہ ہوں گی اور ان کے ذریعے تمام علوم و فنون
پڑھائے جائیں گے تو ان کا معیار بلند ہو جائے گا اور تعلیم یافتہ
جماعت میں سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو اپنے آپ کو ان
کی خدمت کے لیے وقف کر کے انہیں دنیا کی ترقی یافتہ
زبانوں کے مرتبے پر پہنچا دے گا - اس ضمن میں جامعۂ
عثمانیہ حیدرآباد کا تجربہ گو ابھی اس کی عمر چند ہی
سال کی ہے بہت امید افزا ہے - اس کی بدولت بہت سی علمی
تصانیف اردو زبان میں منتقل ہوگئی ہیں اور منتقل ہوتی
جاتی ہیں اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اردو
زبان کے ذریعے یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم دی جا سکتی ہے -
مادری زبان میں تعلیم دینے کی ضرورت کو ایک حد تک

کے لیے اب کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جا سکتی - کیونکہ ملک کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں اتنا علمی اور ادبی ذخیرہ موجود ہے اور وہ اس تیزی سے ترقی کر رہی ہیں کہ نہ صرف ثانوی بلکہ اعلیٰ مدارج میں بھی یہ زبانیں ذریعۂ تعلیم کا کام دے سکتی ہیں - انگریزی زبان کو ہائی اسکولوں اور کالجوں دونوں میں ایک نہایت اہم اختیاری زبان کی حیثیت دینی چاہیے جس کو وہ تمام طلبہ حاصل کریں جن کو تجارت یا سرکاری نوکری یا مغربی علوم و فنون حاصل کرنے کے لیے یا مغربی تہذیب و ادب سے مستفید ہونے کے لیے اس کی ضرورت ہے - ابتدا میں اس کو اختیاری زبان بنا دینے سے کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہوگی کیونکہ پیشتر طلبہ اقتصادی اور سیاسی وجوہ سے اور مغربی تہذیب کے ذہنی تسلط سے مجبور ہوکر انگریزی پڑھیں گے لیکن رفتہ رفتہ لوگ جن کو ایسے پیشے اختیار کرنے ہیں جن میں انگریزی زبان کی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً کاشتکاری' یا چھوٹے پیمانے پر دکانداری یا صنعت و حرفت اس کو چھوڑ دیں گے اور اس کی تعلیم اس مختصر جماعت کے لیے مخصوص ہو جائے گی جن کو علمی مشاغل یا سیاست یا بڑے پیمانے پر صنعت و حرفت اور تجارت میں زندگی بسر کرنی ہے - اس وقت خود اس زبان کی تعلیم بھی بہت بہتر ہوجائے گی- کیونکہ معلموں پر یہ بار نہیں ہوگا کہ وہ ہر کس و ناکس کو خواہ قدرت نے اسے اس قابل بنایا ہو یا نہ بنایا ہو' زبردستی ایک مشکل غیر ملکی زبان پڑھائیں - وہ اپنی پوری توجہ اور محنت ان طلبہ پر صرف کریں گے جو واقعی اس زبان سے مناسبت اور شوق رکھتے

مفہوم سمجھنے کی وہ کوشش کرتا ہے اور اکثر کامیاب نہیں
ہوتا - یا ہوتا بھی ہے تو بڑی محنت سے اور بہت سا وقت
ضائع کرنے کے بعد - لوگ بہت سے ہندوستانیوں کو صحت
اور روانی کے ساتھ انگریزی بولتے اور پڑھتے دیکھتے ہیں مگر
یہ بھول جاتے ہیں کہ انہیں طلبہ میں سے مشکل سے سو دو سو
کو یہ بات حاصل ہوتی ہے اور اگر بالفرض طلبہ کی بہت
بڑی تعداد انگریزی پر عبور حاصل کر لے تب بھی کوئی وجہ
سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ وقت جو مختلف سائنسوں اور
عمرانی علوم کی تحصیل میں صرف ہوسکتا ہے اور جس کی
وجہ سے طلبہ کی علمی قابلیت کا معیار بہت بڑھ سکتا ہے
کیوں محض ایک زبان کی تحصیل میں ضائع کیا جائے ؟
اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ انگریزی زبان نصاب سے خارج
کر دی جائے کیونکہ ہمیں اس کی اہمیت کا پورا احساس
ہے - اس وقت تو وہ سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے ایک
خاص حیثیت رکھتی ہے جس کو ہم نظرانداز نہیں کرسکتے -
لیکن جب ہندوستان پر انگریزوں کا سیاسی تسلط نہ رہے گا
تب بھی تجارت اور بین الاقوامی سیاست کے لیے ہم اس کے
محتاج رہیں گے اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ
ہمارے اور مغربی تہذیب و تمدن کے درمیان انگریزی زبان ہی
واسطے کا کام دے سکتی ہے - لہذا اس کی مستقل اہمیت سے
کسی طرح انکار نہیں ہوسکتا - لیکن ہمیں تعلیمی نقطۂ نظر سے
اس امر پر اعتراض ہے کہ وہ نصاب پر بالکل حاوی ہوگئی ہے اور
اس کی تحصیل میں طلبہ کو بے اندازہ وقت اور محنت صرف
کرنی پڑتی ہے - ہمارے خیال میں اس کو ذریعۂ تعلیم بنانے

کرتے ہیں - اس صورت حال کے جو نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ
تعلیمی اور قومی نقطۂ نظر سے نہایت مضر ہیں - ایک تو
انگریزی زبان پر ضرورت سے زیادہ زور دینے اور دیسی زبانوں سے
غفلت برتنے سے ان زبانوں کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی
جس کو ناسمجھ لوگ ان کے خلاف بطور ایک دلیل کے
پیش کرتے ہیں ! دوسرے، چونکہ ابتدا میں تقریباً تمام تعلیم
انگریزی زبان میں دی جاتی تھی اور اب بھی ثانوی تعلیم
بڑی حد تک اور اعلیٰ تعلیم تمام‌تر انگریزی میں ہوتی ہے
اس لیے ملک میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں کے
درمیان بیگانگی پیدا ہوگئی جس کے اثرات دونوں کے لیے بہت
برے ثابت ہوئے - یعنی ان کے اغراض و مقاصد میں جو
اختلاف تھا وہ اور بڑھ گیا اور معاشری معاملات میں اتفاق رائے
اور اتحاد عمل نامکن ہوگیا - گزشتہ چند سال میں سیاسی
اسباب اور تحریکوں کی بدولت اس کی کسی قدر اصلاح
ہوئی ہے - لیکن ابھی تک ان طبقوں میں یک جہتی پیدا
نہیں ہوئی خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے انگریزی زبان کو ذریعۂ
تعلیم بنانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان تمام طلبہ کا علمی معیار
بہت کم ہوگیا ہے جنھیں غیر زبانوں کی تحصیل سے کوئی
خاص مناسبت نہیں اور چونکہ بہت بڑی تعداد ایسے ہی
طلبہ کی ہے اس لیے مدرسوں کے عام معیار پر نہایت
خراب اثر پڑا - ایک اوسط قابلیت کے طالب علم کے لیے
یہ بہت مشکل ہے کہ وہ کسی مضمون مثلاً تاریخ، جغرافیہ یا
سائنس کا مطالعہ ایک غیر زبان میں کرے - اس کی آدھی
توجہ مطلب پر ہوتی ہے اور آدھی ان الفاظ پر جن کا صحیح

ہوسکتی جب تک عوام کے مذاق کا معیار بلند نہ کیا جائے
اور اس کی ذمہ داری بھی اور بہت سی ذمہ داریوں کی
طرح مدرسوں پر عائد ہوتی ہے - ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ ہر
شخص میں اعلیٰ احساس جمال پیدا ہوسکتا ہے یا ہر
شخص صناع بن سکتا ہے - لیکن ہمارے نزدیک ہر شخص کا
مذاق ایک حد تک اصلاح پذیر ہے اور بےشمار خوبصورت مناظر
اور صنائع میں سے کسی نہ کسی سے ضرور لطف اندوز ہوسکتا ہے -
ساری قوم کے احساس جمال کی تربیت کے لیے مدرسے کے
ساتھ اور بہت سے بیرونی اداروں کا اشتراک عمل ضروری ہے لیکن
جہاں تک نوعمروں کا تعلق ہے مدرسے بہت کچھ کرسکتے ہیں
بشرطیکہ معلموں میں اس بات کا احساس ہو اور خود ان
میں ذوق جمال مفقود نہ ہو - ذوق ایسی چیز ہے جو
سکھایا نہیں جا سکتا بلکہ اسکا اثر براہ راست دل پر پڑتا ہے -
ہندوستانی مدارس کے نصاب کی بحث میں ہمیں مادری
زبانوں اور ان کے ادب کا ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ بہت سے
داخلی اور خارجی اسباب کی وجہ سے ہمارے یہاں اپنے زبان اور
ادب کی کما حقہ قدر نہیں کی جاتی - بہت سے ناواقف لوگوں
کا جنھوں نے صرف مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور تمام علوم
انگریزی زبان میں پڑھے ہیں یہ خیال ہے کہ ہندوستانی زبانیں
ابھی بہت کم مایہ ہیں اور ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ
اعلیٰ تعلیم کا بار اُٹھا سکیں - لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگ
سیاسی اور اقتصادی حالات سے مجبور ہوکر اپنی زبان اور
اپنے علوم سے بیگانہ ہوگئے ہیں اور اپنی ساری توجہ اور کوشش
مغربی علوم انگریزی زبان کے ذریعے سے حاصل کرنے میں صرف

نمونے موجود ہوں وہاں جاکر وہ استاد کی نگرانی میں ان کا مطالعہ کریں اور ان کی نظر میں حسن شناسی پیدا ہو - معمولی طالب علم کو اس کے بدنما اور بے کیف ماحول سے نکالنے کا ، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کا سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں کہ مدرسوں کو گویا اس وحشت ناک صحرا کے بیچ میں ایک دل‌کش نخلستان بنا دیا جائے جس کی فضا میں پرورش پاکر ان کے مذاق کی اصلاح ہو وہ خوش نما اور بدنما چیزوں میں تمیز کرسکیں ، عالم فطرت اور عالم صنعت میں جہاں کہیں کوئی خوبصورت چیز دیکھیں اس کی قدر کریں اور اس سے لطف اندوز ہوں اور اپنی صلاحیت اور میلان کے مطابق خود بھی تخلیق حسن میں حصہ لے سکیں - اس کا طریقہ وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یعنی طلبہ کو حسن صورت اور حسن ذوق کے ماحول میں رکھا جائے جو غیر محسوس طریقے پر ان کے ذاتی مذاق کو سدھارے اور نصاب میں ایسے مضامین شامل کیے جائیں جو ان کی عملی یا انفعالی طور پر جذبۂ تخلیق کے اظہار کا موقع دیں - ادب اور فنون لطیفہ کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جس شخص میں ان کا صحیح مذاق پیدا ہو جاتا ہے وہ گھٹیا چیزوں اور بدنما حرکتوں سے نفرت کرنے لگتا ہے - مثلاً ادنیٰ درجے کے ناولوں اور قصوں، بری تصویروں ، بےجا نمائش اور مبالغے سے اسے وحشت ہوتی ہے اور وہ خود بخود ان سے دور رہتا ہے - اس کے لیے کسی عقلی دلیل یا غور فکر کی ضرورت نہیں ہوتی - کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں مہذب نہیں

ہو، آرٹ کے عمدہ نمونوں کو دیکھ کر ان کا مذاق پاکیزہ اور شستہ ہو اور اُنھیں ایسے مشاغل میں دلچسپی ہو جن کو وہ آئندہ زندگی میں اپنی فرصت کا خوشگوار مشغلہ بناسکیں۔ ہمارے ملک میں شائد سو میں سے ننانوے طلبہ کا خانگی ماحول ایسا ہوتا ہے جو ان کے مذاق کی صحیح تربیت میں کسی طرح معین نہیں ہوسکتا - ان کو اپنے چاروں طرف بھدی اور بےڈھنگی چیزیں، تنگ و تاریک مکان ، خراب اور میلی سڑکیں، ادنیٰ درجے کی تصویریں، مشین کی بدنما مصنوعات نظر پڑتی ہیں جن کا مجموعی اثر ان کی طبیعت اور مزاق پر بہت خراب ہوتا ہے۔ مدرسے کا یہ کام ہے کہ انھیں حسین چیزوں سے روشناس کرے، اپنی چاردیواری کے اندر ہر چیز میں صفائی ، سادگی اور حسن ذوق کو دخل دے - اس کی عمارت صاف ستھری ہونی چاهیے- فرنیچر اور سامان کا قیمتی ہونا ضروری نہیں لیکن سڈول اور خوش‌نما ہونا نہایت ضروری ہے- تصویروں، دستکاریوں وغیرہ کے عمدہ نمونوں، طلبہ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی خوبصورت چیزوں ، اور مختلف قسم کے تعلیمی نقشوں سے کمروں کو سجانا چاهیے تاکہ ان سب کا اثر غیر محسوس طریقہ پر طلبہ کے مذاق پر پڑے - اسی طرح مدرسے میں جہاں کہیں ممکن ہو ، باغ یا چمن لگانا چاهیے کہ وہ حسن فطرت کا نہایت عمدہ نمونہ ہے اور جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں کم خرچ میں خوبصورت پھولوں کے گملوں اور بیلوں کی مدد سے مدرسے میں خوش‌نمائی پیدا ہو سکتی ہے - طلبہ کے لیے تعلیمی سیر و سفر کا اهتمام کرنا چاهیے تاکہ جہاں کہیں فن تعمیر یا مصوری یا قدیم صنعتوں وغیرہ کے خوبصورت

نہیں کیونکہ ایک حد تک انسان کی شخصیت میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں - لیکن بعض مضامین عملی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور بعض حسن ذوق پیدا کرنے پر - نصاب میں ان مضامین کی اہمیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کا ' خصوصاً بچے کا جذبۂ تخلیق کسی مرئی خوشنما شکل میں ظاہر ہونے کے لیے بیقرار رہتا ہے - وہ اپنے گرد و پیش کی اشیا کو ایسی ترتیب دینا چاہتا ہے کہ ان میں حسن پیدا ہو - وہ مادے کو صورت بخشنا چاہتا ہے - ادب میں وہ انسانی جذبات اور خیالات کا نظم و نثر کی خوشنما شکلوں میں مطالعہ کرتا ہے اور خود اپنے جذبات کو اسی انداز میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے - ہمیں ادب کی اعلیٰ معاشری قدر سے انکار نہیں کیونکہ اکثر ادب کے شاہکار انسانی زندگی کے مسائل اور محرکات کو سمجھانے میں سائنس اور تاریخ کے خشک اور علمی بیانات سے کہیں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے ہمجنسوں کی خوشی اور غم' کامیابی اور ناکامی میں شریک کرکے ہمارے جذبۂ انسانیت کی توسیع اور تہذیب کرتے ہیں - کسی اعلیٰ درجے کے شاعر کا کلام یا کسی جید ادیب اور افسانہ‌نگار کی بلند پایہ تصانیف حقیقی معنی میں زندگی کی تفسیر اور تمدن کی تنقید ہوتی ہیں - لیکن کسی تحریر یا تقریر ' کسی نظم یا نثر کو ادب کا درجہ اسی وقت ملتا ہے جب وہ ہمارے ذوق حسن کی تسکین کرے - اسی طرح نصاب میں دست‌کاری اور فنون لطیفہ کو اس غرض سے جگہ دینی چاہیے کہ بچوں میں جذبۂ تخلیق بیدار

کا یہی غلط اور محدود تصور ہے - اگر سائنس کے نصاب کو مجوزہ اصولوں پر مرتب کیا جائے تو اس سے یقیناً طلبہ کے علم اور واقفیت میں مفید اضافہ، ہوگا اور وہ موجودہ نظام تمدن کو جو بڑی حد تک سائنس کے اشاروں پر چلتا ہے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور اس کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہوکر زیادہ کامیابی حاصل کریں گے - یہاں اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ خواہ تاریخ کی تعلیم ہو یا سائنس کی یا کسی اور مضمون کی، اخلاقی مقاصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں کہ وہ ہر وقت طلبہ کے پیش نظر رکھے جائیں اور ان کی جا و بےجا تلقین کی جائے - ایسا کرنے سے طلبہ میں بد دلی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے - پائدار نتائج صرف اسی صورت میں حاصل ہوتے ہیں جب معلم خود تو ان مقاصد کو پیش نظر رکھے مگر طلبہ کو اس بات کا احساس نہ ہونے دے کہ ان کی اخلاقی تعلیم ہو رہی ہے - اخلاقی تلقین اور تبلیغ سے زیادہ موثر وہ بالواسطہ تربیت ہے جو علم اپنی اثر آفرینی، اپنے طریقۂ تعلیم، اور نصاب کی مناسب تدوین کے ذریعے دیتا ہے -

نصاب میں ایک طرف یہ علوم شامل ہیں جن کے ذریعے سے بچے تمدنی زندگی کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں اور مفید معلومات حاصل کرتے ہیں - دوسری طرف اس میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو علم سے زیادہ تربیت ذوق سے تعلق رکھتے ہیں اس میں ادب، فنون لطیفہ، یعنی موسیقی، مصوری، ڈرائنگ وغیرہ اور دست کاری شامل ہیں - تحصیل علم اور تربیت ذوق کے درمیان کوئی حد فاصل

بلکہ انسانی جد و جہد کا نتیجہ سمجھی جائے - اس مقصد کے لیے سائنس کے بڑے بڑے محققوں اور موجدوں کی سوانح عمری کا مطالعہ مفید ہے تاکہ طلبہ کو معلوم ہو کہ انہوں نے کس قدر مشکلات کا مقابلہ کیا کس طرح طلب میں صادق رہے اور اپنی تحقیقات سے دنیا کو مالا مال کرگئے - اور وہ یہ بھی سمجھ لیں کہ ان میں سے ہر ایک کی کامیابی ان بےشمار معروف اور غیر معروف کام کرنے والوں پر موقوف تھی جو ان سے پہلے اس میدان عمل میں جد و جہد کر چکے تھے - تیسری چیز جس کو سائنس کے نصاب کا جزو بنانا چاہیے یہ ہے کہ اس سے عمرانی زندگی میں کیا کام لیا جاتا ہے یعنی طلبہ کو اس کا موقعہ ملنا چاہیے کہ سائنس کے اصولوں کا استعمال روزمرہ کے کار و بار میں دیکھیں - وہ اپنے مدرسے کے معمل میں ایک محدود پیمانے پر سائنس کے قوانین اور اصولوں کے استعمال کو دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ کافی نہیں - انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان قوانین کو انسان نے کس طرح بہت بڑے پیمانے پر اپنے مادی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا ہے - اس لیے جہاں کہیں موقع ہو انہیں بڑے بڑے کارخانوں اور مشینوں کا اور روزمرہ کی زندگی میں سائنس کے کرشموں کا مشاہدہ کرانا چاہیے تاکہ ان کی نظر میں وسعت پیدا ہو اور وہ سائنس کے غیر محدود عملی امکانات سے روشناس ہوں - ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ وہ سائنس کو ایک ایسا علم سمجھیں گے جو کتابوں تک یا مدرسے کے معمل اور اس کے چھوٹے چھوٹے آلات تک محدود ہے - بلکہ سچ پوچھیے تو ہمارے طلبہ میں سے اکثر کے ذہن میں سائنس

نہ صرف اس باہمی وابستگی کی تشریح اور تفسیر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے کر سکتے ہیں بلکہ طلبہ میں وہ علمی طرز خیال پیدا کرسکتے ہیں جس کی ہماری قوم میں بہت کمی ہے - لوگوں کے جوش، حوصلے اور امنگ کو ابھارنے کے لیے انہیں تقدیر پرستی کے بجائے فلسفۂ عمل کی تلقین کرنے کے لیے، ان کی خوابیدہ قوت تسخیر کو بیدار کرنے کے لیے ان تک سائنس کا پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے - دوسری قوموں نے سائنس کے ذریعے نہ صرف فطرت کی قوتوں کو مسخر کرلیا ہے بلکہ ملکوں اور قوموں کو اپنا مطیع بنا لیا ہے - برخلاف اس کے ہم اپنی غفلت اور جمود اور سائنس کی طرف سے بے پروا ہونے کی وجہ سے اپنی قدیم حیثیت کو بھی کھو بیٹھے ہیں - اس حالت کو بدلنے میں سائنس بہت مدد دے سکتی ہے - بےشک اس کا تعلق قومی سیرت کی تشکیل سے ہے جو ایک مشکل اور وسیع مسئلہ ہے جس سے ہم کتاب کے تیسرے حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے - لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس عظیم‌الشان کام کی بنیاد مدرسے ہی میں ڈالی جا سکتی ہے اور اس میں علاوہ اور چیزوں کے، نصاب کو خصوصاً سائنس کے نصاب کو بہت بڑا دخل ہے - اس کا مروجہ نصاب جو متفرق مباحث کے متعلق بالکل سطحی اور سرسری واقفیت تک محدود ہے اس مقصد کو پورا نہیں کرتا - اس میں عملی پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ میں فعالیت اور کارکردگی کی نشو و نما ہو - اس کے انسانی پہلو کو زیادہ نمایاں کرنا چاہیے تاکہ سائنس محض مجرد تصورات اور نظریوں کا مجموعہ نہیں

بنیاد کسی مضبوط عقیدے پر نہیں ہوتی - اگر ہم کسی ملک کے افراد میں اغراض و مقاصد کا مستقل اتحاد اور باہمی ہمدردی کا پائدار جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ ہم مدرسے کی چاردیواری میں نوعمر بچوں اور نوجوانوں پر اثر ڈالیں تاکہ وہ وہاں سے قومی اتحاد کے پکے رنگ میں رنگے ہوئے نکلیں - اس میں تاریخ کا کام یہ ہے کہ وہ انہیں رفتہ رفتہ لیکن نہایت موثر طریقے سے یہ محسوس کرا دے کہ ہر قسم کی ترقی کے لیے، تمام بڑے بڑے کاموں کو انجام دینے کے لیے، ہر زمانے میں اشتراک عمل کی ضرورت رہی ہے اور وہ تمام جنگ و جدل کے واقعات، بادشاہوں کی لڑائیاں، جماعتوں کے اختلافات، جن کی داستانوں سے مروجہ درسی کتب بھری پڑی ہیں سطحی چیزیں ہیں - ان کی مثال طوفانوں کی سی ہے یہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں مگر اصل چیز جو دریا یا سمندر کی ہستی کو قائم رکھتی ہے وہ اتصال یا کشش ہے جو ناچیز قطروں کے مجموعے کو ایک بحر زخار ایک غیر محدود قوت کا خزانہ بنا دیتی ہے - ان سیاسی مخالفتوں کی تہ میں وہ اتحاد عمل پوشیدہ ہے جس کی بدولت معاشرتی زندگی قائم ہے جس کی وجہ سے زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ کے سارے کام چلتے رہے ہیں اور چلتے رہیں گے - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں تاریخ کے اقتصادی، معاشرتی اور عقلی پہلوؤں پر زور دینے کی ضرورت ہے - اسی طرح ہمارے موجودہ قومی حالات میں سائنس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے - اس کی صحیح تعلیم کے ذریعے ہم

جہالت، نہ مرض، نہ بے انصافی ۔ مختصر یہ کہ ہر
مضمون کے ذریعے سے جس کو نصاب میں جگہ دی جائے وہ
طرز خیال پیدا کرنا چاہیے جو انسانوں پر یہ ذمہ‌داری
عائد کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ماحول کی تعمیر جاری
رکھیں اور اپنے لیے ایسے معیار عمل بناتے رہیں جو احترام
انسانیت یعنی جمہوریت کے ساتھ ہم‌آہنگ ہوں"[1]۔

ہمارے ہندوستانی مدارس میں سائنس کی تعلیم اس
قدر ابتدائی اور ناقص حالت میں ہے کہ اس سے نہ وہ محدود
علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں جو عام طور پر استادوں کو مرغوب
ہیں، نہ وہ وسیع‌تر معاشری اغراض جن کی تشریح بوڈ (Bode)
نے اپنی کتاب میں جا بجا کی ہے ۔ یوں تو ہمارے تمام درسی
مضامین میں اصلاح اور ترتیب جدید کی ضرورت ہے لیکن
تاریخ اور سائنس کا نصاب تو ایک سرے سے بدلنا ہے کیونکہ
انھیں دونوں مضامین کے ذریعے ہم ہندوستانیوں میں اجتماعی
احساس کو مستحکم کرسکتے ہیں اور فرقہ‌وارانہ تعصبات کو
مٹا کر ان کی جگہ قومیت کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں ۔
بعض خاص سیاسی حالات میں مثلاً جب ایک ملک کے لوگ
کسی غیر قوم کے محکوم ہوں اور اس کے جبر و تشدد سے عاجز
آجائیں تو قومی اتحاد اور وطنیت کا جوش جذبۂ منافرت یا
جذبۂ انتقام کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن وہ عارضی
ہوتا ہے ۔ ان وقتی اثرات کے دور ہوتے ہی باہمی اختلافات پھر
عود کر آتے ہیں اور اتحاد مفقود ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی

1- Bode : Modern Educational Theories صفحہ ۷۰ ۔

مرتب کرنا ہوگا کہ ہمارے طلبہ ان نئے معاشرتی مسائل سے جو سائنس کی ترقی کا نتیجہ ہیں عہدہ برآ ہوسکیں۔ پروفیسر بوڈے (Bode) سائنس کے امکانات اور اسکے تعلیمی اثرات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"جیسا کہ ہمیں معلوم ہے سائنس نے ہمارے روز مرہ کے ماحول کو بالکل بدل دیا ہے - اگر ہم غور کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس تبدیلی کی وسعت کا صحیح اندازہ ہوگا.........سائنس کی ایجادات مثلاً آلات حرب، مبادلۂ خیالات کے ذرائع، وسائل نقل و حمل، مشینوں کی صنعت و حرفت وغیرہ کی بدولت معاشری نظام کے جدید نمونے قائم ہو گئے ہیں۔ مختلف طرح سے لوگوں میں باہمی وابستگی کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں جن کی وجہ سے باہمی مفاہمت اور اتحاد عمل کا دائرہ وسیع‌تر ہوگیا - اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سائنس ہی نے ہمیں یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ کائنات پر قوانین قدرت کا تسلط ہے اس لیے ہمیں اپنے مذہبی اور اخلاقی تصورات کی تنظیم نئے سرے سے کرنا چاہیے۔ معاشری نظر سے ہماری یہی مراد ہے کہ اگر ایک ہوشیار اور عقل‌مند معلم سائنس پڑھائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ طلبہ کے دل میں انسانوں کا احترام بحیثیت انسان ہونے کے راسخ ہو جائے گا اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم جمہوریت کہتے ہیں - اس مقصد کے لیے معلم اس اصول کو اپنا رہبر بنائے گا کہ انسان اپنے ماحول کا مالک ہے اور وہ ایک ایسی دنیا تعمیر کر سکتا ہے جس میں نہ افلاس ہوگا، نہ

دوسری طرف یہ دکھلائے کہ انسان نے انفرادی اور اجتماعی کوشش کے ذریعے کس طرح رفتہ رفتہ ان قوانین کو سمجھ کر اور ان سے کام لےکر عالم فطرت کو مسخر کرلیا ہے اور صنعت و حرفت اور کاشتکاری کا یہ زبردست نظام قائم کیا ہے - جغرافیہ بحیثیت ایک انسانی علم کے اور بحیثیت ایک سائنس کے یہ فرائض انجام دیتا ہے - عمرانی علوم اور سائنس دونوں اپنی جگہ پر اس مقصد کی تکمیل میں مدد دیتے ہیں اور اپنے رنگ میں طلبہ کی نظر میں وسعت پیدا کرتے ہیں اور انہیں یہ دکھاتے ہیں کہ لوگ کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں کن حالات اور قوانین کے ماتحت اپنے کار و بار چلاتے ہیں اور ہر شخص کی بھلائی برائی ' کامیابی اور ناکامیابی کس طرح اور کس حد تک دوسروں پر منحصر ہے - طریقۂ تعلیم اور مواد تعلیم دونوں کی نفسیاتی تنظیم کرنے اور انہیں موجودہ جمہوری معاشرے کے لیے موزوں بنانے کی غرض سے اسی اصول پر عمل کرنے کی ضرورت ہے - سائنس کا نصاب اس لحاظ سے بھی معین کیا جاسکتا ہے اور اکثر اسی خیال سے کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے طلبہ کو کچھ واقعات اور حقائق معلوم ہو جائیں اور وہ سائنس کے مخصوص طریقۂ عمل سے روشناس ہو جائیں - لیکن اس کا ایک دوسرا اور اہم‌تر مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں میں معاشری احساس اور نظر پیدا کرے جس کے ذریعے سے ان میں تمدنی زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو - اس لیے کہ موجودہ معاشرت اور تمدن کے اصول سائنس سے ماخوذ ہیں اور ان کو سمجھانے کے لیے ہمیں مدرسے میں سائنس ہی سے کام لینا پڑیگا اور اس کی تعلیم کو اس طرح

کئی سال تک تجربے کرنے کے بعد اپنے نصاب شائع کئے ہیں -
ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں بہت کچھ
کام ہوچکا ہے اور وہ نظری بحث کرنے والوں نے نہیں بلکہ
زیادہ‌تر اُن لوگوں نے کیا ہے جو خود معلمی کرتے ہیں انہوں
نے سب مضامین میں اس قدر تبدیلیاں کی ہیں کہ گویا
ان کی قلب ماہیت کردی ہے - اس کے لیے خاص طور پر
ونٹکا (Winnetka) سے نصاب کا مطالعہ کرنا چاہیے جو
پروفیسر رگ (Rugg) کی نگرانی میں تیار ہوا ہے کیونکہ
وہ دوسرے نصابوں کی طرح محض ایک اسکول میں جہاں
کے حالات غیر معمولی طور پر سازگار ہوں استعمال نہیں کیا
گیا بلکہ ایک پوری ریاست کے تمام مدارس میں جاری ہے -

نصاب جدید میں تاریخ ' جغرافیہ ' سائنس' ادب وغیرہ
غرض ہر مضمون میں زندہ مباحث شامل کئے گئے ہیں یعنی
وہ چیزیں جو ایک طرف بچوں کی دلچسپی اور شوق
کو ابھارتی ہیں اور دوسری طرف تمدنی زندگی کے مسائل
حاضرہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہیں - تاریخ ارتقاے
انسانی کی تفسیر ہے جو بچوں کے تجسس پسند دماغ کو وہ
زبردست ڈراما دکھاتی ہے جس کا ہیرو انسان ہے اور اسٹیج
عالم فطرت اور جس کا ہر ایکٹ اس کی تہذیب و ترقی کے
کسی دور کا نقشہ دکھاتا ہے - جغرافیہ بےربط واقعات اور
معلومات کا مجموعہ نہیں رہا - اس کا کام اب یہ ہے کہ انسان
اور اس کے طبیعی ماحول کا عمل اور رد عمل دکھائے اور بچوں
کو ایک طرف تو یہ احساس دلائے کہ انسان اور فطرت قوانین
طبیعی کے ذریعے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور

طلبہ کو اصطلاحوں کی تعریفیں اشیا کے خواص اور قوانین فطرت کے ضابطے یاد کرائے جاتے تھے - ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے اور زندگی کا تعلق جو تعلیم کی جان ہے قطع ہوگیا - لہذا مصلحین تعلیم نے کوشش کی کہ تمام درسی علوم کے متعلق یہ دریافت کریں کہ تمدنی زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے کیا چیزیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور کیا چیزیں ایسی ہیں جو محض رسماً اور روایتاً چلی آتی ہیں - اس لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے - بعض لوگوں نے تمدنی ضروریات کا تجزیہ کیا اور ہر مضمون کے بس اُتنے مسائل جتنے ان ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر تھے منتخب کر لیے - بعض نے زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھا ' بالخصوص امریکا والوں نے - یعنی نصاب کے متعلق بہت سے سوالات تیار کرکے معلموں ' بچوں کے والدین ' کارخانوں کے مالکوں ' سرکاری حکام وغیرہ کے پاس بھیجے گئے اور ان کے جوابوں کا مطالعہ کرکے نتائج نکالے گئے - بعض نے اپنے اپنے مدرسوں میں طلبہ کے شوق اور ان کی پسند کو اپنا راہبر بنایا اور یہ دیکھا کہ کون سے مباحث اور موضوع ایسے ہیں جو ان کی زندگی کے ساتھ ربط رکھتے ہیں - اور جن میں ان کا دل خود بخود لگتا ہے - اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات کوششیں مناسب حدود سے آگے نکل جاتی تھیں اور ایک آزمائشی طریقے کو لوگ حکمی اور قطعی سمجھنے لگتے ہیں - لیکن اُن کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام درسی مضامین میں بہت مفید ترمیم و تنسیخ ہوئی اور ہوتی جا رہی ہے - بعض مدارس جدید نے

اہمیت رکھتے ہیں یا جن کا موجودہ تمدن سے لازمی تعلق ہے - نصاب تعلیم کے معاملے میں ہمیشہ یہی مشکل پیش آتی ہے کہ جب وہ بہت عرصے تک رائج رہتا ہے اور اس پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تو اس میں بہت سی فضول چیزیں شامل ہوجاتی ہیں - چنانچہ یہی صورت مغربی تعلیم کے نصاب کو پیش آئی - اس میں تاریخ ' جغرافیہ ' ریاضی وغیرہ داخل تو ہوگئے لیکن تاریخ خشک اور بےربط واقعات اور ناموں اور سنوں کے مجموعے کا نام تھا جن کو یاد کرنے سے نہ ذہنی تربیت ہوسکتی تھی نہ ماضی کی تعبیر ' نہ حال کی تفسیر ' نہ مستقبل کے لیے تیاری - جغرافیہ بھی علی‌ہذا القیاس دریاؤں اور پہاڑوں اور شہروں اور آبادیوں وغیرہ کے متعلق بےشمار غیر ضروری معلومات سے بھرا پڑا تھا - اس کے مطالعے سے نہ انسان اور اس کے طبیعی ماحول کا تعلق سمجھ میں آتا تھا نہ علت اور معلول کے اس سلسلے پر روشنی پڑتی تھی جس میں کائنات کے تمام مظاہر جکڑے ہوئے ہیں - ریاضی کے تمام مضامین یعنی ہندسہ ' جبر و مقابلہ ' حساب وغیرہ بالعموم اس غرض سے پڑھائے جاتے تھے کہ ان سے قوت استدلال کو ترقی ہو اور مجرد نظریات اور مسائل کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو - اس لیے اس کے مباحث زندگی کے واقعی امور اور معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ اکثر طلبہ کے سامنے ایسے سوالات پیش کیے جاتے تھے جن کے مفروضات کسی طرح عقل میں نہیں آتے تھے - اسی طرح سائنس بھی ابتدا میں ایک نظری علم بنا دی گئی تھی جس میں

کے لوگوں کے لیے موزوں ہو۔ لہذا ضرورت یہ محسوس ہوئی ہے کہ نصاب میں نئے مضامین کو داخل کیا جائے، اس کے نیم مردہ قالب میں نئی روح پھونکی جائے تاکہ وہ جدید تمدن کے راستوں میں طلبہ کی رہبری کر سکے۔ اس تحریک نے جس کو توسیع نصاب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے دو شکلیں اختیار کیں۔ اول تو بعض قدیم مضامین کو ترک کرکے یا ان کے نصاب کو کم کرکے جدید علوم و فنون کو مدرسوں میں جگہ دی گئی۔ اس کی مثالیں ہر ملک میں مل سکتی ہیں۔ مغرب میں یونانی اور لاطینی زبانوں اور ہندوستان میں عربی، فارسی، سنسکرت کا بوجھ ہلکا کیا گیا اور نصاب میں دیسی زبانیں، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، دستکاری، امور خانہ داری وغیرہ شامل کر لیے گئے۔ ان مضامین کی وجہ سے نصاب نہ صرف زیادہ 'مفید' بن گیا بلکہ اس میں وسعت اور جامعیت پیدا ہوگئی اور اس کے دائرے میں تمدنی زندگی کے جدید شعبے بھی آگئے جن کو قدیم نصاب نظرانداز کرتا تھا۔ لیکن نصاب میں محض چند مضامین کے اضافے سے کوئی بنیادی تعلیمی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی۔ اصلاح نصاب کی تحریک کا دوسرا رخ قدیم اور جدید دونوں طرح کے مضامین کی داخلی ترتیب اور تنظیم سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی ماہرین تعلیم کی توجہ اس طرف راجع ہوئی کہ ان تمام مضامین کا از سرِنو جائزہ لیا جائے اور ان میں جس قدر غیر ضروری اور غیر مفید مباحث شامل ہوتے ہیں ان کو خارج کرکے ایسے مباحث داخل کیے جائیں جو مستقل اور دائمی

جاتا ہے کہ طلبہ معاشرے کے نظام اور انسانوں کے باھمی تعلقات کو سمجھیں ' انھیں مل جل کر رھنے اور کام کرنے کا موقع ملے اور وہ اس جمہوری اور تمدنی زندگی میں بطور مفید اور مستعد اراکین کے شریک ہو سکیں جس کی تشکیل جدید سیاسی اور صنعتی اثرات کے ماتحت ہو رہی ہے -

اب ہم بحیثیت مجموعی نصاب کی تنظیم کے مسئلے پر نظر ڈال سکتے ہیں - نصاب کے مضامین کا انتخاب تمدنی زندگی کی ضروریات اور مطالبات کو مد نظر رکھ کر کرنا چاہیے ان کی ترتیب اور تعلیم میں بچوں کی نفسیاتی نشو و نما اور قوانین کو اپنا راھبر بنانا اور ان سے اس طرح کام لینا چاہیے کہ طلبہ نہ صرف مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کرکے بیٹھ رہیں بلکہ ان میں نئے مسائل اور معاملات کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو اور وہ مستعدی کے ساتھ زندگی کے کار و بار میں حصہ لیں - مدرسوں کا قدیم نصاب جن حالات میں مرتب ہوا تھا وہ اب تبدیل ہوچکے ہیں - یورپ میں یونانی اور لاطینی علم و ادب کا دور دورہ تھا - ہندوستان میں سنسکرت ' فارسی اور عربی زبانیں تہذیب اور تعلیم کا سرچشمہ تھیں - تہذیب کا مفہوم بجائے خود محدود اور یکطرفہ تھا - اسی میں ان تمام مشاغل کو کوئی جگہ نہ دی جاتی تھی جن کا تعلق انسان کی مادی ضروریات کے پورا کرنے سے ہے - لیکن اب نئے علوم ' نئی زبانیں ' نئے سیاسی اور معاشرتی حالات پیدا ہوگئے ہیں - تہذیب کا مفہوم وسیع ہو گیا ہے اور اس کو اور زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ہر فرقے اور ہر طبقے

صنعت و حرفت اور اکثر پیشوں کا دار و مدار اس پر ھے بلکہ وہ دماغی تربیت اور تہذیب نفس کا بھی ایک نہایت موثر اور قابل قدر وسیلہ ھے - لہذا اب نصاب میں سائنس محض اس بنا پر داخل نہیں کی جاتی کہ اس سے مثلاً قوت مشاہدہ کی تربیت ھوتی ھے بلکہ اس کا خاص وصف یہ سمجھا جاتا ھے کہ اس کے ذریعے ھم زندگی کے نظم اور ربط کو بخوبی سمجھ سکتے ھیں اور اس میں عمدگی اور قابلیت کے ساتھ حصہ لے سکتے ھیں - اسی طرح نصاب تعلیم پر ان سیاسی تغیرات اور انقلابات کا اثر بھی پڑا جن کی بدولت قومی ریاستیں اور جمہوری حکومتیں وجود میں آئیں' سیاسی اختیارات ایک محدود طبقے کے ھاتھ سے نکل کر رفتہ رفتہ قوم کے تمام افراد کو حاصل ھوئے اور معاشرتی فرقہ‌بندیوں کے ٹوٹنے سے لوگوں میں باھمی یک‌جہتی کا احساس پیدا ھوا - اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم جو پہلے چند خاص طبقوں تک محدود تھی باقی طبقوں میں پھیلنی شروع ھوئی اور حکومت نے یہ تسلیم کرلیا کہ کم از کم ابتدائی تعلیم حاصل کرنا ھر آزاد شہری کا حق ھے - جب تک تعلیم خوش حال اشراف کے لیے مخصوص رھی جن کے فرائض میں حصول معاش ' محنت اور مزدوری ' کاشتکاری ' صنعت و حرفت کے مشاغل شامل نہ تھے اور جو زیادہ‌تر علمی اور ادبی تفریح اور ایک قسم کی سطحی تہذیب کی خاطر تعلیم حاصل کرتے تھے نصاب تعلیم کا قدیم علوم و ادب تک محدود ھونا سمجھ میں آسکتا تھا - اول تو اس وقت تک واقعی یونانی اور رومی زبانیں ھی علم و تہذیب کے بہترین عناصر کی حامل

سائنس کی تحقیقات اور ایجادات پر ہے - یہاں تک کہ اس زمانے میں زندگی کے ہر شعبے میں سائنس کو دخل ہو گیا ہے - کوئی شخص جو سائنس کی کم از کم ابتدائی اور ضروری باتوں سے واقف نہیں اپنے موجودہ ماحول کو نہ پوری طرح سمجھ سکتا ہے نہ کامیابی کے ساتھ اس میں حصہ لے سکتا ہے۔ لہذا مدرسوں کے لیے یہ لازم ہو گیا کہ وہ اپنے نصاب میں سائنس کو نمایاں اہمیت دیں تاکہ طلبہ شہریت کے نئے فرائض کو اچھی طرح ادا کرسکیں - لیکن اس وقت تقریباً تمام ملکوں میں' بالخصوص انگلستان میں' روم اور یونان کا علم و ادب مدرسوں کی تعلیم پر حاوی تھا - علوم قدیمہ کے حامیوں کا دعویٰ تھا کہ ذہنی تہذیب و تربیت کا کوئی ذریعہ ان کے سوا ہو ہی نہیں سکتا - برخلاف اس کے وہ لوگ جو جدید اقتصادی اور صنعتی تحریکوں سے متاثر ہو چکے تھے سائنس کی اہمیت پر زور دیتے تھے - ان کا دعویٰ تھا کہ نہ صرف افادی نقطۂ نظر سے اس کو نصاب میں داخل کرنا ناگزیر ہے بلکہ اس کے بغیر اہم‌ترین دماغی قوتوں کی نشو و نما ناممکن ہے - چنانچہ اُنیسویں صدی کا بیشتر حصہ اِنگلستان کی تعلیمی تاریخ میں' جدید سائنس اور قدیم (یونانی اور رومی) علم و ادب کے درمیان جنگ کا زمانہ تھا جس میں سائنس کا سب سے بڑا اور سب سے ممتاز مددگار ہربرٹ اسپنسر تھا - جب رفتہ رفتہ مدرسوں کے نصاب میں سائنس کو وہ حصہ مل گیا جس کی مستحق تھی اور اس کے طریقۂ تعلیم میں اصلاح ہوگئی تو معلموں کی آنکھیں کھلیں اور انھیں معلوم ہوا کہ سائنس کی اہمیت محض اس وجہ سے نہیں کہ تمام

کہ وہ کامیاب ہوتی ہیں یا نہیں - اس میں شک نہیں کہ اس کا تعلق بہت کچھ طریقۂ تعلیم سے ہے لیکن جب تک نصاب ایسا نہ ہو جس میں ان تجربوں اور کاموں کا موقع مل سکے طریقۂ تعلیم بجائے خود کافی ہیں - موجودہ زمانے میں دستکاری کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی مختلف شکلوں میں ان تمام تجربات کو حاصل کرنے کا امکان ہے اور اس کے ذریعے بچوں کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی تربیت ہوسکتی ہے- بشرطیکہ اسے صحیح اصولوں پر مدرسے میں رائج کیا جائے اور اس کا مقصد تنگ اور محدود نہ ہو بلکہ وہ طلبہ کی پوری شخصیت کو دعوت عمل دیتی ہو -

کچھ عرصے سے نصاب میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں وہ زیادہ تر زمانۂ حال کی تمدنی ترقی اور انقلابات کا نتیجہ ہیں - مدرسوں کا شمار بالعموم قدامت پسند اداروں میں ہوتا ہے یعنی وہ حتی الامکان ان طریقوں میں جو پہلے سے چلے آتے ہیں کسی قسم کا تغیر پسند نہیں کرتے - اس لیے وہ بالعموم معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے بلکہ پیچھے رہ جاتے ہیں - لیکن جب ضروریات زمانہ انہیں بالکل مجبور کردیتی ہیں تو وہ بےدلی سے رفتہ رفتہ اپنے نصاب اور نظم و نسق میں تبدیلیاں کرتے ہیں - اس کی تشریح چند مثالوں سے ہوسکتی ہے - گزشتہ دو سو برس کے اندر مغربی ممالک کی صنعت و حرفت میں ایک زبردست انقلاب ہوا ہے جس نے انسانی معیشت کے قدیم نظام کو درہم برہم کر کے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی ہے - جیسا ہم ایک گزشتہ باب میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں اس نظام کا دار و مدار زیادہ تر

تجربے کی ضرورت ھے - نصاب کے مسئلے کو معاشرتی زندگی سے جدا کرنا اور اس میں محض دماغی قوتوں کی تربیت کا لحاظ رکھنا کسی طرح جائز نہیں - صدیوں تک نصاب کی تنظیم جس غلط نفسی عقیدے کی بنا پر ھوتی رھی ھے اس کی تردید ھم اوپر کرچکے ھیں - نصاب کے لیے مضامین کا انتخاب اس اصول پر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دماغ کی مختلف، مستقل اور غیر مربوط قوتوں کی تربیت کرتے ھیں - مثلاً یہ کہ ریاضی کے ذریعے قوت استدلال کی تربیت، سائنس کے ذریعے قوت مشاھدہ کی، ادب قدیم کے ذریعے قوت تنقید، تخیل اور ذوق حسن کی - موجودہ علم نفسیات سرے سے اسی کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کے ذھن میں اس طرح کی مستقل اور قائم بالذات قوتیں موجود ھیں جن کی نشو و نما خاص خاص مضامین کے ذریعے کی جاتی ھے - اس کا نقطۂ نظر یہ ھے کہ طلبہ کی فطری اور ابتدائی صلاحیتوں کی نشو و نما کر کے ان کو دماغی قوتوں میں تبدیل کرنے کے لیے انہیں ایسے مشاغل میں شریک کرنا چاھیے جن کو انجام دینے میں استدلال، مشاھدہ، تخیل وغیرہ سبھی چیزوں کی ضرورت پڑے اور وہ اپنی خواھش اور جبلت کے تقاضے سے مجبور ھو کر ان سے کام لیں - لہذا مدرسۂ جدید میں درسی مضامین اور مشاغل دونوں کو اس اصول پر منتخب کرنا چاھیے کہ اُن کے واسطے سے طلبہ کو انسانی زندگی اور کار و بار کے مختلف شعبوں کو غور سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے - وہ اپنی قوت مشاھدہ سے کام لیں، چیزیں بنائیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تدبیریں سوچیں اور اُن کو آزما کر دیکھیں

کو پورا کرتی ہیں - ان کے ضمن میں طلبہ جو کچھ سیکھتے
ہیں اس کو وہ زیادہ اچھی طرح استعمال کرسکتے ہیں -

۳—اگر اور سب باتیں یکساں ہوں تو مقابلتاً وہ علوم
و فنون زیادہ قابل قدر اور تعلیمی لحاظ سے زیادہ مفید ہیں
جن کے استعمال کے موقعے انسان کی زندگی میں کثرت سے
پیش آئیں -

۴—نصاب میں ایسے مضامین اور مشاغل کو ترجیح
دینی چاہیے - جو مفید اور فعالانہ عادتوں کو نشو و نما دیں -
مثلاً غور و فکر کی قوت، جدت اپج ، میل جول کی صلاحیت ،
اعتبار وغیرہ -

۵—وہ مضامین اور مشاغل نصاب کے لیے مقابلتاً زیادہ
موزوں ہیں جو نہ صرف موجودہ ضروریات کو پورا کرتے ہیں
بلکہ آئندہ پیش آنے والے مسائل اور غیر متوقع حالات کے
لیے بھی تیار کرتے ہیں - برخلاف اس کے جو مضامین
محض ماضی کے حالات پر مشتمل ہوتے ہیں یا عارضی اور
فوری مفاد اور دلچسپیوں سے تعلق رکھتے ہیں یا محض
ان علمی شوقوں کو قائم رکھتے ہیں جو مدرسے کے روایتی
تعلیم کا نتیجہ ہیں ، ان کی اہمیت بہت کم ہے -

ان اصولوں اور نصاب کے متعلق دوسری تحریکوں کے
مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصاب کی ترتیب و انتخاب
میں ہمیں طالب‌علم اور اُس کے ماحول کے تعلق پر غور
کرنے کی ضرورت ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ تمدنی زندگی کے
مواقع سے ، جو اس تعلق کی بدولت پیدا ہوتے ہیں پوری
طرح فائدہ اُٹھانے کے لیے اسے کس قسم کی معلومات اور

موجود ہے جو گزشتہ چالیس سال میں نصاب کے متعلق کی گئی ہے اور اس پر بحث کر کے بعض اہم نتائج اخذ کیے گے ہیں - ان تمام نتائج کا لب لباب یہ ہے کہ معقول اور مکمل نصاب تعلیم بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی بنیاد طلبہ کی زندگی اور تمدنی ضروریات پر رکھی جائے تاکہ وہ ان کی جبلی رجحانات کی تربیت کر سکے اور ان کو موجودہ تمدن کے سب سے اہم اور بہتر عناصر سے روشناس کرے - پروفیسر تھارن ڈائک (Thorndike) نے تدوین نصاب کے نو اصول بیان کیے ہیں جن میں سے زیادہ ضروری اصولوں کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں [۱] ان سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے یہاں پیش کیا ہے -

۱—نصاب میں ایسے مضامین اور مشاغل کو ترجیح دینی چاہیے کہ جن کے ذریعے طلبہ میں وہ معلومات اور عادات، وہ مہارت، رجحان اور مذاق پیدا ہو جو انہیں ان کے طبیعی ماحول اور ان کی خاندانی شہری اور معاشرتی زندگی کے مطالبات پورا کرنے میں مدد دے اور ان کے جسم و دماغ میں صحت اور توازن قائم رکھے اور ان کے تفریحی، اخلاقی، مذہبی اور علمی وسائل کو ترقی دے - یہ وہ مرکزی معیار ہے جس پر اور تمام معیاروں کا انحصار ہے -

۲—عام طور پر وہ معلومات اور عادات وغیرہ زیادہ قابل قدر ہوتی ہیں جو براہ راست زندگی کی کسی واقعی ضرورت

۱- Thorndike and Gates : Elementary Principles of Education صفحہ ۱۸۳ -

شعبعے سے روشناس کرے۔ لیکن وہ سب مل کر اسے ایک مجموعی فلسفۂ زندگی کی تشکیل میں مدد دیں - اگر تعلیم انسان کو حقیقت کے مختلف پہلو دکھانے تک محدود رہے اور اسکی مکمل تصویر پیش نہ کر سکے تو گویا اس نے اپنے اعلیٰ ترین مقصد کو فراموش کر دیا -

تدوین نصاب کی تحریک نے گزشتہ تیس سال میں مغربی ممالک میں بہت اہمیت حاصل کرلی ہے اس کے متعلق مختلف ماہرین تعلیم نے اپنے اپنے نظریے پیش کیے - حال میں مدرسے کے معلموں اور ماہرین تعلیم دونوں نے نصاب کے مسئلے میں بہت تحقیق و تفتیش کی ہے جس کی وجہ سے مدارس جدید کے نصاب میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوا ہے اور ہوتا جاتا ہے - امریکا میں ہیرلڈ رگ (Harold Rugg) تھارن ڈائک (Thorndike) بوبٹ (Bobbit) اور سنیڈن (Sneddon) وغیرہ کی سرکردگی میں اس کے متعلق بہت سا کام ہوا ہے - بعض مدارس نے بھی اپنے تجربات شائع کیسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ درسی مضامین کی تقسیم و ترتیب اور ان کے موضوع میں کس قدر انقلاب ہو گیا ہے - حال ہی میں امریکا کی ایک مقتدر تعلیمی انجمن[1] نے تدوین نصاب کی تاریخ اور اس کی موجودہ تحریکوں اور بنیادی اصولوں کے متعلق دو ضخیم جلدیں بطور اپنے چوبیسویں سالنامے کے شائع کی ہیں اس کتاب میں اس تمام علمی تحقیقات کا خلاصہ اور تنقید

1- National Sciety for the Study of Education -

بدولت ان کے خیالات میں یک جہتی اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس فرض کا دوسرا نفسی رخ یہ ہے کہ طلبہ کی سیرت اور طبیعت پر جو اثرات تمدنی زندگی کے مختلف شعبوں میں شریک ہونے کی وجہ سے پڑتے ہیں ان میں ہم آہنگی اور تنظیم پیدا کی جائے تاکہ ان کے نفس میں وحدت اور اجتماع قائم رہے۔ اس کی تشریح ہم پہلے کر چکے ہیں۔ یہاں اس کا ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس سے تدوین نصاب کی ایک اہم اصول پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم نصاب کو محدود اور یک طرفہ نہیں بنا سکتے۔ اگر اس کی وساطت سے ہم طالب علم کا تعارف تہذیب و تمدن کے مکمل نظام سے کرنا چاہتے ہیں تو نصاب میں ان تمام اقدار اور مقاصد کی نمائندگی ہونی چاہیے جو اس نظام میں مستقل اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر اس میں سائنس پر حد سے زیادہ زور دیا جائے اور ادب کو نظرانداز کیا جائے یا نظری علوم کو جگہ دی جائے اور عملی مشاغل اور دستکاریوں کا خیال نہ رکھا جائے تو طلبہ کی تربیت ناقص اور یک طرفہ رہے گی اور وہ زندگی کے بعض اہم مسائل اور معاملات کا صحیح احساس نہ کر سکیں گے۔ اس خصوصیت سے دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نصاب کے مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہ ہونا چاہیے ورنہ ان کے اثرات طالب علم کی طبیعت پر جدا جدا پڑکر منتشر ہو جائیں گے اور اس کی مجموعی نشو و نما پر کوئی نمایاں اثر نہ ڈال سکیں گے۔ ان کی تربیت اس خوش اسلوبی سے کرنا چاہیے کہ گو ان میں سے ہر ایک طالب علم کو تمدنی زندگی کے کسی خاص

توقع ہے - اس خیال کا اثر نہ صرف طریقۂ تعلیم اور مضامین
کے انتخاب پر پڑے گا بلکہ ہر مضمون کی داخلی تنظیم میں
اور مباحث کی ترتیب میں اس کی وجہ سے تبدیلی لازم آئے
گی - کیونکہ ہمیں سائنس، ادب، تاریخ، جغرافیہ علوم کے ان
پہلوؤں پر زور دینا ہوگا جو انسانی زندگی کے معاشرتی رخ کی
تشریح کرتے ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں بنی نوع انسان کی
متحدہ جد و جہد کا نقشہ دکھاتے ہیں - اگر نصاب کی مناسب
ترتیب و انتخاب اور مدرسے کے عام مشاغل کے ذریعے بچوں
میں یہ عقیدہ عملی طور پر راسخ ہو گیا کہ انسانی زندگی کا
نظام امداد باہمی کے اصول پر قائم ہونا چاہیے تو ہم یہ توقع
کر سکتے ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد افراد اور جماعتوں کی
خودغرضانہ کشمکش ایک حد تک دور ہو جائے گی -

تیسری خصوصیت مدرسے کے ماحول کی یہ ہے کہ اس
میں تمدنی زندگی کے منتخب شدہ عناصر ایک خاص توازن
اور ہم‌آہنگی کے ساتھ مرتب کئے جاتے ہیں تاکہ تمدنی زندگی
کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کی کشاکش میں نوعمر بچے
اور نوجوان راہ سے بھٹک نہ جائیں اور اپنے آپ کو کسی خاص
طبقے یا خیال کے ساتھ وابستہ کر کے قومی تمدن کے مجموعی
نظام سے بےخبر نہ ہو جائیں - لہذا مدرسے میں فرقہ‌پرستی
کی تنگ فضا کی جگہ قومی روایات کا فراخ تر ماحول مہیا
کرنا چاہیے اور اسے اتنی وسعت دینا چاہیے کہ اس کی
حدود عالمگیر انسانی تمدن سے مل جائیں - اس طرح قوم کے
افراد میں ایک ہم‌آہنگ اور یکساں ذہنیت پیدا ہوتی ہے -
وہ ایک ہی قسم کے نصاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کی،

مقابلے کو بہت اهمیت دی گئی هے اور استاد بجائے اس کے که ان کو تعاون کا شوق دلائیں ان میں رقابت اور مسابقت کے جذبات کو ابھارتے هیں - اس کے ثبوت میں مروجه تعلیم کے بہت سے طریقے اور رجحانات پیش کیے جاسکتے هیں مثلاً امتحانوں کو تعلیم کا منتہائے نظر بناکر نمبروں کی پرستش کرنا ' مقابلے میں "اول" آنے والے طلبه کی حد سے زیادہ قدر و منزلت ' ایسے مضامین پر زور دینا جن میں علحدہ علحدہ کام کرنا پڑتا هے' ان مشاغل کی طرف سے بےپروائی جن میں مل جل کر کام کیا جا سکتا هے - اگر تعلیم کا مقصد یه هے که وہ تمدنی خرابیوں کی اصلاح کرے اور لوگوں کے اصول عمل اور معیار نظر کو بہتر بنائے تو اس کا یہی طریقه هے که طلبه نه صرف ان بہتر اصولوں اور معیاروں سے نظری طور پر روشناس کیے جائیں بلکه انهیں ان پر عمل کرنے کا بھی موقع ملے - مندرجۂ بالا مثال میں اس اصول کے معنی یه هوں گے که مدرسه اپنی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں تعاون عمل پر زور دے - نصاب میں ایسے مضامین اور طریقۂ تعلیم کو داخل کرے که بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا موقع ملے اور وہ تقسیم‌کار کے ذریعے مشکل امور کو انجام دینا سیکھیں - ان میں باهمی اتحاد اور وابستگی کا احساس مستحکم هو اور وہ اس حقیقت کو پہچانیں که وہ ایک جماعت کے رکن هیں اور اس حیثیت سے ان پر بعض اخلاقی اور معاشری فرائض عائد هوتے هیں - اگر وہ ان فرائض کو پورا نه کریں گے تو عمرانی زندگی کا شیرازہ بکھر جائے گا اور اس سے وہ فوائد حاصل نه هو سکیں گے جن کی

مفید ہیں اور مستقل اہمیت رکھتی ہیں - اور انہیں پر مدرسے میں پوری توجہ صرف کی جائے - اس طرح مدرسہ طلبہ کو ایک اعلیٰ تر معیار تمدن سے روشناس کر دیتا ہے تاکہ وہ بڑے ہوکر معاشرے کے مضر اداروں اور طریقوں کی تنقید اور اصلاح کر سکیں - اس خصوصیت کی تشریح ایک مثال سے ہو جائے گی - موجودہ زمانے کا تمام اقتصادی اور معاشرتی نظام مقابلے اور مسابقت باہمی کی بنیاد پر قائم ہے - لوگوں میں باہمی وابستگی کے احساس سے کہیں زیادہ یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے ذاتی فائدے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ اس کے لیے کیسے ہی قابل اعتراض ذرائع اختیار کرنے پڑیں اور اس کے نتائج دوسروں کے حق میں کتنے ہی خوفناک ہوں - بالخصوص بین الاقوامی سیاست اور تجارت میں اس اصول کی کارفرمائی اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے خطروں کا عام لوگ پوری طرح اندازہ نہیں کرسکتے - اگرچہ ہندوستان میں تجارت اور صنعت و حرفت میں اس حد تک ترقی نہیں ہوئی کہ مغرب کے ممالک کا سا مہلک مقابلہ رواج پائے لیکن معاشری زندگی میں ایک فرد دوسرے فرد سے ' ایک جماعت دوسری جماعت سے برسر پیکار رہتی ہے اور کسی کو یہ احساس نہیں کہ ہمارے اغراض میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ محض سطحی اور عارضی ہے ورنہ ہم سب کا حقیقی مفاد مشترک ہے - کیا مدرسے کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ وہ اپنی تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو انہیں خطرناک اصولوں پر چلائے ؟ افسوس ہے کہ ملک کے حالات سے متاثر ہو کر مدرسے میں بھی طلبہ کے باہمی

کرتا ہے کہ تمدنی زندگی کو نصاب کا موضوع مان کر اس میں سے اہم‌ترین مضامین مشاغل اور دلچسپ اور سبق آموز تجربات کا انتخاب کیا جائے اور انہیں نفسیات اطفال کی مناسبت سے ترتیب دی جائے تاکہ ان کے ذریعے سے طلبہ رفتہ رفتہ ان عناصر سے واقف ہوجائیں جن پر تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے - اگر ایسا نہ کیا جائے تو کار و بار سیاست، آرٹ، سائنس، مذہب سب بیک وقت طالب علم کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں گے اور اس کا نتیجہ ایک عام انتشار کی صورت میں رونما ہوگا - لہذا اس معاشرتی ادارے کا جسے ہم مدرسہ کہتے ہیں پہلا فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ کے لیے ایک سادہ ماحول مہیا کرے اور زندگی کے ان عناصر کو منتخب کرے جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کو نوعمر طالب علم سمجھ سکتے ہیں - اس کے بعد وہ ان میں ایک خاص ترتیب قائم کرتا ہے - ابتدا میں آسان چیزیں سکھاتا ہے اور ان کے مدد سے آگے چل کر زیادہ مشکل اور پیچیدہ امور کی تشریح کرتا ہے [1] -

دوسری خصوصیت اس ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تہذیب و تمدن کے وہی عناصر منتخب کئے جاتے ہیں جو بچوں کی تربیت پر عمدہ اثر ڈال سکتے ہیں - تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ سوسائٹی نسلاً بعد نسل تمام رسوم و قوانین منتقل کرتی چلی جائے بلکہ اصلاح اور ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جو صریحاً

---

1 -- Democracy and Education صفحہ ۵۲ -

کی بنیاد ان جبلتوں پر ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں
محض امکانات عمل کی حامل ہیں خود کوئی اخلاقی قدر
نہیں رکھتیں - البتہ آگے چل کر مختلف اثرات کی بدولت
اچھی یا بری صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اس لیے بچوں
کی صحیح تربیت اور ان کی جبلتوں کی مناسب نشو و نما
کے لیے تعلیمی ہدایت اور نگرانی ضروری سمجھی جاتی
ہے - لیکن یہ ذمہ‌داری جس سے ہم اخلاقی تربیت کے ذیل
میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کریں گے کہ بچوں کی
جبلتیں مناسب تادیب و تشریق کے ذریعے صحیح راہ پر
لگائی جائیں صرف معلموں ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ
مدرسے کے تمام ماحول پر جس میں نصاب طلبہ کی اجتماعی
زندگی ان کا کھیل کود ، ان کے فرصت کے مشاغل ، استاد کی
شخصیت وغیرہ سب شامل ہیں - اس لیے تعلیم کا سب سے
بڑا عملی مسئلہ یہ ہے کہ اس ''مخصوص ماحول'' کی تنظیم
کس طرح کی جائے کہ بچوں کی جبلتیں ان کے انفرادی
نشو و نما میں بھی مدد دیں اور عمرانی مقاصد کے حصول
میں بھی کام آئیں - اس ماحول کی تین خصوصیات جو
پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے بیان کی ہیں نصاب کے مسئلے
پر بھی روشنی ڈالتی ہیں اس لیے اس کا مختصر سا اعادہ
کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے - مدرسے کے ماحول میں موجودہ
تہذیب و تمدن کے مشکل اور پیچیدہ عناصر زیادہ آسان اور
سادہ شکل میں طلبہ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں کیونکہ
وہ ان کو اس تحلیل کے بغیر اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے -
اس نقطۂ نظر سے تدوین نصاب کا مسئلہ یہ صورت اختیار

باب اول میں بیان کیا ہے ۔ کیونکہ اس کے بغیر تدوین نصاب کی موجودہ تحریکوں کو سمجھنا مشکل ہوگا ۔

ہم نے بتایا تھا کہ مدرسہ، بقول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے ایک "مخصوص ماحول" ہے جہاں تمام تعلیمی اثرات اور نصاب اور مشاغل کی بالارادہ تنظیم کی جاتی ہے تاکہ طلبہ کی نشو و نما آزادی کے ساتھ ہو اور ان کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کے لیے بہترین حالات اور عناصر مہیا ہوسکیں ۔ طلبہ کو "آزادی" دینے کے یہ معنی نہیں کہ معلم نگرانی اور ہدایت سے بالکل دست‌بردار ہو جائیں اور انہیں ان کی جبلتوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیں اس اُمید پر کہ وہ خود بخود تمام اعلیٰ صفات اور قوتیں حاصل کرلیں گے ۔ ہمارا مشاہدہ اور علم نفسیات دونوں روسو (Rousseau) کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ اگر ہم مدرسوں کو بچوں کی خواہشات اور ضروریات کا تابع بنا دیں تو ان کی عقل و دانش اور سیرت خود بخود صحیح طریقے پر نشو و نما پاکر پختہ ہو جائے گی ۔ روسو کا یہ عقیدہ دراصل اپنے زمانے کے معلموں کی تنگ خیالی اور سخت گیری کے خلاف ایک رد عمل تھا ۔ ایک طرف یہ شدت تھی کہ لوگ گناہ آدم کے عقیدے کی بدولت بچوں کو بھی فطرتاً گناہ میں آلودہ سمجھتے تھے اور ان کی نجات کے لیے ہر قسم کی تعزیر و تادیب کو ضروری جانتے تھے ۔ دوسری طرف یہ غلو کہ ہر بچے کے اندر گویا ایک ولی اور حکیم پنہاں ہے جو پردے کو ہٹاتے ہی خود بخود ظاہر ہو جائے گا ! بہرحال تعلیم جدید ان دونوں نظریوں میں سے ایک کو بھی تسلیم نہیں کرتی ۔ کیونکہ اس کے نزدیک فطرت انسانی

اور مدرسین کے لیے ہمیشہ یہ خطرہ ہے کہ اپنے اپنے خاص
مضامین میں ایسے منہمک ہو جائیں کہ انہیں اس تعلق کا جو
یہ مضامین بچوں کی فطرت اور معاشرے کی زندگی سے رکھتے
ہیں، احساس ہی نہ رہے - لہذا نصاب کی بحث میں
یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس کے مضامین کے انتخاب اور
ان کی ترتیب دو چیزوں کی پابند ہے نفسیات اطفال کی
خصوصیات اور تمدنی زندگی کی ضروریات - اس کے بعد ہم یہ
سمجھ سکیں گے کہ مدرسین کا مروجہ نصاب کس حد تک ان
معیاروں پر پورا اترتا ہے جو ہم نے ان کے لیے مقرر کئے ہیں -
ہم بتا چکے ہیں کہ مدرسۂ جدید کا تعلق جماعتی
زندگی سے بہت قریب کا ہے - وہ کوئی قائم بالذات ادارہ نہیں
ہے جس کو گرد و پیش کی اقتصادی، سیاسی، معاشرتی
اور اخلاقی زندگی سے کوئی واسطہ نہ ہو - موجودہ نقطۂ نظر
یہ ہے کہ مدرسے کو اپنی اندرونی زندگی کی تشکیل معاشرے
کی زندگی کے نمونے پر کرنی چاہیے اور ایسے مواقع
بہم پہنچانے چاہییں جن سے فائدہ اٹھاکر طلبہ عمرانی
مشاغل اور مقاصد کو سمجھ سکیں اور ایک حد تک ان
میں شریک ہو سکیں - اگر مدرسہ بیرونی زندگی سے رابطہ
قائم نہیں رکھے گا تو وہ عمرانی ترقی کے لیے بے کار ثابت
ہوگا اور جو کچھ علم و ہنر اور استعداد طلبہ وہاں حاصل
کریں گے وہ اس کی چاردیواری تک محدود رہے گی اور
جب وہ اس چاردیواری سے باہر قدم رکھیں گے تو اس سے
کچھ فائدہ نہ اٹھا سکیں گے - اس ضمن میں "مدرسے" کے اس
جدید مفہوم کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے جس کو ہم نے

صرف اسی صورت میں ان کی ذہانت بیدار ہو کر مصروف عمل ہو سکتی ہے - محض انفعالی طریقے پر بہت سی معلومات حاصل کرلینا اور اس کو کسی نہ کسی طرح حافظے میں محفوظ رکھنا تعلیم نہیں کہلا سکتا - یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کو تاریخ' جغرافیہ' سائنس' ادب وغیرہ کے متعلق بہت سی واقفیت ہو لیکن اس کا دماغ ذہنی تربیت سے عاری ہو یعنی اس نے یہ ساری معلومات ایسے بےربط طریقے سے بغیر ذاتی جد و جہد کے حاصل کر لی ہو کہ اس سے اس کے ادراک اور احساس پر کوئی اثر نہ پڑا ہو اور وہ ان سے زندگی میں کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے -

علاوہ ذہنی تربیت کے نصاب کا دوسرا مقصد' جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے' یہ ہے کہ وہ طلبہ کو ان کے گرد و پیش کی زندگی اور اس کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد دے - اصل میں نصاب کا موضوع ہمارا طبیعی اور معاشرتی ماحول ہے - ہم نصاب کے مختلف عناصر اسی سے اخذ کرتے ہیں اور ان اجزا کا گہرا مطالعہ نوعمر بچوں کو کل کائنات کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے - اگر مدرسے کا نصاب کسی وجہ سے تمدنی زندگی سے بےتعلق ہو جائے یا ان دونوں کا باہمی رشتہ بہت کمزور ہو جائے تو مدرسے کی تعلیم بےمغز و بےروح ہو جاتی ہے - اور بجائے زندہ مسائل سے بحث کرنے کے الفاظ و علامات کے چکر میں پڑ جاتی ہے -

ہم تعلیم اور تمدن کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے اس خرابی کی طرف اشارہ کرچکے ہیں - اس کے پیدا ہونے کا سب سے زیادہ امکان نصاب کی ترتیب و تنظیم میں ہے جہاں معلموں

گزشتہ باب میں بیان کیا ہے نفسیات کے عالم اور مدرسوں کے معلم دونوں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے تھے کہ انسان کا دماغ مختلف ذہنی قوتوں کا مجموعہ ہے جو گویا اس کے دماغ کے مختلف گوشوں میں جاگزیں ہیں اور اپنی ترتیب و تنظیم میں ایک دوسرے سے بےتعلق اور آزاد ہیں - اس نظریے کے مطابق مختلف درسی مضامین نصاب میں اس لیے داخل کیے جاتے تھے کہ وہ خاص خاص ذہنی قوتوں کی تربیت اور تکمیل کریں گویا وہ قوتیں فطرت کی طرف سے بنی بنائی موجود ہیں صرف ان کو تیز کرنے' مشق اور استعمال کے ذریعے ان میں زیادہ مضبوطی پیدا کرنے کی ضرورت ہے - برخلاف اس کے ہم نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے مطابق انسان کا نفس ایک بسیط وحدت ہے جس کی تمام قوتیں انسانی جبلتوں کی بنیاد پر تجربے یعنی فرد اور ماحول کے باہمی عمل کے ذریعے سے نشو و نما پاتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ ہر تجربے کا اثر دماغ کی تمام قوتوں پر پڑتا ہے اور وہ ان سب کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے - لہذا نصاب کے مشاغل اور مضامین علحدہ علحدہ دماغی قوتوں مثلاً ادراک یا حافظے یا تخیل کو تیز نہیں کرتے بلکہ بحیثیت مجموعی ذہنی تربیت کے مسلسل عمل میں حصہ لیتے ہیں بشرطیکہ ان کی ترتیب و تنظیم مناسب اصولوں پر کی جائے اور طریقۂ تعلیم ارتقاے ذہنی کے قوانین کے ساتھ ہم آہنگ ہو - ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ تمام مضامین کی تحصیل اور مشاغل کی انجام دہی میں طلبہ کو فعالی حیثیت سے شریک ہونا چاہیے کیونکہ

بھی استاد زیادہ‌تر نصاب کی ترتیب و تنظیم سے مدد لیتا ہے
اور مدرسے کی عام فضا بھی اسی وقت تک تربیت کا وسیلہ
بنتی ہے جب طلبہ شوق اور محنت سے اپنے مقررہ نصاب کو
پورا کریں اور اسی کے سلسلے میں دوسرے علمی ' تفریحی اور
تخلیقی مشاغل کی بنا ڈالیں - علاوہ بریں طلبہ کو اپنے کام میں
اس وقت تک انہماک اور دلچسپی پیدا نہیں ہوگی جب تک
نصاب کو نفسیات اطفال کے ساتھ ہم‌آہنگ نہ کیا جائے اور
انہیں اس کے ذریعے نظام تمدن کی معرفت نہ حاصل ہو - اس
لیے بعض لحاظ سے نصاب کا مسئلہ' تعلیم کا مرکزی مسئلہ ہے-
اور گزشتہ پچاس سال میں ماہرین تعلیم نے اس پر بہت
توجہ صرف کی ہے - اور اس کے متعلق بہت کچھ تحقیقات کی
ہے - لیکن ہمارے ملک میں اب تک نصاب کی باقاعدہ تنقید
اور اصلاح نہیں کی گئی اور اس میں طلبہ کی نفسی ضروریات
اور تمدنی مطالبات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی نہیں ہوئی -
بلکہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے اجرا کے وقت جو نصاب
تجویز ہوا تھا اس میں بعض نئے مضامین کے جوڑ اور پیوند
لگا دئے گئے ہیں - لیکن نصاب میں کوئی بنیادی تبدیلیاں
ہوئی ہیں نہ اس کی تنظیم نو کی کوشش کی گئی - لہذا ہم
اس باب میں ان اصولوں سے بحث کریں گے - جن کے مطابق
ہمیں نصاب کی ترتیب و انتخاب کرنا لازم ہے -

تعلیم کے تمام مباحث' بالخصوص مسئلۂ نصاب پر مدتوں
تک' 'نفسیات انشعابی'' [۱] کا تسلط رہا ہے اور جیسا ہم نے

۱—Faculty Psychology

باب چہارم

تدوین نصاب

ہم نے سابقہ ابواب میں ضمناً مسئلۂ نصاب کا ذکر کیا ہے اور گزشتہ باب میں یہ بتایا ہے کہ اگر ہم درسی مضامین اور مدرسے کے دوسرے مشاغل سے طلبہ کی ذہنی تربیت کا کام لینا چاہتے ہیں تو انہیں ان کے سامنے کس حیثیت سے پیش کرنا چاہیے - اب ہم زیادہ تفصیل اور تسلسل کے ساتھ اس امر سے بحث کریں گے کہ نصاب کے مضامین کا انتخاب اور ان کی ترتیب و تدوین کس طرح کرنی چاہیے کہ ان سے فوائد حاصل ہو سکیں جن کی توقع ہے - یہ مسئلہ عملی حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہے کیونکہ اگر مدرسے کے مشاغل کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نصاب کی تعلیم ہی اس کا سب سے بڑا کام ہے - تعلیم کے دوسرے وسائل مثلاً اُستادوں کی شخصیت اور مدرسے کی عام فضا کا اثر اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن سب سے زیادہ جو چیز طلبہ کے ذہن اور اخلاق کو متاثر کرتی ہے وہ ان کا روزمرہ کا کام ہے جس کو وہ دن میں پانچ چھے گھنٹے انجام دیتے ہیں - تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کی تحصیل میں

علمی اور عملی مشاغل میں لگایا جائے جن کی تکمیل کے دوران میں انہیں پیچیدہ مسائل اور مشکلات سے سابقہ پڑے اور کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اپنی قوتوں اور وسائل و ذرائع کو منظم کرنے کی ضرورت پیش آئے -

ذہنی تربیت کے لیے ذاتی کاوش اور جد و جہد ناگزیر ہے - اگر نصاب محض منطق کے لحاظ سے مرتب کیسے ہوئے سبقوں کا مجموعہ ہوگا اور طریقۂ تعلیم میں تجربہ، فعالیت اور عمل کو اہمیت نہیں دی جائےگی تو طلبہ کی دماغی تربیت ہرگز نہ ہوسکے گی - یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض غیر معمولی حافظے کی مدد سے بہت سی معلومات فراہم کرلیں اور ان میں ایک قسم کی "علمیت" کی شان نظر آنے لگے لیکن وہ ذہنی بیداری جو ان کو معاملات کے سمجھنے، ماحول سے فائدہ اُٹھانے اور اس پر قابو پانے میں مدد دیتی ہے جو علم کو عمل میں تبدیل کرتی ہے اور حاصل کردہ واقفیت کا استعمال سکھاتی ہے اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک ہم مدرسے کے تمام تعلیمی کار و بار کو ان اصولوں پراز سر نو مرتب نہ کریں گے جن کی تشریح ہم نے اس باب میں کی ہے - علم کا خزانہ جب تک عمل کے سرچشمے سے ابل کر دریاے مواج نہ بن جائے کشت حیات کو سیراب نہیں کرسکتا ۔ دماغ کو رطب و یابس معلومات کا ذخیرہ بنا لینے کا نام تعلیم نہیں - بقول غالب :

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے هم نہیں قائل
جو آنکھ هی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے ؟

اور قوتیں ہیں وہ زور شور سے کام کرنے لگیں - بقول ڈاکٹر بیلارڈ (Ballard) کے چھوٹے بچوں کی تعلیم میں "کاٹ چھانٹ سے زیادہ سینچنے" کی ضرورت ہے[1] بچوں کے طریقۂ اظہار میں، ضبط و نظام پیدا کرنے اور صحت عمل پر اصرار کرنے کا مناسب وقت وہ ہے جب ان کے شوق کے پر لگ چکے ہوں اور وہ بغیر کسی خارجی دباؤ کے اپنی خوشی سے رنگوں اور شکلوں کے ساتھ کھیلنا شروع کردیں اور خود ہی یہ محسوس کریں کہ اس کھیل کو زیادہ بامعنی اور نتیجہ‌خیز بنانے کے لیے معلم کی ہدایت اور اپنی قوتوں کی تربیت کرنے کی ضرورت ہے - اگر ابتدا ہی سے ہم صحت عمل کی خاطر یا وقت کی کفایت کا خیال کرکے یا نمائشی نتائج کو جلد از جلد حاصل کرنے کے لیے رسمی مشق اور اعادے پر زور دیں گے تو بچوں کا وہ جذبۂ تخلیق افسردہ ہوکر رہ جائیگا جو ہر قسم کے آرٹ کےلیے قوت محرکہ کا کام دیتا ہے اور انسانی شخصیت کا ایک نہایت قیمتی عنصر ہے -

ذہنی تربیت کا جو نظریہ ہم نے اس باب میں پیش کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذہنی تربیت چند مخصوص علمی مشقوں کے ذریعے نہیں ہوسکتی - بچے کے دماغ میں ایسی متفرق اور بےربط قوتیں نہیں ہوتیں جن کی تربیت خاص خاص مضامین کے ذریعے کی جائے - اس کی جبلتوں کی نشو و نما دینے اور ان کو مرتب کرکے ذہانت کو بیدار اور آمادۂ عمل کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کو مختلف

---

[1] Teaching the Mother Tongue

کہ بچے کو شروع ہی سے آزادی کے ساتھ اپنے رجحانات کے اظہار
کا موقع دیا جائے - ہم دیکھتے ہیں کہ اگر بچے کو موقع ملے
تو وہ کاغذ پر رنگوں یا پنسل کی مدد سے اپنے تاثرات کو ظاہر
کرتا ہے - شروع میں یہ اظہار بہت غیر منتظم اور بےڈھنگا ہوتا'
ہے لیکن رفتہ رفتہ اس آزاد شغل میں اس کو اپنی انگلیوں
کی حرکت اور ڈرائنگ کے آلات پر زیادہ قابو حاصل ہوجاتا
ہے - برخلاف اس کے اگر ڈرائنگ کو بجائے ایک آزاد اور مسرت
بخش مشغلے کے' جس میں بچے کو اپنی اندرونی کیفیتوں کو
خارجی شکل میں ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے' محض بےروح
تقلید اور مشق تک محدود رکھا جائے تو وہ ڈرائنگ کو ہرگز اظہار
خودی کا موثر وسیلہ نہ بنا سکیں گے خواہ انہیں بعض اشیا
کی صحیح شکلیں بنانے میں پوری مہارت کیوں نہ حاصل
ہوجائے - وہ ان شکلوں کو جن کی انہیں مشق ہے بنا سکیں گے
لیکن ان میں جدت اور انفرادی ذوق کی کوئی جھلک نہیں
ہوگی - وہ چیزوں کو دیکھ کر ان کی اچھی نقل اُتار لیں گے
لیکن ان کو اس فن سے اتنی دلچسپی اور شوق نہ ہوگا کہ
وہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد بھی اس کو اپنی فرصت کا مرغوب
مشغلہ بنائیں - لہذا مدرسۂ جدید ڈرائنگ کی تعلیم میں
بھی انفرادی کوشش اور آزادانہ اظہار کی قدر کرتا ہے اور
سب بچوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے سے احتراز کرتا'
ہے - بچوں کی تعلیم میں سب سے پہلے ضرورت ہے ان کی
ہمت افزائی کی' ان کے شوق اور تجسس کے ابھارنے کی'
انہیں آزادانہ اظہار خودی کا موقع دینے کی' ان کے رجحان
طبع کو ان کا رہنما بنانے کی تاکہ ان میں جو تخلیقی جذبات

مفید ہنر سیکھنا ہے جس کے ذریعے بچوں کو اظہار خودی کا موقع ملتا ہے اور خوشی نصیب ہوتی ہے یعنی ڈرائنگ - مدرسے میں جتنے مختلف ہنر سکھائے جاتے ہیں خواہ ان کا تعلق فنون لطیفہ سے ہو یا دست‌کاری سے' سب پر کسی قدر ترمیم کے ساتھ وہی اصول عائد ہوتے ہیں جو ہم ڈرائنگ کے ضمن میں بیان کریں گے - ڈرائنگ کی تعلیم کا مروجہ طریقہ مدارس میں یہ رہا ہے کہ پہلے بچوں کو خطوط اور خطوط کو جوڑ کر آسان شکلیں کھینچنے کی مشق کرائی جاتی ہے' پھر رفتہ رفتہ وہ زیادہ مشکل شکلیں بناتے ہیں - ہر قدم پر استاد کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص مشق کا اس قدر اعادہ کرائے کہ بچہ اس میں ماہر ہو جائے اور اس کو بغیر کسی دقت کے نہایت صفائی کے ساتھ بنا سکے - بظاہر یہ طریقہ بہت معقول معلوم ہوتا ہے اور اس مروجہ اصول کے مطابق ہے کہ تعلیم میں تدریجی ترقی اور منطقی ترتیب کو پیش نظر رکھنا چاہیے - لیکن نفسیات اطفال کے اعتبار سے اس پر غور کیا جائے تو یہ سراسر غلط ہے کیونکہ اس طریقے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو ڈرائنگ سے وہ ذوق پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے - بچوں کی تعلیم میں ڈرائنگ (اور اس قسم کے دوسرے مضامین) کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں ان جذبات و خیالات کو اظہار کا موقع ملتا ہے اور یہ اظہار ایک مرئی اور خوش‌نما شکل میں ہوتا ہے - ہر بچے میں فطرت کی طرف سے تعمیر اور اظہار خودی کا جذبہ ودیعت ہوتا ہے اور مدرسے کا فرض یہ ہے کہ وہ اس جذبے کی نشو و نما اور تربیت کرے - یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے

لیے کارآمد ہوتے ہیں - مثلاً پرانی عمارتیں ' سکے ' کتبے وغیرہ لیکن باوجود ان تمام نقائص اور کوتاہیوں کے اس طریقۂ تحصیل کی بدولت طالب علم کو تاریخ کی تدوین کے مشکل عمل کا جو تجربہ حاصل ہوتا ہے وہ ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے - ایک طرف تو اسے شہادتوں اور روایتوں کے جانچنے اور پرکھنے کی عادت پڑتی ہے اور اس کی طبیعت میں احتیاط کا مادہ اور معاملات کو تولنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف (بشرطیکہ معلم صحیح طور پر رہنمائی کرے) اپنی روزمرہ کی زندگی میں مبالغے' تعصب' بےجا طرفداری اور غلطبیانی کو ترک کرکے صداقت کا احترام کرنا سیکھتا ہے جو اخلاقی سیرت کا ایک نہایت قابل قدر عنصر ہے - اس میں شک نہیں کہ مدرسے میں تاریخ کی تعلیم تمام‌تر اسی اصول پر نہیں ہو سکتی کیونکہ علاوہ وقت اور وسائل کے محدود ہونے کے تاریخ کے بہت سے مباحث ایسے بھی ہیں جن میں یہ طریقہ استعمال نہیں ہو سکتا - لیکن مدرسۂ جدید کو اپنے اصل اصول کی بنا پر اس طریقے سے اور اس قسم کے تمام فعالی طریقوں سے جو تعلیم میں جان ڈالتے ہیں حسب امکان ضرور استفادہ کرنا چاہیے - اس طرح کسی حد تک تاریخ کے مطالعے میں بھی ایک علمی اور عملی "مشغلے" کی شان پیدا ہوجائے گی اور طلبہ خود اپنی ذاتی جد و جہد اور ذہنی کاوش کے ذریعے علم حاصل کریں گے -

اس اصول کی توضیح کے لیے ہم ایک اور درسی مضمون کو لیتے ہیں جس کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ایک

بتائی جائے - اس تمام تاریخی مواد پر جو طلبہ کے سامنے
رکھ دیا جاتا ہے چند سوالات قائم کیے جاتے ہیں جن کا
جواب دینا ان کا کام ہوتا ہے - اگر یہ سوالات سوچ سمجھ کر
بنائے جائیں تو ان کا صحیح جواب دینے کے لیے انہیں اپنی
سمجھ اور قوت فیصلہ سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے -
مختلف مورخوں کی ذاتی خصوصیات اور کمزوریوں اور ان
کے تعلقات اور حالات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے - ان کے
تعصب یا جانب‌داری کی وجوہ کو سمجھنا، خلاف قیاس
باتوں کو مسترد کرنا، جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو
گزشتہ زمانے کے لوگوں کا ہم‌خیال بنا کر ان کے نقطۂ نظر سے
معاملات کو جانچنا، یہ تمام مطالبات طالب علم کو ذہنی
جد و جہد اور غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں - متضاد اور
مختلف بیانوں میں سے حقیقت امر معلوم کرنے کے لیے
اسے ایک حد تک وہی کد و کاوش اور رد و قدح کرنی پڑتی
ہے جس سے ایک انصاف پسند مورخ کام لیتا ہے جب وہ
مختلف قسم کا مواد بہم پہنچا کر کسی زمانے کی تاریخ
لکھنے بیٹھتا ہے - لیکن یہ مشابہت بہت محدود ہوتی ہے
کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک نوعمر، خام‌کار طالب علم ایک مستند
مورخ کی طرح کام نہیں کرسکتا - وہ گزشتہ زمانوں کی
زندگی اور لوگوں کے خیالات اور جذبات اور ان کے محرکات
عمل کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ
اس کے لیے نفسیات کا نظری علم اور عملی تجربہ درکار ہے
جو اسے حاصل نہیں - وہ معلومات حاصل کرنے کے ان غیر
مرتب ذرائع سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جو مورخ کے

اجتہاد سے کام لے سکیں اور استاد ان کو ہر کام کے لیے ایک بنے بنائے راستے پر نہ ڈال دے جس پر وہ بغیر سوچے سمجھے' بغیر اپنے دماغ پر زور ڈالے چلتے رہیں - اسی خیال سے متاثر ہوکر اور طلبہ کو تاریخ کے مطالعے میں فعالی حیثیت سے شریک کرنے کے لیے پروفیسر کیٹنگ (Keatinge) نے' جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم کے پروفیسر ہیں' اپنا Source Method مرتب کیا ہے[1] جس کی بنیاد یہ اصول ہے کہ مدرسے میں طلبہ کو ایک حد تک مورخ بننے کا موقع دیا جائے یعنی ان کے لیے کم و بیش ایسے حالات مہیا کیے جائیں جن میں مورخ تاریخ کو ترتیب دیتا ہے - عام طور پر مدرسوں میں یہ ہوتا ہے کہ طلبہ معمولی درجے کے کم علم معلوں کی درسی کتابوں کو پڑھ کر نہ صرف تاریخی معلومات حاصل کرتے میں بلکہ ان کی رائے اور خیالات اور نزاعی مسائل میں ان کے فیصلوں کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں - ظاہر ہے کہ اس طریقے پر تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ان میں نہ کوئی بصیرت پیدا ہوسکتی ہے نہ آزادی رائے نہ ذہنی تربیت - چنانچہ کیٹنگ (Keatinge) کی تجویز جس پر انھوں نے عمل کرکے دیکھا ہے یہ ہے کہ انھیں چشم دید حالات کے لکھنے والوں اور مستند مصنفوں کے بیانات مطالعے کے لیے دیے جائیں اور بالعموم ایک ہی واقعے کے متعلق مختلف ہمعصر مورخوں کی رائے

---

[1] اس طریقے پر انھوں نے تفصیلی بحث اپنی کتاب Teaching of History میں کی ہے -

زمانوں میں انسانوں نے اپنی اہم‌ترین ضروریات یعنی لباس، خوراک، حفاظت ذات وغیرہ کے لیے کیا انتظام کیا ہے۔ اس مبحث کے متعلق طلبہ مختلف ذرائع سے معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور ان کو ایک خاص طریقے سے کارڈوں پر درج کرتے ہیں جن کا نام مصنف موصوف نے "اسباق حیات" رکھا ہے۔ استادوں کی نگرانی میں وہ ان تمام معلومات کو عنوانات بالا کے ماتحت مرتب کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ذاتی کوشش اور دوسروں کی مدد سے حاصل کی ہوئی واقفیت میں نظم و ترتیب قائم کرنا سیکھتے ہیں اور یہی واقفیت آگے چل کر تاریخ اور انسانیات کے دوسرے شعبوں کی سنگ بنیاد بن جاتی ہے۔ پروفیسر فاریادی واسکونسلو (Faria de Vasconcellos) نے بھی اپنے بلجیم کے مدرسے کے حالات میں لکھا ہے[1] کہ تمام مضامین کی تعلیم میں عملی مشاغل اور طلبہ کی ذاتی کوشش کو نمایاں اہمیت دینی چاہیے۔ اس مدرسے میں طلبہ جب تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ خود اس کی تحصیل میں جسمانی جد و جہد اور ذہنی کاوش سے کام لیتے ہیں اور حتی‌الامکان کسی بات کو استاد سے سن کر یا کتاب میں پڑھ کر بغیر غور اور تنقید کیے قبول نہیں کرتے۔ اونچی جماعتوں میں خاص کرکے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ طلبہ کے لیے ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ وہ خود اپنی قوت فکر و عمل اور

۱۔ ان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ A New School in Belgium کے نام سے شائع ہوا۔

سیکھنے کی ذمہ‌داری زیادہ‌تر خود طلبہ پر ہے - معلم کا کام اس میں صرف اتنا ہے کہ وہ ان کے ذوق تحقیق و تجسس کو ابھارتا رہے اور مدرسے میں کتابوں، نقشوں، تصاویر وغیرہ کی مدد سے اور اپنی شخصیت کی اثر آفرینی اور نصاب کی معقول تنظیم کے ذریعے ان کے لیے ایک ایسا ماحول مہیا کردے کہ ان میں تاریخی ارتقا کا احساس بیدار ہو اور وہ تاریخ کے اس مرکزی مسئلے میں دلچسپی لیں کہ انسانی سوسائٹی کس طرح اپنی ابتدائی حالت سے موجودہ حالت کو پہنچی -

ابتدائی تاریخ کی تعلیم کا یہ نظریہ صرف ایک ہی تعلیمی مفکر تک محدود نہیں بلکہ دوسرے ماہرین تعلیم نے بھی اپنی مقامی اور ذاتی ضروریات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی کرکے اس طریقے کو استعمال کیا ہے - مثلاً ڈاکٹر فیریر نے "مدرسۂ عمل" کے متعلق اپنی ضخیم تصنیف کی تیسری جلد [۱] (مدرسۂ عمل کی عملی تنظیم) میں تاریخ کی ابتدائی تعلیم کے لیے جو طریقہ تجویز کیا ہے اس میں بھی بچوں کے ذاتی مشاہدے اور عملی کام پر زور دیا ہے - ان کی تجویز یہ ہے کہ بچوں کو سب سے پہلے اس موضوع کا مطالعہ کرنا چاہیے جو ان کی دلچسپی کا قدرتی مرکز ہے یعنی "انسان کی ضروریات زندگی اور ان کا پورا ہونا" - بچے فطرتاً یہ بات معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مختلف

۱—La Pratique de l'ecole active یہ کتاب فرانسیسی زبان میں ہے - اس کا ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا -

مدرسے کے طلبہ تاریخ کے مطالعے ابتدا سیاسی تاریخ کی درسی کتابوں سے نہیں کرتے بلکہ سب سے پہلے اپنے گرد و پیش کی معاشری اور اقتصادی زندگی کے مشاغل اور انسان کی ابتدائی زندگی یعنی عہد حجری اور عہد فلزی کے اور وحشیوں کے طریقۂ بود و باش وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں؟ اپنے قریبی ماحول کو سمجھنے کے لیے وہ ذاتی مشاہدوں تعلیمی سیر و سفر اور علمی تجربوں سے کام لیتے ہیں - بازاروں، دکانوں، کارخانوں، صنعتی کارگاہوں وغیرہ کو غور سے دیکھتے ہیں اور جہاں تک ان سے ممکن ہے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ کس طرح ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اپنی ضروریات فراہم کرتے ہیں - قدیم زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک طرف تو وہ خود اسی قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس زمانے کے مشاغل مثلاً گھر بنانے، آگ جلانے، کپڑا بننے، کاشتکاری وغیرہ کی تقلید کر کے اس جگ بیتی کو آپ بیتی بنا دیتے ہیں اور دوسری طرف تصویروں، عجائب خانوں کے نمونوں اور کتابوں وغیرہ کے ذریعے اپنی معلومات اور تخیل میں وسعت اور وضاحت پیدا کرتے ہیں - اس طرح وہ اپنی موجودہ زندگی کے سادہ اور عام فہم مظاہر کو سمجھنے میں اور ابتدائی زندگی کے حالات معلوم کرنے میں عملی اور فعالی طور پر شریک ہوتے ہیں اور تاریخ کے اس اہم‌ترین مسئلے کو ذاتی تجربے اور مشاہدے سے حل کرتے ہیں کہ انسان کی صنعت و حرفت اور معاشری زندگی کی تنظیم کس طرح ہوئی اور اس نے اپنی تمام ضروریات کیونکر پوری کیں - ان باتوں کو

دراصل اس طریقے پر منحصر ہے جس کے ذریعے طلبہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں یعنی ایک معنی میں وہ اپنا نصاب خود بناتے ہیں - مثال کے طور پر تاریخ کو لیجیے - ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخی واقعات طلبہ کے سامنے بطور زندہ مسائل اور معاملات کے پیش کیے جائیں اور جہاں تک ممکن ہو وہ اس کی تحریکوں کو اسی نظر سے دیکھیں جس سے وہ لوگ دیکھتے تھے جن کو ان سے براہ راست سابقہ پڑا تھا - جس حد تک ہم تاریخ کے بظاہر مردہ جسم میں روح پھونک سکیں گے یعنی ماضی کے واقعات کا ربط اور تسلسل حال کے مسائل کے ساتھ قائم کرسکیں گے اسی حد تک تاریخ کی تعلیم میں شگفتگی اور دلچسپی پیدا ہوگی - جہاں کہیں صاحب نظر اور باتخیل معلموں نے تاریخ کی تعلیم میں جان ڈالی ہے انہوں نے ہمیشہ اس کو ماضی کے بھولے بسرے افسانوں کے بجائے حال کی تفسیر بنا دیا ہے اور طلبہ کو یہ محسوس کرایا ہے کہ افراد اور جماعتوں کی زندگی کے تمام واقعات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور علت و معلول کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنے شکاگو کے تجربی مدرسے کے کچھ حالات Elementary School Record کے نام سے شائع کیے تھے - ان میں سے چند ضروری اقتباسات اور مضامین کو پروفیسر فنڈلے (Findley) نے مرتب کر کے اپنے دیباچے کے ساتھ "School and the Child" کے نام سے شائع کیا ہے - اس کے ایک باب میں مصنف نے تاریخ کے طریقۂ تعلیم سے بحث کی ہے اور اس کے اصولوں کو مختصر طور پر بیان کر کے بتایا ہے کہ انہوں نے کس طرح اپنے اسکول میں ان پر عمل کیا - اس

شاعر ہیں جنہوں نے اس کی جد و جہد، اس کی کامرانیوں اور ناکامیوں کے افسانے کو مصوری کے ذریعے یا مجسموں کی شکل میں یا الفاظ کے پیکر میں ایسے دلکش انداز سے بیان کیا ہے کہ اس کا مطلب اور مفہوم تمام لوگوں کی سمجھ میں آجاتا ہے ...... انسانی دماغ نے زندگی کے ارتقا میں جو حصہ لیا ہے اس کا صحیح احساس پیدا کرنے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے مطالعے سے طلبہ پر یہ بات واضح ہو جائے کہ بدویت کے زمانے سے موجودہ دور تمدن تک جس قدر ترقی انسان نے کی ہے اس کا انحصار علمی دریافتوں اور ایجادوں پر ہے اور وہ یہ سمجھ لیں کہ بہت سے ایسے واقعات جن کو عام طور پر تاریخی تصانیف میں اہمیت دی گئی ہے محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ انہوں نے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی ہیں جن کو عقل کے ذریعے زیر کرنا پڑا ہے"[1] -

لیکن صحیح نصاب کا تعین بجائے خود کافی نہیں جب تک استادوں کا طریقۂ تعلیم اور طلبہ کا طریقۂ تحصیل دونوں درست نہ ہوں - کیونکہ ہمارے تعلیمی نظریے کی رو سے نصاب اور طریقۂ تعلیم دو بالکل جداگانہ چیزیں نہیں ہیں یعنی ہم یہ نہیں سمجھتے کہ نصاب بجائے خود ایک مکمل اور مرتب چیز ہے جس پر بعض خارجی طریقوں سے طلبہ کو عبور حاصل کرنا ہے - نصاب کی ترتیب و تنظیم

1- Dewey : Democracy and Education صفحہ ۲۶۴ -

میں ابھی اتنی دماغی پختگی نہیں آئی کہ وہ تاریخ کے مجرد تصورات کو ذہن نشین کر سکیں بلکہ انہیں یہ بتانا چاہیے کہ ان کے آبا و اجداد نے کس طرح اس مقام سے ابتدا کرکے، جس کا حال وہ ابتدائی زمانے کی تاریخ میں پڑھ چکے ہیں، رفتہ رفتہ صنعت و حرفت اور معاشرت کے موجودہ نظام کو اپنی متعدد کوششوں کے ذریعے تعمیر کیا ہے اور کس طرح اس زمانے میں وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر رہتے ہیں تقسیم عمل اور اشتراک عمل کے ذریعے اپنی روزی کماتے ہیں اور دنیا کا کام چلاتے ہیں، اور انسان کی مجموعی ترقی میں صنعت و حرفت کا کیا حصہ ہے - چوتھی چیز جس کی جانب پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے ہمیں توجہ دلائی ہے اور جس کو ان کے خیال میں معلموں نے عام طور پر نظرانداز کیا ہے وہ علمی اور عقلی ترقی کی تاریخ ہے - تاریخ کے مطالعے سے طلبہ میں اس بات کا صحیح احساس پیدا ہونا چاہیے کہ انسان کی ترقی میں اس کی دماغی جد و جہد اور کاوش کو کس حد تک دخل ہے اور سائنس اور دوسرے علوم نے تجارتی ارتقا میں کیا نمایاں خدمت انجام دی ہے - وہ لکھتے ہیں :—

"ہم میں یہ احساس ابھی حال ہی میں پیدا ہوا ہے کہ وہ بڑے بڑے سورما جنھوں نے انسانوں کی قسمت کو بنایا ہے ماہرین سیاست فوجی جرنیل اور ملکی لیڈر نہیں ہیں بلکہ وہ علمی محققین اور موجد ہیں جن کی بدولت انسان کے قبضۂ قدرت میں ایسے ذرائع آگئے ہیں جو اس کے تجربے کی توسیع اور تنظیم کرتے ہیں اور وہ صناع اور

کہ موجودہ تمدن کے پیچیدہ نظام کی ابتدا کس طرح ہوئی اور اس کی بنیادیں کن چیزوں پر قائم ہیں - یہ وہ زمانہ ہے جب نہتا انسان فطرت کی زبردست، بےرحم اور بےپناہ قوتوں کے ساتھ بر سر پیکار ہے - یہ صورت حال اُس کی فعالیت، اس کی قوت عمل، اس کی قوت اختراع کو ابھارتی ہے اور وہ طرح طرح کے آلات اور ہتھیار ایجاد کرکے ان قوتوں کو رفتہ رفتہ اپنے قابو میں لاکر اپنا دوست اور خادم بناتا ہے - اس کی ایک مثال ہم کسی گزشتہ باب میں رابنسن کروسو کے قصے سے دے چکے ہیں - اس حالت میں انسان کو روزی حاصل کرنے کے لیے شکار اور زراعت کی، گرمی، سردی اور جانوروں وغیرہ کے خطروں سے بچنے کے لیے مکان، اور بدن کی حفاظت کے لیے کپڑا جوتا وغیرہ بنانے کی ضرورت تحق ہوتی ہے اور اس طرح ان تمام پیشوں اور مشاغل کی ابتدا ہوتی ہے جن کو ہم آج زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ شکل میں موجودہ تمدن کا جزو پاتے ہیں - ان تمام کاموں کے ذریعے انسان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے سراسر اپنے ماحول کا محتاج ہے اور اس کی وساطت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا - غرض اس قدیم اور ابتدائی انسانی تمدن کا مطالعہ بچوں کے لیے بہت مفید اور دلچسپ ہے - بشرطیکہ اس میں عملی طریقوں سے کام لیا جائے جن کی مختصر سی تشریح ہم ذیل میں کریں گے - تیسری چیز جس کو نصاب میں نمایاں حیثیت دینی چاہیے صنعت و حرفت اور اقتصادی تاریخ ہے - اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ اقتصادی تاریخ بطور ایک علم کے مدرسے کے طلبہ کے سامنے پیش کی جائے کیونکہ ان

لڑی گئی تھیں - ہمیں اس وقت صرف ان نتائج سے بحث اور سروکار ہے جنھوں نے انسانوں کی زندگی اور جماعتوں کے باہمی تعلقات پر اس طرح اثر ڈالا کہ ہماری اپنی زندگی بھی اس سے بلاواسطہ یا بالواسطہ متاثر ہوئی - ہمیں کم از کم مدرسے کی تعلیم میں ان سیاسی پیچیدگیوں اور ملکی تقسیموں سے بھی زیادہ تعلق نہیں جو مختلف زمانوں میں ہوتی رہی ہیں سوائے ایسی حالت کے جب ان کی وجہ سے ملکی معاشرت اور تمدن میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہوں - تاریخ کے انسانی رخ کو نمایاں کرنے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ نصاب میں بعض خاص چیزوں کو زیادہ اہمیت دی جائے مثلاً بڑے بڑے مشاہیر کی سوانح زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے نہ بحیثیت افراد کے کیونکہ اس لحاظ سے ان کا تعلق تاریخ سے زیادہ نفسیات کے علم سے ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ تمدنی تحریکوں کے نمائندے ہیں اور ان کی زندگی اور کارناموں سے ان تحریکوں پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - یعنی ہمیں ان کی انفرادی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کے معاشرتی اور تمدنی حالات کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے جو ان کے خیال اور عمل کے محرک ہوئے اور جنھوں نے ایک طرف ان کی ذات پر اپنا اثر ڈالا اور دوسری طرف خود ان کی ذات سے متاثر ہوئے - دوسرے چھوٹے بچوں کے نصاب تاریخ میں ہمیں ابتدائی زمانے کی تاریخ کا مطالعہ بھی شامل کرنا چاہیے کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے سب سے زیادہ اہم اور مستقل مشاغل اور اداروں کا آغاز بہت وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے اور بچے سمجھ سکتے ہیں

بھی ہیں اس پر پوری ذہنی قدرت حاصل نہیں کر سکتے -
اس سے نہ ان کی دماغی تربیت ہوتی ہے نہ وہ اس واقفیت
سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں -

تاریخ کے مطالعے کی دوسری صورت یہ ہے کہ اسے ہم
تمدنی معاشری اور سیاسی مسائل کے سمجھنے اور حل کرنے
کا ذریعہ بنائیں اور اس کی مدد سے انسان کی ادراک معانی
کی قابلیت میں وسعت اور گہرائی پیدا کریں - اگر اس کے
مطالعے کی بدولت ہم اپنے ذاتی اور وقتی کار و بار کی حقیقی
اور مستقل اہمیت اور ان کے ارتقا کے سلسلے کو سمجھ سکیں
تو تاریخ ذہنی تربیت کا موثرترین وسیلہ بن جاتی ہے -
تاریخ کی تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ طالب‌علم کو معلوم
ہو جائے کہ اس کے روزمرہ کے کاموں کا تعلق وسیع‌تر انسانی
مشاغل سے کیا ہے اور جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوتا
جائے اس میں یہ استعداد بڑھتی جائے کہ تمدنی امور اور
مسائل پر ارتقائی نظر ڈال سکے اور ماضی حال اور مستقبل کی
باہمی وابستگی اور ان کی تشکیل میں انسان کی کارفرمائی
کو محسوس کرے - اگر تاریخ کے منشا کی یہ تشریح صحیح
ہے تو اس سے تاریخ کے نصاب اور طریقۂ تعلیم دونوں میں
ترمیم لازم آتی ہے - اس کی عملی تفصیل کی یہاں گنجائش
نہیں لیکن بعض باتیں بالکل بدیہی اور واضح ہیں -
مدرسوں کے نصاب میں بجائے تاریخ کے سیاسی اور حربی
پہلو پر زور دینے کے اس کے انسانی اور تمدنی رخ کو نمایاں
کرنے کی ضرورت ہے - ان لڑائیوں کے واقعات اور تفصیلات ہمارے
لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے جو اب سے سینکڑوں سال پہلے

واقعات بےربط اور بےجان معلومات کی حیثیت سے طالب‌علم کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں جن کو کسی بیرونی دباؤ یا اثر کی وجہ سے اپنے حافظے میں محفوظ رکھنا ہے تو تاریخ کا مطالعہ نہ اس کے تجربے کو وسیع بنا سکتا ہے نہ معنی‌خیز - وہ ماضی کے ارتقائی سلسلے کا تصور نہیں کر سکتا اور نہ یہ محسوس کر سکتا ہے کہ آج جو کچھ ہے وہ گزشتہ زمانے کے لوگوں کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے - اس میں حال کی قوتوں اور تحریکوں سے مستقبل کے لیے کام لینے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوتی اس کی روزمرہ کی زندگی اور مشاغل کا سلسلہ ایک سطح پر جاری رہتا ہے اور ایک دوسری سطح پر وہ بہت سی ایسی باتوں کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتا ہے جو اس کے ذاتی تجربات کی دنیا سے بالکل بعید اور غیر متعلق ہیں - مثلاً یہ کہ اب سے کئی ہزار سال قبل اشوک اعظم ہندوستان کا ایک شہنشاہ تھا جس نے ایک خوں‌ریز جنگ کے بعد امن پسندی اختیار کر لی تھی - یا علاءالدین نے دکن کے بہت بڑے حصے کو فتح کیا - ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں زندگی کی ان دونوں سطحوں کے درمیان کوئی نتیجہ‌خیز رابطہ قائم نہیں ہو سکتا یعنی تاریخ کے مطالعے سے طلبہ کے ذاتی تجربات کی معنویت اور اہمیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا - کیونکہ اول تو مباحث کا انتخاب بہت مہمل اور قابل اعتراض ہوتا ہے جس میں سطحی نمائشی اور غیر ضروری چیزوں کو اہم تمدنی مسائل اور معاشری معاملات پر ترجیح دی جاتی ہے - دوسرے طریقۂ تعلیم ایسا اختیار کیا جاتا ہے کہ طلبہ جو کچھ سیکھتے

طلبہ کو چند ضروری اور غیر ضروری ناموں اور سنوں اور تاریخی
واقعات کے یاد ہو جانے کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔
اس طرح کے مطالعے کی حیثیت اگر اس کے لیے "مطالعے"
کا وقیع لفظ استعمال کرنا جائز ہو بالکل وہی ہے جو اور بہت
سے ارتسامات (Impressions) کی جن سے انسان کے بعض
حواس متاثر ہوتے ہیں لیکن اس کے دماغ یا اس کی زندگی
پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ فرض کیجیے ایک ناواقف
اور ناتجربہ‌کار شخص کسی غیر ملک کے ایک بہت بڑے
تجارتی مرکز میں جاتا ہے جہاں کی زبان وہ نہیں جانتا اور
یہاں بہت سی غیر مانوس آوازیں سنتا ہے اور اجنبی لوگوں،
غیر مانوس چیزوں اور کار و بار کو دیکھتا ہے۔ اس پر ان
تجربات کا کیا اثر ہوگا؟ یہ سب آوازیں اور نظارے محض
اس کی قوت سامعہ اور قوت باصرہ کو متاثر کرتے ہیں
اور بس۔ اگر وہ ان کے باہمی تعلق اور مفہوم سے واقف
نہیں، اگر وہ اس مقصد کو جو ان میں ربط پیدا کرتا ہے
نہیں سمجھتا تو یہ تمام متفرق تاثرات نہ اس کے علم میں
اضافہ کر سکتے ہیں نہ اس کے عمل میں کوئی تبدیلی پیدا
کر سکتے ہیں۔ اس کا ذہن انفعالی طریقے سے ان تاثرات کو
قبول کر لیتا ہے لیکن ان کا ادراک نہیں کر سکتا۔ یہی
حال اس ناواقف طالب علم کا ہے جس کو بغیر کسی ذہنی
تیاری، بغیر ذاتی تجربے اور مشاہدے کے تاریخ ناپیدا کنار
سمندر میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس کی لہریں گنا کرے
جن کا نہ وہ باہمی تعلق سمجھ سکتا ہے نہ اپنی زندگی کے
ساتھ ان کی وابستگی کو محسوس کرتا ہے۔ جب تاریخ کے

کو مطالعہ کر کے اور اپنی قوت مشاہدہ سے کام لے کر وہ بہت سے طبیعی حالات دریافت کر سکتے ہیں مثلاً زمین کی ساخت' پہاڑوں اور دریاؤں کی موجودگی یا غیر موجودگی' آب و ہوا وغیرہ - گزشتہ واقفیت کی بنا پر یا کسی جغرافیے کی کتاب کی مدد سے انہیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس آب و ہوا اور ایسے طبیعی حالات میں وہاں کس قسم کی پیداوار ہوگی اور کیا حیوانات پائے جائیں گے - اس معلومات کی بنا پر وہ وہاں کے باشندوں کے مشاغل اور طرز زندگی سے بحث کرسکتے ہیں اور استاد کے رہنمائی کرنے والے سوالوں کی مدد سے ان کی توجہ ایسے امور کی طرف رجوع ہو سکتی ہے جو اس معاملے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں - اسی قسم کی تعلیم سے جس میں ذاتی مشاہدے اور تجربے' باہمی مشورے اور کتابوں سے استفادے کا موقع حاصل ہوگا ان کو مختلف انسانی مسائل اور مظاہر فطرت کا باہمی تعلق سمجھنے میں مدد ملےگی' ان کی غور و فکر کی قوت اور نتائج اخذ کرنے کی قابلیت نشو و نما پائے گی اور وہ جغرافیے کے مطالعے سے عام ذہنی تربیت حاصل کریں گے جو ان کی زندگی میں بہت سے موقعوں پر مفید ثابت ہوگی یہ تعلیمی اصول جس کی توضیح ہم نے ایک معمولی سی مثال کے ذریعے سے کی ہے - جغرافیے کے بہت سے مباحث پر عائد ہو سکتا ہے -

اسی طرح اگر ہم تاریخ پر بحیثیت ایک درسی مضمون کے نظر ڈالیں تو اس میں بھی اصلاح اور تبدیلی کی بہت گنجائش نظر آتی ہے - اس کی مطالعے کی ایک صورت تو وہ ہے جو ہمارے اکثر مدارس میں پائی جاتی ہے جس میں

واقعات اور معلومات کو حافظے میں ٹھونس لینے سے کیا فائدہ
جن سے نہ کوئی ذہنی تربیت ہو، نہ ان کی بذات خود کوئی
خاص اہمیت ہو؟ لہذا جغرافیہ کی تعلیم میں بھی ہمیں
وہی اصول اختیار کرنا چاہیے جو ہم نے اور تعلیمی مشاغل
کے لیے ضروری قرار دیا ہے یعنی مدرسے میں بچوں کے سامنے
مختلف قسم کے جغرافی مسائل پیش کیے جائیں جو ان کے
اپنے مشاہدے میں آئے ہوں اور ان کے ماحول سے تعلق رکھتے
ہوں، جن کے حل کرنے سے انہیں فطرتی طور پر دلچسپی ہو -
اس کی وجہ سے بچوں کو اپنے ماحول کا زیادہ غور کے ساتھ
مشاہدہ کرنا پڑے گا انہیں مختلف قسم کی معلومات فراہم
کرنی اور اس کی ترتیب و تنظیم کرنی ہوگی جو ذہنی تربیت
کا بہترین وسیلہ ہے - ان کو اس مضمون میں آسانی کے ساتھ
دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ انسانی جغرافیے کی تمام
معلومات ایک ایسے موضوع کے تحت میں لائی جا سکتی ہے
جو بچوں کے لیے فطرتاً دلچسپ ہے یعنی " انسان اور اس
کی زندگی اور مشاغل" - یہ مربوط اور دلچسپ موضوع بچوں
کے تمام جغرافی مطالعے کا مرکز بن جائے گا تو ان کی متفرق
معلومات میں ربط اور نظم پیدا ہوگا اور وہ اس کے منشا اور
مفہوم کو سمجھ سکیں گے - ہر سمجھ دار استاد کو یہ چاہیے
کہ بجائے اپنے طلبہ کو متفرق اور بے ترتیب باتیں بتانے اور یاد
کرانے کے ان کے سامنے ایسے دلچسپ مسائل پیش کرے کہ مثلاً
بتاؤ صحرائے افریقہ کے لوگ یا سوئسٹان کے باشندے کس قسم
کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کے کیا اسباب ہیں - اب اس
مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ان کے پاس اٹلس موجود ہے جس

طرح کے مسائل کہ پہاڑ، دریا، بارش زمین کی پیداوار، صنعت و حرفت وغیرہ انسان کی زندگی پر کیا اثر ڈالتے ہیں اور انسان کس طرح ان سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور ان کو اپنے قابو میں لاتا ہے - جغرافیہ کے جتنے مسائل اس ضمن میں شامل ہیں وہ مدرسوں میں بالعموم اس طرح پڑھائے جاتے ہیں کہ ہر چیز کے متعلق جتنی واقفیت ضروری سمجھی جاتی ہے وہ بغیر کسی ترتیب کے بہت خشک، بےمزہ طریقے سے طلبہ کے سامنے بیان کردی جاتی ہے - مثلاً یہ کہ فلاں ملک میں کون سے پہاڑ ہیں، کتنے دریا ہیں، کس قدر بارش ہوتی ہے، کیا کیا پیداوار ہے، لوگ کس کس قسم کے کام کرتے ہیں اور ملک کی سیاسی تقسیم کس طرح کی گئی ہے - طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان تمام غیرمربوط اور بظاہر بےمقصد معلومات کو کسی نہ کسی طرح حفظ کر لیں یہ بجائے خود مستقل اہمیت رکھتے ہیں - بھلا بتائیے تو کہ حافظے پر اس طرح کا بوجھ ڈالنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے ؟ فرض کیجیے طالب علم کو اپنی آئندہ زندگی میں کسی موقع پر کوئی جغرافی امر معلوم کرنے کی ضرورت آپڑے مثلاً وہ کسی غیر ملک میں سفر کرنا یا کسی پہاڑ کی سیاحت کرنا چاہتا ہے اور اس کے متعلق اسے واقفیت درکار ہے - ایسے موقع پر وہ اس سرسری واقفیت سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جو اس نے جغرافیہ کے سبقوں یا کتابوں سے حاصل کی تھی ضرورت کے وقت وہ ہر قسم کی معلومات کتابوں اور نقشوں سے حاصل کرسکتا ہے بشرطیکہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ مفید مطلب واقفیت کو کتابوں سے نکال سکے - پھر ایسے

واقعات اور معلومات کو حافظے میں ٹھونس لینے سے کیا فائدہ جن سے نہ کوئی ذہنی تربیت ہو ' نہ ان کی بذات خود کوئی خاص اہمیت ہو؟ لہذا جغرافیہ کی تعلیم میں بھی ہمیں وہی اصول اختیار کرنا چاہیے جو ہم نے اور تعلیمی مشاغل کے لیے ضروری قرار دیا ہے یعنی مدرسے میں بچوں کے سامنے مختلف قسم کے جغرافی مسائل پیش کیے جائیں جو ان کے اپنے مشاہدے میں آئے ہوں اور ان کے ماحول سے تعلق رکھتے ہوں' جن کے حل کرنے سے انہیں فطرتی طور پر دلچسپی ہو - اس کی وجہ سے بچوں کو اپنے ماحول کا زیادہ غور کے ساتھ مشاہدہ کرنا پڑے گا انہیں مختلف قسم کی معلومات فراہم کرنی اور اس کی تربیت و تنظیم کرنی ہوگی جو ذہنی تربیت کا بہترین وسیلہ ہے - ان کو اس مضمون میں آسانی کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ انسانی جغرافیے کی تمام معلومات ایک ایسے موضوع کے تحت میں لائی جا سکتی ہے جو بچوں کے لیے فطرتاً دلچسپ ہے یعنی " انسان اور اس کی زندگی اور مشاغل" - یہ مربوط اور دلچسپ موضوع بچوں کے تمام جغرافی مطالعے کا مرکز بن جائے گا تو ان کی متفرق معلومات میں ربط اور نظم پیدا ہوگا اور وہ اس کے منشا اور مفہوم کو سمجھ سکیں گے - ہر سمجھ دار اُستاد کو یہ چاہیے کہ بجائے اپنے طلبہ کو متفرق اور بے ترتیب باتیں بتانے اور یاد کرانے کے ان کے سامنے ایسے دلچسپ مسائل پیش کرے کہ مثلاً بتاؤ صحرائے افریقہ کے لوگ یا سوئستان کے باشندے کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کے کیا اسباب ہیں - اب اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ان کے پاس اٹلس موجود ہے جس

طرح کے مسائل کہ پہاڑ، دریا، بارش زمین کی پیداوار، صنعت و حرفت وغیرہ انسان کی زندگی پر کیا اثر ڈالتے ہیں اور انسان کس طرح ان سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور ان کو اپنے قابو میں لاتا ہے - جغرافیہ کے جتنے مسائل اس ضمن میں شامل ہیں وہ مدرسوں میں بالعموم اس طرح پڑھائے جاتے ہیں کہ ہر چیز کے متعلق جتنی واقفیت ضروری سمجھی جاتی ہے وہ بغیر کسی ترتیب کے بہت خشک، بےمزہ طریقے سے طلبہ کے سامنے بیان کردی جاتی ہے - مثلاً یہ کہ فلاں ملک میں کون سے پہاڑ ہیں، کتنے دریا ہیں، کس قدر بارش ہوتی ہے، کیا کیا پیداوار ہے، لوگ کس کس قسم کے کام کرتے ہیں اور ملک کی سیاسی تقسیم کس طرح کی گئی ہے - طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان تمام غیرمربوط اور بظاہر بےمقصد معلومات کو کسی نہ کسی طرح حفظ کر لیں یہ بجائے خود مستقل اہمیت رکھتے ہیں - بھلا بتائیے تو کہ حافظے پر اس طرح کا بوجھ ڈالنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے ؟ فرض کیجیے طالب علم کو اپنی آئندہ زندگی میں کسی موقع پر کوئی جغرافی امر معلوم کرنے کی ضرورت آپڑے مثلاً وہ کسی غیر ملک میں سفر کرنا یا کسی پہاڑ کی سیاحت کرنا چاہتا ہے اور اس کے متعلق اسے واقفیت درکار ہے - ایسے موقع پر وہ اس سرسری واقفیت سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جو اس نے جغرافیہ کے سبقوں یا کتابوں سے حاصل کی تھی ضرورت کے وقت وہ ہر قسم کی معلومات کتابوں اور نقشوں سے حاصل کرسکتا ہے بشرطیکہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ مفید مطلب واقفیت کو کتابوں سے نکال سکے - پھر ایسے

میں سائنس کی ایجادات اور ان کے استعمال کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی دیا جاتا ہے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ سائنس اور متمدن زندگی میں کس قدر قریبی تعلق ہے اور انسان نے کس طرح اپنی قوت تسخیر سے کام لے کر فطرت کی قوتوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے - معلموں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طلبہ سائنس کو محض چند اصولوں اور قاعدوں کا مجموعہ نہ سمجھیں بلکہ اس کی بدولت ان کے دل میں تسخیر فطرت کا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو جائے - اس کوشش کا اظہار کہیں کہیں مخصوص اور مکمل تعلیمی طریقوں کی شکل میں ہوا ہے - مثلاً پروفیسر آرمسٹرونگ (Armstrong) کا "طریقۂ دریافت" (Heuristic Method) - اور کہیں اس کا اثر عام ذہنی تربیت کی اصلاح میں نمایاں ہوا ہے جس نے سائنس کے طریقۂ تعلیم اور اس کی داخلی روح میں انقلاب پیدا کر دیا ہے -

یہی اصول کسی قدر مختلف صورت میں دوسرے مضامین پر بھی عائد ہوتا ہے مدرسے کے نقطۂ نظر سے جغرافیہ کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں ایک وہ جو زیادہ تر مظاہر فطرت کے اسباب و نتائج سے بحث کرتی ہے مثلاً یہ کہ بادل کیسے بنتے ہیں، زمین کی سطح میں تبدیلیاں کیسے ہوتی ہیں - اجرام فلکی کی گردش سے زمین اور پانی پر کیا اثر پڑتا ہے، آب و ہوا اور پیداوار کا باہمی تعلق کیا ہے وغیرہ - جغرافیہ کی اس شاخ کو "سائنس" کے مضامین میں شمار کرنا چاہیے - لیکن اس کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کا اصل موضوع انسان اور اس کے طبیعی ماحول کا تعلق ہے یعنی اس

سمجھیں اور ان سے کام لینا سیکھیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کام لینے کے ذریعے سے ان کو سمجھیں - کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی طالب‌علم بغیر ذاتی تجربے اور عمل کے سائنس کے کسی اصول یا حقیقت کو محض لفظی بیان اور تشریح سے پوری طرح سمجھ جائے - اس کے لیے ہمیشہ یہ ضرورت ہے کہ انہیں براہ راست سائنس کے آلات اور خواص اشیا کا تجربہ ہو' وہ ان کو مختلف حالات میں دیکھیں اور ان حالات کو بدل کر اس تبدیلی کے اثرات پر غور کریں اور اس طرح رفتہ رفتہ ان نتائج تک پہنچیں جو ممکن ہے ان کے استادوں اور ماہرین سائنس کے لیے بالکل پیش پا افتادہ ہوں لیکن خود ان کے لیے بڑی حد تک ایک نئی دریافت کی شان رکھتے ہیں - اسی اصول سے متاثر ہوکر زمانۂ حال میں سائنس کی تعلیم میں بہت انقلاب انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں اور تمام مدارس جدید میں پرانی کتابی تعلیم کو ترک کرکے جو سوائے حافظے کے اور کسی دماغی قوت کی تربیت نہیں کرتی تھی' سائنس ایک عملی اور تجربی مضمون بنادی گئی ہے اور مدرسوں میں باقاعدہ معمل اور کارخانے قائم کیے گئے ہیں جہاں طلبہ اپنے ہاتھ سے کام کرسکتے ہیں - وہ سائنس کی معلومات حاصل کرنے اور اس کو مرتب کرنے میں فعالی طور پر شریک ہوتے ہیں اور ایک حد تک انہیں حالات میں اور انہیں شرائط کے ماتحت کام کرتے ہیں جو سائنس کے محققین کے لیے درکار ہیں - اس کے عملی پہلو پر زور دینے کے لیے نہ صرف مدرسوں کے نصاب میں عملی کام کا عناصر بڑھا دیا گیا ہے بلکہ طلبہ کو صنعت و حرفت کے کارخانوں میں اور گرد و پیش کی زندگی

کرنے سے ان کو نئے مضامین پر بہت جلد قدرت حاصل نہ ہو
یعنی وہ ان کو "جلد" یاد نہ کر سکیں یا ان کے ہاتھ میں
بہت تھوڑے وقت میں صفائی اور سلیقہ پیدا نہ ہو اور جیسا
کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ نمائشی نتائج نہ دکھا سکیں -
لیکن اس کمی کی پوری پوری تلافی اس طرح ہو جاتی ہے
کہ طلبہ میں ایک عام ذہنی بیداری پیدا ہوتی ہے اور ان
میں تعمیر و تخلیق کا شوق اور جدت و اجتہاد کی صلاحیت
تربیت پاتی ہے جو اعلیٰ فوری اور عارضی نتائج سے زیادہ
قیمتی اور قابل قدر ہے - مروجہ نصاب کے درسی مضامین
کی تعلیم پر اس اصول کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے بعض مضامین
تو ایسے ہیں جو صریحاً اس اصول کے تحت میں آتے ہیں
مثلاً وہ تمام علوم جن کو شعبۂ سائنس سے تعلق ہے - سائنس
علوم انسانی کی وہ شاخ ہے جو تمام‌تر ہماری کوشش اور تخلیق
کا نتیجہ ہے - جب انسان کا دماغ اپنے طبیعی ماحول کو
سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور مظاہر فطرت کے پوشیدہ قوانین
کو دریافت کرنے کے لیے مشاہدات اور تجربات سے کام لیتا ہے
تو وہ گویا سائنس کی تشکیل کر رہا ہے - اس کی امتیازی
خصوصیت یہی ہے کہ وہ اپنی تدوین اور ترقی کے لیے انسان کی
دریافت اور جستجو کی مرہون منت ہے- اگر مدرسے میں ہم اس
خصوصیت کو نظرانداز کر دیں اور استاد طلبہ کو ہر بات بتا
دیا کرے یا زیادہ سے زیادہ انہیں چند مقررہ تجربات کرکے دکھا
دیا کرے تو سائنس کا تعلیمی مقصد بالکل فوت ہو جائے گا -
ان تمام طبیعی، کیمیاوی، حیاتیاتی علوم کے پڑھانے سے ہمارا
مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنے مادی ماحول کی قوتوں اور مظاہر کو

مختلف ذہنی قوتوں کی تربیت ہو جائے گی اور وہ اسی کی بدولت ہر قسم کی مشکلات سے جو زندگی میں پیش آتی ہیں عہدہ‌برآ ہو سکیں گے - مثلاً اگر ان کا دماغ منطق اور ریاضی کے پیچیدہ مسائل میں منجھ گیا ہے تو یہ مخصوص قابلیت زندگی کی عملی گتھیوں کو سلجھانے اور تمدن و معاشرت کے مسائل کو حل کرنے میں مدد دے گی - بلکہ اسے یہ کرنا چاہیے کہ ان کے تمام مسائل اور اسباق کو اس اصول پر ترتیب دے کہ انہیں مختلف مضامین میں اور مختلف مواقع پر ذہنی اجتہاد اور قوت فیصلہ کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے، نئے طریقوں کو آزمانے کے لیے آمادگی پیدا ہو اور وہ ہر کام کے لیے کسی بنے بنائے راستے، کسی سیکھے سکھائے قاعدے کے محتاج نہ رہیں - اس کا ایک بہت اہم فرض یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ طلبہ کو اپنی مدد اور اپنے سہارے سے بےنیاز کر دے اور ان کو خود اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سکھائے - اچھے ڈاکٹر کی طرح، اچھے استاد کی پہچان بھی یہی ہے کہ اس کی طرف رجوع کرنے والے کچھ عرصے کے بعد اس کی امداد اور رہنمائی سے آزاد ہو کر خود اپنی نگہداشت کر سکیں - یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب استاد شروع ہی سے طلبہ کو اس طرح تعلیم دے کہ وہ آزادی کے ساتھ کام کر سکیں اور اپنی رائے اور فیصلے پر بھروسا کرنا سیکھیں - البتہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خودسری سے کام نہ لیں اپنی رائے پر بےجا اصرار نہ کریں اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے اور ان سے سبق سیکھنے کے لیے ہمیشہ تیار رہیں - ممکن ہے کہ اس طریقے پر عمل

ہے جس کو اس نے سیکھا ہے بلکہ جس کام کو بھی کرنا چاہتا ہے اس میں ذہنی عادتیں مفید اور معاون ہوتی ہیں - فرض کیجیے ایک شخص کو مختلف قسم کے کار و بار اور مشاغل میں یہ عادت پڑ گئی ہے کہ وہ جب کوئی نیا کام کرتا ہے تو اپنے مقصد اور ذرائع کا جائزہ لیتا ہے، اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کوئی طریقہ عمل تجویز کرتا ہے اور اس کے مطابق اپنے وسائل اور ذرائع کی ترتیب و تنظیم کرتا ہے اور پھر اپنے عمل کے نتائج سے سبق اور تجربہ حاصل کر کے آگے قدم بڑھاتا ہے یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتا ہے یہ تمام طریقۂ کار اور اس کے ساتھ جو ذہنی عادتیں وابستہ ہیں وہ مختلف قسم کے بےشمار کاموں اور مواقع میں استعمال ہو سکتی ہیں- اگر کوئی شخص جنگل میں اپنا راستہ بھول گیا ہے اور چاہتا ہے کہ صحیح راستے پر پڑ جائے تو یہ طریقہ اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا - اگر وہ سائنس یا صنعت و حرفت کے کسی مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہے تو اُس کو یہی سلسلۂ عمل اختیار کرنا پڑے گا - اگر وہ کسی بڑے تجارتی کار و بار میں مصروف ہے تو اسے اپنی تجارتی پالیسی اسی طرح معین کرنی ہوگی - اگر وہ کسی کمیٹی یا کونسل میں انتخاب کے لیے امیدوار ہے تو بھی اس کو لازم ہوگا کہ اپنے تمام وسائل اور ذرائع کا جائزہ لے اور ایک معین مقصد کے خاطر ان کی تنظیم کرے - غرض بہت سی صورتوں میں انسان اس طریق عمل سے فائدہ اٹھا سکتا ہے - لہذا مدرسۂ جدید کے معلم کو اس غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے کہ کسی خاص درسی مضمون کے مطالعے سے طلبہ کی

موجودہ علم نفسیات اِس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا کہ جو دماغی قوت انسان کسی خاص کام کو سیکھنے یا کسی خاص مضمون کے مطالعے سے حاصل کرتا ہے وہ ہر کام اور ہر مضمون میں استعمال ہو سکتی ہے - انسان کا دماغ کوئی چاقو نہیں کہ اگر اسے پتھر پر رگڑ لیا جائے تو وہ ہر چیز کو کاٹ دے گا خواہ وہ لکڑی ہو یا کپڑا یا کاغذ - پرانا نظریہ جس کو جدید نفسیاتی تحقیقات اور مشاهدے نے مسترد کر دیا ہے یہ تھا کہ اکتسابی قوت ایک مضمون سے دوسرے مضمون میں اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع میں جوں کی توں منتقل ہو سکتی ہے یہ نظریہ جس کو انگریزی میں Transfer of Training (انتقال قوت اکتسابی) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے عرصے سے ماہرین نفسیات کے درمیان ما بہ النزاع ہے - اس مسئلے کے متعلق موجودہ نقطۂ نظر بحیثیت مجموعی اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص قابلیتیں جو کسی علم یا فن سیکھنے کے دوران میں حاصل ہوتی ہیں منتقل نہیں ہو سکتیں - مثلاً اگر کوئی شخص ریاضی کی تعلیم اور مطالعے کی وجہ سے ریاضی کے مسائل کو اچھی طرح حل کر سکتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے بالکل مختلف قسم کے معاملات مثلاً سیاسی یا اخلاقی مسائل پر بھی ذہانت اور قابلیت سے بحث کرے گا - البتہ اگر مناسب طریقۂ تعلیم اختیار کیا جائے تو بعض عام ذہنی رجحانات اور صلاحیتیں، تحصیل علم کے گر، نئے مسائل پر غور کرنے کے طریقے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو سیکھ کر انسان نہ صرف ایک خاص کام کو اچھی طرح کر سکتا

ہے جس کو اس نے سیکھا ہے بلکہ جس کام کو بھی کرنا چاہتا
ہے اس میں ذہنی عادتیں مفید اور معاون ہوتی ہیں -
فرض کیجیے ایک شخص کو مختلف قسم کے کار و بار اور
مشاغل میں یہ عادت پڑ گئی ہے کہ وہ جب کوئی نیا کام
کرتا ہے تو اپنے مقصد اور ذرائع کا جائزہ لیتا ہے' اس مقصد
کو پیش نظر رکھ کر کوئی طریقہ عمل تجویز کرتا ہے اور اس
کے مطابق اپنے وسائل اور ذرائع کی ترتیب و تنظیم کرتا ہے
اور پھر اپنے عمل کے نتائج سے سبق اور تجربہ حاصل کر کے آگے
قدم بڑھاتا ہے یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتا ہے یہ تمام
طریقۂ کار اور اس کے ساتھ جو ذہنی عادتیں وابستہ ہیں وہ
مختلف قسم کے بےشمار کاموں اور مواقع میں استعمال ہو
سکتی ہیں - اگر کوئی شخص جنگل میں اپنا راستہ
بھول گیا ہے اور چاہتا ہے کہ صحیح راستے پر پڑ جائے تو یہ
طریقہ اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا - اگر وہ سائنس
یا صنعت و حرفت کے کسی مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہے تو
اُس کو یہی سلسلۂ عمل اختیار کرنا پڑے گا - اگر وہ کسی
بڑے تجارتی کار و بار میں مصروف ہے تو اسے اپنی تجارتی
پالیسی اسی طرح معین کرنی ہوگی - اگر وہ کسی کمیٹی یا
کونسل میں انتخاب کے لیے امیدوار ہے تو بھی اس کو لازم
ہوگا کہ اپنے تمام وسائل اور ذرائع کا جائزہ لے اور ایک معین
مقصد کے خاطر ان کی تنظیم کرے - غرض بہت سی صورتوں
میں انسان اس طریق عمل سے فائدہ اٹھا سکتا ہے - لہذا
مدرسۂ جدید کے معلم کو اس غلط فہمی میں نہیں پڑنا
چاہیے کہ کسی خاص درسی مضمون کے مطالعے سے طلبہ کی

موجودہ علم نفسیات اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا کہ جو دماغی قوت انسان کسی خاص کام کو سیکھنے یا کسی خاص مضمون کے مطالعے سے حاصل کرتا ہے وہ ہر کام اور ہر مضمون میں استعمال ہو سکتی ہے - انسان کا دماغ کوئی چاقو نہیں کہ اگر اسے پتھر پر رگڑ لیا جائے تو وہ ہر چیز کو کاٹ دے گا خواہ وہ لکڑی ہو یا کپڑا یا کاغذ - پرانا نظریہ جس کو جدید نفسیاتی تحقیقات اور مشاہدے نے مسترد کر دیا ہے یہ تھا کہ اکتسابی قوت ایک مضمون سے دوسرے مضمون میں اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع میں جوں کی توں منتقل ہو سکتی ہے یہ نظریہ جس کو انگریزی میں Transfer of Training (انتقال قوت اکتسابی) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے عرصے سے ماہرین نفسیات کے درمیان ما بہ النزاع ہے - اس مسئلے کے متعلق موجودہ نقطۂ نظر بحیثیت مجموعی اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص قابلیتیں جو کسی علم یا فن سیکھنے کے دوران میں حاصل ہوتی ہیں منتقل نہیں ہو سکتیں - مثلاً اگر کوئی شخص ریاضی کی تعلیم اور مطالعے کی وجہ سے ریاضی کے مسائل کو اچھی طرح حل کر سکتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے بالکل مختلف قسم کے معاملات مثلاً سیاسی یا اخلاقی مسائل پر بھی ذہانت اور قابلیت سے بحث کرے گا - البتہ اگر مناسب طریقۂ تعلیم اختیار کیا جائے تو بعض عام ذہنی رجحانات اور صلاحیتیں، تحصیل علم کے گر، نئے مسائل پر غور کرنے کے طریقے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو سیکھ کر انسان نہ صرف ایک خاص کام کو اچھی طرح کر سکتا

خود انہیں کام کرکے دکھا دے تو بچوں کے لیے بس یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ بغیر کسی دماغی جد و جہد کے انفعالی طریقے پر اس کی نقل اتار لیں - ممکن ہے کہ بار بار مشق کرنے سے اس خاص کام میں انہیں مہارت پیدا ہو جائے اور وہ اس کو آسانی اور تیزی کے ساتھ کرنا سیکھ لیں لیکن اس میں انہیں یہ موقع کہاں ملے گا کہ اپنی قوت انتخاب سے کام لے کر فیصلہ کریں کہ انہیں مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو سب سے زیادہ مناسب ثابت ہو ؟ اس میں شک نہیں کہ اگر اُستاد اور شاگرد دونوں اس سہل اور محفوظ طریقے کو اختیار کریں گے تو وہ بہت سی غلطیوں سے بچ جائیں گے' سامان اور آلات کا جو صرف بچوں کے عملی کام میں ہوتا ہے اس میں بہت کفایت ہوگی اور اگر محض نمائشی تعلیم مقصود ہو تو ''نتائج'' بھی بہت جلد حاصل ہو جائیں گے یعنی بچے بغیر سوچے سمجھے چند مقررہ حرکات کو انجام دے سکیں گے - لیکن زندگی کی کشمکش اور جد و جہد میں ایسے ''نتائج'' سے کام نہیں چلتا - کیونکہ وہاں ہر ذی‌شعور انسان کو جس کی زندگی محض نقالی اور احکام کی بجا آوری تک محدود نہیں' آئے دن ایسے مسائل اور واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن میں قوت فیصلہ کی اور اپنی آزادانہ رائے قائم کر کے اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے - زندگی میں کامیابی کے لیے فعالیت کی ضرورت ہے - اس کی تربیت دینے کے لیے مدرسے کو ایسا طریقۂ عمل اختیار کرنا چاہیے کہ طلبہ نئے مواقع اور نئے حالات سے دوچار ہو کر ان سے عہدہ‌برآ ہونے کی تدبیریں سوچ سکیں -

کی پناہ ڈھونڈتے ھیں اور مروجہ طرز خیال کے سہارے اندھوں کی طرح ایک راستے پر چلتے رھتے ھیں - ان میں نئے خیالات سے متاثر ھونے اور فکر و عمل کی دنیا میں آزادی اور جرأت کے ساتھ نئی راھیں تلاش کرنے کی صلاحیت ھی نہیں - نہ اُنھیں ابھی تک تلاش حق کا شوق پیدا ھوا ھے اور نہ تجربی طریقے کی ھوا لگی ھے - اس کی جہاں اور بہت سی وجوہ ھیں ایک بڑی وجہ یہ بھی ھے کہ مدرسوں کی تعلیم بالعموم طلبہ کے ذھن کو معطل رکھتی ھے اس میں ھر بات کے متعلق تحکمی اور قطعی واقفیت تھونس دی جاتی ھے جسے حاصل کرنے میں انھیں ذھنی کاوش سے مطلق کام نہیں لینا پڑتا - یہ طریقہ نہ صرف ان مضامین کی تعلیم میں رائج ھے جن کا مقصد ایک حد تک مفید معلومات کا مہیا کرنا ھے بلکہ ان مضامین میں بھی جن کا مخصوصی تعلیمی مقصد ھی یہ ھے کہ وہ طلبہ میں ذھنی اجتہاد اور قوت فکر پیدا کریں -

اس بحث سے معلم کے لیے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ جب وہ اپنے مدرسے میں تعلیمی مشاغل کو رائج کرے تو اسے یہ نہیں چاھیے کہ وقت محنت اور سامان کی کفایت کے خیال سے بچوں کو پہلے ھی سے کام کرنے کا مفصل طریقہ بتلا دے بلکہ مسائل اور مشکلات کو ان کے سامنے پیش کرنے کے بعد ان کا حل کرنا اُنھیں پر چھوڑ دے اور خود صرف ان کی نگرانی اور ھدایت کرتا رھے اور ان کی دلچسپی کو قائم رکھے - اگر وہ ان کے سامنے ایک بنا بنایا نمونہ پیش کردے جس سے کام کے تمام مدارج ان کی سمجھ میں آجائیں یا وہ

سے دوچار ہوں جس کو حل کیے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہو - اس حل کو دریافت کرنے کے لیے وہ اپنے سابق تجربے اور تخیل کی مدد سے کوئی فرضیہ یا نظریہ قائم کرتے ہیں اور اس کے مطابق حالات کو مرتب کرکے دیکھتے ہیں کہ ان کا متوقع نتیجہ پیدا ہوتا ہے یا نہیں - اگر وہ فرضیہ جو گویا پہلی مثال کی " تدبیر " کا قائم مقام ہے کامیاب نہیں ہوتا تو وہ کوئی دوسرا فرضیہ قائم کرتے ہیں اور اس کے ماتحت مختلف قسم کے آلات اور وسائل کی مدد سے تجربے کرتے ہیں اور اپنی غلطیوں سے سبق لے کر رفتہ رفتہ اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں جس کی ان کو تلاش تھی - سوائے ان چند بڑی علمی دریافتوں کے جن کی ابتدا کسی اتفاقی تجربے یا مشاہدے سے ہوئی ہے علم کو بالارادہ حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے اور اسی کو موجودہ زمانے میں " علمی طریقے " کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو شائد دور حاضر کی سب سے اہم اور قابل قدر دریافت ہے اور جس نے انسان کی ترقی کے امکانات کا دائرہ بے حد وسیع کردیا ہے - تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ طلبہ میں ایسی قابلیت پیدا کرے کہ وہ دوسروں کی رائے اور حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بجائے تحصیل علم میں فعالی طور پر حصہ لیں اور خود سوچ سمجھ کر اپنے افعال کی ذمہ‌داری قبول کریں اور اپنی رہنمائی کا فرض انجام دیں - عموماً ہر ملک میں جمہور ان صفات سے محروم ہیں - خصوصاً ہندوستان میں تو بدقسمتی سے یہ عالم ہے کہ لوگ ہر قسم کے معاملات میں بالخصوص معاشرتی اور اخلاقی مسائل میں ' رسمی عقائد

بہر حال اب وہ کوئی اور تدبیر سوچتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے یا اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ کامیابی نامکن ہے - اس صورت حال میں شروع ہی سے ایسے امکانات موجود ہیں جو اس کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو دعوت عمل دیتے ہیں اور اس میں کوشش اور جد و جہد کی خواہش کو ابھارتے ہیں - اس کو جو کچھ تجربہ اس کوشش کے دوران میں حاصل ہوتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اس کی قوت عمل اور معلومات کا جزو ہو جاتا ہے - اگر اس طول عمل کے بجائے ہم شروع ہی میں اسے یہ بتا دیتے کہ کرسی پر چڑھ کر میز پر سے کھلونا اتار لو یا خود کھلونا میز پر سے لے کر اسے دے دیتے تو اس کو ہر گز وہ ذہنی تربیت حاصل نہ ہوتی جو اس صورت میں ہوئی - یہی حال علمی تحقیق و تفتیش اور پختہ کار ماہرین کی جد و جہد کا ہے - یہ صحیح ہے کہ ان کو اپنے ماحول کا زیادہ علم اور اس پر زیادہ قابو ہوتا ہے - وہ علم حاصل کرنے کے ذرائع سے واقف ہوتے ہیں اور اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ انہیں حسن اتفاق سے کوئی نیا مشاہدہ یا تجربہ حاصل ہوجائے بلکہ وہ خود ایسے حالات پیدا کرتے ہیں اور واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ نئے مشاہدے اور تجربے کرسکیں - لیکن باوجود اس تمام فرق کے ان کا تحصیل علم کا طریقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بچوں کے طریقے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں - ان کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے علمی اور عملی مشاغل کے دوران میں کسی ایسے مسئلے یا مشکل

یہ اس سے ممکن نہیں تو اس کے گرد چکر کاٹ کر میز تک پہنچتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کھلونے تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس کا قد چھوٹا ہے اور میز اونچی ہے اب اسے یہ مسئلہ در پیش ہے کہ کھلونے تک کیسے پہنچے - ممکن ہے وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوکر یا اچھل کر کھلونا حاصل کر لے - اگر یہ ترکیب بھی نہ چلے تو شائد کوئی کرسی یا مونڈھا کھینچ کر لائے اور اس پر چڑھ کر کھلونا میز پر سے اتارے اور اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے - یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس طرح بھی کھلونا نہ پا سکے تو کسی دوسرے شخص سے مدد مانگے یا اپنی پہنچ اور قابلیت کی کوتاہی کا احساس کر کے اس مقصد سے بالکل ہی دست بردار ہو جائے - اب ذرا اس سلسلۂ حرکات کا تجزیہ کیجیے - ان کی محرک بچے کی ایک فطری خواہش (یعنی کھیل) ہے جس کو وہ تشفی کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کی تمام کوششیں اور ان کی ترمیم اور تبدیلی ایک خاص مقصد ' ایک مستقل ارادے کی تابع ہیں - اس کو کسی نے پہلے سے یہ نہیں بتایا کہ اگر کھلونا لینا چاہتے ہو تو فلاں طریقۂ عمل اختیار کرو - وہ اپنے معمولی مشاغل کے دوران میں ایک مشکل کا سامنا کرتا ہے اور اس کو حل کرنے کے لیے اپنے دماغ پر زور ڈال کر ایک تدبیر سوچتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے - اگر اس سے کامیابی نہیں ہوتی تو دوبارہ اُسی تدبیر کو استعمال نہیں کرتا - یا ممکن ہے دو تین بار آزمانے کے بعد اسے یہ اندازہ ہو کہ یہ تدبیر نہیں چلے گی اور پھر وہ اسے ترک کرے -

کوششوں اور بڑے بڑے عالموں کی تحقیق سب پر برابر عائد ہوتا ہے - جب چھوٹے بچے کوئی نئی بات سیکھتے ہیں خواہ وہ کوئی علم ہو یا ہنر تو وہ اس میں یہی طریقۂ عمل اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہی ان کی فطرت کے قوانین کے ساتھ ہم‌آہنگ ہے - یہ سچ ہے کہ مدرسوں کا طریقۂ تعلیم اکثر اس سے مختلف ہوتا ہے - استاد بالعموم ہر بات کو بالکل صاف اور واضح کر دیتے ہیں اور سبق کو ان کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے اور بچے انفعالی طریقے پر اس کو سمجھ لیتے ہیں اور یاد کر لیتے ہیں- یہ بھی "سیکھنے" کا ایک طریقہ ہے لیکن اس طرح سیکھنے میں ذہنی جدت اور تیزی پیدا نہیں ہوتی - اگر ہمارا مقصد طلبہ کی تعلیم سے یہ ہے کہ ان میں مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے اور مشکلات سے عہدہ‌برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو تو ہم اس قسم کی تعلیم کو کسی طرح مناسب اور تشفی بخش قرار نہیں دے سکتے - اس معاملے میں ہمیں فطرت اطفال اور ان کی نشو و نما کے قوانین سے سبق لینا چاہیے اور یہ مشاہدہ کرنا چاہیے کہ بچے مدرسے آنے سے پہلے اپنی عمر کے ابتدائی چند سال میں کس طرح بہت سی اہم‌ترین باتیں سیکھتے ہیں - اس کی تشریح ایک معمولی سی مثال سے ہوسکتی ہے - بچہ کسی کھلونے کو لینا چاہتا ہے جو ایک میز پر رکھا ہوا ہے - وہ اس کی طرف بڑھتا ہے راستے میں پلنگ یا کوئی اور رکاوٹ حائل ہے - وہ اس سے ٹکراتا ہے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر یا تو اس چیز کو ایک طرف ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر

نہیں - وہ ایک مفید خدمت ضرور ہے لیکن اس سے مزدور
کو کوئی دماغی تربیت یا فائدہ حاصل نہیں ہوتا - اسی
طرح اگر مدرسے میں کوئی بچہ پیشے کے طور پر نجاری کا کام
سیکھے یا مشینوں کے چلانے میں یا باغبانی یا کاشتکاری وغیرہ
میں ماہر ہو جائے تو گو یہ چیزیں بجائے خود مفید اور
عمدہ ہیں لیکن ان سے اس کے تعلیمی مقاصد کے حصول
میں مدد نہیں ملتی - ہمارے مدارس کو ہر لحاظ سے ایک
تعلیمی ماحول ہونا چاہیے نہ کہ پیشہ آموز درسگاہیں - اور
انہیں اپنے تمام مشاغل اور نصاب کی ترتیب و تدوین اس
طرح کرنی چاہیے کہ ان کے ذریعے طلبہ کی ذہنی تربیت
بخوبی ہو سکے - اس لیے ہمیں انتخاب مشاغل کے بعد اس
مسئلے سے بحث کرنی ہے کہ طلبہ کی ذہنی تربیت کن
اصولوں کے ماتحت کی جائے -

ذہنی تربیت کے لیے ایک شرط لازم یہ ہے کہ طلبہ جو
کچھ کام کریں اس میں ان کو اپنی قوت فیصلہ کو استعمال
کرنے، وسائل اور ذرائع کو کسی مقصد خاص کے ماتحت
ترتیب دینے اور اپنی مشکلات کو ذاتی کوشش سے حل
کرنے کا موقع ملے - دماغ پر زور ڈالنے اور تدبیریں سوچنے کی
ضرورت ہمیں صرف اس وقت پڑتی ہے جب ہم کسی مشکل
مسئلے سے دوچار ہوں اور اس کا حل ہمیں معلوم نہ ہو - ایسی
حالت میں ہم پہلے ایک تدبیر سوچتے ہیں اور اسے آزماتے
ہیں، اگر وہ تدبیر نہیں چلتی تو کسی اور تدبیر سے کام لیتے
ہیں اور اس طرح اپنی ناکامیوں سے سبق لے کر رفتہ رفتہ
کامیابی حاصل کرتے ہیں - یہ اصول چھوٹے بچوں کی معمولی

باب سوم

"ذهنی تربیت"

ہم نے گزشتہ باب میں مدرسۂ عمل کی خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ تعلیم کی بنیاد عملی مشاغل پر رکھنی چاہیے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم طلبہ کو محض دست‌کار بنانا چاہتے ہیں اور ان کی علمی اور دماغی تربیت کو مقابلتاً غیر اہم سمجھتے ہیں - تعلیم کے عملی پہلو پر زیادہ اصرار کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہمارے مروجہ مدارس میں تعلیم دینے اور کتابیں پڑھانے کو بالکل ہم‌معنی سمجھ لیا گیا ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے صلاحیت عمل مفقود ہوتی جاتی ہے - مگر یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہم ان میں ایسی "عملیت" پیدا کرنی نہیں چاہتے جو محض چند مقررہ افعال پر منحصر ہو جن کو وہ بطور ایک معمول کے انجام دے سکیں - ایک مزدور جو اینٹیں ڈھو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے یقیناً کام کر رہا ہے لیکن اس کام کو سکھانے کے لیے مدرسے کی ضرورت

میں اس حقیقی تہذیب کو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو خود کام کرنے اور اس کے معاشری اور اخلاقی نتائج کو سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے - یہ وہ تہذیب ہے جو ممکن ہے ایک مستعد، خوش دل مزدور میں یا اس کاشتکار میں جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مفید کام کرتا ہے پائی جائے اور ایک عالم یا ادیب یا فنون لطیفہ کے ماہر کو اس کی ہوا بھی نہ لگی ہو!

وغیرہ - (علاوہ ان کے علم نباتات کا مطالعہ کرنے کے لیے باغ اور کاشت‌کاری کے لیے زمیں بھی ہوگی -)

"ایک اور حصے میں آرٹ اور موسیقی کے لیے کمرے ہوں گے ' تھیٹر کا ہال ہوگا اور ایک ایسا کمرا ہوگا جس میں طلبہ صنعتی زندگی کے ارتقاء اور صنعت و حرفت کے نمونوں کا مطالعہ کرسکیں گے -

"یہ کوئی خیالی یا ناممکن تجویز نہیں بلکہ ہر شہر اور ملک کے مقدور میں ہے"[1] -

"مدرسۂ عمل" کی یہ تصویر ہمارے ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے قریب قریب ناممکن‌العمل معلوم ہوتی ہے - اس میں شک نہیں کہ ان تمام سامان اور آلات کا مہیا کرنا سوائے خاص خاص مدارس کے اور کہیں ممکن نہیں لیکن ایک حد تک ہر مدرسہ ان تعلیمی اصول پر یقیناً عمل کرسکتا ہے اور ہم آئندہ چل کر بتائیں گے کہ نصاب کی تدوین اور تعلیم کس طرح کی جائے کہ اس سے مذکورہ بالا مقاصد حاصل ہوسکیں - فی‌الحال ہمیں مدرسۂ عمل کی اس امتیازی خصوصیت کو اچھی طرح ذہن نشیں کرلینا چاہیے کہ وہ 'کتاب' کے بجائے تخلیقی اور اشتراکی 'کام' کو اپنی تعلیم کی بنیاد بناتا ہے اور طلبہ کو ایسے مشاغل میں لگاتا ہے جن میں اُنھیں اپنی جسمانی اور دماغی قوتوں کی ہم آہنگ تربیت کا موقع ملے - اس مدرسے میں تہذیب (Culture) کی بنیاد بھی کتابی علوم پر نہیں رکھی جاتی بلکہ طلبہ

۱—The Story of a Great School Master صفحہ ۱۲۶ -

جن میں ہر قسم کی مشینیں اور اوزار مہیا ہوں - ایک لوہار خانہ، ایک دھاتیں ڈھالنے کا کمرا، ایک بڑھئی کی کارگاہ ایک ڈرائنگ کا کمرا جن میں صنعت و حرفت کے مختلف کام کیے جائیں گے اور ہر عمر کے طلبہ کے لیے مناسب مشاغل مہیا ہوں گے -

"اس کے علاوہ ایک بہت وسیع ادبی اور تاریخی کارگاہ بھی ہوگی جس میں ایک بڑا کتب خانہ ہوگا جہاں جدید علوم کی کتابیں اور کتب حوالجات موجود ہوں گی - اس عمارت کے دونوں پہلوؤں میں کمروں کا ایک سلسلہ ہوگا جن میں مختلف قدیم و جدید علوم، تاریخ، اقتصادیات ادب اور سائنس وغیرہ پر غیر زبانوں کی کتابیں فراہم کی جائیں گی - ایسی کتابیں جتنی زیادہ ممکن ہوں مہیا کرنی چاہییں تاکہ طلبہ کے دل میں دوسری قوموں سے ہمدردی اور ان کا احترام پیدا ہو، انہیں ان کے متعلق واقفیت حاصل ہو اور اس طرح زندگی کے ایک زیادہ وسیع اور گہرے نصب العین کی بنیاد پڑے - اسی طرح ایک اور گیلری میں جغرافیہ، علم موالید اور علم الاقوام کی کتابیں ہوں گی -

"ایک اور عمارت سائنس کے لیے مخصوص ہوگی جس میں انجینیری کا معمل ہوگا، مشینوں کا کمرا ہوگا، طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کے معمل ہوں گے جن میں ہر قسم کے ضروری آلات اور سامان اور عملی کام کے لیے مشینیں ہوں گی جن کی مدد سے طلبہ جدید تحقیقات میں حصہ لے سکیں گے مثلاً آلات کو جانچنے کی مشینیں

کی عمارتیں بنانی پڑیں گی اور درسی مضامین کی اضافی قدر میں بہت بڑا انقلاب ہوجائے گا۔ سائنس جو ایک نیا مضمون ہے اور جدید صنعت و حرفت جو اس سے پیدا ہوئی ہے دونوں کو مدرسے کے تمام شغل میں ایک نمایاں اہمیت حاصل ہوگی - اب یہ کہنا کافی نہیں کہ مدرسے میں سائنس پڑھانی چاہیے -۔ اس کا وقت گزر چکا ہے - ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ سائنس کو مدرسے کی زندگی کا روح رواں بنا دینا چاہیے - سائنس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں تخلیق اور اشتراک عمل لازم ہے -۔ اس کی نظر ہمیشہ مستقبل پر یعنی ترقی اور تبدیلی کی طرف رہتی ہے - اس کے معنی ہیں تلاش حق جس کے لیے عملی تحقیق اور تجربے کی ضرورت ہے - اس کی بنیاد تقلید پر نہیں ہے - اس نئی تعلیمی روح کے زیر اثر ہمیں تمام مضامین یعنی تاریخ، ادب، آرٹ بلکہ زبانوں کو بھی از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

''اس تبدیلی کی وجہ سے مدرسوں میں نئے قسم کے سامان و آلات اور عمارتوں کی ضرورت پیش آئے گی جن میں صرف ''پڑھائی'' کے کمرے شامل نہ ہوں گے بلکہ عملی کام کرنے کے لیے بڑے بڑے فراخ ہال درکار ہوں گے -۔ موجودہ مدارس کے کمروں میں بچے محض ''پڑھائے'' جاتے ہیں - وہ گویا ذہنی اوزار تیز کرنے کی جگہیں ہیں جو یقیناً ضروری ہیں لیکن ان کی اہمیت ثانوی ہے - علمی تحقیق اور تخلیقی اور اشتراکی کاموں کے لیے بڑے بڑے ہال درکار ہوں گے، انجینیری اور نجاری کے لیے بہت وسیع کمرے

حالات اور تعلیمی خیالات کے متعلق دو نہایت دلچسپ اور سبق آموز کتابیں حال میں شائع ہوئی ہیں جن کا مطالعہ معلموں کے لیے بہت مفید اور ہمت افزا ہے[1] - ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک شخص اپنے خلوص اور محنت کی بدولت ان رکاوٹوں اور مشکلوں پر قابو پا سکتا ہے جو بالعموم مصلحین تعلیم کو پیش آتی ہیں - اس میں شک نہیں کہ مالی اعتبار سے اس کو بعض آسانیاں حاصل تھیں جو ہمارے یہاں مدرسوں کو نصیب نہیں ہیں اور محکمۂ تعلیم کی طرف سے قیود اور قوانین بھی اس قدر سختی کے ساتھ عائد نہیں کیے گئے تھے لیکن پبلک کی مخالفت اور جمود اور قدامت پسندی کے خلاف اس کو بھی بالکل اسی طرح جنگ کرنی پڑی تھی جس طرح ایک ترقی پسند معلم کو ہمارے ملک میں کرنی پڑتی ہے - اس نے ایک مرتبہ لندن میں تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کے تصور میں مدرسے کا جو نقشہ ہے اس میں کن چیزوں پر زور دیا جائے گا اور تعلیم اور قومی ضروریات میں کس طرح ربط قائم ہوگا :—

"میں جس تبدیلی کی اہمیت پر زور دے رہا ہوں اس کے لیے ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت ہوگی - نئی قسم

۱—ان میں سے ایک کتاب ویلز (Wells) نے The story of a great School master (ایک بڑے معلم کی کہانی) کے نام سے لکھی ہے اور دوسری جو زیادہ ضخیم اور مفصل ہے' سینڈرسن کے شرکائے کار نے اپنی متفقہ کوشش سے مرتب کی ہے اس کا نام "Sanderson of Oundle" ہے- دونوں میں سینڈرسن کی تحریروں اور تقریروں سے کافی اقتباسات دیے گئے ہیں ۔

جو ایک خاص منطقی ترتیب کے مطابق مدون کیے گئے ہیں اور جن کی تحصیل طلبہ پر کسی نامعلوم مصلحت کی وجہ سے فرض کردی گئی ہے - بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے گرد و پیش کے انسانی مشاغل تعلقات اور کاروبار کو اپنا نقطۂ آغاز بنائیں اور بچوں کو مشاہدے ' عملی تجربے اور تقلیدی مشاغل کے ذریعے ان سے اچھی طرح روشناس کریں - اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کے تجربات اور مشاہدوں کی بنیاد پر ان "علوم" کی عمارت قائم کریں - تعلیم کی بنیادی عناصر دو ہیں- انسان اور اس کی زندگی اور طالب علم اور اس کے فطری رجحانات - علوم کی مروجہ ترتیب و تنظیم ایک ثانوی چیز ہے جو محض بالغوں کے دماغ کی مخصوص منطق کا عکس ہے - یہ ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ خود اپنی کوشش کے ذریعے اپنی معلومات میں یہ ترتیب پیدا کرے - ابتدا ہی سے بچوں پر اس خارجی ترتیب کا عائد کرنا ان کی ذہنی تربیت کو روکنا ہے - مروجہ مدارس کی ایک بہت بڑی غلطی یہی رہی ہے کہ انھوں نے علم کی ایک غلط تصور کو بت بناکر پوجنا شروع کردیا اور بچوں کی زندگی کی ضروریات اور ان کے شوقوں کو اس پر قربان کر دیا -

اونڈل(Oundel) پبلک اسکول کے مشہور ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں انگلستان کے ایک مدرسۂ عمل کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے - اُس نے اپنی بلند نظری' اپنی قوت فکر و عمل کی بدولت اپنے اسکول کو جمود کی حالت سے نکال کر ملک کے بہترین ترقی پذیر اسکولوں کے دوش بدوش کھڑا کردیا تھا - اس کے

تک پہنچتی ہے اس قسم کے عملی مشاغل کا استعمال صرف علومِ صحیحہ تک محدود نہیں بلکہ معاشری علوم کی تحصیل میں بھی ان سے اسی طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ مدارسِ جدید کا تجربہ اس خیال کی تصدیق کرتا ہے اور حال میں تعلیمی تجربات کے جو حالات شائع ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جا بجا معلموں نے یہ کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب ہوئے ہیں کہ تاریخ، جغرافیہ، ادب وغیرہ کو بطور "رسمی مضامین" کے نہ پڑھائیں بلکہ ان سے طلبا کے گرد و پیش کی زندگی کی تشریح کا کام لیں اور انہیں عملی مشاغل کی شکل میں پیش کریں۔

"مبتدیوں کے لیے معاشیات اور مدنیات کے علوم تک رسائی حاصل کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ انہیں یہ معلوم ہو کہ معاشری زندگی میں صنعتی مشاغل اور کار و بار کا کیا درجہ رہا ہے۔ بلکہ اونچے درجوں کے طلبہ کے لیے بھی ان علوم کی حیثیت بالکل مجرد اور رسمی علوم کی نہ رہے گی جیسی کہ اب ہے اگر ہم اُن کو بجائے باضابطہ علوم کے طور پر پڑھانے کے ان کا مطالعہ اس نظر سے کریں کہ ان کے اصول اور مسائل ان تمدنی گروہوں کی زندگی میں کس طرح ظاہر ہوتے ہیں جن میں طلبہ خود شریک ہیں"۔

اس عبارت سے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کی مراد یہ ہے کہ تاریخ، معاشیات، مدنیات، انسانی جغرافیہ وغیرہ وہی اسی طرح نہ پڑھانا چاہیے گویا وہ مخصوص فنون ہیں

کے دوران میں کی ہیں - یہی حال اور تمام علوم کا ہے جو نصاب میں پائے جاتے ہیں - اگر طلبہ ان کی تحصیل کی ابتدا مناسب عملی مشاغل کے ذریعے کریں تو گویا وہ ایسا راستہ اختیار کریں گے جس پر نسل انسانی چل چکی ہے اور جس پر چل کر اسے کامیابی حاصل ہوئی ہے اس صورت میں مختلف سائنسوں کی حیثیت ان کے لیے مجرد اور نظری علوم یا چند ناقابل فہم اصولوں کے مجموعے کی نہ ہوگی بلکہ وہ واقعی یہ دیکھیں گے اور محسوس کریں گے کہ ان کا زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ نسل انسانی کے نقش قدم پر چلنے میں انہیں وہ تمام غلطیاں اور تضیع اوقات نہیں کرنی چاہیے جو گزشتہ زمانے میں ہمارے آبا و اجداد کو مجبوراً کرنا پڑی تھی - مدرسے کے باضابطہ ماحول کی بدولت وہ بہت سی صریحی غلطیوں سے بچ جائیں گے جن میں پڑکر بعض مرتبہ انسانوں نے چھوٹی چھوٹی دریافتوں میں صدھا برس لگادیے ہیں - اور ان کی علمی ترقی زیادہ یقینی اور اس کی رفتار تیز تر ہو جائے گی - یہی فطرت کی تعلیم اور انسانوں کی اِرادی تعلیم کا فرق ہے - مگر جہاں مدرسۂ جدید ان کے لیے ایک حد تک محفوظ ماحول مہیا کرے گا وہاں وہ اس بات پر بھی زور دے گا کہ طلبہ ان علوم کی تحصیل میں پوری پوری کوشش کریں، ان عملی مشاغل میں حصہ لیں جن کا ان علوم سے تعلق ہے ' روزمرہ کی زندگی سے ان کا رشتہ پہچانیں اور یہ دیکھیں کہ نسل انسانی کس طرح آہستہ آہستہ جہالت اور عطائی واقفیت کی منزل سے گزر کر علم اور عقل کی منزل

میں ہوئی ہے - علم طبیعیات (Physics) کے باقاعدہ طور پر مدون ہونے سے صدیوں پہلے لوہار اور نجار بہت سے وہ اوزار استعمال کرتے تھے جنھوں نے اس علم کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے مثلاً ہتوڑی، برما، پیچ، بھٹی وغیرہ - پہلے انسان نے ان چیزوں کے استعمال سے عملی واقفیت حاصل کی اس کے بعد جوں جوں اس کا تجربہ اور مشاہدہ وسیع اور منظم ہوتا گیا یہ عملی واقفیت علم کی صورت اختیار کرتی گئی - واقعہ یہ ہے کہ علم اور عمل دونوں اپنی ترقی اور تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور رہیں گے - اوزار اور آلات کے استعمال سے عملی واقفیت پیدا ہوتی ہے جو اصطلاحی معنی میں علم کا پیش‌خیمہ ہے اور علم کی ترقی کی بدولت بہتر اوزار اور آلات ایجاد ہوتے ہیں اور استعمال میں آتے ہیں - پھر ان بہتر آلات کے ذریعے انسان کی قوت مشاہدہ بہت بڑھ جاتی ہے تجربات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور علم میں اور زیادہ اضافہ ہوتا ہے - علت و معلول کا یہ سلسلہ یوں ہی قائم ہے - اسی طرح علم کیمیا کی ابتدا وہ بہت سے مفید اور ضروری کام ہیں جو لوگ صدیوں سے اپنے عملی تجربے کی بنا پر کرتے چلے آئے ہیں مثلاً رنگ سازی، دھاتوں کا کام، دوائیں بنانا وغیرہ -

زراعت کو ایک مدون علم کی شکل اختیار کیے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے لیکن بحیثیت ایک اہم‌ترین عملی مشغلے کے وہ ابتدائے تمدن سے جاری ہے علم زراعت میں انہیں تجربوں، مشاہدوں اور دریافتوں کو ایک مرتب شکل میں پیش کیا جاتا ہے جو انسان نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے کاشتکاری

تسکین کے لیے ان کا مطالعہ کریں - مثلاً بیجوں کی نشو و نما اور پودوں کی خوراک کا مسئلہ ' پھلوں کی پیداوار وغیرہ - اس طرح اکثر عملی دلچسپیاں رفتہ رفتہ ایک موزوں ماحول اور فطرت شناس معلم کی نگرانی میں علمی ذوق میں تبدیل ہوسکتی ہیں - گو بظاہر علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ طریقے ایک طول عمل معلوم ہوتا ہے لیکن فطرت اطفال اور ذہنی ارتقاء کے قوانین کا تقاضا یہی ہے کہ تعلیم میں یہ لمبا راستہ اختیار کیا جائے - یہ ان مقامات میں سے ہے جہاں وقت اور محنت کی بیجا کفایت دراصل انتہائی اسراف ہے !

باغبانی کا تعلق مروجہ درسی مضامین سے نہیں ہے - مگر یہ اصول کہ تعلیم عمل کے ذریعے ہونی چاہیے درسی مضامین پر بھی صادق آتا ہے ہم مروجہ نصاب کے تقریباً ہر مضمون کو لیکر یہ بات ثابت کرسکتے ہیں کہ عقل اور تجربے دونوں کے لحاظ سے اس کی تحصیل میں بچوں کو عملی اور تخلیقی کام کرنے کا موقع دینا چاہیے اور صرف اسی طرح ہم ان کی تعلیم کو موثر اور کامیاب بنا سکتے ہیں - لیکن اس مثال کی توضیح کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مدرسۂ عمل کے نقطۂ نظر سے طلبہ کے عملی ' فعالی اور فرحت بخش مشاغل مثلاً باغبانی اور مروجہ درسی مضامین میں جو فصل قائم ہو گیا ہے وہ بالکل غیر ضروری اور نقصان دہ ہے اور موجودہ نظریۂ تعلیم کی رو سے مطلق جائز نہیں - بہر حال اگر ہم مختلف علوم خصوصاً علوم صحیحہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ ان سب کی ابتدا مفید اور عملی پیشوں' صنعتو اور دستکاریوں کی شکل

تعلق مدرسے کے مضامین اور مشاغل سے ھے باغبانی اُن مشاغل میں سے ھے جن کی اھمیت تمام ماھرین تعلیم نے تسلیم کی ھے اور جس کو خود تعلیم کے عمل سے ایک خاص مشابہت ھے - مدرسے میں باغبانی اس لیے نہیں کی جاتی کے طلبہ کو آئندہ چل کر پیشہ‌ور باغبان بنانا ھے یا ان کا وقت خوشگوار طریقے پر گزارنا مقصود ھے - بلکہ اس کی غرض یہ ھے کہ انہیں معلوم ہو کہ انسان کے لیے کاشت‌کاری اور باغبانی کس قدر ضروری کام ھیں اور موجودہ نظام معاشرت میں ان کی کیا اھمیت ھے- اگر وہ سمجھ دار معلموں کی نگرانی میں اپنے مدرسوں میں کاشت‌کاری اور باغبانی کریں گے تو انہیں اس کے ذریعے پودوں کی نشو و نما ' متی کے کیمیائی اجزا ' روشنی ' ھوا اور رطوبت کے اثرات ' مفید اور مضر کیڑوں کے حالات معلوم کرنے کا موقع ملے گا - علم نباتات کے ابتدائی مسائل میں سے کوئی بات ایسی نہیں جو طلبہ کو پودوں کی نشو و نما اور انکی غور و پرداخت کے سلسلے میں نہایت معقول اور موثر طریقے پر نہ سکھائی جاسکے اسطرح ان باتوں کو سیکھنے کا نتیجہ یہ ھوگا کہ وہ جو کچھ واقفیت حاصل کریں‌گے اس کا تعلق ایک خاص مضمون "علم نباتات" سے نہ ھوگا بلکہ وہ ان کے روزمرہ کے مشاھدات اور مشاغل کا جزو ھوگی اور اس عام معلومات کے ساتھ مربوط ھوجائے گی جو وہ زمین کے مظاھر اور انسانی حیوانی زندگی کے متعلق رکھتے ھیں- یہ بھی ممکن ھے کہ جب ان کا شوق زیادہ پختہ اور تجربہ زیادہ وسیع ھوجائے تو بعض طلبہ کو ان میں سے بہت سے مسائل ایسے دلچسپ معلوم ھوں کہ وہ محض علمی تحقیق یا اپنے ذوق تجسس کی

عملی مشغلے کے اجزا بن کر باہم مربوط ہو جاتے ہیں - عام طور پر مدرسوں کی تعلیم میں یہ خرابی ہے کہ وہاں ہر مضمون اپنی جگہ پر مکمل اور قائم بالذات سمجھا جاتا ہے جس کا نہ دوسرے مضامین سے کوئی تعلق ہے نہ طلبہ کی زندگی اور تجربات سے - تاریخ جغرافیہ ' ریاضی' ادب' سائنس وغیرہ سب گویا دماغ کے علحدہ علحدہ خانوں میں بند رہتے ہیں جو کسی خاص موقعے پر مثلاً آموختہ سنانے یا امتحان دینے کے وقت وہاں سے باہر نکلتے ہیں اور بس! برخلاف اس کے اگر طلبہ کسی بامقصد کام مثلاً باغبانی میں' یا تعلیمی سیر و سفر میں' یا مدرسے کے میدان میں ہندوستان کا ایک بڑا اور مفصل نقشہ بنانے میں مصروف ہیں تو وہ اپنی تمام معلومات سے حسب ضرورت کام لیتے ہیں اور اپنی کوشش اور دوسروں کی مدد سے نئی معلومات حاصل کرتے ہیں اس طرح ان نئی اور پرانی معلومات میں برابر لازمی اور قدرتی طور پر ربط قائم ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے ان کے علم میں استحکام پیدا ہوجاتا ہے اور وہ ضرورت کے وقت استعمال میں آسکتا ہے - جب ہم ان تعلیمی مشاغل کو مدرسوں میں داخل کریں یا معمولی درسی مضامین سے طریقۂ تعلیم میں منصوبی اصول پو عمل کریں تو ہمیں ہمیشہ ایسے مشاغل کا انتخاب کرنا چاہیے جن میں مختلف قسم کی معلومات کو مربوط اور منظم کرنے' ذہنی کاوش اور اجتہاد سے کام لینے اور تجربہ کو زیادہ وسیع اور بامعنی بنانے کے امکانات ہوں - یہی اصول منصوبی طریقے کی بنیاد ہے -

اس اصول کی توضیح چند مثالوں سے ہوسکتی ہے جن کا

لکھنے یا کہانیاں سنانے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے - اگر طلبہ یہ محسوس کریں کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر انہیں اپنے دلچسپ مشاغل میں کامیابی ہوگی تو وہ ان کو بہت شوق اور توجہ سے حاصل کریں گے -

بڑا تعلیمی مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان مشاغل کو یا ان میں سے بعض کو بچوں کی تعلم و تربیت کا قابل قدر جزو کس طرح بنا سکتے ہیں - اس کتاب میں ہمیں زیادہ تر عام تعلیمی اصولوں سے بحث ہے اس لیے یہاں اس کا موقع نہیں کہ ہم ان مشاغل پر تفصیلی نظر ڈال کر بتائیں کہ ان سے مدرسے میں کس طرح فائدہ اُٹھایا جائے - البتہ یہ عام اصول یاد رکھنا چاہیے کہ بحیثیت تعلیمی وسائل کے ان کی کامیابی اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک طلبہ کے مفید شوقوں کو اُبھارتے ہیں اور ان کو نئی اور پائدار دلچسپیوں سے روشناس کرتے ہیں - تعلیم کا منشا یہ ہے کہ طلبہ کی شخصیت میں وسعت اور گہرائی پیدا کرے اور مدرسے کے یہ مشاغل اس منشا میں اسی وقت معین ہو سکتے ہیں جب وہ بچوں میں صحیح قسم کی دلچسپیاں پیدا کریں اور مختلف علوم کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے دکھائیں تاکہ وہ اپنے علم سے زندگی کے مسائل پر روشنی ڈال سکیں اور زندگی کے تجربات سے علم میں وضاحت اور صحت پیدا ہو - مدرسے کے معمولی درس پر اس قسم کے مشاغل کو اس وجہ سے ترجیح دی جاتی ہے کہ ان کے ذریعے سے جو معلومات طلبہ حاصل کرتے ہیں اس میں جان پڑ جاتی ہے اور مختلف مضامین ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہتے بلکہ ایک مسلسل

اگر اس اصول پر مشاغل کا انتخاب کیا جائے تو ان سے یقیناً وہ تعلیمی فائدے حاصل ہوسکتے ہیں جو اس تحریک کے حامیوں کے مد نظر ہیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے ان مشاغل کی ایک مختصر سی فہرست بھی دی ہے جو بہت سے مدرسوں میں رائج ہو چکے ہیں اور جن میں سے اکثر کو انھوں نے اپنے مشہور ابتدائی مدرسے "شکاگو ایلمنٹری اسکول" میں جو امریکا کے بیشتر تجربی مدارس کا پیش رو ہے، آزمایا تھا - وہ ان مشاغل میں جو بچوں کی عام تعلیم کے لیے اور دست کاری سکھانے کے واسطے مفید ہیں، مندرجہ ذیل چیزوں کو شامل کرتے ہیں :—

مدرسوں میں طلبہ کاغذ، کارڈ بورڈ لکڑی چمڑے، کپڑے، سوت، مٹی، ریت اور دھاتوں کا کام کرتے ہیں کبھی اوزاروں کی مدد سے اور کبھی ان کے بغیر - اس قسم کے کاموں کو کرتے وقت انھیں بہت سی چیزیں سیکھنی اور کرنی پڑتی ہیں مثلاً کاغذ کا کاٹنا، تہ کرنا، سوراخ کرنا، ناپنا، ڈھالنا، ماڈل بنانا، نمونے کاٹنا، گرم کرنا، ٹھنڈا کرنا، ھتوڑے آری، ریتی سے کام کرنا - یہ سب کام مشق کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مختلف دلچسپ مشاغل کے دوران میں کرنے پڑتے ہیں مثلاً علاوہ طرح طرح کے کھیلوں کے تفریحی سفر کے لیے جانا، باغبانی، کھانا پکانا، سینا، چھپائی، جلدبندی، کپڑا بننا، رنگ بھرنا، تصویرکشی، ڈراما کرنا، کہانیاں کہنا، اور لکھنا پڑھنا نہ اس خیال سے کہ ایک خاص فن سیکھنا ہے جو آئندہ چل کر مفید ہوگا بلکہ بحیثیت عملی مشاغل کے جن سے ان کے موجودہ مقاصد کی تکمیل میں مدد ملتی ہے مثلاً آپس میں ایک دوسرے کو خط

معلومات اور اصول پنہاں ہیں وہ تمدنی لحاظ سے بہت اہمیت اور قدر رکھتے ہیں - اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ باغبانی، پارچہ‌بافی، لکڑی اور دھات کا کام، کھانا پکانا .اور اسی قسم کے مختلف مشاغل جو انسانی کاروبار میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں اور مدارس جدید میں داخل کیے گئے ہیں محض روزی کمانے کا ذریعہ ہیں تو ہم ان کی واقعی اہمیت سمجھنے سے بالکل قاصر رہیں گے - مانا کہ عام طور پر لوگوں کو صنعت و حرفت کے تمام کاروبار ایک ناگزیر مصیبت معلوم ہوتے ہیں جس کو وہ محض حصول معاش کی خاطر گوارہ کرتے ہیں لیکن یہ قصور ان کاموں کا نہیں بلکہ ان کے حالات کا ہے جن میں یہ کام کیے جاتے ہیں - دور حاضر کی زندگی میں اقتصادی معاملات کی اہمیت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے - اس لیے تعلیم کا فرض ہے کہ وہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ تمدنی بہبود کا انحصار ان معاملات پر ہے اور ان کا سائنس پر - مدرسوں میں یہ مشاغل کسی مالی منافع کی خاطر جاری نہیں کئے جاتے بلکہ اپنی داخلی قدر و قیمت کی بنا پر - جب یہ تمام خارجی اثرات اور روپیہ کمانے کی خواہش سے آزاد ہوجاتے ہیں تو ان کے ذریعے سے ایسے تجربات حاصل ہوتے ہیں جو بجائے خود مفید ہیں - اس وقت وہ واقعاً دماغ کی آزاد تربیت کے باعث ہوتے ہیں" ۱ -

---

۱— Democracy and Education صفحہ ۲۳۵۔

جاتا ہے کہ ان میں عقلی تربیت اور سائنس سے واقفیت حاصل کرنے کے امکانات موجود ہوں - سائنس کی جدید ترقی نے اس بات کو بالکل واضح کردیا ہے کہ مختلف علوم و فنون مثلاً زراعت، ریاضی، طبیعیات، کیمیا وغیرہ میں ترقی اور توسیع اس طرح نہیں ہوتی کہ ہم اپنے دماغ سے منطقی دلائل کا استخراج کریں بلکہ اس کے لیے تجربے، مشاہدے اور علمی تحقیقات کے تمام فنی وسائل اور طریقوں کے استعمال کرنے کی ضرورت ہے - اس صورت حال کا اثر مدرسے کے کام پر بھی ہوا ہے چونکہ اب تمام مفید اور ضروری فنوں کی بنیاد سائنس پر قائم کی گئی ہے اور ان کے استعمال اور ترقی کے لیے سائنس سے واقف ہونا شرط ہے - اس لیے ہمیں بہت سے ایسے پیشے مل سکتے ہیں جن کے ضروری اجزا کو مناسب ترتیب کے ساتھ طلبہ کے سامنے پیش کر کے ہم مدرسوں کے لیے موزوں مشاغل تجویز کر سکتے ہیں اس قسم کے مشاغل ہمارے چاروں طرف موجود ہیں اور وہ عقلی [اور معاشرتی امکانات سے مالا مال ہیں لیکن ہم ایک تنگ درسی نقطۂ نظر کی چاردیواری میں اسی طرح محصور ہوگئے ہیں کہ ہماری نظر ان تک پہنچتی ہی نہیں -

''انسان کے جتنے مشترک اور اہم‌ترین مشاغل ان کا تعلق خوراک'' مکان، لباس اور مکان کے ضروری سامان سے، اشیا کے بنانے ان کا مبادلہ کرنے اور ان کو صرف کرنے کے ذرائع اور وسائل سے ہے - چونکہ یہ تمام چیزیں انسانی زندگی کی ضروریات اور آسائش سے متعلق ہیں اسی لیے وہ انسانی جبلتوں کی گہرائی تک پہنچتی ہیں - اور ان میں جو

طرح قوت پیداوار بڑھ گئی ہے وہاں انسانی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے کام کی قدر و قیمت بہت گھٹ گئی ہے کیونکہ جیسا ہم حصہ اول باب چہارم میں بتا چکے ہیں کارخانوں میں مزدوروں کی حیثیت مشین کے پرزوں کی سی ہو گئی ہے جو بغیر سوچے سمجھے ایک مقررہ معمول کو پورا کرتے رہتے ہیں جس کے لیے انہیں دماغ سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی - اس مشین گردی سے بچنا مشکل اور اس کو برا کہنا فضول ہے کیونکہ وہ تمدنی زندگی کی مادی اور صنعتی ترقی کی ایک ناگزیر منزل ہے - ہمارا کام شکایت کرنا نہیں بلکہ نئے حالات پر قابو پانا اور ان کے ذریعہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنا ہے - معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ تعلیم کے ذریعے ایک ایسی نسل تیار کرے جو ایک طرف صنعت و حرفت کے لیے امکانات سے پورا فائدہ اٹھائے اور دوسری طرف اپنی امتیازی صفات اور انسانی خصوصیات کا تحفظ کرے جو اکثر دوسرے ممالک میں مادی ترقی کے شوق میں قربان کر دی گئی ہیں - مدرسۂ جدید کی یہ کوشش ہے کہ طلبہ میں کام سے محبت اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے اور اس کے ذریعے ان کی اخلاقی اور ذہنی قوتوں کی تربیت کرے - لہذا وہ ایسے مشاغل کا انتخاب کرتا ہے جو ان کو تمدنی زندگی کے کاروبار اور نظم و نسق سے روشناس کریں - اس کی غرض یہ نہیں کہ مدرسے کو صنعت و حرفت کے اغراض یا اقتصادی ضروریات کا تابع بنا دیا جائے اور قبل از وقت پیشے کی تعلیم شروع کر دی جائے بلکہ اس میں معاشرتی احساس اور ذہنی قوتوں کی نشو و نما پر زور دیا جاتا ہے - مدرسے کے مشاغل میں اس بات کا لحاظ رکھا

سنستی ہوگئی ہیں - ہر شخص جسے پڑھنے کا شوق ہے وہ
کتابوں، اخباروں، رسالوں وغیرہ کے ذریعے عمر بھر اپنی کتابی
تعلیم جاری رکھ سکتا ہے - لیکن موجودہ زندگی میں جو
کشمکش اور جد و جہد سے معمور ہے کامیابی کے لیے جس
فعالیت کی ضرورت ہے وہ محض کتابی مطالعے سے حاصل
نہیں ہوسکتی - لہذا مدرسۂ جدید کو یہ ضرورت پیش آئی کہ
وہ محض کتابوں کو اپنا ذریعۂ تعلیم نہ بنائے بلکہ تعلیم میں
ایسے عناصر کو داخل کرے جن کے ذریعے سے ان صلاحیتوں کی
نشو و نما ہو سکے جو صنعت و حرفت، سائنس اور جمہوریت
کے موجودہ دور میں افراد کی کامیابی کے لیے درکار ہیں - اس
خیال کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ لوگ
بالعموم جس قسم کے کام کرتے ہیں ان میں ذہنی اور اخلاقی
تربیت کے وہ امکانات باقی نہیں رہے جو پہلے زمانے میں پائے جاتے
تھے - اس ضمن میں اس تمام بحث کو دہرانے کی ضرورت نہیں
جو تعلیم اور پیشے کے متعلق کی گئی ہے - صرف اتنا یاد دلانا
کافی ہے کہ صنعت و حرفت کے کاموں میں جو انقلابی تبدیلیاں
یورپ اور امریکا میں ہوئی ہیں ان کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا
ہے اور آئندہ چل کر اور زیادہ پڑے گا - بہت سی مشہور سودیشی
دستکاریاں جو زمانۂ قدیم سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے
لیے وسیلہ معاش تھیں اور جن میں انہیں اکثر ذوق جمال
اور جدت طرازی سے کام لینے کا موقع ملتا تھا اب یا تو بالکل
مفقود ہوگئی ہیں یا ان میں کام کرنے والوں کی کھپت کم
ہوگئی ہے، کیونکہ اب ویسی ہی چیزیں بہت آسانی اور کفایت
کے ساتھ مشین کے ذریعے تیار ہوجاتی ہیں - لیکن جہاں اس

اپنی تصانیف میں کی ہے اور ہم اس مسئلے پر ان کی رہنمائی میں بحث کریں گے -

مدرسے کے مشاغل کو تعلیمی لحاظ سے مفید بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ان کا انتخاب اس اصول پر کیا جائے کہ وہ تمدنی زندگی کے بڑے بڑے شعبوں اور پیشوں کی نمائندگی کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے طلبہ جو علم یا ہنر حاصل کریں وہ انہیں اس زندگی کو سمجھنے اور اس میں شرکت کرنے میں مدد دے اور جب وہ مدرسے کی چار دیواری سے نکل کر بیرونی دنیا میں پہنچیں تو ان کی مدرسے کی عادتیں اور معلومات دنیاوی کار و بار اور معاملات میں کام آئیں - سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں، جب انسانی زندگی کا نظام مقابلۃً بہت سادہ تھا، طلبہ ان مفید عادتوں اور عملی صلاحیتوں کو روزمرہ کے کار و بار اور اپنے عزیزوں اور ہمسایوں کی صحبت میں حاصل کرلیتے تھے - طباعت کا فن ابھی ایجاد نہ ہوا تھا اس لیے کتابیں کمیاب تھیں اور کتابی علوم بہت مشکل سے حاصل ہوتے تھے اور ان کی قدر بہت زیادہ تھی کیونکہ لوگوں کے لیے اپنے تنگ تجربات اور خیالات کے تنگ اور محدود دائرے سے باہر نکلنے اور ایک وسیع‌تر ماحول سے آشنا ہونے کا یہی ایک ذریعہ تھا - اس لیے مدرسے بجا طور پر انہیں چیزوں پر زور دیتے تھے جو کتابی اور نظری علوم کے مطالعے سے حاصل ہوتی تھیں - اور طلبہ کی ذہنی اور کسی حد تک اخلاقی تربیت میں مدد دیتی تھیں - لیکن اب یہ صورت حال بالکل تبدیل ہوچکی ہے - اب نتیجہ‌خیز اور پرمعنی تجربے کمیاب اور کتابیں بہت عام اور

ان مشاغل کو مدرسوں میں رائج کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ طلبہ ذہنی تربیت اور تحصیل علم کی طرف سے غافل ہو کر اپنا تمام وقت "دست کاری" سیکھنے میں صرف کریں تاکہ وہ جلد سے جلد روزی کمانے کے قابل ہو جائیں اور تمدنی زندگی کے کاروباری معاملات میں حصہ لے سکیں یا "غیر مفید" مضامین کی طرف سے بےپروائی برتنے لگیں نہ اس تجویز سے ہم صرف یہ چاہتے کہ اس کے ذریعے کسی نہ کسی طرح طلبہ کو مدرسے سے دلچسپی پیدا ہو اور ان کا وقت خوشی اور تفریح کے ساتھ بسر ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مقاصد بجائے خود مفید ہیں اور یہ بڑی ضروری چیز ہے کہ طلبہ میں عملی کارکردگی اور سلیقہ پیدا ہو، وہ آئندہ زندگی کے کاموں کے لیے تیار ہوں اور مدرسے کے مشاغل کو دلچسپی اور خوشی کے ساتھ انجام دیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس اصول کی علت غائی نہیں ہیں۔ ہمارا اصل مقصد اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ یعنی ہم ان مشاغل کے ذریعے طلبہ کو تمدنی زندگی سے روشناس کرنا چاہتے ہیں اس لحاظ سے ان کی تنظیم اس طرح کرنی چاہیے کہ ان میں شریک ہو کر طلبہ کی عقلی اور ذہنی تربیت ہو اور ان کی طبیعت میں تمدنی فرائض کا احساس، تمدنی معاملات کی سمجھ، اور ان میں شرکت کرنے کی قابلیت پیدا ہو۔ یہ تنظیم صرف اس حالت میں ہو سکتی ہے جب چند ضروری نفسی اور تمدنی شرائط پوری کی جائیں۔ وہ شرائط کیا ہیں؟ ان کی سب سے زیادہ مفصل اور مدلل تشریح پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے

باھمی اشتراک عمل کے مواقع ملتے ھیں اور جن کی وجہ سے ان کی تمام معلومات کا تعلق معاشری زندگی سے قائم ھو جاتا ھے - مختصر یہ کہ کھیلوں اور عملی کاموں کو مدرسے میں اس لیے جگہ نہیں دی جاتی کہ بچے ذرا دیر خوش ھو جائیں بلکہ اس لیے کہ وہ عقلی اور تمدنی لحاظ سے ضروری ھیں" [1] -

امریکا کے دو ماھرین تعلیم نے حال ھی میں جرمنی کی تعلیم جدید کی تحریکوں کا بہت غور سے مطالعہ کیا ھے - وہ اس اصول کی تشریح کرتے ھوئے لکھتے ھیں :—

"(تعلیم میں) فعالی اصول اور تجربے کا اصول بالکل ھم‌پایہ اور ھم‌معنی ھے اور نفسیات ترکیبی (Structural Psychology) کا جزو لازم ھے (اس کے مطابق) فرد کو تخلیقی افعال (Creative Activity) کا سرچشمہ سمجھنا چاھیے - انھیں کے ذریعے وہ اپنے تجربات کے مجموعے کو معنی پہناتا ھے اور انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دیتا ھے - اس طرح وہ اپنے نفس کے اندر اپنی دنیا تعمیر کرتا ھے اور جو چیزیں باھر سے حاصل کرتا ھے ان کو اپنے اندر جذب اور منظم کرنے کے لیے اپنی تخلیقی قوتوں سے کام لیتا ھے تاکہ وہ بعد میں ان چیزوں کو جو اس کی روح میں جاگزیں ھیں عمل میں ظاھر کر سکے - تعلیم کا سب سے اھم فرض یہ ھے کہ وہ اس تخلیقی قوت کو اُبھارے اور اس کی تربیت کرے" [2]

۱— Democracy and Education صفحہ ۲۲۹ -

۲— The New Education in the German Republic Alexender and Parker صفحہ ۳۶۰ -

دیتے ھیں اور جن میں ان کی جسمانی اور دماغی قوتیں متحد ھو کر کام کرتی ھیں - اسی وجہ سے مدراس جدید میں بچوں کی تعلیم کی ابتدا ان کی فطری صلاحیتوں اور رجحانات سے ھوتی ھے ۔ ان کو ایسے کھیلوں اور کاموں میں لگانے کی کوشش کی جاتی ھے جن کی جانب وہ مدرسے سے باھر بھی خود بخود غیر ارادی طور پر متوجہ ھوتے ھیں - ان مدارس نے جو تعلیمی مشاھدات اور تجربات شائع کیے ھیں ان سے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ جب طلبہ کے قدرتی رجحانات کو آزادی کے ساتھ اظہار کا موقع ملتا ھے تو وہ رفتہ رفتہ رسمی مضامین اور نصاب کی تحصیل میں بھی زیادہ دل لگا کر محنت کرتے ھیں ان میں ضبط نظم کا قائم رکھنا آسان ھو جاتا ھے اور مدرسہ ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن جاتا ھے بہ قول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے :

''ذھنی زندگی کے مطالعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ھے کہ بچوں کی زندگی میں ڈھونڈنے اور دریافت کرنے' اوزاروں اور آلات کو استعمال کرنے' چیزوں کو بنانے اور خوشی کے جذبات کو ظاھر کرنے کی جبلی خواھشوں کی اھمیت بہت زیادہ ھے- جب ایسے مشاغل' جو ان رجحانات کو کام میں لاتے ھیں' مدرسے کے پروگرام کا جزو بن جائیں تو بچے کی پوری شخصیت ان میں منہمک ھوجاتی ھے اور مدرسے کے اندر اور باھر کی زندگی میں جو مصنوعی فصل پیدا ھو گیا ھے وہ دور ھو جاتا ھے - بچوں کو خود بخود یہ تحریک ھوتی ھے کہ وہ ایسے کاموں اور چیزوں کی طرف توجہ کریں جو تعلیمی لحاظ سے مفید ھیں' جن میں

نفسیات کی جدید تحقیقات بھی ہماری رہنمائی اسی نتیجے کی طرف کرتی ہے - پرانے علم‌النفس میں رسمی طور پر یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ انسانی دماغ بنی بنائی نفسی قوتوں کا مجموعہ ہے جن کی تربیت بعض مخصوص علوم اور درسی مضامین کے ذریعے ہو سکتی ہے اور انہیں کے مطالعے سے یہ قوتیں اس طرح تیز ہو جاتی ہیں جس طرح چاقو پتھر پر رگڑنے سے تیز ہو جاتا ہے - استاد کا محض اتنا کام ہے کہ وہ مشق اور اعادے کے ذریعے ان کی تمام مختلف اور منتشر دماغی قوتوں کو مجتمع اور مستحکم بنائے - برخلاف اس کے نفسیات کا موجودہ نظریہ یہ ہے کہ بچے میں اوائل عمر سے بہت سی مخصوص جبلتیں (Instincts) اور عام فطری رجحانات (General Impulses) ہیں جو ابتدا میں مختلف قسم کی جسمانی حرکتوں اور خواہشوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، اس کے بعد نئے کھیلوں اور تجربوں کی صورت میں، اور رفتہ رفتہ نشو و نما پا کر مربوط اور مرتب ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی شعوری نفسی زندگی پوری طرح منظم ہو جاتی ہے جس طرح انسان کی سیرت اس کو بنی بنائی نہیں ملتی اسی طرح دماغ بھی کوئی مکمل چیز نہیں - بلکہ اس کی اپنی جد و جہد اور تجربات اور اس کے ماحول کے باہمی عمل اور رد عمل سے نشو و نما پاتا ہے - یہ جبلی رجحانات جو طلبہ میں ولولۂ عمل، شوق اور تجسس پیدا کرتے ہیں مجرد اور نظری مضامین کے مطالعے سے تربیت نہیں پاتے بلکہ ان مشاغل اور افعال کے ذریعے جن کو وہ فعالی حیثیت سے اور آزادی کے ساتھ انجام

مدرسہ اور نارمل اسکول جس میں منصوبی طریقہ (Project Method) آزمایا جا رہا ہے - البتہ چند مدرسے ایسے بھی ہیں جن میں ہندوستانی حالات اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایک بہتر تعلیمی ماحول مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - ان میں سب سے زیادہ معروف ٹیگور کا مدرسہ 'شانتی نکیتن' ہے جہاں اس فلسفی شاعر نے بچوں کی مکمل اور ہم‌آہنگ تربیت کے لیے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جس میں انہیں فطرت کے مناظر اور اس کی پر اسرار زندگی سے ہر وقت تعلق رہتا ہے اور محنت' مزدوری باغبانی اور دوسرے عملی کاموں کے مواقع نصیب ہیں :—

"جب میں کبھی کسی ایسی تعلیم‌گاہ کا تصور کرتا ہوں جس میں سب سے پہلا اور اہم سبق انسان اور فطرت کا مکمل اتحاد ہو تو میرے دل میں رابنسن کروسو کے جزیرے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے - یہ اتحاد محض محبت کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے عملی ارتباط اور ذہنی تعاون کی ضرورت ہے"[1]-

ان تمام مدرسوں میں جزوی اور اکثر اہم اختلافات کے باوجود یہ اصول مشترک ہے کہ ابتدائی تعلیم کی بنیاد عمل پر رکھنی چاہیے اور علم کو بچوں کے لیے شعوری مقصد نہیں بنانا چاہیے بلکہ اس کو ان کے مرغوب مشاغل کا نتیجہ ہونا چاہیے -

---

۱—ملاحظہ ہو ٹیگور کے لکچر جو Religion of Man کے نام سے شائع ہوتے ہیں -

سمجھایا ہے - اور جنگ عظیم کے بعد سے اس پر کامیابی کے ساتھ عمل کر کے مغربی تعلیم پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے! - انگلستان میں بھی مدارس جدید کے بانیوں اور کارکنوں نے تعلیم جدید کے اس بنیادی اصول پر عمل کیا ہے - مثلاً سینڈرسن (Sanderson) نے اونڈل (Oundle) کے پبلک اسکول میں' بیڈلے (Badley) نے بیڈیلز (Bedales) کے اسکول میں' مس میکنڈر (Mackinder) نے مارل برو (Marlborough) کے اسکول میں اپنے اپنے ماحول کی مختلف ضروریات کے مطابق کتابی مدرسوں کو عملی مدرسوں میں تبدیل کر دیا ہے - ہندوستان میں ابھی تک اس تحریک کا عام رواج نہیں ہوا کیونکہ یہاں نہ حکومت اور محکمۂ تعلیم نے اس کی سرپرستی کی ہے' نہ ایسے تعلیمی تجربے کرنے والے معلم موجود ہیں جو اپنی ذاتی کوشش اور شغف سے تجربی مدارس قائم کریں - لیکن جہاں کہیں کسی بیدار مغز معلم نے عام راستے سے ہٹ کر بچوں کی تعلیم میں اصلاح کی بنا ڈالی ہے وہاں اسی کا اثر کارفرما ہے - بعض مدارس تو ایسے ہیں جو براہ راست مغرب کے تعلیمی خیالات سے متاثر ہوئے ہیں اور کسی قدر ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ ان پر عمل کر رہے ہیں مثلاً وہ تعلیم گاہیں جن میں طریق ڈالٹن (Dalton) مروج ہے یا موگا کا ابتدائی

---

۱ — جرمنی کی جدید تعلیمی تصانیف میں سے بہت کم کا ترجمہ انگریزی میں شائع ہوا ہے - کرشن اشٹائنر کی دو کتابوں کا انگریزی ترجمہ موجود ہے جن میں سے ایک (Education as Citizenship) ہے اور دوسری (School and the Nation) - دونوں میں تعلیم کے عملی مسائل سے بحث کی گئی ہے -

اس تحریک پر مختلف شکلوں میں عمل کیا ھے اور تعلیم کے طریقے اور نظم و نسق کو اس کے اصولوں پر قائم کیا ھے - تعلیم جدید کا مطالعہ کرنے والے ان میں سے بہت جدت‌آفریں معلموں کے نام سے واقف ھیں مثلاً پارکر (Parker) کلپٹرک (Kilpatrick) مس پارکھرسٹ (Parkhurst) واشبرن (Washburn) اور بیگ لے (Bagley) وغیرہ - پروفیسر اوڈولف فیریر (Adolphe Ferriere) نے جو سوئستان کے جید تعلیمی رھنما ھی اپنی مختلف تصانیف کے ذریعے اس تحریک کی اشاعت کی ھے اور بالخصوص اپنی ایک نہایت اھم تصنیف "L'Ecole Active" (مدرسۂ عمل) کی پہلی دو جلدوں میں اس کی نظری اور عملی تشریح کی ھے اور تیسری جلد میں اس کی عملی تنظیم سے بحث کی ھے اور مدارس عمل کی مثالیں دے کر اس کے اصولوں کو سمجھایا ھے [1]. بلجیم کے مشہور معلم ڈکرولی (Decroly) نے اپنے مدرسے میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ھے [2] - جرمنی میں ڈاکٹر کرشن اسٹائنر (Kerschensteiner) نے جو وھاں تعلیم جدید اور اصلاح مدارس کی تحریک کے بانی اور سرگروہ ھیں اور ان کے شاگردوں نے اس تحریک کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو بہت قابلیت کے ساتھ سمجھا اور

۱—ان کی تمام تصانیف فرانسیسی اور جرمن زبان میں ھیں - البتہ "L'Ecole Active" کی ایک جلد کا انگریزی ترجمہ (Activity of School) کے نام سے شائع ھوا ھے -

۲—اس مدرسے کے حالات کئی کتابوں میں شائع ھوئے ھیں جن میں سے (Mlle. A. Hamaide) کی کتاب جس کا انگریزی ترجمہ (Decroly Class) کے نام سے شائع ھوا ھے خاص طور پر قابل ذکر ھے -

فرائض کے لیے تربیت دی جائےگی - اس تحریک کا آغاز بھی بہت سی دوسری مفید تحریکوں کی طرح روسو (Rousseau) کے انقلاب آفریں خیالات سے ہوا لیکن اس نے اپنی فطرت کے مطابق صرف منفی اور تخریبی پہلو پر زور دیا یعنی مروجہ تعلیم کی خرابیوں کو اپنی بےپناہ تنقید کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کردیا - اس کے بعد فروئبل (Froebal) اور پستالوتسی (Pestalozzi) وغیرہ نے اس تحریک کو عملی جامہ پہنایا اور اس کے متعلق عملی تجاویز پیش کیں - گزشتہ پچاس سال میں مغربی ممالک کے ماہرین تعلیم نے اپنی اپنی ضروریات اور نقطۂ نظر کے مطابق اس تحریک کی تنظیم کی ہے - امریکا میں اس کی رہنمائی اور فلسفیانہ تفسیر کا کام پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے انجام دیا ہے- وہ فطرت اطفال' دماغی ارتقا کے قوانین اور اپنے ملک کے معاشری حالات کا مطالعہ کرکے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب تک مدرسوں میں تعلیم کی بنیاد ان عملی مشاغل پر نہ رکھی جائے گی جو ایک مختصر پیمانے پر مفید تمدنی مشاغل کا نمونہ ہوں' اس وقت تک نہ تعلیم فطرت اطفال کے لحاظ سے موزوں ہوگی نہ تمدنی زندگی کے لیے مفید ثابت ہوگی[1] - امریکا میں بہت سے معلموں نے ولیم جیمز (William James) کی نفسیات اور ڈیوئی (Dewey) کے تعلیمی خیالات سے متاثر ہوکر

[1] ڈیوئی کی تمام تعلیمی تصانیف اسی خیال کی تشریح ہیں بالخصوص ان کی مستند تصنیف Democracy and Education جس میں انہوں نے ہر نقطۂ نظر سے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور تعلیم کا ایک مکمل اور مدلل نظریہ پیش کیا ہے -

باب دوم

"مدرسۂ عمل"

ہم نے گزشتہ باب میں علم اور زندگی کے باھمی تعلق کو واضح کیا ھے اور یہ بتایا ھے کہ مروجہ درسی تنظیم میں یہ تعلق بالکل منقطع ہوگیا ھے جس کی وجہ سے مدرسے کی تعلیم بےجان اور بےاثر ھو کر رہ گئی ھے - اس صورت حال کی اصلاح کے لیے مختلف ملکوں میں بہت سی تعلیمی تحریکیں وجود میں آئی ھیں جن میں بعض جزئیات اور عملی تجاویز کے اعتبار سے اختلاف ھے' لیکن اس اصول پر وہ سب متفق ھیں کہ مدرسوں کی تعلیم کو بالکل مجرد اور نظری بنانے کے بجائے طلبہ کی عملی زندگی کے ساتھ مربوط کرنے کی ضرورت ھے اور اگر ابتدائی جماعتوں کی تعلیم میں منطقی اصول پر مرتب کیے ہوئے اسباق کی جگہ عملی اور فعالی مشاغل پر زور دیا جائے تو مدرسہ بجائے ایک "انفعالی" درسگاہ کے واقعاً ایک "مدرسۂ عمل" بن جائے گا جہاں طلبہ محض کتب‌بینی یا محرری کے کام کے لیے تیار نہیں کئے جائیں‌گے بلکہ انہیں تمدنی زندگی کی گوناگوں ضروریات اور

محسوس کرنے لگیں - لیکن اس کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ
معلم خود اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ علوم تمدنی
زندگی کی ضروریات کی بدولت پیدا ہوئے ہیں اور ان کا
منشاے حقیقی یہی ہے کہ وہ اس زندگی کی طرف رجوع کرکے
اس کو بہتر اور زیادہ معنی‌خیز بنائیں اور وہ طلبہ کی زندگی
میں بھی ان علوم کو انہیں اصولوں کے مطابق جگہ دے جس
کے ماتحت وہ تمدنی زندگی میں وجود میں آئے ہیں -

کرنا چاہیے کیونکہ وہ جب تک بالکل بےغرضی کے ساتھ علم کی خدمت نہ کریں اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل نہیں کر سکتے - مگر یہ ضروری نہیں کہ اس علمی تحقیقات کو دوسرے لوگ عملی مصرف میں نہ لا سکیں- بلکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ محقق اپنی جگہ پر نظری انکشافات کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس کو صنعتی کاموں میں استعمال کرتے ہیں- جہاں تک مدرسے کے طلبہ کا تعلق ہے معلم کو ان کی تعلیم کی ابتدا اس طرح کرنی چاہیے کہ ان کے درسی مشاغل ان کی موجودہ زندگی اور شوقوں میں گھل مل جائیں اور اس کے بعد ان کے شوقوں کی نشو و نما اس طرح ہو کہ وہ ان علوم میں بذفسہ دلچسپی لینے لگیں اور ان میں بعید مقاصد کی خاطر محنت اور کوشش کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے - ایک اوسط قابلیت کے طالب علم کے لیے شائد کبھی ایسا زمانہ نہ آئے کہ اسے بالکل مجرد اور نظری علوم سے دلچسپی اور انہماک پیدا ہو جائے لیکن پھر بھی عقل‌مند استاد جو فطرت اطفال سے واقف ہو' اتنا ضرور کر سکتا ہے کہ طلبہ میں درسی مضامین سے تھوڑا بہت شغف پیدا کر دے - اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ وہ ہر منزل پر انہیں یہ محسوس کرادے کہ ان کے لیے ان مضامین کی تحصیل اس وسیع‌تر معنی میں ''مفید'' ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے - یعنی وہ ان کے دل و دماغ اور شخصیت کی اس طرح تربیت کرے کہ ان کی معلومات زیادہ وسیع اور واضح' ان کا مذاق زیادہ شائستہ اور ان کی قوت عمل زیادہ موثر اور مستحکم ہو جائے اور وہ علم و زندگی کے باہمی تعلق کو

کی تکمیل میں استعمال کیسے جا سکیں - جب طالب علم کی ذہنی عمر زیادہ ہو جاتی ہے، اس کا تجربہ بڑھ جاتا ہے اور ایک حد تک اس کے شوقوں کی نشو و نما ہو چکتی ہے تو اسے بعض علوم سے بلفسہ دلچسپی ہو جاتی ہے - مثلاً وہ ریاضی کو اس لیے نہیں سیکھتا کہ گھر کا حساب و کتاب لکھ سکے، یا مدرسے کی دکان چلا سکے، یا آگے چل کر کسی محکمے میں ملازم ہو جائے بلکہ اسے ان ذہنی قوانین اور اعمال سے ذوق پیدا ہو جاتا ہے جن پر علم ریاضی مشتمل ہے - اسی طرح تاریخ میں وہ براہ راست تاریخی تحریکوں اور ان کے ارتقاء کے مطالعے میں منہمک ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے بصیرت اور عبرت حاصل کرتا ہے - ادب کی مطالعے کی بدولت اسے خیالات و جذبات اور جمالی احساسات کی ایک نئی دنیا نظر آنے لگتی ہے جو اس کو کوئی مادی "نفع" نہیں پہنچاتی لیکن اس کے تجربے میں وسعت اور گہرائی اور اس کی قوت احساس میں نزاکت اور لطافت پیدا کرتی ہے اور وہ اپنے خیال میں ان سب چیزوں سے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ "فائدہ" حاصل کرتا ہے جتنا دوسرے آدمی کسی خاص ہنر کو سیکھ کر روپیہ کمانے سے - سائنس کے ایک عالم کے متعلق، جس نے علم طبیعیات میں کوئی نیا اور اہم انکشاف کیا تھا یہ قصہ مشہور ہے کہ اس سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کی اس نئی تحقیق کا کوئی عملی فائدہ بھی ہے یا نہیں - اس نے فوراً جواب دیا "خدا کا شکر ہے کہ اس سے کسی طرح کے فائدہ کا امکان ہی نہیں" - یہ علمی محققوں کا مخصوص نقطۂ نظر ہے جس کا ہمیں احترام

کا ہے جو بالطبع "مصرف پسند" (pragmatist) اور "افادیت پسند" ہوتے ہیں - وہ ہر چیز کے متعلق یہ سوال کرتے ہیں : اس سے میری ذات کو یا دوسروں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے ؟ اس کا مصرف کیا ہے ؟ چھوٹے بچے تو ہمیشہ صاف صاف اس قسم کی باتیں پوچھتے ہی رہتے ہیں - یہاں تک کہ شروع میں ان کے ذہن میں ہر چیز کا تصور اس شکل میں قائم ہوتا ہے کہ اس سے کیا کام نکل سکتا ہے - کرسی ان کے لیے کسی خاص مستقل شے کا نام نہیں وہ "بیٹھنے کے لیے" ایک چیز ہے - کلک یا قلم سرکنڈے کا ٹکڑا نہیں جو ایک طرف سے ترشا ہوا ہو بلکہ "لکھنے کے لیے" ایک آلہ ہے - جب وہ سن شعور کو پہنچتے ہیں تو چاہے صاف طور پر اس قسم کے سوال نہ کریں کہ فلاں چیز یا فلاں مضمون ہمارے کس کام کا ہے لیکن ہر چیز کی طرف ان کا ذہنی رویہ یہی رہتا ہے - اس لیے عام مشاہدے اور نفسیات دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ابتدا میں طلبہ کے سامنے تمام مضامین اس طرح پیش کیے جائیں کہ وہ ان کا "فائدہ" محسوس کریں اور جو کچھ معلومات حاصل کریں وہ ان کی اپنی زندگی سے بعید اور بے ربط نہ ہوں بلکہ ان کی دلچسپیوں اور مشاغل کے تار و پود میں گتھ جائیں - علم اور زندگی کا صحیح باہمی تعلق صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے -

ہم نے جو نقطۂ نظر اوپر پیش کیا ہے اس سے ہماری مراد یہ نہیں کہ تعلیم سے سب مدارج میں تمام علوم کو اس طرح پڑھانا ممکن یا مناسب ہے کہ وہ کسی عملی مشغلے کا نتیجہ ہوں اور فوراً کسی دوسرے شغل میں یا اسی شغل

ہے - اُس میں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس قسم کے کاموں میں ان کو اپنے دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ مل جل کر چیزیں بنانے' معاملات پر غور کرنے اور منصوبوں کو عمل میں لانے کے موقع حاصل ہوتے ہیں جس سے ان کی معاشری تربیت عمل میں آتی ہے - ان تمام مشاغل کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے لیے انہیں مختلف قسم کی معلومات درکار ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے وہ بڑے شوق سے اپنے اُستادوں اور دوستوں یا کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جس طرح ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ضرورت کے وقت اخباروں ' کتابوں اور دوسرے لوگوں سے مشورہ لیتے ہیں - اس صورت میں طلبہ کا ریاضی سیکھنا ' یا کسی ملک کا جغرافیہ پڑھنا یا دوکان کا کار و بار چلانے کے لیے تجارتی معلومات حاصل کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی روپے کا لین دین کرنے والا یا تھوک فروش اپنی کار و باری ضرورت سے اخبار میں بازار کے نرخ کا مطالعہ کرتا ہے - اس پر کوئی شخص جبر نہیں کرتا کہ وہ ان خشک اعداد میں سر کھپائے لیکن چونکہ اسے اپنی دوکان کی کامیابی کی فکر ہے اس لیے اس کے نقطۂ نظر سے وہ اعداد و شمار غیر دلچسپ نہیں ہوتے بلکہ نہایت معنی خیز ہوتے ہیں اور وہ گھنٹوں ان کے مطالعے میں دماغ سوزی کر سکتا ہے - یہ مثال ان تمام علوم اور معلومات پر صادق آتی ہے جو لوگ عام طور پر اپنی خوشی سے حاصل کرتے ہیں - یہ چیزیں واقعی اور حقیقی طور پر ان کی ملکیت ہو جاتی ہیں اور چونکہ اکثر اور براہ راست استعمال میں آتی رہتی ہیں اس لیے ان کا اثر ان کی زندگی اور سیرت پر بھی پڑتا ہے - یہی حال نوعمر بچوں اور نوجوانوں

اور انھیں نصاب بالکل غیر دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ مدرسۂ جدید کی کوشش یہ ہے کہ وہ بچوں کو ابتدا سے ایسے مشاغل میں لگائے جن کو انجام دینے میں خود بخود اور قدرتی طور پر ان مضامین کو پڑھنے اور سیکھنے کی ضرورت محسوس ہو یعنی وہ اس کے ذاتی تجربات کو وسیع‌تر اور با معنی بنانے میں مفید ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ منصوبی طریقے (Project Method) میں مدرسے کے کام کی بنیاد ہمارے مروجہ مدارس کی طرح ''سبقوں'' پر نہیں رکھی گئی۔ ان سبقوں کے بجائے طلبہ مختلف قسم کے باقاعدہ مرتب کیے ہوئے اور خود ان کے پسند کیے ہوئے کاموں (Occupations) پر لگائے جاتے ہیں۔ ان مشاغل کے دوران میں انھیں اپنے علم اور واقفیت کو بڑھانے اور ہاتھ سے کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور منصوبے بنانے اور ان کو پورا کرنے کے وسائل سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے - مثلاً مدرسے میں دوکان چلانا، پوسٹ آفس قائم کرنا، مکان بنانا، باغبانی کرنا۔ بچوں کو ایسے کاموں سے فطرتاً دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ یہ ان کی بعض اہم جبلتوں سے تعلق رکھتے ہیں - اور بالخصوص دو نمایاں نفسی رجحانات، یعنی جبلت تعمیر اور جبلت تعاون کو اظہار کا موقع دیتے ہیں - ان کاموں میں ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنے حواس، اپنے ہاتھ پاؤں اور دماغ کو ایک مسلسل کام کی تکمیل میں لگاتے ہیں مثلاً کسی تجویز کو عملی جامہ پہناتے ہیں یا خارجی اشیا اور ذرائع کو مرتب کرکے کوئی مفید اور نئی چیز تیار کرتے ہیں جس سے ان میں مسرت اور کامیابی کا احساس پیدا ہوتا ہے جو شخصیت کی تربیت میں بےحد مدد دیتا

اپنی بنائی ہوئی کہانیوں کو اپنے ساتھیوں کو سنائے گا اور اس کی بدولت اس کی قوت بیان کی تربیت ہوگی - رفتہ رفتہ اس میں یہ خواہش بھی پیدا ہوگی کہ وہ خود ان کہانیوں کو کتابوں میں پڑھ سکے تاکہ نئی نئی کہانیا سننے کے لیے وہ استاد کا محتاج نہ رہے اور اس کا کہانیوں کا ذخیرہ بہت وسیع ہو جائے - لیکن وہ اس خواہش کو اس وقت تک پورا نہیں کر سکتا جب تک پڑھنا نہ سیکھے - اگر اس کی طلب صادق ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بخود پڑھنے کی طرف مائل ہوگا - اس کو زبردستی حروف تہجی اور ان کی ترکیبوں کی دشوارگزار منزلوں میں سے گھسیٹنا نہیں پڑے گا بلکہ وہ اپنی خوشی سے اور محنت کر کے مشکلات پر قابو پائے گا - کیونکہ ان کو سیکھ لینے سے اسے اپنے ایک ذاتی مقصد کے حصول میں مدد ملے گی - وہ قاعدے کو اور انمل بےجوڑ جملوں کی کتابوں کو اس خیال سے نہیں پڑھے گا کہ اسے پڑھنے کا فن سیکھنا ہے بلکہ اس مقصد سے کہ اس قابلیت کو حاصل کرتے ہی وہ فوراً ان قصوں کو پڑھ سکے گا جن کی خاطر اس نے یہ تمام محنت اُٹھائی ہے - اس کو معلوم ہوگا کہ میرے مطالعے کا کیا مقصد اور کیا فائدہ ہے اور وہ قدرتاً یہ محسوس کرے گا کہ میں مدرسے میں جو کچھ سیکھ رہا ہوں وہ کسی نامعلوم مصلحت یا مستقبل بعید کی خاطر نہیں، بلکہ خود اپنی موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہے - یہی حال نصاب کے اور تمام مضامین کا ہے ان کے مطالعے کو چھوٹے بچوں کے لیے ایک مستقل مقصد بنا دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بد شوق اور بےتوجہ ہو جاتے ہیں

مدرسوں میں عام طور پر اس قدرتی اور معقول طریقے کے بجائے دور از کار اور خلاف فطرت طریقے استعمال کیے جاتے ہیں - بچے کی توجہ ہمیشہ براہ راست ان چیزوں کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے جو انہیں سیکھنی ہیں خواہ وہ بالکل نہ سمجھیں کہ ان کی زندگی اور مشاغل سے ان کا کیا تعلق ہے - نصاب کے مضامین اور معلومات کے ذریعے ان کے ذوق عمل کی تسکین نہیں کی جاتی کہ ان میں مفید عادتیں پیدا ہوں' ان کی قوت اور بصیرت میں اضافہ ہو اور وہ اپنی دماغی ترقی اور نشو و نما کے احساس سے خوشی حاصل کریں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی معلومات بالکل سطحی اور سرسری رہ جاتی ہیں اور ان کے افعال و اخلاق پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا -

مدرسۂ جدید کی جو خصوصیت ہم نے اوپر بیان کی ہے اس کی تشریح چند مثالوں سے ہو جائے گی - بچوں کو فطرتاً کہانیاں سننے کا شوق ہوتا ہے اور ہر گھر میں ماں یا بہن چھوٹے بچوں کو کہانیاں سناتی ہیں - جب بچہ کسی ایسے مدرسے میں داخل ہوتا ہے جو معقول تعلیمی اصولوں پر چلایا جا رہا ہے تو معلم اس شوق کو تعلیم کا محور بنا کر اسے طرح طرح کی دلچسپ کہانیاں سناتا ہے جو اس کی معلومات اور رجحانات میں غیر محسوس طور پر وسعت پیدا کرتی ہیں - پھر ممکن ہے وہ بجائے زبانی کہانیاں سنانے کے کسی کتاب میں سے کہانیاں پڑھ کر سنائے - اگر کہانیوں کا انتخاب صحیح اور موزوں ہے تو بچے کو یقیناً اس سے دلچسپی پیدا ہوگی' اور وہ خود انہیں کہانیوں کو یا

یا یہ قصد کر کے نہیں چلتا کہ مجھے چلنا پھرنا آ جائے بلکہ اسے خود بخود دوسرے لوگوں کے ساتھ میل جول کرنے ان سے تعلقات قائم کرنے کی خواہش ہوتی ہے - وہ اس فطری خواهش کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں پہلے اپنے توتلے پھوٹے الفاظ کے ذریعے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے - اس کے بعد آهستہ آهستہ پیہم کوشش اور مشق کے دوران میں اسے بےتکلف بات چیت کرنی آ جاتی ہے - اس طرح اسے خواهش ہوتی ہے کہ بڑھ کر کھلونے کو یا کسی اور چیز کو هاتھ میں لے' یا اپنے کسی عزیز کے پاس جائے' یا ایسی ضرورت آ پڑتی ہے کہ اپنی جگہہ سے هٹ کر کسی بہتر اور زیادہ محفوظ جگہہ پہنچ جائے - اس خواهش یا نفسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ حرکت شروع کرتا ہے - پہلے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہے اس کے بعد جب مشق بڑھ جاتی ہے تو کسی قدر تیزی اور روانی پیدا ہو جاتی ہے - یہاں تک کہ چلنا پھرنا اس کا روزمرہ کا معمول ہو جاتا ہے' جس سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق کام لیتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لیے سیر و سیاحت کرنا خود ایک دلچسپ اور پر لطف مشغلہ بن جاتا ہے - ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ ہم بچوں کی نفسی کیفیات اور اعمال کا مطالعہ کریں یا بڑوں کی حرکات کو دیکھیں دونوں صورتوں میں یہ نظر آتا ہے کہ انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ کسی عمل یا مشغلے کے دوران میں بطور اس کے ضمنی نتیجے کے سیکھتا ہے وہ کسی خاص هنر کی تحصیل کو اپنا مقصد نہیں بناتا - برخلاف اس کے همارے

کی خاطر" حاصل کرتے ھیں اپنے ذوق تجسس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس منزل تک پہنچتے ھیں جہاں وہ علم کو مقصود بالذات بنا سکیں اور ان کے لیے کسی علم کے میدان میں جدید تحقیقات کرنا واقعاً ایسا ھی "مفید" اور تشفی بخش ھوتا ھے جس طرح مثلاً کسی موچی کے لیے چمڑا رنگنے کا ایک نیا اور بہتر طریقہ معلوم کرنا - ان کے لیے "افادے" کا مفہوم عام لوگوں سے مختلف ھو جاتا ھے - جب سوائے بڑے بڑے عالموں کے کسی شخص کے لیے بھی یہ بات آسان نہیں کہ تحصیل علم کو اپنا مقصود زندگی بنا سکے تو یہ کیسے ھو سکتا ھے کہ بچے جن کی توجہ بہت منتشر اور نظر بہت محدود ھوتی ھے سالہا سال محض تحصیل علم کو اپنا منتہائے نظر بنا کر مدرسے کے پہلے چند سال میں جب خاص طور پر اس کی ضرورت ھوتی ھے کہ بچوں کے درسی مشاغل ان کے لیے دلچسپ بنائے جائیں اور وہ اس قابل بھی نہیں ھوتے کہ حصول معاش کی آرزو ان کی محرک عمل بن سکے' ان کے سامنے بالعموم کوئی ایسا مقصد پیش نہیں کیا جاتا جس کو وہ سمجھ سکیں عام طور پر لوگ نئی چیزیں اور نئے ھنر اس طرح سیکھتے ھیں کہ وہ کسی کام میں مشغول ھوتے ھیں جو بذفسہ ان کو مرغوب ھے اور اس کی ضمن میں یا اس کے نتیجے کے طور پر کوئی نئی بات معلوم ھو جاتی ھے - اس اصول کو واضح کرنے کے لیے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) ایک چھوٹے بچے کی مثال دیتے ھیں کہ وہ چلنا یا بولنا کس طرح سیکھتا ھے - بچہ شعوری طور پر یہ ارادہ کر کے بات چیت نہیں کرتا کہ میں گفتگو کا فن سیکھ لوں

انسان بھی اس سے منکر نہیں ہوگا۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ یہ سب مضامین ان کی نموپذیر زندگی اور تجسس پسند طبیعت میں خود بخود جذب ہونے کے بجائے ان پر استادوں کی یا محکمۂ تعلیم کی طرف سے ایک مقررہ نصاب کی شکل میں شائد کر دیے جاتے ہیں - طلبہ کے لیے ان کا مطالعہ لازمی ہوتا ہے - اس صورت میں ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان علوم کو حاصل کرنے سے ان کی عملی یا ذہنی زندگی پر کوئی اثر پڑے گا یا وہ ان کی تحصیل میں اپنی خوشی اور شوق سے محنت کریں گے - موجودہ اصول تعلیم اس بارے میں یہ ہے کہ علم صرف اس صورت میں مفید اور پائدار ہو سکتا ہے جب اس کی ضرورت قدرتی طور پر زندگی کے مشاغل اور کار و بار کے دوران میں پیدا ہو اور طالب علم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسے حاصل کرے - ہماری روزمرہ کی تمدنی زندگی میں یہی اصول کارفرما ہے اور لوگ جو کچھ سیکھتے ہیں وہ انہیں حالات اور شرائط کے ماتحت سیکھتے ہیں - ہم کسی راہ چلتے شخص کو خواہ مخواہ جبر و مقابلہ یا سائنس کے مطالعے پر آمادہ نہیں کر سکتے - برخلاف اس کے اگر اس کے مشاغل زندگی ایسے ہیں کہ اسے اپنے فرائض کی ادائگی کے لیے جبر و مقابلہ یا سائنس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ خوشی کے ساتھ انہیں حاصل کرے گا - اور چاہے جتنی محنت کرنا پڑے اس سے جی نہیں چرائے گا - لیکن بغیر ان علوم کی ضرورت محسوس کیے، بغیر اپنی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق پہچانے وہ ہرگز ان کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنائے گا - وہ لوگ بھی جو دراصل "علم کو علم

سے باهر نه هو تو ان کی طبیعت میں مطالعے کا شوق اور علم و هنر حاصل کرنے کی خواهش خود بخود پیدا هوگی - مدرسے کے اندر باهر کے حالات ایسے هوں که ان میں بچے اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اُٹھا سکیں تو مستقبل کے لیے اهتمام اور فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں - معلم کا فرض یہ هے که وہ اُن کے موجودہ مشاغل اور تجربات کو جس قدر پر معنی اور سبق آموز بنا سکے بنائے' یعنی ان کا سلسله تمدنی حالات مواقع اور محرکات عمل سے ملا دے - اور ان کی تربیت اور تنظیم اس طرح کرے که وہ نه صرف بچوں کی موجودہ خواهشوں اور ضرورتوں کو پورا کرسکیں بلکه آگے چل کر اپنی مکمل شکل میں افراد اور سوسائٹی کے دونوں کے لیے ثابت هوں -

مدرسے کا یه جدید تصور علم حاصل کرنے کے طریقے پر بھی روشنی ڈالتا هے علم اور زندگی میں جو فصل پیدا هو گیا هے اس کی وجه سے مدرسوں میں تحصیل علم مقصود بالذات بنالی گئی هے اور اس کے لیے بعض اصطلاحی طریقے تجویز کیے گئے هیں - وهاں بچوں کا کام هے پڑھنا' لکھنا تاریخ جغرافیه' ریاضی وغیرہ درسی مضامین کا مطالعه کرنا - انهیں اس سے کچھ غرض نہیں که اس تمام محنت اور کاوش کا جو ان مضامین کے یاد کرنے میں اٹھانی پڑتی هے ان کی موجودہ یا آئندہ زندگی سے کیا تعلق هے - حروف تہجی کا پہچاننا بھی ان پر اسی طرح فرض هے جیسے مثلاً پانی پت کی لڑائیوں کی تاریخ یاد رکھنا یا امریکا کے دریاؤں کے نام جاننا - همیں ان مضامین کی اهمیت سے انکار نہیں بلکه کوئی سنجھدار

اپنی پوری جسمانی اور ذہنی قوت کام میں نہیں لگے رہتے وہ
پڑھنے لکھنے کا کام بیدلی سے بغیر مقصد کو سمجھے ہوئے کریں گے
اور اُن کی ذہنی حالت میں انتشار رہے گا - معلم کو مجبور
ہوکر اُن تحریصوں اور ترغیبوں سے کام لینا پڑے گا جو مضرت سے
سے خالی نہیں - کبھی وہ انہیں سزا کی دھمکی دے گا' کبھی
امتحان میں ناکامی کی بھیانک تصویر دکھائے گا' کبھی
والدین اور دوستوں کی ناراضگی اور شرمندگی اور آگے چل کر
خود اُن کی پشیمانی اور افسوس کا خیال دلائے گا' یہ نہیں تو
طرح طرح کے لالچ سے انہیں پھسلائے گا - نمبروں کا اور درجے کا
خبط جو ہمارے نظام تعلیم پر اس درجہ حاوی ہے' انعامی
کی تقسیم اور اس کی حد سے زیادہ اہمیت طلبہ کی باہمی
مسابقت اور اس قسم کی تمام چیزیں جو ہمارے مدرسوں کے
نظام کا جزو ہوگئی ہیں سب کی ضرورت اسی وجہ سے پڑتی ہے
کہ طلبہ کو اپنے مقررہ کام سے کوئی واقعی نفسی تعلق نہیں
ہوتا کیونکہ اس کی بنیاد اُن کے شوق اور جبلت' اُن کی
خواہش عمل اور اُن کے ذوق تجسس پر نہیں رکھی گئی -
اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں کام کو کام کی خاطر کرنے
کی خواہش اور اس سے خوشی حاصل کرنے کا مادہ پیدا نہیں
ہوتا - اُن کی خواہش عمل مردہ ہو جاتی ہے اور وہ تمام عمر
اس کا خمیازہ بھگتے ہیں - غرض کام کو کسی خارجی مقصد
کی خاطر جبراً طلبہ پر عائد کرنا تعلیمی اور نفسی اعتبار
سے سراسر قابل اعتراض ہے - اگر طلبہ کا ماحول سازگار ہو' جو
کام اُن کے لیے تجویز کیا گیا ہے وہ اُن کے رجحانات سے
مناسبت رکھتا ہو اور مقصد کا اُن کی سمجھ اور استعداد

تخیل کی وجہ سے مستقبل کا زیادہ واضح تصور کرسکتے ہیں،
بالعموم بعید مقاصد اور اغراض کی خاطر کام کرنے کو تیار نہیں
ہوتے - پھر بچوں سے یہ کیسے توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے فوری
اور موجودہ شوق اور دلچسپیوں سے منہ موڑ کر دور و دراز مقاصد
اور امیدوں کی خاطر، ایسے کاموں میں اپنا دل لگائیں جو ان
کو بذات خود اچھے نہیں معلوم ہوتے "اچھے" سے ہماری مراد
یہ نہیں، کہ وہ بالغوں کے نقطۂ نظر سے اخلاقی خوبی رکھتے
ہوں- بچوں کے لیے ہر وہ کام "اچھا" ہے جس میں انہیں اپنی
بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے اور اس سے انہیں
خوشی اور احساس قوت حاصل ہو - تعلیم کا یہ کام ضرور ہے،
جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، کہ وہ بچوں کو زندگی کے لیے
تیار کرے لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ہمیشہ کسی آنے والے
زمانے کی یاد سے بچوں کو بہلاتی رہے - اس کی بہترین تدبیر
یہ ہے کہ بچپن اور نوجوانی کے زمانے میں ان کے لیے ایسے مواقع
بہم پہنچائے جائیں کہ وہ اپنی فطرت اور جبلی خواہشات کے
مطابق زندگی بسر کرسکیں اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے
لیے مفید عادتیں اور علم و ہنر سیکھیں - معلم کو چاہیے کہ
ہمیشہ بچوں کی زندگی اور موجودہ رجحانات کو نقطۂ آغاز
بنائے کیونکہ فطرتاً ان کی دلچسپی کا مرکز زمانۂ حال ہوتا
ہے - ان کی نظر میں مستقبل کی کوئی فوری اور شدید
اہمیت نہیں ہوتی - اگر ان کے مطالعے اور مشاغل کے لیے
ایسی چیزوں کو عمل کا محرک بنایا جائے جو ان کی نفسی
کیفیت اور خصوصیات کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کی موجودہ
زندگی کو دلچسپ اور معنی خیز بناتی ہیں تو وہ مدرسے میں

بہت سے مدارس اس زمانے میں انگلستان، جرمنی، سوئٹزر لینڈ وغیرہ میں کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں) تو ہمیں اس کی ظاہری حیثیت ساز و سامان اور عمارتوں ہی سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ قدیم نظام تعلیم بالکل بدل گیا ہے - جہاں پہلے سوائے چند دریوں، یا بنچوں، میزوں کرسیوں کتابوں اور نقشوں کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی وہاں اب حسب استطاعت سائنس اور دستکاریوں کے لیے بڑے بڑے معمل، مشینیں، جانوروں اور پودوں کے نمونے، باغات، تیراکی کے لیے حوض، ورزش کے لیے جملازیم، عمدہ عمدہ تصویریں، طلبہ کے آرام کرنے کے لیے کمرے، جلسہ گاہیں، بڑے بڑے کتب خانے جہاں علاوہ درسی کتابوں کے مستند تصانیف، حوالے کی کتابیں فرصت میں پڑھنے کے دلچسپ قصے وغیرہ، غرض وہ تمام چیزیں ملیں گی جو مدرسوں سے باہر متمدن ممالک کے باشندوں کو نصیب ہیں یا ہونی چاہییں - اس تکلیف اور اہتمام کا مقصد نمود نہیں بلکہ یہ ہے کہ طلبہ مدرسے کی زندگی کے دوران میں اپنا وقت اس طرح صرف کریں کہ ان کی زندگی تجربات سے مالا مال ہو، جو ان کے لیے خوشی کا سرمایہ ہوں، ان کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو نشو و نما دیں اور ان کو آگے چل کر تمدنی زندگی میں شرکت کرنے کے قابل بنائیں -
ہم ایک گزشتہ باب میں اس امر کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کہ بچوں سے کسی مستقبل بعید کی خاطر کام کرنے کی توقع رکھنا سراسر نادانی ہے - نفسیات کی تعلیم اور روزمرہ کا تجربہ دونوں اس کی تردید کرتے ہیں - بالغ، تجربہ کار لوگ بھی جو اپنے برے بھلے کو سمجھ سکتے ہیں اور اپنے پختہ تجربے اور

مقصد اول یہ ہے کہ طلبہ اس میں عمدہ اور خوشگوار زندگی بسر کریں اور ثانوی مقصد یہ ہے کہ اس زندگی کے دوران میں بعض مفید علوم اور ہنر حاصل کریں مدرسے میں بچہ محض پڑھنے لکھنے کے لیے نہیں آتا بلکہ اپنا وقت ایسے خوشگوار، مفید اور محنت طلب مشاغل میں صرف کرنے کی غرض سے جو اس کے شوقوں کو ابھاریں اور ان کی ابتدائی غیر منظم شکل کو بدل کر ان میں تربیت اور تنظیم پیدا کریں۔ یہ خیال ایک تعلیمی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ اس کو تسلیم کرنے سے مدرسے کے مروجہ طریقۂ تعلیم اور نصاب اور ضبط و نظم میں بہت کافی ترمیم لازم آتی ہے۔ عام طور پر مدرسوں اور تعلیمی افسروں نے مدرسوں کی تنظیم ایک محدود علمی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کی ہے تاکہ طلبہ لکھنا پڑھنا اور چند ضروری مضامین سیکھ لیں۔ لیکن اگر ہم مدرسے کو زندگی کے تجربات کا مدرسہ بنانا چاہتے ہیں تو اس میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں بچے آزادی کے ساتھ مختلف قسم کے کام کریں آپس میں ملیں جلیں، ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے واقفیت حاصل کریں اپنے لیے وہ مشاغل انتخاب کریں جو ان کی طبیعت کے رجحان کے موافق ہوں اور انہیں تنہا یا دوسروں کی مدد سے تکمیل کو پہنچائیں اس میں ایسے محرکات موجود ہونے چاہییں جو خود بخود رفتہ رفتہ طلبہ کو مختلف قسم کے علمی اور عملی مقاصد کی طرف کھینچیں اور وہ وسائل اور ذرائع بھی جو ان مقاصد کو انجام تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوں۔ اگر ہم یورپ یا امریکا کے کسی "مدرسۂ جدید" کا معائنہ کریں، (اس قسم کے

بہت سے مدارس اس زمانے میں انگلستان، جرمنی، سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں) تو ہمیں اس کی ظاہری حیثیت ساز و سامان اور عمارتوں ہی سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ قدیم نظام تعلیم بالکل بدل گیا ہے - جہاں پہلے سوائے چند دریوں، یا بنچوں، میزوں کرسیوں کتابوں اور نقشوں کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی وہاں اب حسب استطاعت سائنس اور دستکاریوں کے لیے بڑے بڑے معمل، مشینیں، جانوروں اور پودوں کے نمونے، باغات، تیراکی کے لیے حوض، ورزش کے لیے جمنازیم، عمدہ عمدہ تصویریں، طلبہ کے آرام کرنے کے لیے کمرے، جلسہ گاہیں، بڑے بڑے کتب خانے جہاں علاوہ درسی کتابوں کے مستند تصانیف، حوالے کی کتابیں فرصت میں پڑھنے کے دلچسپ قصے وغیرہ، غرض وہ تمام چیزیں ملیں گی جو مدرسوں سے باہر متمدن ممالک کے باشندوں کو نصیب ہیں یا ہونی چاہییں - اس تکلیف اور اہتمام کا مقصد نمود نہیں بلکہ یہ ہے کہ طلبہ مدرسے کی زندگی کے دوران میں اپنا وقت اس طرح صرف کریں کہ ان کی زندگی تجربات سے مالا مال ہو، جو ان کے لیے خوشی کا سرمایہ ہوں، ان کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو نشو و نما دیں اور ان کو آگے چل کر تمدنی زندگی میں شرکت کرنے کے قابل بنائیں -
ہم ایک گزشتہ باب میں اس امر کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کہ بچوں سے کسی مستقبل بعید کی خاطر کام کرنے کی توقع رکھنا سراسر نادانی ہے - نفسیات کی تعلیم اور روزمرہ کا تجربہ دونوں اس کی تردید کرتے ہیں - بالغ، تجربہ‌کار لوگ بھی جو اپنے برے بھلے کو سمجھ سکتے ہیں اور اپنے پختہ تجربے اور

مقصد اول یہ ہے کہ طلبہ اس میں عمدہ اور خوشگوار زندگی بسر کریں اور ثانوی مقصد یہ ہے کہ اس زندگی کے دوران میں بعض مفید علوم اور ہنر حاصل کریں مدرسے میں بچہ محض پڑھنے لکھنے کے لیے نہیں آتا بلکہ اپنا وقت ایسے خوشگوار، مفید اور محنت طلب مشاغل میں صرف کرنے کی غرض سے جو اس کے شوقوں کو ابھاریں اور ان کی ابتدائی غیر منظم شکل کو بدل کر ان میں تربیت اور تنظیم پیدا کریں - یہ خیال ایک تعلیمی انقلاب کا پیش خیمہ ہے - اس کو تسلیم کرنے سے مدرسے کے مروجہ طریقۂ تعلیم اور نصاب اور ضبط و نظم میں بہت کافی ترمیم لازم آتی ہے - عام طور پر مدرسوں اور تعلیمی افسروں نے مدرسوں کی تنظیم ایک محدود علمی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کی ہے تاکہ طلبہ لکھنا پڑھنا اور چند ضروری مضامین سیکھ لیں - لیکن اگر ہم مدرسے کو زندگی کے تجربات کا مدرسہ بنانا چاہتے ہیں تو اس میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں بچے آزادی کے ساتھ مختلف قسم کے کام کریں آپس میں ملیں جلیں، ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے واقفیت حاصل کریں اپنے لیے وہ مشاغل انتخاب کریں جو ان کی طبیعت کے رجحان کے موافق ہوں اور انہیں تنہا یا دوسروں کی مدد سے تکمیل کو پہنچائیں اس میں ایسے محرکات موجود ہونے چاہییں جو خود بخود رفتہ رفتہ طلبہ کو مختلف قسم کے علمی اور عملی مقاصد کی طرف کھینچیں اور وہ وسائل اور ذرائع بھی جو ان مقاصد کو انجام تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوں - اگر ہم یورپ یا امریکا کے کسی مدرسۂ جدید" کا معائنہ کریں، (اس قسم کے

درس گاہ بنتا جاتا ہے یہ مسئلہ زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے کہ تعلیم کے ان دونوں پہلوؤں میں کس طرح تعلق قائم رکھا جائے' یعنی اس چیز میں جو لوگوں نے بالارادہ کوشش کرکے سیکھی ہے اور اس میں جو انہوں نے غیر محسوس طریقے پر دوسروں کے ساتھ میل جول کے ذریعے اپنی طبیعت اور سیرت کی تشکیل کے دوران میں حاصل کی ہے" [۱] -

ان الفاظ سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدرسۂ جدید اور مورجہ مدارس کا پہلا نمایاں فرق کیا ہے - مدرسہ محض ایک جائے درس نہیں جہاں ہم سوسائٹی کی زندگی اور مشاغل سے قطع نظر کرکے طلبہ کے دماغوں میں اصطلاحی معلومات کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں جس کا ان کی روزمرہ کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا - مدرسہ دراصل وہ ماحول ہے جہاں بچوں کی زندگی کے گوناگوں اور پیچیدہ تجربات ایک منتخب اور منظم شکل میں حاصل ہوسکتے ہیں - اگر وہ ان تجربات کو براہ راست حاصل کرتے تو اس میں بہت وقت ضائع ہوتا اور یہ باقاعدگی اور نظم پیدا نہ ہوسکتا - مدرسۂ جدید کا ایک اساسی اصول تجربے کی اہمیت کا احساس ہے اور موجودہ تعلیمی طریقوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم کی بنیاد ذاتی اور بلاواسطہ تجربے پر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی مکتبی زندگی اصلی اور عملی زندگی بن جائے -

اس نقطۂ نظر سے مدرسہ ایک ایسا ماحول ہے جس کا

۱— Demccracy and Education صفحہ ۱۰

اور اظہار خیال کے عام طریقے کام نہیں دیتے - اندیشہ یہ ہے کہ مدرسوں کے نصاب پر رسمی تعلیم کا مواد حاوی ہو جائے گا، اس کا ربط زندگی کے تجربات سے قائم نہ ہوگا، مستقل معاشرتی مقاصد نظرانداز کر دیے جائیں گے اور ان چیزوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہوگی جن کی تمدنی زندگی کے نظام میں کوئی جگہ نہیں بلکہ ان کا تعلق محض اصطلاحی علوم سے ہے - اس طرح ہمیں تعلیم کا عام مروجہ تصور حاصل ہوتا ہے جس میں اس کی معاشرتی غرض اور نتائج فراموش کر دیے جاتے ہیں اور اس کا لحاظ نہیں رہتا کہ تعلیم کا موضوع انسانوں کے وہ تمام باہمی تعلقات اور مراسم ہیں جو ہماری شعوری زندگی پر اثر ڈالتے ہیں بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم دور از کار معاملات کے متعلق واقفیت بہم پہنچانے اور لفظی علامتوں کے ذریعے علم سکھانے کا نام ہے گویا وہ محض نوشت خواند تک محدود ہے - لہذا فلسفۂ تعلیم کا ایک اہم‌ترین مسئلہ یہ ہے کہ ارادی اور غیر ارادی، رسمی اور اصلی تعلیم میں کسی طرح مناسب توازن قائم رکھا جائے - محض معلومات کا ذخیرہ بہم پہنچانے اور اصطلاحی اور ذہنی مشق حاصل کرلینے سے انسان کے نفس میں معاشری احساس پیدا نہیں ہوتا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزمرہ کے تجربات معنویت سے خالی ہوتے ہیں اور مدرسے میں طلبہ جو کچھ سیکھتے ہیں اس سے ان میں محض ایک خاص قسم کی تیزی اور ہوشیاری اور ماہرین خصوصی کی سی خودپسندی پیدا ہوجاتی ہے - جوں جوں مدرسہ محض ایک اصطلاحی

کے ذریعے بچے سوسائٹی کے مشاغل میں براہ راست شریک ہو کر، یا کھیل میں اس کی نقل اتار کر، جو معلومات بہم پہنچاتے تھے وہ مستقل طور پر ان کی ملکیت اور ان کی شخصیت کا جزو بن جاتی تھی وہ اس کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ ذاتی کاوش اور عملی تجربے سے حاصل کی ہوئی چیز ہوتی تھی - جب کتابی تعلیم کا دور شروع ہوا تو علم کا تعلق روزمرہ کے کاروبار اور تجربات سے کم ہونے لگا، مدرسے میں الفاظ اور اصطلاحات پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور اس کا یہ اصل مقصود پس پشت ڈال دیا گیا کہ وہ طلبہ کے لیے مفیدترین اور اہم‌ترین تجربات کے مناسب مواقع بہم پہنچائے - زمانۂ حال کے بہت سے تعلیمی مفکرین نے اس خرابی کو محسوس کیا ہے اور تعلیم جدید کی کوشش یہ ہے کہ مدرسے اور زندگی کا ٹوٹا ہوا رشتہ نئے سرے سے جوڑا جائے پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے فلسفۂ تعلیم کا مقصد تمام‌تر یہی ہے وہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"ترقی یافتہ تمدن میں جو باتیں بچوں کو سیکھنی ہوتی ہیں وہ زیادہ‌تر اصطلاحی علامتوں کی شکل میں مرتب اور محفوظ ہوتی ہیں انہیں معمولی جانی بوجھی چیزوں اور کاموں کی صورت میں تحویل نہیں کرتے اس قسم کا تعلیمی مواد زیادہ‌تر سطحی اور اصطلاحی ہوتا ہے اور حقیقی واقعات اور زندگی کے مقابلے میں اصلیت سے خالی نظر آتا ہے اصلیت کا معیار یہ ہے کہ کسی چیز کو عملی معاملات سے کس حد تک تعلق ہے - اس تعلیمی مواد کی ایک علحدہ دنیا ہوتی ہے جہاں خیال

اسی حد تک سمجھتا ہے جس حد تک اس کا محدود تجربہ ان الفاظ میں جان ڈال سکے اور اس کے نفس میں وہ ذہنی اور جذباتی کیفیتیں پیدا کر سکے جو الفاظ کے پردے میں پوشیدہ ہیں۔ اگر بالفرض اس کو ان حالات کا ذرا سا بھی واقعی علم یا تجربہ نہیں ہے - تو سفرنامے کے الفاظ اس کے لیے محض اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ اس کے بعض حواس کو عارضی طور پر متاثر کرتے ہیں اور بس - زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس کا سابق علم وسیع اور تخیل پر زور ہے تو قیاس کے ذریعے سے چند کم و بیش مبہم تصویریں اس کے دماغ کے سامنے آ جائیں - اسی طرح کیمیا کی کتاب میں یہ پڑھ لینا کہ کاربونک ایسڈ گیس' کاربن اور آکسیجن کے ایک خاص تناسب سے ملنے سے بنتی ہے بغیر عملی تجربے اور مشاہدے کے ایسا ہی ہے جیسا کوئی جادو کے منتر کو دھرائے - ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذاتی تجربے کی پشت پناہی کے بغیر لفظی تعلیم ناکافی ہے - معلومات جب تک برتی نہ جائے اور عمل کی کسوٹی پر پوری نہ اترے اسے علم کا درجہ نصیب نہیں ہوتا -

یہ بات بظاہر اتنی صاف اور سیدھی معلوم ہوتی ہے کہ شاید کوئی شخص اس سے انکار نہ کرے گا - لیکن عملاً مدرسے صدیوں سے اس حقیقت کو نظرانداز کرتے رہے ہیں - انہوں نے ذاتی اور بلاواسطہ تجربے کے بجائے الفاظ کی تعلیم کو اپنا منتہائے نظر بنا لیا ہے بلکہ بالواسطہ تجربے کو بھی اپنے نصاب سے بڑی حد تک خارج کر دیا ہے - ابتدائی بےضابطہ تعلیم کا میدان تنگ ضرور تھا لیکن اس میں فائدہ یہ تھا کہ اس

ذریعے بیان کئے جا سکتے ہیں - جو شخص ان تجربوں کو بذات خود حاصل کر چکا ہے اور ان حقائق کا محرم ہے جنہیں یہ علامات ظاہر کرتی ہیں وہ ان سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا ہے - اس کی نظر میں ان کی وہی حیثیت ہے جو ایک ماہر فن کے نزدیک مختصر نویسی کی یادداشتوں کی ہوتی ہے - وہ ان اشارات پر نظر ڈالتا ہے اور اس کے ذہن میں وہ تمام تجربات اور واقعات تازہ ہو جاتے ہیں جن کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر چند نشانات بنا لیے تھے - لیکن ہم اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ شخص جو ان تجربوں سے بالکل محروم رہا ہو اور جسے ان واقعات کے مشاہدے کا موقع نہیں ملا ان الفاظ اور علامتوں سے اتنا ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے - ممکن ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر قیاس سے کام لے کر لفظوں اور علامتوں کو ایک حد تک معنی پہنا سکے لیکن جب تک وہ خود ان نتائج تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرے گا جو ان الفاظ و علامات میں ظاہر کیے گئے ہیں اس کے علم میں اصلیت کا رنگ پیدا نہیں ہوگا - اگر یہ بات صحیح نہ ہوتی تو قطب شمالی کے ایک تجربہ کار سیاح کو وہاں کے حالات کا جتنا حقیقی علم ہے اتنا ہی ایک نوعمر لڑکے کو ہوتا جو پڑھنا سیکھ کر اس سیاحت کا سفرنامہ غور سے شروع سے آخر تک پڑھ لے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ سیاح کی نظر کے سامنے گوناگوں تجربات کی ایک دنیا لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور اس کا ذہن فوراً الفاظ سے حقائق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے - برخلاف اس کے لڑکا کتاب کو

یا والدین اپنے نقطۂ نظر سے ضروری سمجھتے ھیں اور جن میں ان کے خیالات کی نشو و نما اور کسی حد تک زمانے کی رفتار کے مطابق ترمیم اور تبدیلی ھوتی رھتی ھے -

مدرسے کے اس تصور کا انحصار چند ایسے فرضوں پر ھے جن کی تنقید کرنا ضروری ھے کیونکہ موجودہ نظریۂ تعلیم کو ان سے اختلاف ھے - اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ علمی ترقیوں اور انسانی زندگی کی موجودہ تنظیم کو مد نظر رکھتے ھوئے قدیم غیر مرتب تعلیم ھماری ضروریات کے لیے کافی نہیں ھو سکتی تھی - وہ تعلیم جیسا کہ ھم بتا چکے ھیں عملی زندگی میں براہ راست دی جاتی تھی اور اس کا دائرہ بہت ھی محدود تھا - اس کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجودہ تمدنی ذخیرے اور علمی اور عملی خزانے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرنا ممکن نہیں- آج کل کے باضابطہ مدارس میں جو تعلیم کتابوں اور تحریری علوم کے ذریعے دی جاتی ھے اس سے طلبہ کا تجربہ بہت وسیع ھوتا ھے - وہ نہ صرف اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے بلکہ قدیم تصانیف کے مطالعے کے ذریعے تمام عہد کے بہترین تمدنی علمی اور ادبی کارناموں سے واقف ھو جاتے ھیں - لیکن جہاں مدرسے کی اس نئی تنظیم سے تعلیم میں وسعت اور باقاعدگی پیدا ھوئی ھے وھاں بعض خطرے بھی پیش آئے ھیں - انسان نے اپنی واقفیت اور علم کو محض اپنے حافظے میں یا عمل کی صورت میں محفوظ نہیں رکھا بلکہ اس کو ضبط تحریر میں لے آیا ھے - اس لیے وہ تمام حقائق اور اصول جو بڑے بڑے طویل تجربوں کا نچوڑ ھیں محض چند اصطلاحات یا علامات کے

کیا تھا - اِس سے مراد تھی ایک ایسی درسگاہ جہاں طلبہ
وہ مفید علوم حاصل کرتے تھے جو زندگی کی بقا اور گرد و
پیش کے حالات کو سمجھنے کے لیے ضروری تھے اور جن سے
اُن کے ذوق تجسس کی بھی تھوڑی بہت تشفی ہو جاتی
تھی - جب مدرسے کے تصور کی تکمیل ہو گئی تو اس میں
طلبہ علم کو بغیر کسی خارجی غرض کے بھی حاصل کرنے لگے
کیونکہ اس سے ان کے نفس کی تہذیب اور ذہن کی تربیت
ہوتی تھی اور زندگی کی معنویت میں اضافہ ہوتا تھا -
مختصر یہ کہ مدرسے کی توجہ تین قسم کے علوم کی جانب
تھی - ایک وہ جو طلبہ کو حصول معاش اور مادی زندگی
کی ضروریات کے لیے تیار کرتے تھے، دوسرے وہ جو ان کی
عقلی اور ذہنی تربیت میں معین ہوتے تھے، تیسرے وہ جو
اِن کی اخلاقی تربیت اور سیرت کی تشکیل میں مدد دیتے
تھے - اس تدریجی ارتقاء کے ابتدائی دور میں تعلیم کے افادی
پہلو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا کیونکہ اس سے براہ راست
زندگی کی مادی ضروریات پوری ہوتی تھیں جب علوم کو
ترقی ہوئی اور معلمی نے ایک مستقل پیشے کی صورت اختیار
کرلی تو نظری اور ذہنی امور پر زیادہ توجہ ہونے لگی
یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں "مدرسہ" کا لفظ "جائے درس"
کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور درس کے معنی کتابی
اور زبانی تعلیم قرار پا گئے - ہمارے ملک میں ابتک اور
گزشتہ صدی کے تعلیمی انقلاب سے قبل تقریباً تمام ملکوں
میں "مدرسہ" کا یہ مفہوم تھا کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں
طلبہ کو چند خاص مضامین پڑھائے جاتے ہیں جنہیں معلم

داخلی تنظیم میں بھی سوسائٹی کی ترقی اور پیچیدگی کے لحاظ سے تبدیلیاں شروع ہوئیں اور ان میں نئے علوم اور مضامین داخل ہوتے گئے - ابتدا میں ان کی تعلیم یقیناً چند مفید دستکاریوں اور رسوم و عقائد کے سکھانے تک محدود ہوگی- لیکن جب علم انسانی میں اضافہ ہوا اور وہ ضبط تحریر میں لایا گیا تو لکھنے پڑھنے کی اہمیت زیادہ ہو گئی کیونکہ نوشت و خواند کی قابلیت اب حصول علم کی کنجی سمجھی جانے لگی - ویلن ٹائن ڈیوس (Valentine Davis) اپنی کتاب "The School Idea" (مدرسے کا تصور) میں ان عناصر کے اضافہ کا ذکر کرتا ہے :—

"جب انسان کے علم و عقل میں ترقی ہوئی اور اس کو فرصت، علمی غور و فکر، اور تخیل کی بلند پروازی کے مواقع نصیب ہوئے تو ادب موسیقی، آرٹ اور رقص بطور نئے فنون کے مدرسے کے نصاب میں داخل کیے گئے - اس کے بعد اس نے مروجہ ضابطۂ عمل (یعنی قانون)، صحیح یا پسندیدہ طرز عمل (یعنی اخلاق) اور ایمان بالغیب (یعنی مذہب) کو علم و تہذیب کے دائرے میں شامل کر لیا - جب بچوں کو یہ علوم سکھائے گئے اور انہیں انسانیات کو مناسب طریقے پر سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کی تعلیم دی گئی تو مدرسے کے موجودہ تصور کی تکمیل ہوگی [۱] - "

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدرسے کا ابتدائی تصور

۱—صفحہ ۱۲ -

کیا تھا - اس سے مراد تھی ایک ایسی درسگاہ جہاں طلبہ
وہ مفید علوم حاصل کرتے تھے جو زندگی کی بقا اور گرد و
پیش کے حالات کو سمجھنے کے لیے ضروری تھے اور جن سے
ان کے ذوق تجسس کی بھی تھوڑی بہت تشفی ہو جاتی
تھی - جب مدرسے کے تصور کی تکمیل ہو گئی تو اس میں
طلبہ علم کو بغیر کسی خارجی غرض کے بھی حاصل کرنے لگے
کیونکہ اس سے ان کے نفس کی تہذیب اور ذہن کی تربیت
ہوتی تھی اور زندگی کی معنویت میں اضافہ ہوتا تھا -
مختصر یہ کہ مدرسے کی توجہ تین قسم کے علوم کی جانب
تھی - ایک وہ جو طلبہ کو حصول معاش اور مادی زندگی
کی ضروریات کے لیے تیار کرتے تھے، دوسرے وہ جو ان کی
عقلی اور ذہنی تربیت میں معین ہوتے تھے، تیسرے وہ جو
ان کی اخلاقی تربیت اور سیرت کی تشکیل میں مدد دیتے
تھے - اس تدریجی ارتقاء کے ابتدائی دور میں تعلیم کے افادی
پہلو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا کیونکہ اس سے براہ راست
زندگی کی مادی ضروریات پوری ہوتی تھیں جب علوم کو
ترقی ہوئی اور معلمی نے ایک مستقل پیشے کی صورت اختیار
کرلی تو نظری اور ذہنی امور پر زیادہ توجہ ہونے لگی
یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں "مدرسہ" کا لفظ "جائے درس"
کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور درس کے معنی کتابی
اور زبانی تعلیم قرار پا گئے - ہمارے ملک میں ابتک اور
گزشتہ صدی کے تعلیمی انقلاب سے قبل تقریباً تمام ملکوں
میں "مدرسہ" کا یہ مفہوم تھا کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں
طلبہ کو چند خاص مضامین پڑھائے جاتے ہیں جنہیں معلم

داخلی تنظیم میں بھی سوسائٹی کی ترقی اور پیچیدگی کے لحاظ سے تبدیلیاں شروع ہوئیں اور ان میں نئے نئے علوم اور مضامین داخل ہوتے گئے - ابتدا میں ان کی تعلیم یقیناً چند مفید دستکاریوں اور رسوم و عقائد کے سکھانے تک محدود ہوگی- لیکن جب علم انسانی میں اضافہ ہوا اور وہ ضبط تحریر میں لایا گیا تو لکھنے پڑھنے کی اہمیت زیادہ ہو گئی کیونکہ نوشت و خواند کی قابلیت اب حصول علم کی کنجی سمجھی جانے لگی - ویلن ٹائن ڈیوس (Valentine Davis) اپنی کتاب "The School Idea" (مدرسے کا تصور) میں ان عناصر کے اضافہ کا ذکر کرتا ہے :—

"جب انسان کے علم و عقل میں ترقی ہوئی اور اس کو فرصت، علمی غور و فکر، اور تخیل کی بلند پروازی کے مواقع نصیب ہوئے تو ادب موسیقی، آرٹ اور رقص بطور نئے فنون کے مدرسے کے نصاب میں داخل کیسے گئے - اس کے بعد اس نے مروجہ ضابطۂ عمل (یعنی قانون)، صحیح یا پسندیدہ طرز عمل (یعنی اخلاق) اور ایمان بالغیب (یعنی مذہب) کو علم و تہذیب کے دائرے میں شامل کر لیا - جب بچوں کو یہ علوم سکھائے گئے اور انہیں انسانیات کو مناسب طریقے پر سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کی تعلیم دی گئی تو مدرسے کے موجودہ تصور کی تکمیل ہوگی [۱] - "

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدرسے کا ابتدائی تصور

۱—صفحہ ۱۲ -

میں اضافہ کر رہے تھے - اس طرح تمدنی زندگی کے نظام میں مدرسے نے اپنے لیے جگہ پیدا کی - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اس صورت حال پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :—

"جوں جوں تمدن کو ترقی ہوتی ہے بچوں کی صلاحیتوں اور بڑوں کے کار و بار میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہوتی جاتی ہے اور بچوں کے لیے یہ بہت مشکل ہوتا جاتا ہے کہ بجز ان مشاغل کے جو بہت سادہ اور آسان ہیں بالغوں کے کاموں میں براہ راست شریک ہو کر کچھ سیکھ سکیں بالغوں کے کام اکثر اتنے پیچیدہ اور بچوں کی سمجھ سے اِس قدر بعید ہوتے ہیں کہ وہ کھیل میں ان کی نقل اتار کر ان کے منشا اور مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے - اس لیے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ بچے بڑے ہوکر سوسائٹی کے کار و بار میں مفید طریقے پر شرکت کریں تو یہ ضروری ہے کہ انھیں پہلے سے اس مقصد کے لیے تعلیم دی جائے - اس غرض کو مد نظر رکھ کر باضابطہ تعلیم‌گاہیں قائم کی جاتی ہیں تعلیمی وسائل اور نصاب وغیرہ کی ترتیب عمل میں آتی ہے اور ضروری چیزوں کے پڑھانے کا کام ایک خاص جماعت کے سپرد کردیا جاتا ہے ....جوں جوں سوسائٹی کے ذرائع اور وسائل زیادہ وسیع اور اُس کا نظم و نسق زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے مروجہ باضابطہ تعلیم کی ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے[1] -"

جب مروجہ مدارس قائم ہو گئے تو ان کے نصاب اور

۱— Democracy and Education صفحہ ۹ -

نے "بے ضابطہ تعلیم"[1] کے نام سے موسوم کیا ہے اور ابتدا میں تعلیم کی محض یہی ایک صورت تھی - اس وقت پیشوں اور صنعتوں وغیرہ کی تعلیم نوجوان بلاواسطہ عملی طور پر حاصل کرتے تھے یعنی سوسائٹی کے کار و بار میں براہ راست شریک ہوتے تھے - نظری تعلیم جو ابھی تک اتنی مجرد نہ تھی کہ زندگی کے عملی مشاغل سے اس کا تعلق بالکل نظر سے چھپ گیا ہو، انھیں خاندان ھی میں دی جاتی تھی - لیکن جب رفتہ رفتہ انسان نے اپنے ذوق تجسس کی وجہ سے گرد و پیش کے مظاھر اور اشیا پر توجہ کی اور ان کی خاصیتوں اور تعلقات پر غور کرنا شروع کیا تو اس کی معلومات کا ذخیرہ بڑھا اور مختلف "علوم" کی صورت میں مدون ھوا - تب سوسائٹی کو اس کی ضرورت محسوس ھوئی کہ یہ علوم با قاعدہ طریقے پر بچوں اور نوجوانوں تک پہنچائے جائیں کیونکہ اب کام کی وسعت اور ذمہ‌داری اتنی ھو گئی تھی کہ خاندان کے افراد اپنے اور لازمی مشاغل کے دوران میں ضمناً اس تعلیمی فرض کو انجام نہ دے سکتے تھے - اس ضرورت سے مجبور ھو کر "مدرسے" قائم کئے گئے جہاں بعض لوگ، جو اسی غرض سے دوسرے معاشی فرائض سے سبکدوش کردیے گئے تھے خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے کہ انھیں نہ صرف تمام مفید ھنر اور عملی کام سکھائیں جو زندگی کے قیام کے لیے ضروری ھیں بلکہ ان نظری علوم سے بھی روشناس کریں جو برابر نشو و نما پا رہے تھے اور انسان کی واقفیت اور قوت

Informal Education—1

کیا تھا - اس سے مراد تھی ایک ایسی درسگاہ جہاں طلبۂ وہ مفید علوم حاصل کرتے تھے جو زندگی کی بقا اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے کے لیے ضروری تھے اور جن سے ان کے ذوقِ تجسس کی بھی تھوڑی بہت تشفی ہو جاتی تھی - جب مدرسے کے تصور کی تکمیل ہو گئی تو اس میں طلبۂ علم کو بغیر کسی خارجی غرض کے بھی حاصل کرنے لگے کیونکہ اس سے ان کے نفس کی تہذیب اور ذہن کی تربیت ہوتی تھی اور زندگی کی معنویت میں اضافہ ہوتا تھا - مختصر یہ کہ مدرسے کی توجہ تین قسم کے علوم کی جانب تھی - ایک وہ جو طلبہ کو حصولِ معاش اور مادی زندگی کی ضروریات کے لیے تیار کرتے تھے، دوسرے وہ جو ان کی عقلی اور ذہنی تربیت میں معین ہوتے تھے، تیسرے وہ جو ان کی اخلاقی تربیت اور سیرت کی تشکیل میں مدد دیتے تھے - اس تدریجی ارتقاء کے ابتدائی دور میں تعلیم کے افادی پہلو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا کیونکہ اس سے براہ راست زندگی کی مادی ضروریات پوری ہوتی تھیں جب علوم کو ترقی ہوئی اور معلمی نے ایک مستقل پیشے کی صورت اختیار کرلی تو نظری اور ذہنی امور پر زیادہ توجہ ہونے لگی یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں "مدرسہ" کا لفظ "جائے درس" کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور درس کے معنی کتابی اور زبانی تعلیم قرار پا گئے - ہمارے ملک میں ابتک اور گزشتہ صدی کے تعلیمی انقلاب سے قبل تقریباً تمام ملکوں میں "مدرسہ" کا یہ مفہوم تھا کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں طلبہ کو چند خاص مضامین پڑھائے جاتے ہیں جنھیں معلم

داخلی تنظیم میں بھی سوسائٹی کی ترقی اور پیچیدگی کے لحاظ سے تبدیلیاں شروع ہوئیں اور ان میں نئے نئے علوم اور مضامین داخل ہوتے گئے - ابتدا میں ان کی تعلیم یقیناً چند مفید دستکاریوں اور رسوم و عقائد کے سکھانے تک محدود ہوگی- لیکن جب علم انسانی میں اضافہ ہوا اور وہ ضبط تحریر میں لایا گیا تو لکھنے پڑھنے کی اہمیت زیادہ ہو گئی کیونکہ نوشت و خواند کی قابلیت اب حصول علم کی کنجی سمجھی جانے لگی - ویلن ٹائن ڈیوس (Valentine Davis) اپنی کتاب "The School Idea" (مدرسے کا تصور) میں ان عناصر کے اضافہ کا ذکر کرتا ہے :—

"جب انسان کے علم و عقل میں ترقی ہوئی اور اس کو فرصت، علمی غور و فکر، اور تخیل کی بلند پروازی کے مواقع نصیب ہوئے تو ادب موسیقی، آرٹ اور رقص بطور نئے فنون کے مدرسے کے نصاب میں داخل کیے گئے - اس کے بعد اس نے مروجہ ضابطۂ عمل (یعنی قانون)، صحیح یا پسندیدہ طرز عمل (یعنی اخلاق) اور ایمان بالغیب (یعنی مذہب) کو علم و تہذیب کے دائرے میں شامل کر لیا - جب بچوں کو یہ علوم سکھائے گئے اور انھیں انسانیات کو مناسب طریقے پر سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کی تعلیم دی گئی تو مدرسے کے موجودہ تصور کی تکمیل ہوگی [1] - "

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدرسے کا ابتدائی تصور

1— صفحہ ۱۲ -

کیا تھا - اس سے مراد تھی ایک ایسی درسگاہ جہاں طلبہ وہ مفید علوم حاصل کرتے تھے جو زندگی کی بقا اور گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے کے لیے ضروری تھے اور جن سے ان کے ذوق تجسس کی بھی تھوڑی بہت تشفی ہو جاتی تھی - جب مدرسے کے تصور کی تکمیل ہو گئی تو اس میں طلبہ علم کو بغیر کسی خارجی غرض کے بھی حاصل کرنے لگے کیونکہ اس سے ان کے نفس کی تہذیب اور ذہن کی تربیت ہوتی تھی اور زندگی کی معنویت میں اضافہ ہوتا تھا - مختصر یہ کہ مدرسے کی توجہ تین قسم کے علوم کی جانب تھی - ایک وہ جو طلبہ کو حصول معاش اور مادی زندگی کی ضروریات کے لیے تیار کرتے تھے' دوسرے وہ جو ان کی عقلی اور ذہنی تربیت میں معین ہوتے تھے' تیسرے وہ جو ان کی اخلاقی تربیت اور سیرت کی تشکیل میں مدد دیتے تھے - اس تدریجی ارتقاء کے ابتدائی دور میں تعلیم کے افادی پہلو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا کیونکہ اس سے براہ راست زندگی کی مادی ضروریات پوری ہوتی تھیں جب علوم کو ترقی ہوئی اور معلمی نے ایک مستقل پیشے کی صورت اختیار کرلی تو نظری اور ذہنی امور پر زیادہ توجہ ہونے لگی یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں "مدرسہ" کا لفظ "جائے درس" کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور درس کے معنی کتابی اور زبانی تعلیم قرار پا گئے - ہمارے ملک میں ابتک اور گزشتہ صدی کے تعلیمی انقلاب سے قبل تقریباً تمام ملکوں میں "مدرسہ" کا یہ مفہوم تھا کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں طلبہ کو چند خاص مضامین پڑھائے جاتے ہیں جنہیں معلم

داخلی تنظیم میں بھی سوسائٹی کی ترقی اور پیچیدگی کے لحاظ سے تبدیلیاں شروع ہوئیں اور ان میں نئے نئے علوم اور مضامین داخل ہوتے گئے - ابتدا میں ان کی تعلیم یقیناً چند مفید دستکاریوں اور رسوم و عقائد کے سکھانے تک محدود ہوگی- لیکن جب علم انسانی میں اضافہ ہوا اور وہ ضبط تحریر میں لایا گیا تو لکھنے پڑھنے کی اہمیت زیادہ ہو گئی کیونکہ نوشت و خواند کی قابلیت اب حصول علم کی کنجی سمجھی جانے لگی - ویلن ٹائن ڈیوس (Valentine Davis) اپنی کتاب "The School Idea" (مدرسے کا تصور) میں ان عناصر کے اضافہ کا ذکر کرتا ہے :—

"جب انسان کے علم و عقل میں ترقی ہوئی اور اس کو فرصت، علمی غور و فکر، اور تخیل کی بلند پروازی کے مواقع نصیب ہوئے تو ادب موسیقی، آرٹ اور رقص بطور نئے فنون کے مدرسے کے نصاب میں داخل کیے گئے - اس کے بعد اس نے مروجہ ضابطۂ عمل (یعنی قانون)، صحیح یا پسندیدہ طرز عمل (یعنی اخلاق) اور ایمان بالغیب (یعنی مذہب) کو علم و تہذیب کے دائرے میں شامل کر لیا - جب بچوں کو یہ علوم سکھائے گئے اور انھیں انسانیات کو مناسب طریقے پر سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کی تعلیم دی گئی تو مدرسے کے موجودہ تصور کی تکمیل ہوگی [1] - "

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدرسے کا ابتدائی تصور

---

[1] — صفحہ ۱۲ -

کیا تھا۔ اس سے مراد تھی ایک ایسی درسگاہ جہاں طلبہ
وہ مفید علوم حاصل کرتے تھے جو زندگی کی بقا اور گرد و
پیش کے حالات کو سمجھنے کے لیے ضروری تھے اور جن سے
ان کے ذوقِ تجسس کی بھی تھوڑی بہت تشفی ہو جاتی
تھی۔ جب مدرسے کے تصور کی تکمیل ہو گئی تو اس میں
طلبہ علم کو بغیر کسی خارجی غرض کے بھی حاصل کرنے لگے
کیونکہ اس سے ان کے نفس کی تہذیب اور ذہن کی تربیت
ہوتی تھی اور زندگی کی معنویت میں اضافہ ہوتا تھا۔
مختصر یہ کہ مدرسے کی توجہ تین قسم کے علوم کی جانب
تھی۔ ایک وہ جو طلبہ کو حصولِ معاش اور مادی زندگی
کی ضروریات کے لیے تیار کرتے تھے، دوسرے وہ جو ان کی
عقلی اور ذہنی تربیت میں معین ہوتے تھے، تیسرے وہ جو
ان کی اخلاقی تربیت اور سیرت کی تشکیل میں مدد دیتے
تھے۔ اس تدریجی ارتقاء کے ابتدائی دور میں تعلیم کے افادی
پہلو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا کیونکہ اس سے براہ راست
زندگی کی مادی ضروریات پوری ہوتی تھیں جب علوم کو
ترقی ہوئی اور معلمی نے ایک مستقل پیشے کی صورت اختیار
کرلی تو نظری اور ذہنی امور پر زیادہ توجہ ہونے لگی
یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں "مدرسہ" کا لفظ "جائے درس"
کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور درس کے معنی کتابی
اور زبانی تعلیم قرار پا گئے۔ ہمارے ملک میں ابتک اور
گزشتہ صدی کے تعلیمی انقلاب سے قبل تقریباً تمام ملکوں
میں "مدرسہ" کا یہ مفہوم تھا کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں
طلبہ کو چند خاص مضامین پڑھائے جاتے ہیں جنہیں معلم.

داخلی تنظیم میں بھی سوسائٹی کی ترقی اور پیچیدگی کے لحاظ سے تبدیلیاں شروع ہوئیں اور ان میں نئے نئے علوم اور مضامین داخل ہوتے گئے - ابتدا میں ان کی تعلیم یقیناً چند مفید دستکاریوں اور رسوم و عقائد کے سکھانے تک محدود ہوگی- لیکن جب علم انسانی میں اضافہ ہوا اور وہ ضبط تحریر میں لایا گیا تو لکھنے پڑھنے کی اہمیت زیادہ ہو گئی کیونکہ نوشت و خواند کی قابلیت اب حصول علم کی کنجی سمجھی جانے لگی - ویلن ٹائن ڈیوس (Valentine Davis) اپنی کتاب "The School Idea" (مدرسے کا تصور) میں ان عناصر کے اضافہ کا ذکر کرتا ہے :—

"جب انسان کے علم و عقل میں ترقی ہوئی اور اس کو فرصت، علمی غور و فکر، اور تخیل کی بلند پروازی کے مواقع نصیب ہوئے تو ادب موسیقی، آرٹ اور رقص بطور نئے فنون کے مدرسے کے نصاب میں داخل کیے گئے - اس کے بعد اس نے مروجہ ضابطۂ عمل (یعنی قانون)، صحیح یا پسندیدہ طرز عمل (یعنی اخلاق) اور ایمان بالغیب (یعنی مذہب) کو علم و تہذیب کے دائرے میں شامل کر لیا - جب بچوں کو یہ علوم سکھائے گئے اور انہیں انسانیات کو مناسب طریقے پر سمجھنے اور ان کی قدر کرنے کی تعلیم دی گئی تو مدرسے کے موجودہ تصور کی تکمیل ہوگی [1] - "

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ مدرسے کا ابتدائی تصور

میں اضافہ کر رہے تھے - اس طرح تمدنی زندگی کے نظام میں
مدرسے نے اپنے لیے جگہ پیدا کی - پروفیسر ڈیوئی (Dewey)
اس صورت حال پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :-

"جوں جوں تمدن کو ترقی ہوتی ہے بچوں کی صلاحیتوں
اور بڑوں کے کار و بار میں ایک بہت بڑی خلیج حائل
ہوتی جاتی ہے اور بچوں کے لیے یہ بہت مشکل ہوتا
جاتا ہے کہ بجز ان مشاغل کے جو بہت سادہ اور آسان
ہیں بالغوں کے کاموں میں براہ راست شریک ہو کر کچھ
سیکھ سکیں بالغوں کے کام اکثر اتنے پیچیدہ اور بچوں کی
سمجھ سے اس قدر بعید ہوتے ہیں کہ وہ کھیل میں ان
کی نقل اتار کر ان کے منشا اور مفہوم کو نہیں سمجھ
سکتے - اس لیے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ بچے بڑے
ہوکر سوسائٹی کے کار و بار میں مفید طریقے پر شرکت
کریں تو یہ ضروری ہے کہ انہیں پہلے سے اس مقصد کے لیے
تعلیم دی جائے - اس غرض کو مد نظر رکھ کر باضابطہ
تعلیم گاہیں قائم کی جاتی ہیں تعلیمی وسائل اور نصاب
وغیرہ کی ترتیب عمل میں آتی ہے اور ضروری چیزوں کے
پڑھانے کا کام ایک خاص جماعت کے سپرد کردیا جاتا ہے
........جوں جوں سوسائٹی کے ذرائع اور وسائل زیادہ
وسیع اور اس کا نظم و نسق زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے
مروجہ باضابطہ تعلیم کی ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے [۱]-"
جب مروجہ مدارس قائم ہو گئے تو ان کے نصاب اور

۱- Democracy and Education صفحہ ۹ -

نے "بے ضابطہ تعلیم"[1] کے نام سے موسوم کیا ہے اور ابتدا میں تعلیم کی محض یہی ایک صورت تھی - اس وقت پیشوں اور صنعتوں وغیرہ کی تعلیم نوجوان بلاواسطہ عملی طور پر حاصل کرتے تھے یعنی سوسائٹی کے کار و بار میں براہ راست شریک ہوتے تھے - نظری تعلیم جو ابھی تک اتنی مجرد نہ تھی کہ زندگی کے عملی مشاغل سے اس کا تعلق بالکل نظر سے چھپ گیا ہو، انھیں خاندان ہی میں دی جاتی تھی - لیکن جب رفتہ رفتہ انسان نے اپنے ذوق تجسس کی وجہ سے گرد و پیش کے مظاہر اور اشیا پر توجہ کی اور ان کی خاصیتوں اور تعلقات پر غور کرنا شروع کیا تو اس کی معلومات کا ذخیرہ بڑھا اور مختلف "علوم" کی صورت میں مدون ہوا - تب سوسائٹی کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ علوم با قاعدہ طریقے پر بچوں اور نوجوانوں تک پہنچائے جائیں کیونکہ اب کام کی وسعت اور ذمہ‌داری اتنی ہو گئی تھی کہ خاندان کے افراد اپنے اور لازمی مشاغل کے دوران میں ضمناً اس تعلیمی فرض کو انجام نہ دے سکتے تھے - اس ضرورت سے مجبور ہو کر "مدرسے" قائم کئے گئے جہاں بعض لوگ، جو اسی غرض سے دوسرے معاشی فرائض سے سبکدوش کردیے گئے تھے خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے کہ انھیں نہ صرف تمام مفید ہنر اور عملی کام سکھائیں جو زندگی کے قیام کے لیے ضروری ہیں بلکہ ان نظری علوم سے بھی روشناس کریں جو برابر نشو و نما پا رہے تھے اور انسان کی واقفیت اور قوت

Informal Education—1

کہ ہمارے اپنے مدارس جدید تعلیمی خیالات کی رو سے کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں -

مدرسۂ جدید کی واقعی اہمیت اور حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ہمیں بطور پس منظر کے "مدرسہ" یا "اسکول" کے قدیم تاریخی تصور پر ایک سرسری نظر ڈالنی چاہیے تاکہ ہم دونوں کا مقابلہ کر کے سمجھ سکیں کہ تصور میں کون سے عناصر مستقل اہمیت رکھنے کی وجہ سے قدیم زمانے سے اب تک برابر چلے آتے ہیں اور کن امور میں تبدیلی اور ترمیم ہوگئی ہے - ہم تعلیم اور تمدن کی ابتدائی بحث میں یہ بیان کرچکے ہیں کہ انسانی زندگی کے نظام میں مدرسے کا آغاز کس طرح ہوا - ابتدا میں لوگوں نے زندگی کی ضروریات سے مجبور ہوکر اپنی اولاد کو بعض وہ چیزیں بتائیں اور سکھائیں جن کے جانے بغیر چارہ نہ تھا یعنی جن پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا - مثلاً خوراک حاصل کرنے کے طریقے، گرمی اور سردی سے محفوظ رہنے کے لیے کوئی جائے پناہ تلاش کرنا یا بنانا - لباس کی فراہمی، کاشت کرنے، شکار کھیلنے اور دوسرے ضروری کاموں کے لیے ہتھیار اور آلات تیار کرنا - اس ابتدائی دور میں ان کی توجہ لازماً مادی اشیا اور ضروریات تک محدود تھی - لیکن کچھ زمانے کے بعد مختلف قبیلوں میں رسم و عبادات، قانون، معاشرت کے طریقوں، گیتوں اور بھجنوں کا مجموعہ تیار ہو گیا - اور یہ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بھی والدین یا خاندان کے بزرگوں نے خود ہی براہ راست بچوں کو سکھائی ہوں گی - یہ تعلیم کی وہ منزل ہے جس کو مورخین

سلسلے میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے جس کا سمجھنا اور سمجھانا
فلسفے کے طالب علم کا فرض ہے - یہی صورت تعلیمی تبدیلیوں
کی ہے - یہ بھی ایک ایسے ہی ارتقاء کا نتیجہ ہیں - ان کی
جڑیں ماضی کے واقعات اور حوادث میں پوشیدہ ہیں مگر ان کا
فوری سبب وہ حالات ہیں جو اس زمانے میں ہمارے پیش نظر
ہیں - لیکن اس کتاب میں ہمارا موضوع بحث تعلیم کا
تاریخی مطالعہ نہیں بلکہ اصول تعلیم کا تجزیہ اور تشریح ہے
اس لیے ہم اس حصے میں مختلف تعلیمی مسائل سے ان بڑے
بڑے اصولوں کی ضمن میں بحث کریں گے جس پر موجودہ
زمانے کے بہترین تعلیمی خیالات مبنی ہیں - یہاں یہ بات
بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی عملی تجویز یا انسانی ادارہ
اپنے نصب العین سے پوری پوری مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ
نصب العین کوئی مقررہ منزل نہیں جہاں ہم واقعی پہنچ
جائیں بلکہ ایک رہنما ستارہ ہے جو ہماری دسترس سے بلند
ہوتا ہے اور ہماری کوششوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتا ہے -
حصۂ اول میں ہم نے تعلیم کی جو غایت بیان کی ہے اس کی
حیثیت ایک آئیڈیل (نصب العین) کی ہے جس کو تمام و
کمال حاصل کرنا امکان سے باہر ہے لیکن مدرسۂ جدید کے
تعلیمی اصولوں اور رجحانات پر غور کرنے سے ہمیں یہ ضرور
معلوم ہوسکتا ہے کہ ہماری تعلیمی ارتقاء کا کیا رخ ہے اور ہماری
تعلیم گاہیں کن مقاصد کو پورا کرنے میں کوشاں ہیں - مثال
کے طور پر ہمیں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی طریقوں
اور کوششوں کا ذکر کرنا ہوگا اور اس طرح ہمیں ان کے تعلیمی
تجربات سے بھی آگاہی ہوجائے گی اور ہم یہ اندازہ کر سکیں گے

حصہ دوم

"ذہنی تعلیم"

باب اول

علم اور زندگی

موجودہ نظریۂ تعلیم اور اس کے اہم ترین اصولوں کو بخوبی سمجھنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم مدرسۂ جدید کے اس تصور پر نظر ڈالیں جو اس زمانے میں پیدا ہوا ہے اور جس نے جدید تعلیمی خیالات کو علمی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ اگر ہمارا مقصد موجودہ تعلیم کے تاریخی ارتقاء کو دیکھنا ہوتا تو ہم اس سے بحث کرتے کہ "جدید خیالات" سے مراد یہ نہیں کہ ان کا قدیم خیالات سے کوئی تعلق نہیں یا تعلیم میں دفعۃً کوئی زبردست انقلاب ہوگیا ہے جس کی وجہ سے تمام پرانے آثار مٹ گئے ہیں اور ان کے بجائے ایک بالکل نئی عمارت کھڑی ہو گئی ہے۔ انسانی معاملات کی ہر تبدیلی علت اور معلول کے ایک اٹل ارتقائی

ماحول بنا دیں کہ جو طلبہ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں وہ ہندوستان کے آزاد شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دے سکیں جو اس نئے جمہوری معاشرے میں ان پر عائد ہوں گے جس کی تشکیل ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے، اگرچہ کبھی کبھی باہمی اختلافات اور مناقشات کی وجہ سے فضا اِس درجہ تاریک اور مکدر ہو جاتی ہے کہ اس میں مستقبل کا روشن رخ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے -

---

خیالات اور مشاغل میں شرکت کر کے اور باہمی داد و ستد کی بدولت اس میں تمدنی قدروں اور تعلقات کا احساس مستحکم ہو جائے گا جمہوریت کا ایک طرف تو یہ تقاضا ہے کہ ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ اظہار خودی کا موقع دیا جائے، لیکن دوسری طرف یہ شرط ہے کہ یہ اظہار اپنے لیے وہ وہ راستے اختیار کرے جو معاشرے کے اعلیٰ ترین مقاصد کے منافی نہ ہوں بلکہ ان کے حصول میں مدد دیں - ہندوستان کی جدید حکومت کا اولین فرض یہ ہوگا کہ وہ تمام سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی وسائل کا جائزہ لے کر ان کو منظم اور مربوط کرے اور ایک وسیع اور مکمل نظام قائم کرے جس کے دامن میں رفتہ رفتہ ملک کی نوخیز نسل کے تمام افراد آ جائیں جن کی تربیت اسی احتیاط اور غور کے ساتھ کی جائے جو آج کل صرف بعض اہل ثروت لوگوں کے حصے میں آتی ہے - وہ تمام رکاوٹیں جو مفلسی کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل ہیں دور کی جائیں اور انہیں بچپن اور بلوغ کے زمانے میں ایسے تعلیمی اثرات میں رکھا جائے کہ قوم کے جس طبقے میں جہاں کہیں بھی کوئی جوہر قابل پیدا ہو اس کو اعلیٰ ترین تربیت اور نشو و نما کا موقع ملے اور باقی تمام لڑکے اور لڑکیاں اپنی ذہنی استعداد اور رجحان کے مطابق تعلیم پائیں اور اپنی قوتوں کو ذاتی اور قومی مقاصد کے حصول میں صرف کریں - ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہوگا کہ وہ فلسفۂ تعلیم کی اور نظریۂ تعلیم کی تشکیل کریں اور نصاب، طریقۂ تعلیم، اصول ضبط اور مدرسوں کے داخلی اور خارجی نظم و نسق میں مناسب ترمیم کر کے تعلیم گاہوں کو ایسا

ان میلانات میں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہیں - ایک تو یہ کہ افراد میں تمام صلاحیتوں کو ابھارا جائے جو ترقی اور حرکت کے لیے ضروری ہیں - دوسرے یہ کہ افراد اور جماعتوں میں اغراض اور مقاصد کا ایسا اتحاد پیدا ہو جائے کہ ان میں باہمی ہمدردی اور باہمی احتیاج کا احساس ہر دم تازہ رہے جس معاشرے میں حرکت ہو ہر جدید چیز کی اشاعت کے لیے راہیں کھلی ہوئی ہوں اس میں یہ انتظام ہونا چاہیے کہ اس کے تمام افراد میں جدت کا مادہ اور خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت پیدا ہو - ورنہ وہ ان تبدیلیوں کے گرداب میں پڑ کر رہ جائیں گے جو ان کے گرد و پیش ہو رہی ہیں اور جن کی اہمیت سے وہ ناواقف ہیں" ۱ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے ہر فرد کی صلاحیتوں کو پوری پوری نشو و نما کا موقع دیا جائے - تاکہ ہر طرح کی صلاحیت اور قابلیت رکھنے والے افراد مل کر معاشرے میں ترقی اور تبدیلی کی گنجائش پیدا کریں - یہ تعلیم افراد میں ایک بےرنگ اور بےروح یکسانی کو رواج نہیں دے گی بلکہ ان تمام قوتوں کو ابھارے گی جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممتاز کرتی ہیں تاکہ ان رنگ برنگ کے سروں کے میل سے ایک ہم‌آہنگ نغمہ پیدا ہو - جمہوری تعلیم انفرادیت پر زور دےگی لیکن انفرادیت کی تربیت ایسے معاشرتی ماحول میں کرے گی جہاں ایک دوسرے کے تجربات،

۱- Dewey ; Democracy and Education صفحہ ۱۰۲ -

سوسائٹی میں حرکت اور تموج کو روکتے ہیں اور افراد کی مفید صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتے - موجودہ ہندوستانی سیرت کی ایک قابل افسوس کمزوری یہ ہے کہ اس میں حوصلہ، ہمت، اپچ اور مشکلات کو استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کی قوت کم ہے - وہ اپنی ذمہ‌داری پر بڑے بڑے کاموں کو شروع کر کے ان کو انجام تک نہیں پہنچاتے ہندوستانیوں کے لیے یہ بات باعث ننگ ہے کہ غیر ملکوں کے لوگ اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر ان کے سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچیں اور ان میں سے ایسے جان پر کھیلنے والے سیاح موجود نہ ہوں جن کے نصیب میں یہ سرخروئی آئے - ان کے لیے یہ شرم کا موجب ہے کہ ان کے یہاں کی بیماریوں اور امراض کا علاج معلوم کرنے کے لیے یورپ اور امریکا کے ماہرین فن جد و جہد کریں، اپنا روپیہ صرف کریں، اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالیں اور وہ خود اس جہاد میں پیش پیش نہ ہوں - ان باتوں کے تاریخی وجوہ جو کچھ بھی ہوں اور اس کی ذمہ‌داری اور الزام جس کسی پر بھی عائد ہو تعلیم کو بہرحال اس خرابی کا علاج کرنا ہے اور ملک کے افراد کو ان دشواریوں اور ذمہ‌داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت دینی ہے جس سے ان کو آگے چل کر سابقہ پڑے گا، اور ان میں سائنس کی تعلیم کے ذریعے تسخیر فطرت اور ترقی کی صلاحیت پیدا کرنی ہے - جب تک تعلیم میں ایک نئی روح نہ پھونکی جائے اور اس کو ان جدید میلانات سے روشناس نہ کیا جائے جو جمہوری معاشرے کا خاصہ ہیں اس وقت تک ہندوستان کی آئندہ حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی

میں اس وقت کس قسم کے حالات پائے جاتے ہیں اور ان سے ہمارے تعلیمی مسائل کے متعلق کیا نتیجہ نکلتا ہے ۔ ہندوستان سیاسی لحاظ سے اس وقت تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے ۔ شخصی غیر ملکی اور دفتری حکومت کا باب اب ختم ہوا چاہتا ہے اور دیر سویر ختم ہو کر رہے گا اور اس کے بجائے ملک میں بہت جلد یا کچھ عرصے کے بعد جمہوری نظام اور ادارے قائم ہونے والے ہیں ۔ اس تبدیلی اور تغیر کے زمانے میں قدیم رسوم و عقائد اور جدید خیالات اور اداروں میں کشمکش ہو رہی ہے ۔ ایک طرف وہ سکون اور قدامت پسندی لوگوں میں باقی ہے جس کی مثال میں رسل نے چینی تہذیب کو پیش کیا ہے اور دوسری طرف زمانے کے حالات اور تقاضے سے متاثر ہو کر ملک میں حرکت اور قوت عمل پیدا ہو گئی ہے جو نئے سیاسی اور تمدنی تجربوں کے لیے تیار اور آمادہ ہے ۔ اس کشمکش کے عرصے میں تعلیم کو نہایت اہم فرائض انجام دینے ہیں ۔ اگر تعلیم کا اثر اور رجحان جمود اور قدامت پرستی کی طرف ہوگا تو نہ صرف آنے والی جمہوری حکومت کا تجربہ ناکامیاب ثابت ہوگا بلکہ علاوہ سیاست کے میدان کے ہمارا ملک زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ترقی نہ کر سکے گا اور دوسری قوموں سے پیچھے رہ جائے گا ۔ برخلاف اس کے اگر تعلیم‌گاہیں اور معلم اپنا تمام اثر جمہوری حکومت اور جمہوری معاشرے کے مناسب ذہنیت پیدا کرنے میں صرف کریں تو اس کے نتائج بہت گہرے اور وسیع ہوں گے کیونکہ ان کی مدد سے نوخیز نسلیں ان معاشرتی اختلافات اور تعصبات کو دور کر سکیں گی جو

وہ ان دونوں کا فرق سمجھانے کے لیے ایک دلچسپ، مثال دیتے
ہیں: "سیاست اور حب وطن کے جوش میں یونانیوں کو اپنی
قوت کے اظہار کے عملی موقعے ملتے تھے - جب کوئی سیاسی
لیڈر اپنے وطن سے نکال دیا جاتا تھا تو وہ ایک چھوٹی سی فوج
جمع کرکے اپنے وطن پر حملہ کردیتا تھا - برخلاف اس کے اگر
کوئی چینی افسر معزول کر دیا جاتا تھا تو وہ پہاڑوں میں
کوئی جائے پناہ تلاش کرلیتا تھا اور وہاں دیہاتی زندگی کی
مسرتیں اور لطف کے متعلق نظمیں لکھتا تھا" - موجودہ زمانے
میں متحرک سوسائٹی کی مثال امریکہ اور یورپ کی بعض
اقوام ہیں جنہوں نے سائنس کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیا ہے
اس کے ذریعے سے وہ قوت حاصل کی ہے جس کے بغیر آج کل
دنیا میں جہاں مقابلہ اور جنگ و جدل کا دور دورہ ہے
بسر ہونی مشکل ہے - موجودہ زمانے میں کامیابی کے ساتھ
زندگی بسر کرنے کے لیے بقول رسل کے اس قسم کے آدمیوں کی
ضرورت نہیں جیسے انگلستان کے پبلک اسکول اور پرانی
یونیورسٹیاں پیدا کرتی رہتی ہیں - یہ درسگاہیں اعتماد نفس،
اعتقاد راسخ، مضبوطی اور حوصلہ مندی پر زور دیتی تھیں اور
عقل، ہمدردی اور انسانی احساس کو ان صفات پر قربان کردیتی
تھیں - اس زمانے میں ایسے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہے
"جن میں تخیل اور ہمدردی زیادہ ہو، جن کی عقل میں
زیادہ رسائی ہو، جو معاملات کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکیں،
جن کو کتے کی سی بہادری اور استقلال پر کم اور فنی معلومات
پر زیادہ بھروسا ہو" -

ہمارے لیے اس وقت یہ سوال درپیش ہے کہ ہندوستان

حاکم کے حکم کی تعمیل کرے اور اپنی سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوت کو معطل رکھے - لیکن جمہوری حکومت جس کا دار مدار افراد کی ذاتی جد و جہد اور کاوش پر ہے ایسے لوگوں کی طالب ہے جو اپنی عقل اور قوت عمل دونوں سے کام لیں اور اپنے شوق اجتہاد کی بدولت نئے راستوں اور نئے تجربوں کی تلاش میں رہیں - اس قسم کے معاشرے میں جمود پیدا ہوجانا اس کی خرابی کی صریح علامت ہے - مشہور انگریزی مفکّر برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) اپنی کتاب "تعلیم" (On Education) میں دونوں قسم کے معاشروں کی مثالیں دیتے ہیں - وہ کہتے ہیں [۱] کہ چین کا معاشرہ اور چین کی تعلیم اب سے کچھ عرصے پہلے تک سکون اور جمود کی نہایت عمدہ مثال تھی - وہاں کی تہذیب نے اپنی انتہائی ترقی کے زمانے میں دو چیزیں پیدا کیں یعنی سکون و استقلال اور آرٹ - لیکن وہ نہ سائنس پیدا کر سکی نہ ترقی کی خواہش اور قابلیت - اس کا ذہنی میلان ایک قسم کے فلسفۂ تشکیک (Scepticism) کی جانب تھا جس میں عقائد کی پختگی اور جوش و خروش نہ پایا جاتا تھا - جہاں کہیں یہ جوش اور حرکت پائی جاتی ہے وہاں اس کا نتیجہ یا تو انتہائی ترقی ہوتا ہے یا تباہی، سکون ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا- پرانی یونانی تعلیم بالخصوص ایتھنز (Athens) کی تعلیم میں یہ بات پائی جاتی تھی - کیونکہ یونانی لوگ چینیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ صاحب قوت اور صاحب حوصلہ تھے -

---

۱—دیکھو صفحہ ۲۰ -

قسم کے افراد اور جماعتوں کو وہ ساکن مثالیں (Stationary types) کہتے ہیں - برخلاف اس کے بعض افراد اور جماعتیں ایسی ہیں جو اپنے ماحول کے ساتھ اتنی ہم‌آہنگ نہیں ہیں کہ اُن کے نظام اور افعال میں تبدیلی کی ضرورت ہی نہ ہو - ان کو مسلسل نئے تجربوں اور تبدیلیوں سے سروکار رہتا ہے - اور یہ جماعتیں اپنی کوشش اور جد و جہد سے ایک طرف تو اپنے ماحول کو زیادہ پیچیدہ اور معنی‌خیز بناتی ہیں اور دوسری طرف اس ماحول کے ساتھ ہم‌آہنگ ہونے کی کوشش میں افراد کی نشو و نما کے سلسلے کو جاری رکھتی ہیں - اس طرح ان "متحرک جماعتوں" (Dynamic Types) میں ایک حرکت پیہم پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے تمام اداروں اور نظام زندگی میں تبدیلی اور نشو و نما ہوتی رہتی ہے - جمہوری معاشرہ اس قسم کی متحرک جماعت کی بہترین مثال ہے کیونکہ اس میں افراد اور جماعتیں برابر اوپر نیچے آگے پیچھے حرکت کرتی رہتی ہیں - اس کی زندگی مقررہ راستوں پر اور تنگ حدود کے اندر مقید نہیں رہتی بلکہ آزادی کی فضا میں پرورش پانے کی وجہ سے اس میں نئے راستے تلاش کرنے کی آرزو اور نئے تجربے حاصل کرنے کا جوش ہوتا ہے - اس لیے اس معاشرے میں جو تعلیم دی جائے وہ لازماً ایسی ہونی چاہیے جو نوجوانوں میں جدت اور اپج کا مادہ پیدا کرے' ان کو نامناسب قدامت پرستی سے بچائے اور ان کی تمام مخفی قوتوں کے لیے نشو و نما اور اظہار کے مواقع پیدا کرے - شخصی حکومت کی کامیابی کے لیے رعایا کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ وہ آنکھیں بند کر کے

متحدہ میں ھائی اسکول کی اعلیٰ جماعتوں میں حال ھی میں مدنیات (Civics) نصاب میں داخل ھوئی ھے -

جمہوری حکومت محض اسی وجہ سے دوسری حکومتوں سے مختلف نہیں کہ اس میں ملک کے انتظام کا طریقہ، حکمرانوں کا تقرر، اور اختیارات کی تقسیم مختلف ھوتی ھے بلکہ اس کے ماتحت جو معاشرہ نشو و نما پاتا ھے اس کی نوعیت بھی جداگانہ ھوتی ھے - اس معاشرے کے لیے لازم ھے کہ اس کے افراد اور جماعتوں میں باھمی ربط اور میل جول، تبادل خیالات اور شرکت عمل بہت زیادہ ھو اور وہ تمام بندشیں اور حدود جو انسانوں کو انسانوں سے علحدہ رکھتی ھیں اور ان کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف طبقوں میں تقسیم کرتی ھیں توڑ دی جائیں - یعنی یہ معاشرہ زیادہ متحرک ھوتا ھے، تبدیلیوں کو اور جدید اثرات کو جلد قبول کرتا ھے اور اس کے ماحول میں جو نئے حالات اس کی اپنی کوششوں یا خارجی اسباب سے پیدا ھوتے ھیں ان کے مطابق خود کو ڈھالتا رھتا ھے تاکہ وہ زمانے کے دوش بدوش ترقی کرے، اس سے پیچھے نہ رہ جائے - پروفیسر جیمز وارڈ (James Ward) نے اپنی قابل مطالعہ کتاب "نفسیات تعلیم" [۱] میں دو قسم کے ماحول میں تمیز کی ھے - ایک ماحول وہ ھے جس کی حالت کم و بیش یکساں رھتی ھے اس میں ایک ایسا مستقل سکون پایا جاتا ھے کہ اس میں زندگی بسر کرنے والے اپنی عادتوں اور افعال میں صدیوں تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے - اس

---

۱ - Psychology applied to Education -

میں فرقہ‌وارانہ سیاست کے اثرات طلبہ پر ڈالے جائیں گے۔ لیکن اول تو ہر کام میں جو کرنے کے قابل ہوتا ہے خطرے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی وجہ سے کوئی دانشمند اس کام کو ترک نہیں کرتا بلکہ ان خطرات کو دور کرنے کی تدبیریں کرتا ہے۔ دوسرے اگر جمہوری حکومت صحیح اصولوں پر قائم ہو اور رفتہ رفتہ لوگوں میں جمہوری ذہنیت پیدا ہو جائے تو اُن کے اغراض و مقاصد میں اس درجہ ہم‌آہنگی پیدا ہوجاتی ہے کہ سیاسی فرقہ بندیوں کے مضر اثرات مقابلتاً کم ہو جاتے ہیں اور سیاست کو مدرسوں میں دخل دینے میں نقصان کا زیادہ امکان نہیں رہتا۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ کی وجہ سے، جو کسی نہ کسی شکل میں آج کل ہر ملک میں جاری ہے، ابھی تک صحیح جمہوری ذہنیت پیدا نہیں ہوسکی اور مثلاً انگلستان میں جہاں کم از کم جمہوری ادارے مدتوں سے قائم ہیں آئے دن یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ مختلف پارٹیاں مدرسوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوششیں کرتی ہیں۔ مگر باوجود اس کے بھی بعض مقاصد تمام جماعتوں میں مشترک ہیں جو باسلوب مناسب شہریت کی تعلیم کے ضمن میں مدرسوں میں سمجھائے جاسکتے ہیں۔ اور جب ان زبردست سیاسی حریفوں میں ایک حد تک اغراض کی ہم‌آہنگی پیدا ہوگی تو صورت حال بہت بہتر ہو جائے گی۔ ہندوستان میں باوجود تمام اختلافات کے بھی یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ شہریت کی تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہے اور ابھی گزشتہ چند سال کے اندر مختلف تعلیمی محکموں نے اسے مدرسوں میں رواج دیا ہے۔ صوبجات

اور محدود خیالات میں جکڑ بند کردیتی ہے - سیاست کا
ایک مفہوم زیادہ وسیع اور عام ہے جس کا تعلق تمام قوم سے
ہے - اس مفہوم کے مطابق سیاسی احساس صحیح حب وطن
کی بنیاد ہے - وہ بچوں اور نوجوانوں کو اُن کے حقوق و فرائض
سے آگاہ کرتا ہے اور اُن کے دلوں میں انحصار باہمی اور
ذمہ‌داری کے احساس کو تازہ رکھتا ہے - یہ وہ قوت ہے جو
کسی ملک یا قوم کے افراد کو ایک رشتے میں منسلک
کردیتی ہے اور اُن اثرات کو جو انتشار کا باعث ہوتے ہیں
روکتی ہے - اس سیاست کو کسی حالت میں تعلیم اور
مدرسے سے علحدہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ مدرسوں کا فرض ہے
کہ وہ اپنے طلبہ کو شہریت کی تربیت دیں اور اُن کی تعلیم
کو محض رسمی اور نظری علوم تک محدود رکھنے کے بجائے
انہیں معاشرت اور سیاست کے زندہ مسائل سے روشناس کریں
جو آج کل کی متمدن دنیا میں عموماً اور خود اُن کے ملک
میں خصوصاً نہایت درجہ اہمیت رکھتے ہیں - شخصی
حکومت کے دور میں سیاست کو مدرسے میں دخل دینا غیر
ضروری اور غیر مفید ہے کیونکہ اس حالت میں بے غرضی
کے ساتھ اس کام کو انجام دینا تقریباً ناممکن ہے - مگر
جمہوری حکومت کے قیام اور استحکام کے لیے صحیح قسم
کی سیاسی تعلیم کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ اسی کے ذریعے سے
آئندہ شہری ان تمام مسائل اور فرائض سے واقف ہوسکتے ہیں
جو انہیں پیش آنے والے ہیں - اس میں بھی یہ اندیشہ ضرور
ہے کہ اگر معلموں کا انتخاب اور نصاب تعلیم کی تدوین بہت
احتیاط سے نہ کی جائے گی تو شہریت کی تعلیم کے بھیس

لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر عوام کے ہاتھ میں آ گئے ہیں
جو صدیوں سے جہالت یا بےحسی میں گرفتار ہیں اور
اپنی طاقت سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے - یہ نقطۂ خیال
محض جمہوریت کا پیش خیمہ ہے اصل جمہوریت اس وقت
شروع ہوتی ہے جب ''آقاؤں'' اور ''نوکروں'' کا یہ امتیاز جس
میں استہزا کی جھلک نظر آتی ہے بالکل اٹھ جائے -

ایک تعلیمی اصول مدت سے یہ چلا آتا ہے کہ ''تعلیم کو
سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے'' اور اس اصول
کو مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مقصد کے لیے حسب ضرورت
استعمال کیا ہے لیکن اس اصول کے سمجھنے میں اکثر لوگ
ایک غلطی کرتے ہیں جس کا صاف کرنا ضروری ہے - ہم یہ
پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ایسا زمانہ تو کوئی بھی نہ ہوا
جب تعلیم کو سیاست سے نہایت قریبی تعلق نہ رہا ہو -
قدیم زمانے سے اب تک ہمیشہ حکومت کی غالب جماعتوں
نے یہی کوشش کی ہے کہ مدرسوں کی تعلیم کے ذریعے
نوجوانوں کے سیاسی خیالات پر اثر ڈالیں - اس قسم کی
اثراندازی کو ہم تعلیمی لحاظ سے جائز قرار نہیں دے سکتے -
نوعمر لڑکوں کے دماغ میں قبل از وقت جب ان کی قوت
فیصلہ میں پختگی نہیں آتی کسی قسم کے سیاسی خیالات
ٹھونسنا سراسر نامناسب ہے کیونکہ وہ ان کی آزادی فکر اور
دماغی نشو و نما کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے - لیکن یہ
اعتراض اس سیاست پر عائد ہوتا ہے جس کا تعلق کسی
خاص پارٹی یا جماعت سے ہوتا ہے اور جو بجائے سیرت کی
تربیت میں معین ہونے کے عقل اور دماغ کو چند یک طرفہ

کو بے روک ٹوک نشو و نما کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے تربیت یافتہ ارادے اور آزاد رائے سے وہ راہ اختیار کریں جو اپنے لیے اچھی سمجھتے ہیں - اُن پر جبراً ایسے قاعدے اور قوانین عائد نہ کئے جائیں جو دوسرے لوگ اُن کے حق میں اچھا سمجھیں - البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اس آزادی کے استعمال میں دوسروں کی جائز آزادی میں مداخلت نہ کریں - جب ہم اس اصول کا اطلاق تعلیم پر کرتے ہیں تو اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام لوگوں کو اس طرح تعلیم دی جائے کہ وہ خود اپنا برا بھلا سمجھیں اور اپنے ذاتی اور معاشرتی فائدے کو اچھی طرح پہچان کر اس کے حصول کی کوشش کریں - بہ الفاظ دیگر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ چونکہ جمہوری حکومت کا کاروبار قوم کے تمام بالغ افراد کی رائے دہندگی پر منحصر ہے اور اس میں براہ راست یا بذریعۂ نیابت سب لوگ شریک ہیں اس لیے اس میں ہرگز اُس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک جمہور میں ذمہ‌داری اور سیاسی اور معاشرتی معاملات کی سمجھ پیدا نہ ہو - یہ ممکن ہے کہ شخصی حکومت بغیر رعایا کے تعاون کے' بغیر ان کو تعلیم دیے ایک حد تک کامیاب ہو جائے لیکن جمہوری حکومت کی کامیابی کے لیے ایک وسیع ہمہ‌گیر اور مناسب نظام تعلیم شرط لازم ہے - انیسویں صدی کے ایک مشہور انگریز مدبر نے کہا تھا کہ ''اب ہمیں اپنے آقاؤں کی تعلیم کی فکر کرنی چاہیے'' - اس کا مطلب یہ تھا کہ اب سیاسی انقلاب کی وجہ سے جماعتوں کی قوت کا توازن درہم برہم ہو گیا اور حکومت کے اختیارات رفتہ رفتہ چند

جمہوری نظام مستحکم ہوتا جاتا ہے اور لوگ اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھتے جاتے ہیں یہ تفرقے کم ہو رہے ہیں اور مروجہ رسمی اختلافات بھی مٹ رہے ہیں - سیاسی نقطۂ نظر سے تعلیم کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اس تحریک کو قوت پہنچائے اور جمہوریت کو سطحی معنوں میں نہیں بلکہ حقیقی اور گہرے معنی میں ملک میں رائج کرے -

جمہوری حکومت کا تصور سیاست کی تاریخ میں کوئی جدید تصور نہیں - انقلاب فرانس سے پہلے بھی اس کی مثالیں مختلف زمانوں میں بالخصوص اسلام کے ابتدائی دور میں ملتی ہیں لیکن بحیثیت ایک عملی سیاسی نظام کے اس نے انقلاب فرانس کے بعد ہی رواج پایا ہے - اس کی نمایاں سیاسی خصوصیت اور پہچان کیا ہے؟ شخصی حکومت میں فرماں روائی کی قوت جو کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے قوم سے بالکل آزاد ہوتی ہے اور فرماں روا قوم سے برتر یا جدا سمجھا جاتا ہے - ممکن ہے یہ بادشاہ یا فرماں روا لوگوں کی مرضی اور رضاجوئی کا خیال کرے لیکن اس پر ایسا کرنا لازم نہیں - اُسے اختیار ہے کہ وہ ایسا کرے یا نہ کرے - برخلاف اس کے جمہوری نظام میں کم از کم نظری طور پر قوم کی متفقہ رائے اور ارادے کی حکومت ہوتی ہے یعنی حکومت بجائے ایک خارجی اور ارادے کے ایک داخلی قوت بن جاتی ہے جس کی حامل قوم کی نمائندہ جماعتیں ہوتی ہیں - اور ان کے مشورے سے اور ان کی نگرانی میں حکومت کے کاروبار انجام پاتے ہیں - سیاسی آزادی کا موجودہ تصور یہ ہے کہ لوگوں کی قوتوں اور صلاحیتوں

کے ساتھ چل سکیں - یہ کہنا غلط ہے کہ فلاطون کو تعلیم کی تمدنی اہمیت کا احساس نہیں تھا - اس کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل کے ماہرین تعلیم کی نسبت زیادہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ معاشرے کے قیام اور اس کی اصلاح میں تعلیم کا کیا درجہ ہے - لیکن وہ وقتی اور مقامی حدود سے باہر نہیں نکل سکا اور اس کے خیالات قدرتی طور پر ان سے متاثر ہوئے جو اس زمانے کے معاشرے میں پائے جاتے تھے - اس لیے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس نے ان جماعت بندیوں اور معاشرتی اور اقتصادی اختلافات کو مستقل اور دائمی سمجھ لیا تھا جن کی وجہ سے اس کے زمانے میں یونانی معاشرہ مختلف طبقوں میں منقسم ہو گیا تھا - یہی وجہ تھی کہ اس نے مختلف جماعتوں کے لیے مختلف قسم کی تعلیم تجویز کی جس کی بنیاد محض نفسی اختلافات پر نہ تھی -

اُس زمانے کے حالات اور نظام معاشرت کے لحاظ سے ہم اس نظام تعلیم کو غیر مناسب نہیں کہ سکتے گو ہمارے اخلاقی اصولوں کے مطابق وہ قرین انصاف نہ ٹھہرے - لیکن اس وقت سے اب تک جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں انہوں نے ہماری زندگی کے سیاسی ماحول میں کایاپلٹ کر دی اور اس کے لیے یہ نظام تعلیم کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا - یہ صحیح ہے کہ اب تک ہماری معاشرت اور تعلیم دونوں میں ایسے اثرات موجود ہیں جنھوں نے معاشرے کو علحدہ علحدہ طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اس میں پوری طرح یکجہتی اور باہمی ربط موجود ہیں - لیکن جوں جوں

بےلکیے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا - فلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے وہ بھی مانتا ہے کہ ریاست میں حکومت کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام افراد کو جمعیت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انہیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا ہے" ۱ -

لیکن ریاست کے افراد کو اس نے دو مختلف جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے - اس میں ایک جماعت "فلسفی حکمرانوں" یا "فلسفی بادشاہوں" کی ہوگی جن کو بہترین معاشرتی اور انفرادی تعلیم دی جائے گی' جو عقل‌مند' فیاض اور باخبر ہوں گے اور رعایا کی ضرورت اور بہتری کو بخوبی سمجھ سکیں گے - ان کا فرض یہ ہوگا کہ وہ قانون بنا کر ریاست کے لیے انہیں نافذ کریں اور باقی لوگوں کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ بے چون و چرا اس قانون کی پابندی کریں - کیونکہ وہ عقل کل فلسفی جو قانون بھی بنائیں گے ان کی اطاعت لوگوں کے لیے سراسر بہتری کا باعث ہوگی - اس معاشرے کے لیے اس نے وہی نظام تعلیم تجویز کیا جو قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - یعنی کچھ لوگوں کو جن میں اعلیٰ صلاحیت ہو منتخب کر کے ان کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ حکمرانی کے قابل بنیں اور باقی لوگوں کو اطاعت اور فرماں‌برداری سکھائی جائے تاکہ ریاست کے سب کام عمدگی

---

۱ — افلاطون کی Republic کا ترجمہ "ریاست" کے نام سے انجمن ترقی اردو اورنگ‌آباد نے شائع کیا ہے - دیکھو صفحہ ۱۸ -

حکومت کا جو تصور آج کل ہمارے ذہن میں ہے وہ اس مفہوم سے بہت مختلف ہے جو پرانے زمانے میں سمجھا جاتا تھا - افلاطون نے نظام حکومت کا جو تخییلی خاکہ اپنی ریاست میں پیش کیا ہے اس میں اور موجودہ فلسفۂ سیاست میں یہ بات ضرور مشترک ہے کہ دونوں حکومت کو افراد کی فلاح اور بہبود کا ضامن سمجھتے ہیں - لیکن افلاطون کے نظریۂ حکومت میں ملک کے تمام افراد کے حقوق یکساں نہیں ہیں- وہ جنگ‌آزماؤں اور حکم‌رانوں کے لیے تعلیم کا ایک نظام پیش کرتا ہے جس کے ذریعے ان میں اپنے مخصوص فرائض کی ادائگی کی اہلیت پیدا ہو لیکن اس سب سے بڑے طبقے کا کوئی ذکر نہیں کرتا جس میں مزدور اور دولت کمانے والے لوگ شامل ہیں - وہ تعلیم کو حکومت کے اہم‌ترین فرائض میں شمار کرتا ہے اور ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانتا ہے - ڈاکٹر ذاکر حسین خاں افلاطون کی "ریاست" کے مقدمے لکھتے ہیں-

> "فلاطون سے پہلے بھی عام طور پر یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانا جاتا تھا یعنی ایسی جمعیت جو ایک مشترک متاع روحانی و اخلاقی کی مالک ہو - اس لیے ریاست کے فرائض لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترک متاع روحانی میں اپنے سب اراکین کو حصہ‌دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے آپ کو ایک تعلیمی ادارہ بنا دے جس میں رہ کر ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترک متاع روحانی کے ذریعے دوسرے افراد سے رشتۂ اتحاد پیدا کرے - اس متاع مشترک سے مراد وہ لکھے اور

چاہیے کہ ملک میں بہت تیزی کے ساتھ مستقیم تعلیم پہنچانے کی ضرورت ہے تاکہ جمہور اپنے نئے فرائض کو عمدگی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ یہ مقصد جمہوری حکومت کے قائم ہوجانے سے جلدتر حاصل ہوگا۔ عملی طور پر سیاسی اور مدنی تعلیم پانے کا موقع اسی صورت میں مل سکتا ہے۔

تعلیم اور حکومت کا باہمی تعلق مندرجۂ بالا بیان سے واضح ہوگیا ہوگا۔ ہم نے بتا دیا ہے کہ بالعموم حکومت پر تعلیم کے متعلق کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ لیکن علاوہ اس ظاہری تعلق کے حکومت اور تعلیم کی ماہیت میں بھی ایک گہرا رشتہ ہے جس کو نظام تعلیم سے زیادہ تعلیم کی روح اور غایت سے سروکار ہے۔ ہم نے پہلے باب میں صراحت کے ساتھ ظاہر کردیا ہے کہ تعلیم کو اپنے ماحول کے ساتھ ایک خاص تعلق ہوتا ہے خواہ وہ سیاسی ماحول ہو یا معاشرتی اور اگر اس ماحول میں تبدیلیاں واقع ہوں تو تعلیم کے منشا اور مفہوم پر اس کا اثر یقیناً پڑتا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں حکومت کے نظام اور فلسفۂ سیاست میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، جن کو انقلاب فرانس نے استحکام اور قبول عام بخشا ہے انہوں نے تعلیم کے نئے نئے مسائل پیدا کردیے ہیں اور اب ہمیں اس پر غور کرنا ضروری ہوگیا ہے کہ ان سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے تعلیم میں کیا تبدیلیاں لازم ہوگئی ہیں۔ ہندوستان میں اس مسئلے کی فوری اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ہمیں عنقریب نظام حکومت میں ان تبدیلیوں اور ذمہ داریوں سے سابقہ پڑنے والا ہے جو دنیا کے بیشتر ملکوں میں اس وقت پائی جاتی ہیں۔

کریں یا نہ کریں تو اندیشہ ھے کہ بعض لوگوں کی غفلت اور بےپروائی کی وجہ سے تمام معاشرے کے لیے خطرات پیدا ہو جائیں گے - تعلیم نہ صرف افراد کے لیے ضروری ھے کہ وہ اپنی زندگی کی باقاعدہ تنظیم کریں بلکہ حکومت اور معاشرت کے قیام کے لیے بھی وہ ناگزیر ھے خصوصاً جمہوری حکومتوں کے لیے کیونکہ وھاں ملک کا کاروبار چلانے کی ذمہداری تمام تر لوگوں پر ھے - اگر ملک کے ھر باشندے کو کم از کم اتنی تعلیم نہ دی جائے جو اس کو اپنے شہری اور ملکی حقوق و فرائض سمجھنے میں مدد دے سکے تو اس کو ایک ذمہدار شہری کا رتبہ کیسے دیا جاسکتا ھے اور وہ اپنے رائے دھندگی وغیرہ کے حقوق کا صحیح استعمال کیسے کرسکتا ھے؟ اس صورت میں ملک میں جاھل اور ناواقف لوگوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ھوجائے گی جو باقی لوگوں کے لیے خطرے کا باعث ھوگی - ھندوستان میں آج کل یہ حالت بہت عام اور اندیشہناک ھے . ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد نہایت کم ھے اور آبادی کا بہت بڑا حصہ ان لوگوں کا ھے جو خواہ اپنے کام میں مستعد اور اچھے ھوں لیکن ابھی ان حقوق و فرائض سے پوری طرح واقف نہیں جو ھندوستانی شہری کی حیثیت سے انھیں اس وقت حاصل ھیں یا بہت جلد حاصل ھونے والے ھیں - اس وجہ سے وہ بہت آسانی سے مختلف قسم کی نامعقول تحریکوں کا شکار ھو جاتے ھیں - ھر طرف سے سختیاں اور حق تلفیاں سہتے ھیں اور کچھ نہیں کرسکتے - اس صورت حال کو جمہوری نظام حکومت کے قیام کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں - بلکہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا

ہمارا مطلب محض تعلیم کی توسیع نہیں بلکہ تعلیمی اصلاح
بھی ہے، وہاں معلموں کی تعلیم کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے
اور اس کی مدت بھی ہمارے ملک سے بہت زیادہ ہے - البتہ
یہ ضرور ہے کہ اس تعلیم کو لازم قرار دینے سے پہلے اس کی
اصلاح اور تنظیم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ وہ بےروح تعلیم
جو عموماً ہمارے نارمل اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی
ہے ہرگز اس عظیم‌الشان فرض کے شایاں نہیں جو انہیں انجام
دینا ہے - اس لیے کہ استادوں کا کام اس زمانے میں محض
بچوں کو چند علوم و فنون سکھا دینا نہیں بلکہ نئی نسلوں
کی دماغی نشو و نما اور سیرت کی تربیت کے ذریعے قومی
تنظیم میں حصہ لینا ہے - مگر یہ مبحث بجائے خود اس
قدر وسیع ہے کہ اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں -
حکومت کو ایک حق یہ بھی حاصل ہے کہ وہ ملک میں
جبری تعلیم کا نفاذ کرے - اس حق کا جواز کس بنا پر ہے ؟
اگر گھوڑے کو اس کی مرضی کے خلاف گھاٹ پر لے جانا اور
مجبور کرکے پانی پلانا جائز نہیں تو کیا انسانوں کو جبری
طور پر تعلیم دلانا جائز ہو سکتا ہے ؟ حکومت کا فرض اس پر
ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ملک میں ابتدائی مدارس کا ایک
نظام قائم کر دے اور لوگوں کو آزادی ہو کہ خواہ وہ اس سے
مستفید ہوں یا نہ ہوں - حکومت معاشرے کے مقاصد اور
اغراض کو عمل میں لانے کا ایک آلہ ہے - اس لیے اس کا فرض
ہے کہ وہ تمام ایسے ذرائع اختیار کرے جو معاشرے بقا اور ترقی
کے لیے ضروری ہوں - اگر حکومت تعلیم کو اختیاری رکھے اور
اس بات کو لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دے کہ وہ تعلیم حاصل

جائے - لیکن اب کہ تعلیم کا شعبہ بہت کچھ ھندوستانیوں کے
کے ھاتھ میں آ گیا ہے اور تھوڑے دنوں میں اس کی تمام‌تر
ذمہ‌داری انھیں پر عائد ہوگی ہمیں اس معاملے میں جرأت
کے ساتھ ایک سخت پالیسی اختیار کرنی چاہیے تاکہ
محض جذبات سے متاثر ہوکر اور مروت میں آکر لوگ اپنے
بچوں کی تعلیم کو برباد نہ ہونے دیں - محکمۂ تعلیم کو اس
بات پر اصرار کرنا پڑے گا کہ بالعموم مدرسوں میں ایسے اساتذہ
کا تقرر کیا جائے جو باقاعدہ معلمی کے کام کے لیے تیار کیے
گئے ہیں اس شرط سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہر سند یافتہ
معلم لازمی طور پر قابل ہوتا ہے اور جو شخص کسی ٹریننگ
اسکول یا کالج کی چکی میں سے نہیں گزرا وہ معلمی کا کام
کر ہی نہیں سکتا - یہ امر مشاہدے اور تجربے کے خلاف ہے -
کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے دل و دماغ اور سیرت
میں قدرتاً وہ خصوصیات ہوتی ہیں جو معلم کے لیے لازم
ہیں اور بعض لوگ باوجود اعلیٰ درجے کی فنی تعلیم کے
معلمی کے لیے بالکل نااہل ثابت ہوتے ہیں - لیکن
بحیثیت مجموعی یہ امر مسلم ہے - کہ اچھا معلم فنی تعلیم
حاصل کرنے کے بعد اپنا کام اور زیادہ خوبی کے ساتھ اور برا
معلم اپنا کام قدرے بہتر کرسکتا ہے - محکمۂ تعلیم کو یہ حق
ہمیشہ حاصل ہونا چاہیے کہ خاص صورتوں میں بہت اچھے
معلموں کو فنی تعلیم کی شرط سے بری کر دے لیکن بالعموم
حکومت کو محکمۂ تعلیم کے توسط سے تمام معلموں کے لیے
یہ تعلیم لازم کر دینا چاہیے - جن ملکوں میں گزشتہ پچاس
سال میں تعلیمی ترقی ہوئی ہے اور یہاں تعلیمی ترقی سے

سے کوئی اپنی فطری صلاحیت کی وجہ سے اچھا معلم نکلتا تو یہ طلبہ کی خوش قسمتی تھی ورنہ بالعموم وہ لوگ جو دوسرے کاموں میں ناکامیاب رہتے یا ابتدا ہی سے اور کاموں کے لیے ناقابل ہوتے وہ بچوں کو پڑھانے کے لیے مدرسہ کھول دیتے تھے۔ انگلستان میں گزشتہ صدی تک یہ حالت دیکھنے میں آتی تھی اور مشہور ناول نویس چارلس ڈکنس (Charles Dickens) نے اپنے سحرنگار قلم سے سکویرز (Squeers) کے مدرسے کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں مبالغے کی چاشنی ضرور ہے لیکن نہ وہ خلاف واقعہ ہے نہ غیر معمولی - ہمارے ملک میں بدقسمتی سے اب بھی بےشمار چھوٹے چھوٹے مدرسے ایسے ہیں جن میں بالکل ناقابل اُستاد نہایت کم مشاہرے پر بچوں کو پڑھاتے ہیں - بلکہ پڑھاتے کیا ہیں اپنا وقت اور ان کی عمر ضائع کرتے ہیں - ہر وہ شخص جو کسی شہر یا قصبے میں مقامی اہمیت اور حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے چندے سے تھوڑا بہت روپیہ اکٹھا کرکے ایک مدرسہ کھول دیتا ہے اور اس میں کم سے کم تنخواہ پر اکثر ایسے استاد ''معلم'' رکھ لیتا ہے جو معلمی تو کیا کسی کام کے لیے بھی موزوں نہیں ہوتے - حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کے مدرسوں کی تعداد کو بڑھنے نہ دے کیونکہ ناقص تعلیم ' جو ایک خراب ماحول میں دی جائے' ہرگز جہالت سے بہتر نہیں - اس میں شک نہیں کہ ایک غیر ملکی حکومت کے لیے افراد کی تعلیمی کوششوں کو روکنا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ اس میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ تعلیمی جد و جہد اور تجربوں کی جائز آزادی میں فرق آجائے اور ملک میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی

کے لیے مدرسے جانا ضروری ہے - زندگی کا نظام بہت پیچیدہ
ہو گیا ہے اس لیے والدین اور پیشہ‌ور لوگ براہ راست اکثر
کاموں کی تعلیم نہیں دے سکتے - اور بعض ملکوں میں جہاں
صنعت و حرفت کی بےاندازہ ترقی نے انسانوں کو مشین اور
زندگی کو ایک بندھا ہوا معمول بنا دیا ہے گھر کی زندگی کا
قدیم نقشہ بھی بالکل بگڑ چکا ہے - حالانکہ یہی بچوں کی
ابتدائی تعلیم کا مرکز اور ان کی تربیت کا موثرترین ذریعہ
تھا - اس لیے یہ نئے فرائض بھی اب مدرسے کے ذمے پڑ گئے
ہیں - اور ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ہر کس و ناکس
اس اہم فرض کو بجا لائے گا خواہ وہ اس کام کے لیے باقاعدہ
طور پر تیار کیا گیا ہو یا نہیں - جب اس تخصیص اور
مہارت فن کے دور میں ہم معمولی کاموں کے لیے بھی
باقاعدہ تعلیم یافتہ ماہرین کی تلاش کرتے ہیں اور اس امر پر
مصر ہوتے ہیں کہ ڈاکٹری ' انجینیری ' زراعت غرض
ہر قسم کے کام کے لیے ایسے آدمی مقرر کئے جائیں جنھیں
ان شعبوں میں خاص مہارت ہو تو یہ کیسے جائز رکھا
جاسکتا ہے کہ' بچوں کی تعلیم و تربیت کو ایک ایسی
جماعت کے سپرد کردیں جو اس اہم فرض کی اہلیت
نہ رکھتی ہو - ہم جانوروں اور انسانوں کی جسمانی صحت کی
نگہداشت اور پھولوں اور پودوں کی نشو و نما کا انتظام جاہل
اور ناواقف لوگوں کے سپرد نہیں کرسکتے - مگر یہ کیسے تعجب
کی بات ہے کہ صدیوں تک انسانوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و
تربیت کو ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں رکھا جن کو اس فرض
کی ادائگی کی کوئی تعلیم نہیں دی گئی تھی - اگر ان میں

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ محکمۂ تعلیم کے نگران افسروں اور معلموں میں جب تک اس قسم کے امداد باہمی کے تعلقات قائم نہ ہوں گے ملک میں تعلیمی اصلاح ممکن نہیں کیونکہ تعلیم بالخصوص ان مشاغل میں سے ہے جن میں دفتری ذہنیت اور بندشیں نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں -

اُستادوں کی تعلیم کی ذمہ داری بھی حکومت کے سر ہے کیونکہ اس اہم کام کو تمام تر افراد اور جماعتوں کی مرضی پر نہیں چھوڑا جا سکتا - مدتوں تک لوگوں کا یہ خیال رہا کہ ہر شخص بچوں کو پڑھانے کا کام انجام دے سکتا ہے جو خود تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہو - اس کے لیے کسی خاص تعلیم و تربیت یا انتخاب کی ضرورت نہیں - جب تک تعلیم خاص طبقوں تک محدود تھی اور افراد اپنی مرضی اور طبیعت سے تعلیم کے فرض کو اپنے ذمے لیتے تھے اس طرح کام چلتا رہا - طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اور معلمی کا فرض اکثر وہ لوگ انجام دیتے تھے جو کم از کم اپنے خیال میں اس سے کچھ طبعی مناسبت رکھتے تھے - علاوہ بریں اس وقت مدرسے یا معلم کا کام یہی تھا کہ اپنے شاگردوں کو علم سکھائے یعنی ان کو درسی کتابیں پڑھا دے - تعلیم کے دوسرے پہلوؤں یعنی کسب معاش اور تمدنی زندگی کی تیاری کی طرف معاشرہ خود توجہ کرتا تھا - بچے مختلف قسم کے عملی کاموں اور معاشرتی مشاغل میں شرکت کرتے تھے اور اس طرح ان کی درسی تعلیم کی تکمیل زندگی کے مدرسے میں ہوتی تھی - لیکن اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے - تعلیم عام ہو گئی ہے اور کم از کم ابتدائی مدارج تک ہر بچے

امتحانوں کے نتیجے کی کسوٹی پر کسے جاتے تھے اور ان کا مستقل ہونا اور ترقی پانا سب کچھ اس بات پر منحصر تھا کہ کسی طرح امتحانوں کا نتیجہ خاطر خواہ رہے اور اس طرح تعلیمی دیوتا خوش رکھے جائیں - لیکن یہ صورت حال اب بالکل بدل چکی ہے - بورڈ کا کام مشورہ دینا اور رہنمائی کرنا قرار پایا ہے - وہاں سے استادوں کے لیے مختلف تعلیمی مباحث پر رپورٹیں اور رسالے شائع ہوتے ہیں جو ان کو نئے راستے سمجھاتے ہیں - بورڈ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ایک عام معیار تجویز کر دیتا ہے جس سے مدرسوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں ایک مقررہ مدت میں کم و بیش اس قدر کام کرنا ہے اور پھر وہ اس کے لحاظ سے اپنے کام کی تنظیم کر سکتے ہیں - اسی اصول پر انسپکٹر بھی کام کرتے ہیں - اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کا نقطۂ نظر بہت کچھ اس کی طبیعت اور خیالات پر منحصر ہوتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی اب انسپکٹروں کی جماعت کا کام پولیس کے سپاہیوں کی طرح معلموں کے جرائم اور کمزوریوں کی تفتیش کرنا اور سزا دینا نہیں بلکہ ان کو مدد دینا اور ان کو نئے تعلیمی طریقوں سے اور تجربوں سے روشناس کرنا ہے - بقول زمانۂ حال کے ایک مصنف کے ''محکمۂ تعلیم کا انسپکٹر ہیڈ ماسٹر کے پاس بیٹھ کر سگرٹ کا کش لگائے گا اور دوستانہ گفتگو کے دوران میں اپنا وسیع تر تجربہ اس کے سامنے پیش کر دے گا '' -

ممکن ہے ہندوستان کے بعض ''دفتری'' ذہنیت رکھنے والے انسپکٹر اور تعلیمی افسروں کو اس تصور سے غش آ جائے

تحقیق کی بنا پر طلبہ کو مناسب کام حل کرنے میں مدد دیتے ہیں - علاوہ بریں غریب طلبا کو معقول وظائف دیے جاتے ہیں جس سے نہ صرف ان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں بلکہ ایک حد تک ان والدین کی بھی دستگیری ہو جاتی ہے جو اپنے بچوں کو مدرسے بھیجنے کی وجہ سے ان کی مالی امداد سے محروم ہو جاتے ہیں اور خود معذور ہونے کی وجہ سے اپنی روزی نہیں کما سکتے -

حکومت کے ذمے یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ نظام تعلیم کی عام نگرانی اور رہنمائی کرے تاکہ مختلف مدارس کے تعلیمی معیار میں یکسانی رہے - اگر مناسب نگرانی نہ کی جائے گی تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ بعض تعلیم گاہیں اپنے تعلیمی فرائض کو محنت اور دیانتداری کے ساتھ انجام نہ دیں گی اور ان کا معیار بہت گر جائے گا - محکمۂ تعلیم کو ایسی مناسب تجاویز اختیار کرنی چاہییں جس سے معلموں کے دل میں اپنے فرائض کا احساس تازہ رہے اور انہیں بجا لانے کی ترغیب ہو اور نئے تعلیمی تجربوں اور تحریکوں سے واقف ہونے کا موقع ملے - اسے ایسی عام ہدایات اُستادوں کی رہنمائی کے لیے شائع کرنی چاہییں جن پر اُستاد اپنے اپنے مقام پر عمل کر سکیں لیکن ان کی جائز آزادی میں فرق نہ پڑے - گزشتہ صدی تک انگلستان میں بورڈ آف ایجوکیشن (مرکزی مجلس تعلیم) اور اس کے کارکن گورنمنٹ انسپکٹر اُستادوں اور مدرسوں پر جابر جاسوسوں کی طرح مسلّط تھے - ان کے لیے صدر دفتر سے تفصیلی احکام جاری کئے جاتے تھے جن پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا اُستادوں کا کام تھا - وہ

جاتی - ایک فرض شناس حکومت کا کام یہ بھی ہے کہ مالی امداد کے ذریعے سے جہاں تک ممکن ہو ان روکاوٹوں کو دور کرے جو غریب طلبہ کی راہ میں حائل ہے تاکہ وہ اپنی تعلیم کے زمانے میں اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہ سکیں اور امیر و غریب کا فرق کم سے کم مدرسے میں ان کو حتی‌الامکان محسوس نہ ہو - اکثر متمدن حکومتوں نے اس ذمہ‌داری کو قبول کر لیا ہے اور اپنی اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق ایسے انتظامات کئے ہیں جن سے غریب طلبہ اور ان کے والدین کی مشکلات میں کمی ہو گئی ہے - چنانچہ یورپ اور امریکا کے بعض ملکوں میں جو تعلیمی قوانین حال میں نافذ ہوئے ہیں ان میں یہ امر بھی شامل ہے کہ حسب ضرورت حکومت طلبہ کو خوراک اور لباس کے مصارف میں امداد دے گی تاکہ ناقص یا ناکافی خوراک اور لباس کی وجہ سے ان کی صحت پر برا اثر نہ پڑے - اسی طرح محکمۂ حفظان صحت کا تعلق مدرسوں سے قائم کیا گیا ہے تاکہ وہ طلبہ کی نگہداشت کرے اور وقتاً فوقتاً طبی معائنہ کر کے بیماریوں کی روک تھام اور صحت کے قیام کے لیے مناسب تدابیر عمل میں لائے - بےروزگاری کے مسئلے کو حل کرنے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار سے لگانے کے لیے بھی حکومت نے کوششیں کی ہیں اور جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں بعض ملکوں میں ایسے دفتر (Employment Bureaus) قائم کئے گئے ہیں جن کا تعلق ایک طرف مدرسوں، ہیڈ ماسٹروں اور والدین سے ہے اور دوسری طرف صنعت و حرفت کے نظام اور مختلف پیشوں سے، اور وہ اپنی واقفیت اور

کافی وسائل بہم پہنچائے ہیں نہ موجودہ تعلیم کی اصلاح، بہتری اور استحکام میں اسے کامیابی ہوئی ہے - اُس ذمہ‌دار ہندوستانی حکومت کو جو جدید آئینی اصلاحات کے نافذ ہونے پر وجود میں آئے گی بہت جلد اس مسئلے سے سابقہ پڑے گا اور بجٹ بنانے کے تمام پرانے اصولوں کو بدلنے کے بعد اس میں تعلیمی مصارف کو وہ نمایاں حیثیت حاصل ہوگی جس کے وہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستحق ہیں - یہ سوال قومی زندگی اور فلاح کے لیے نہایت درجہ اہم ہے اور اگر ہمیں ترقی کی دوڑ میں معاصر اقوام سے پیچھے رہنا گوارا نہیں تو ہمیں بھی تعلیم کی اشاعت اور ترقی کے لیے اسی مستعدی اور یک جہتی کے ساتھ جد و جہد کرنی پڑے گی جس طرح مثلاً روس میں انقلاب کے بعد سے ہو رہی ہے - ہم اپنی موجودہ حالت کا مقابلہ تیس چالیس برس پہلے کی حالت سے نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس زمانے میں دوسرے ملک جن کے دوش بدوش ہمیں چلنا ہے، کیا کر رہے ہیں اور تعلیم پر کس قدر صرف کر رہے ہیں - لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حکومت کے تعلیمی مصارف میں محض یہی خرچ شامل نہیں کہ اعلیٰ اور ثانوی مدارس قائم کیے اور چلائے جائیں اور غیر سرکاری مدرسوں کو امداد دی جائے - تمام متمدن ممالک میں لازمی ابتدائی تعلیم کا اجرا ہو چکا ہے یا ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ یہ تعلیم مفت دی جائے تاکہ ملک کے تمام بچے اس سے مستفید ہو سکیں - اس خرچ کی ذمہ‌داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے - مگر یہ ذمہ‌داری یہیں ختم نہیں ہو

ہے کہ تعلیم پر خرچ کرنا ایک ضروری مصرف ہونے کے علاوہ
قومی کفایت کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے - اگر صحیح قسم
کی تعلیم ملک میں رائج ہو تو اس بےشمار رقم میں بہت
کفایت ہو سکتی ہے جو اس وقت مختلف قسم کے
جیل خانوں' اسپتالوں' مجرموں کی بستیوں اور دیگر تعزیری
انتظامات پر صرف ہوتی ہے - پہلی نظر میں یہ دعوی بہت
مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے اور اس کی تردید میں ایسے
اعداد و شمار پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے
کہ بعض ملکوں میں تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ تعداد
اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے جرائم بہت بڑھ گئے ہیں -
لیکن اس اضافے کی ذمہ‌داری ناقص اور نامکمل تعلیم پر ہے
اور اس غفلت پر ہے جو تربیت کی طرف سے برتی جاتی ہے نہ
کہ نفس تعلیم پر ! ڈاکٹر کرشن اشٹائنر (Kerschensteiner)
نے جو جرمنی کے ایک نہایت زبردست تعلیمی مفکر
اور منظم تھے اور جن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے
اپنی کتاب "Schools and the Nation" (مدرسے اور قوم)
میں تعلیم کے اس اصلاحی اور کفایتی پہلو پر زور دیا ہے -
ہندوستان میں بھی گزشتہ پچاس سال میں مقابلتاً تعلیمی
بجٹ میں بہت اضافہ ہوا ہے لیکن ضروریات کے لحاظ سے
موجودہ تعلیمی بجٹ بالکل ناکافی ہے اور ہندوستانیوں کو
حکومت سے ایک عام شکایت یہ ہے کہ وہ فوجی مصارف میں
ملک کے مداخل کا تقریباً نصف خرچ کر دیتی ہے اور تعلیم
پر اس کا بہت تھوڑا حصہ صرف ہوتا ہے - مالی دقتوں کی
وجہ سے حکومت نے اب تک نہ تعلیم کی توسیع کے لیے

تو یقیناً ملک کا افلاس ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کی ذمہ‌داری پبلک اور محکمۂ تعلیم کی بےحسی پر بھی عائد ہوتی ہے کیونکہ ان کو یہ احساس ہی نہیں کہ بچوں کی نشو و نما میں ایک موزوں ماحول کو کس درجہ دخل ہے - ورنہ باوجود روپئے کی کمی کے بھی یہ ممکن ہے کہ شہری اور دیہاتی مدرسوں میں بہت کم خرچ سے ایسی چیزیں مہیا کی جائیں جو طلبہ کے لیے مفید اور آرام‌دہ ثابت ہوں - مگر بالعموم سوائے خال خال خوش قسمت مدرسوں کے' اور کہیں ہمیں سوائے ٹوٹے پھوٹے ڈسکوں' بلچوں اور چند نقشوں اور سیاہ تختوں کے کچھ بھی نہیں ملتا - پھر ہم کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ ایک ایسی عمارت میں بچے دلچسپی کے ساتھ ہر روز کئی گھنٹے گزار سکیں اور ان مدرسوں کے گرد ایسی روایات مجتمع ہو جائیں جن کو نوجوانوں کی نسلیں یکے بعد دیگرے عزیز رکھیں؟ وہاں ان کے مذاق کی اصلاح اور تربیت کیسے ہو سکتی ہے؟ تعلیمی اصلاح کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ مدرس اور محکمۂ تعلیم دونوں اس جانب توجہ کریں اور مدرسوں کی مادی حالت کو بہتر بنائیں اور حکومت کا فرض ہے کہ اس کوشش میں ان کی مدد کرے -

اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومت کے فرائض میں قومی تعلیم کے مصارف کا مہیا کرنا بھی شامل ہے- گزشتہ دو صدیوں کے اندر اندر اکثر حکومتوں نے یہ ذمہ‌داری قبول کر لی ہے اور ان کے سالانہ بجٹ کا مطالعہ کرنے کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تعلیمی اخراجات سال بہ سال نہایت تیزی کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے محسوس کرلیا

بیان کیا ہے جس سے اسکول کے فرنیچر[1] کی اہمیت معلوم ہوتی ہے - بہت سال گزرے ایک معلم نے نیویارک کی تمام بڑی بڑی دوکانوں کا گشت لگایا جہاں اسکول کا فرنیچر فروخت ہوتا تھا - اور ایک خاص قسم کے ڈسکوں اور کرسیوں کی تلاش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی - ایک دوکاندار نے جو دوسروں سے زیادہ سمجھدار تھا معلم موصوف کا مطلب سمجھ کر جواب دیا - ''اچھا آپ کو ایسے ڈسکوں کی تلاش ہے جس پر طلبہ کام کرسکیں لیکن ہم لوگ جو ڈسک بناتے ہیں وہ تو اس لیے ہوتے ہیں کہ طلبہ ان پر بیٹھ کر اُستاد کے لکچر سن سکیں''- اس قصے سے پروفیسر موصوف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کچھ عرصے پہلے مدرسوں میں اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ طلبہ خود کوئی عملی کام کرسکیں بلکہ وہ اُستاد کی سزا کے خوف سے چپ چاپ اور بےحس و حرکت بیٹھ کر اس کے سبق کو سنتے تھے یا سوالات کا جواب دیتے تھے اور جب موقع ملتا تھا تو اس خلاف فطرت خاموشی کے بدلے میں بےتحاشا اودھم مچاتے تھے- بہر حال اس وقت سے اب تک امریکا کے مدرسوں میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوگئی ہیں اور ان کے فرنیچر تک میں اس قدر ترقی ہوگئی ہے کہ ایک ناواقف شخص کو، جو نئے تعلیمی خیالات سے آگاہ نہیں ہے کسی جدید مدرسے کو دیکھ کر یہ پہچاننے میں بھی دقت ہوگی کہ یہ عمارت کسی تعلیم‌گاہ کی ہے یا بچوں کے کھیلنے، تفریح کرنے اور دستکاریاں سیکھنے کے لیے ہے - اس لحاظ سے ہمارا ملک بہت پیچھے ہے کیونکہ ہمارے مدرسے کیا بہ لحاظ عمارت کے اور کیا بہ لحاظ سامان کے بالعموم نہایت ابتر حالت میں ہیں - اس کی ایک وجہ

مختلف مشاغل میں شریک ہوں اور اس طرح ان کی جسمانی اور دماغی نشو و نما آزادی کے ساتھ ہو سکے - مدرسے کے ماحول کی تشکیل ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے لیے طرح طرح کے اہتمام کی ضرورت ہے - اس کا ایک جزو طبیعی ماحول کی درستی ہے - "مدارس عمل" (Activity Schools) قائم کرنے کی جو تحریک گزشتہ چند سال میں یورپ اور امریکہ کے بعض ملکوں میں جڑ پکڑ چکی ہے اِس کا ایک نمایاں عنصر ان مدرسوں کا طبیعی ماحول ہے - ڈاکٹر فیریر (Ferriere) نے جو سوئستان اور وسطی یورپ میں اس تحریک کے قائدینِ‌اعظم میں سے ہیں اپنی کتاب "L'Ecole Active" (مدرسۂ عمل) میں پورا ایک باب اس بحث کی نذر کیا ہے کہ مدارسِ جدید کا طبیعی ماحول کیسا ہونا چاہیے - اسی طرح بلجیم کے ایک مشہور ماہر تعلیم واس کونسلو (Vasconcellos) جنہوں نے جنگ یورپ سے چند سال پیشتر ایک تجربی مدرسہ قائم کیا تھا اپنی کتاب ۱ میں اسی مدرسے کا حال لکھتے ہوئے نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ مدرسے کی عمارت، ساز و سامان آلت تعلیم اور گرد و پیش کی فضا بچوں کے جسم اور سیرت کی نشو و نما پر کیا اثر ڈالتی ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اپنی چھوٹی سی کتاب (School and Society) (مدرسہ اور معاشرہ) میں ایک واقعہ

۱—Une Ecole Nouvelle in Belge جس کا ترجمہ انگریزی میں A New School in Belgium کے نام سے شائع ہوا ہے -

جب حکومت کے تعلیمی محکموں اور افسروں نے مدرسوں پر سے اپنی آهنی گرفت ڈھیلی کر دی - اس وقت مدرسوں کو ایک گونہ آزادی نصیب ہوئی کہ خود اپنی تعلیم اور زندگی کی تعمیر کریں اور "بورڈ آف ایجوکیشن" کی حیثیت محض ایک مشورتی ادارے کی قرار پائی - ہمارا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ حکومت' جو قومی زندگی کا سب سے منتظم اور زبردست ادارہ ہے' نظام تعلیم سے بالکل سبکدوش ہو جائے - رفتار زمانہ کا تقاضا تو اس سے بالکل مختلف ہے یعنی یہ کہ حکومت ان تمام تعمیری کاموں میں پہلے سے زیادہ حصہ لے جو ملک کی بہبودی کے لیے ضروری ہیں - لیکن جہاں تک تعلیم کے میدان کا تعلق ہے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس مداخلت کی نوعیت بہت مختلف ہونی چاہیے اور حکومت کے لیے لازم ہے کہ اسے معقول اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے چند مخصوص فرائض انجام دے -

حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ' تعلیم کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائے اور وہ تمام انتظامات کرے جو ایک وسیع نظام تعلیم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہیں - ایک نہایت ضروری کام مدرسوں کے لیے موزوں عمارتیں اور وہ سامان مہیا کرنا ہے جس کے ذریعے بچوں کی تعلیم موثر اور خوشگوار بنائی جا سکے - گزشتہ سو سال میں اس لحاظ سے اکثر متمدن ممالک میں نہایت زبردست ترقی ہوئی ہے کیونکہ حکومت اور ماہرین تعلیم دونوں نے اس کوشش میں شرکت کی ہے کہ مدرسے کو ایک ایسا ماحول بنائیں جہاں بچے خود بہ خود خوشی سے کام کریں' کھیلیں'

ہونی چاہیے کیونکہ اس کا انحصار دو ایسے امور پر ہے جو حکومت کے اثر سے بالکل باہر ہیں ایک طرف تو قومی روایات' قومی سیرت اور قومی ضروریات اور دوسری طرف خود متعلم کی نفسی زندگی' اس کی طبیعت' اس کی نشو و نما کے قوانین - انہیں دونوں کے باہمی تعامل اور اثر سے تعلیم کے مقاصد کا تعین ہوتا ہے - اگر حکومت ایک منظم اور بااختیار جماعت ہونے کی حیثیت سے تعلیم کے مقاصد کو جزوی و کلی طریقے پر معین کرے گی تو اس سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ خالص تعلیمی مقاصد سیاسی اور خارجی مقاصد کے لیے قربان کر دیئے پڑیں گے - عملاً اس خرابی کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ ملک کے تمام مختلف مدارس جن کے ماحول اور روایات اور ضروریات مختلف ہیں حکومت کے مقرر کئے ہوئے یکساں مقاصد کے حصول میں کوشاں ہوتے ہیں اور ان میں آزادانہ نشو و نما کی فضا پیدا نہیں ہوتی - اسی طرح مدرسے کے اندرونی معاملات یعنی طریقۂ تعلیم اور نظم و نسق میں استادوں اور تعلیمی جماعتوں کو آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق کام کریں اور نئے تجربوں کے ذریعے تعلیمی ترقی اور اصلاح ہوتی رہے - جب کبھی مدرسے کے تعلیمی معاملات میں حکومت کی دلچسپی' مشورے' ہمت‌افزائی' عام نگرانی اور انفرادی کوششوں کی تنظیم کی حد سے آگے بڑھ جائے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم بےجان اور بےروح ہو کر رہ جاتی ہے - اس کی ایک جدید مثال یہ ہے کہ انگلستان میں جس قدر تعلیمی ترقی گزشتہ عرصے میں ہوئی وہ سب اس وقت سے

ہمیشہ ان مختلف جماعتوں اور ہم‌غرض طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے جو کسی خاص وقت میں ملک پر حاوی ہوتے ہیں - یعنی جو جماعت یا طبقہ برسر حکومت ہوتا ہے وہ لازمی طور پر یہ کوشش کرتا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں اپنے خیالات اور مقاصد کی اشاعت کرے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئی نسلوں کے خیالات اور دماغوں پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش میں تعلیم کے اولین اور اعلیٰ‌ترین مقاصد نظرانداز ہو جاتے ہیں اور بجاے اس کے کہ مدرسہ بچوں کے قواے ذہنی کی تربیت کرے اور ان کو "صحیح انسانی" زندگی کے قابل بنائے استادوں اور شاگردوں کی محنت اور توجہ دور از کار چیزوں میں صرف ہوتی ہے - تعلیم کا ایک مقصد جیسا کہ ہم پہلے باب میں بتا چکے ہیں' یہ ہے کہ وہ خود بچوں میں تعلیم اور نشو و نما کو جاری رکھنے کی صلاحیت پیدا کرے یعنی اس کے پیش نظر فرد کی صحیح اور مکمل ارتقا رہتی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تعلیم کا عمل آزاد ہو لیکن حکومت کی دست‌اندازی کی وجہ سے آزادی کا عنصر مفقود ہو جاتا ہے' تعلیم خارجی مقاصد کی مطیع ہو جاتی ہے' اور موضوع تعلیم بجاے ایک آزاد اور ارتقاپذیر ہستی کے ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے جو دوسروں کے ارادے سے چلتی ہے -

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کو تعلیم کے میدان میں کس حد تک اور کن کن امور میں دخل دینا چاہیے؟ جہاں تک تعلیم کی غایت کا تعلق ہے ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ حکومت کو اس پر کوئی دسترس نہیں

حد تک ان کے مصارف کی ذمہ‌دار ہے - انگریزی مثل ہے "جو دام دے کر بین بجوائے وہی راگ کی لے بتائے" اگر ملک میں ایسی تعلیم‌گاہیں قائم کی جائیں جن کے مقاصد اور پالیسی عام مروجہ مقاصد سے بالکل یا بہت کچھ مختلف ہو تو ان کا کامیابی کے ساتھ چلنا بہت مشکل ہے - کیونکہ وہ نہ صرف حکومت کی مالی امداد اور ملک کے اہل ثروت کی سرپرستی سے محروم رہیں گے بلکہ ان کے فارغ التحصیل طلبہ کو، جن کی اسناد پر سرکاری مہر نہ ہوگی، وسائل معاش تلاش کرنے میں بھی مشکلات پیش آئیں گی - یہی دقت ان "قومی تعلیم‌گاہوں" کو پیش آ رہی ہے جو گزشتہ پندرہ بیس سال میں جابجا قائم کی گئی ہیں -

اس مختصر سے تبصرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم اس زمانے میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی حکومت تعلیم میں بالکل مداخلت نہ کرے یعنی اس کی پالیسی اور مقاصد پر اثر ڈالنے کی کوشش نہ کرے - لیکن اس ناگزیر صورت حال کی وجہ سے یہ اور بھی ضروری ہے کہ ہم اس مداخلت کی حدود کا تعین کریں - ایک حد تک ہر حکومت کو اپنی حفاظت کے لیے اس دست‌اندازی کی ضرورت پڑتی ہے - لیکن حکومت کا اقتدار اور غلبہ جتنا زیادہ اور قوی ہو اسی نسبت سے اندیشہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے اصلی مقاصد فوت ہو جائیں گے - اگر حکومت بہترین قومی روایات اور اخلاقی صفات کا مجسمہ ہوتی تو اس کی مداخلت نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہوتی - لیکن یہ محض ایک خیالی تصویر ہے جس کا وجود کہیں نہیں - دراصل حکومت

کے لیے تیار کرے ۔ اس زمانے سے قطع نظر کرلیجیے جب
عیسائی مشنریوں کی تعلیمی کوششیں "کفر اور جہالت میں
بھٹکے ہوئے دیسیوں کو راہ ہدایت دکھانے" کے لیے وقف تھیں۔
ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں جو مراسلات اور
تعلیمی ریکارڈ ملتے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ
انگریزی تعلیم کا نفاذ اس غرض سے کیا گیا تھا کہ کمپنی کے
روزافزوں کاروبار کو چلانے کے لیے محرر اور چھوٹے درجے کے افسر
تیار کیے جائیں تاکہ ذرا ذرا سے کام کے لیے کمپنی کو انگلستان
سے لوگ نہ لانے پڑیں جو بیش قرار تنخواہوں کے طالب ہوتے
تھے - پھر یہ مصلحت بھی تھی کہ کچھ ایسے لوگ کمپنی کے
پاس رہیں جو تجارت اور ملک‌داری دونوں کے معاملات میں
اُن کے اور ہندوستانیوں کے درمیان واسطے کا کام دیں - اس کے
ساتھ ہی لارڈ میکالے (اور بعض اور نیک نیت لوگوں) کو یہ فکر
بھی تھی کہ اس وسیع بر اعظم کے لاتعداد باشندوں کو اس
جہالت سے نکالا جائے جس کی تاریکی میں یہ بچارے' ان
بزرگ کے نزدیک شہد اور مکھن کے سمندر میں غوطے کھا رہے
تھے ! اس وقت سے اب تک اگرچہ تعلیمی نقطۂ نظر میں
بہت کچھ تبدیلی ہو چکی ہے اور سرکاری بیانات' مراسلوں
اور تحریروں میں دوسرے اور بہتر مقاصد کی جھلک بھی نظر
آتی ہے لیکن عمل کے لحاظ سے تعلیم بحیثیت مجموعی
اب بھی متوسط طبقوں کو نوشت و خواند سکھانے اور ان کو
سرکاری نوکریوں کے واسطے تیار کرنے تک محدود ہے - علاوہ اس
کے سرکاری اور نیم سرکاری دونوں قسم کے مدارس کی تعلیم اور
پالیسی حکومت کی دست نگر ہے کیونکہ حکومت ہی بڑی

کی سرپرستی کرتے تھے شاھی عطیوں سے ان کی امداد کرتے تھے - بعض اوقات اُن لوگوں کو با قاعدہ سالانہ وظائف بھی ملتے تھے لیکن حکومت نہ نظام تعلیم قائم کرنے کی ذمہ‌دار تھی نہ اس کے تمام مصارف کی کفیل - مختلف علوم کے عالم اور ماھر اپنی اپنی جگہ پر اپنے خاص فن میں درس دیتے تھے - اُن کا حلقۂ درس اعلیٰ تعلیم‌گاہ کا کام دیتا تھا جہاں علم کے پیاسے دور اور نزدیک سے آکر جمع ھوتے تھے اور ان کے آگے زانوے ادب تہ کرکے اپنی پیاس بجھاتے تھے - ان درسگاھوں اور یورپ کی قرون وسطیٰ کی یونیورسٹیوں میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ھے کہ وھاں بھی شائقین علم ملک ملک پھرا کرتے اور جہاں کہیں کوئی جید عالم ھوتا اس کے درس سے مستفید ھوتے - یہاں تمام لوگوں کے لیے تعلیم کا انتظام نہ تھا لیکن مفلسی تعلیم کی راہ میں زیادہ حارج نہ ھوتی تھی اور سچا شوق رکھنے والوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھلے رھتے تھے - مذھبی جماعت کو مدارس پر اقتدار ضرور حاصل تھا کیونکہ اکثر علوم میں وھی لوگ اُستادی کا درجہ رکھتے تھے جنہیں علوم دین میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی - لیکن چونکہ ان بزرگوں کو سیاست اور حکومت سے کوئی گہرا اور بلا واسطہ تعلق نہ تھا اس لیے حکومت تعلیم کی آزادی میں سد راہ نہ تھی -

انگریزی عہد حکومت میں تعلیم اور حکومت کے درمیان ایک نیا اور مضبوط رشتہ قائم ھوگیا ھے اور کمپنی کے عہد کی ابتدا سے اب تک کم و بیش واضح طور پر حکومت کی یہی کوشش رھی ھے کہ تعلیمی مدارس کے ذریعے طلبہ کو اپنے مقاصد

پھیلائیں اور اس طرح ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ
کریں جو اشتمالی حکومت کے قیام کے لیے جد و جہد
کر رہے ہیں یعنی مقصد یہ ہے کہ پرولتاری (Proletarian)
فلسفہ کا بیج نوجوانوں کے دل و دماغ میں بویا جائے......
اس کا ایک ذریعہ یہ ہوگا کہ نظام تعلیم کی رہنمائی ان
لوگوں کے سپرد کی جائے جو اشتمالی اور اشتراکی ہیں اور
مزدوروں کے انقلاب سے ہمدردی رکھتے ہیں - دوسرے یہ کہ
اخباروں اور بچوں کی کتابوں کے ذریعے اشتمالی خیالات
کی اشاعت کی جائے اور تیسرے تعلیم عامہ کی تمام
درسگاہوں کی تنظیم اسی اصول پر کی جائے" ۱-

اسی معاملے میں روسی پالیسی اور دوسرے ملکوں کی
پالیسی میں یہ فرق ہے کہ روس میں علی‌الاعلان یہ مقصد
تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسرے ملکوں میں اس پر عمل کیا
جاتا ہے لیکن یہ نظریہ تعلیم میں صراحت کے ساتھ داخل
نہیں کیا گیا -

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا
ہے کہ زمانۂ قدیم میں حکومت نے تعلیم کے نظام کو اس طرح
اپنے مقاصد کا تابع نہیں بنایا جس طرح اوپر کی مثالوں سے
ظاہر ہوتا ہے - ہندوؤں اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں
تعلیم سے زیادہ‌تر اہل علم کو سروکار تھا جو کبھی بغیر کسی
خاص مالی امداد کے اور کبھی اہل ثروت کی سرپرستی میں
مدرسے چلاتے تھے - بادشاہ اور رؤسا اکثر تعلیم گاہوں اور عالموں

۱- صفحہ ۱۵۱ -

اپنے ذاتی یا خاندانی مفاد کی خاطر تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے اور اب جمہوری حکومت ان مقاصد کی خاطر تعلیم کی رہنمائی کرتی ہے جنہیں وہ اپنے خیال میں عام رعایا کے لیے مفید اور عمدہ سمجھتی ہے اور جن کے بغیر اس کی بنیادیں مستحکم نہیں ہو سکتیں - مگر بہر حال مدرسہ پروپگینڈا کا ایک ذریعہ پہلے بھی سمجھا جاتا تھا اور اب بھی سمجھا جاتا ہے - موجودہ زمانے میں اس کی نہایت واضح مثال روس جدید کا نظام تعلیم ہے جس کے بنیادی اور صریحی اصولوں میں یہ بات شامل ہے کہ مدرسوں کے ذریعے سوویٹ کے خیالات اور عقائد کی اشاعت کی جائے - پروفیسر پنکےوچ (Pinkevitch) جو موسکو یونیورسٹی کے صدر اور روس کے جیّد تعلیمی ماہرین میں سے ہیں مدرسے کے فرائض سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں [1]-

"مزدور بچوں کے مدرسۂ جدید کی ایک اور خصوصیت امتیازی اس کا مقصد یہ ہے کہ آنے والے انقلاب کے لیے جنگ جو شہریوں کی ایک جماعت تیار کرے اور نئے معاشرے کی تعمیر کے لیے معماروں کی ' قابل منتظموں' اور انقلاب پسندوں کی تربیت کرے "-

دوسری جگہ وہ اسی ضمن میں لکھتے ہیں :-

"تعلیم عامہ سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کا کام یہ ہوگا کہ وہ نوخیز نسلوں میں اشتمالی (Communist) خیالات

---

[1] New Education in Soviet Republic (ریاست سوویٹ میں تعلیم جدید) صفحہ ۱۶۲ -

فرانسیسی یا انگریز شہری کے عائد ہوتے ہیں - تعلیم کا مفہوم بجائے نوجوانوں کی شخصیت اور انفرادی قوتوں کی آزاد نشو و نما میں مدد دینے کے یہ قرار پایا کہ وہ بنے بنائے سانچوں میں ڈھالے جائیں خواہ ان کی نموپذیر شخصیت ارباب سیاست کے پسند کیے ہوئے سانچوں میں سمائے یا نہ سمائے - یہی طریقہ جمہوری حکومتوں نے اختیار کیا جو شخصی حکومتوں کے بعد قائم ہوئیں اور اب جن ملکوں میں جمہوری حکومتیں ہیں ان کی بھی یہی کوشش ہے کہ ہر نئی نسل کو ان خیالات اور روایات کے مطابق تربیت دیں جن پر جمہوری حکومت کا قیام ہے - اس کی ایک عمدہ مثال ممالک متحدہ امریکا کی ہے جہاں حکومت نے تمام باشندوں کے لیے عام اس سے کہ ان کا تعلق کسی مذہب یا طبقے سے ہو' ایک ہی نظام مدارس قائم کر دیا ہے تاکہ امیر اور غریب' عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کو دوش بدوش تعلیم دے کر تمام لوگوں میں ایک مخصوص جمہوری ذہنیت پیدا کی جائے- یہاں ہمیں اس امر سے بحث نہیں کہ انہیں اس کوشش میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اور یہ نظامِ تعلیم کہاں تک تعصب اور دوسرے نقائص سے پاک ہے - ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ جمہوری حکومت کو بھی اپنے شہریوں کی تعلیم سے کم از کم اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کسی اور نظام حکومت کو - بلکہ ایک وجہ سے' بہت زیادہ دلچسپی ہے کیونکہ یہاں ملک کے کار و بار اور فلاح کی ذمہ‌داری خود جمہور پر ہے - اگر ان میں معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کی کمی ہوگی تو تمام کام درہم برہم ہو جائیں گے - پس فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے زمانے میں بادشاہ بالعموم

سیاسی اور اخلاقی معاملات میں میں لوگوں کی رائے پر اثر ڈال سکیں"۔

اس تحریک پر جرمن فلسفہ اور خیالات کا خاص طور پر اثر پڑا اور تعلیم ایک ملکی مسئلہ تسلیم کر لی گئی۔ پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اس صورت حال سے اپنی کتاب میں بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس کی تاریخی وجوہ کیا تھیں۔ جرمنی کو "نپولین کے ہاتھوں شکست ہو چکی تھی۔ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ اپنی سیاسی قوت دوبارہ حاصل کرنے اور اپنی بگڑی حالت کو سدھارنے کے لیے تعلیم کو آلۂ کار بنائے اور مدرسوں کا ایک وسیع اور منظم سلسلہ قائم کرے۔ چنانچہ اس سیاسی صورت حال کا اثر نہ صرف تعلیم کے عملی نظام پر پڑا بلکہ تعلیم کا فلسفہ اور مقاصد بھی اس سے متاثر ہوئے۔ "جب ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹی تک سارے نظام تعلیم کا مقصد یہی ٹھہرا کہ وطن دوست شہری اور سپاہی اور حکام اور افسر تیار کیے جائیں اور ملک کی فوجی صنعتی اور سیاسی تحفظ اور استحکام کا اہتمام ہو تو لزوماً نظریۂ تعلیم میں بھی "اجتماعی افادے" (Social Efficiency) کے اصول کو اہمیت دی گئی" ۱۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ "اجتماعی افادے" کو بہت تنگ اور محدود معنی پہنائے گئے اس سے مراد "انسانی" فرائض کی ادائیگی نہ تھی بلکہ ان خاص فرائض کی ادائیگی جو ایک انسان پر مثلاً بحیثیت ایک جرمن یا

۱—جمہوریت اور تعلیم صفحہ ۱۰۹۔

ھوتا تھا - اس طرح قرون وسطیٰ میں جب یورپ میں تعلیم کا نظام ملکی حکومتوں کے ماتحت نہ تھا بلکہ عیسائی کلیسا، جو اس زمانے میں صرف مذھبی قوت کا مرکز ھی نہ تھا بلکہ بہت زبردست سیاسی اقتدار بھی رکھتا تھا ' اکثر ملکوں کے تعلیمی نظام پر حاوی تھا ' اس کی بھی یہی کوشش تھی کہ اپنے خاص مقاصد تعلیم کے ذریعے حاصل کرے - اس کی سب سے زیادہ موثر اور کامیاب مثال یسوعیوں (Jesuits) کا نظام تعلیم ھے جس نے ایک زمانے میں تقریباً تمام یورپ میں اپنا سکہ بٹھا دیا تھا اور ھر قسم کی مذھبی اور سیاسی تحریکوں کی سر کردگی حاصل کر لی تھی - اس کے بعد رفتہ رفتہ اس فرقے کا مذھبی اقتدار کم ھوگیا اور تعلیم بھی بڑی حد تک ان کے قبضے سے نکل گئی - اس زمانے میں مختلف اسباب ایسے جمع ھوگئے جن کی وجہ سے جماعتوں اور افراد کی متفرق تعلیمی کوشش قومی مقاصد کے لیے ناکافی ثابت ھوئی اور اس نظام تعلیم کی بنیاد پڑی جس کو اب ھم تقریباً تمام متمدن ممالک میں رائج پاتے ھیں - یعنی تعلیم کا انتظام حکومتوں نے اپنے ھاتھ میں لے لیا - لیکن یہ یاد رکھنا چاھیے کہ حکومت کا یہ فعل خود مطلبی سے خالی نہ تھا - خصوصاً ابتدا میں اکثر ملکوں کے مطلق العنان بادشاھوں نے مدرسے اسی غرض سے قائم کیے تھے کہ اپنی رعایا کے خیالات کو اپنی راے اور مقاصد کے مطابق ڈھالیں - نپولین نے اس خیال کو صاف صاف ظاھر کر دیا تھا :—

" اس نظام تعلیم قائم کرنے سے میری سب سے بڑی غرض یہی ھے کہ میرے ھاتھ میں ایک ایسا ذریعہ ھو جس سے

ملک کے باشندوں کی اخلاقی قدر میں اضافہ ہو' اس کے لیے یہ ضروری مناسب نہیں کہ وہ خود ایسے کام انجام دے کر' جو افراد اس کے برابر یا اس سے بہتر انجام دے سکتے ہیں' ان کی قوتوں کو معطل کر دے - حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کی ذاتی کوششوں کے لیے مناسب مواقع فراہم کرے نہ یہ کہ ان کے بجائے کام کرے یا ان کی کارکردگی اور حوصلے کو پست کردے"۱ -

یہ اصول حکومت کی مداخلت کی جائز حدود کا تعین کرتا ہے لیکن تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ دراصل حکومتوں نے کبھی خود کو ان حدود کے اندر نہیں رکھا بلکہ ہمیشہ اپنے امکان بھر یہ کوشش کی ہے کہ افراد کے افعال اور خیالات دونوں کو اپنے قابو میں رکھیں - چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے نہ صرف قوانین حکومت کا استعمال کیا بلکہ تعلیم پر حاوی ہو کر اس کے ذریعے لوگوں کے خیالات کو خاص سانچوں میں ڈھالنا چاہا - اس کی بہت سی مثالیں قدیم زمانے سے لے کر آج تک تاریخ میں مل سکتی ہیں - سپارٹا (Sparta) کی تعلیم کا نصب‌العین علانیہ طور پر یہ تھا کہ ایسے شہری پیدا کئے جائیں جو اپنی جسمانی طاقت اور تربیت کی بدولت ملک کے لیے مفید ثابت ہوں اور اس کی سیاسی حکومت کو مستحکم کریں - ایسی وجہ سے اسپارٹا میں بچپن ہی سے لڑکوں کی تربیت خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتی تھی اور اس میں والدین کا حصہ محض برائے نام

---

۱ Nation's Schools—1 صفحہ -

جهد میں دقتیں اور مجبوریاں حائل نہ ہوں - مگر شرط یہ ہے کہ حکومت کا یہ دخل انہیں مشاغل اور کار و بار تک محدود رہے جو ہماری مشترکہ زندگی پر اثر ڈالتے ہیں اور اس میں معین یا سد راہ ہیں - وہ افعال جو ہمارے ذاتی افعال ہیں، جن کا تعلق اور اثر ہماری ذات تک محدود ہے ان سے عموماً حکومت کو براہ راست نہ کوئی واسطہ ہوتا ہے نہ ہونا چاہیے - ہمارے خیالات اور جذبات، ہمارا مذہب اور عقیدہ ہماری اپنی چیز ہیں - ان میں حکومت کا کوئی حصہ نہیں اور جب تک ہم ان کے اظہار میں یا ان پر عمل کرنے میں دوسروں کے ساتھ بےجا تعرض نہ کریں حکومت ان میں کسی طرح دخل نہیں دے سکتی - اگر حکومت اس شعبۂ زندگی میں بھی دست اندازی شروع کر دے گی تو افراد کی جائز آزادی سلب ہو جائے گی اور حکومت کی مداخلت صحیح حد سے، جو صرف اس قدر ہے کہ افراد اور جماعتوں کی ترقی میں جو رکاوٹیں حائل ہوں انہیں دور کرے، تجاوز کر جائے گی - پروفیسر اسمتھ (Smith) اپنی کتاب "Nation's Schools" (قوم کے مدرسے) میں لکھتے ہیں -

"حکومت کی مداخلت کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ ہماری آزادی میں اضافہ ہو نہ یہ کہ اس میں اور کمی ہو جائے - اس کی بدولت ہمیں (اپنے کاروبار کے لیے) ایک ایسا ماحول ملنا چاہیے جس میں بےکھٹکے، بےتکلف رہنا سہنا چلنا پھرنا ممکن ہو - مثلاً ایک منظم حکومت میں تمام افراد کو سیاسی آزادی حاصل ہوتی ہے - علاوہ بریں چونکہ حکومت کے تمام افعال کا مقصد یہ ہے کہ

کو سمجھنا اور ان کی مداخلت کے حدود معین کرنا نہایت ضروری ہے -

حکومت افراد کی زندگی میں کیوں دخل دیتی ہے؟ اس کو انفرادی آزادی میں حائل ہونے کا کیا حق ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حکومت کے قیام کی غرض یہی ہے کہ وہ افراد کی کوشش کو مجتمع اور منظم کرکے ان کے مقاصد کے حصول میں امداد دے جو ان سب میں مشترک ہیں - افراد کا دائرۂ عمل جدا جدا رہے تو وہ بہت سے بڑے بڑے کام مثلاً ذرائع آمد و رفت' وسائل معاش کی فراہمی وغیرہ کے انجام دینے سے قاصر رہیں گے - لہذا اس قسم کے کاموں کو حکومت خود اپنے ہاتھ میں لیتی ہے یا ان کے انجام دینے میں امداد کرتی ہے - اس کے علاوہ جب افراد میں یا جماعتوں میں باہم اشتراک عمل یا مسابقت ہو تو ان کے اغراض و مقاصد میں اکثر اختلاف پیدا ہوتا ہے اور ان میں انصاف کرنے اور سمجھوتا کرانے کے لیے کسی ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو ان سب پر حاوی ہو اور قوی کو محض قوت کی وجہ سے کمزور پر غالب نہ آنے دے- اسی لیے حکومت افراد کے معاملات اور کار و بار میں دخل دیتی ہے اور ان کو باقاعدگی اور انتظام کے ساتھ چلانے کے لیے قوانین بناتی ہے' سزائیں معین کرتی ہے' افسر اور حکام مقرر کرتی ہے جو قانون کی پابندی کراتے ہیں اور امن قائم رکھتے ہیں- غرض اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ افراد اور جماعتوں کی زندگی کا ایسا نظام بن جائے جس کے ماتحت وہ اطمینان کے ساتھ اپنے جائز مشاغل میں مصروف رہیں اور ان کی جائز انفرادی جد و

باب پنجم

حکومت اور تعلیم

ہم اب تک کئی تمدنی اداروں سے بحث کر چکے ہیں جو بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم اور ان کی زندگی کی تشکیل پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالتے ہیں اور جن کی وجہ سے بہت سے اہم تعلیمی مسائل پیدا ہوتے ہیں - اب ہم ایک ایسے منظم ادارے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ان سے زیادہ وسیع ہے اور جس میں یہ مقابلتاً چھوٹی جماعتیں شامل ہیں' یعنی کسی ملک کی حکومت کا نظام جس کے ذریعے سے کوئی قوم یا جماعت اپنی عمرانی زندگی کی تنظیم کرتی ہے اور افراد کے لیے مشترک اور متمدن زندگی بسر کرنے کے اسباب اور وسائل مہیا کرتی ہے - ہمیں یہاں حکومت کے عام مقاصد اور اغراض سے بحث نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ تعلیم کی اشاعت اور رہنمائی کے ضمن میں حکومت پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور حکومت اس میں کس طرح اور کس حد تک دخل دے سکتی ہے - اس زمانے میں جب حکومت کا اثر اور مداخلت بڑھتی جاتی ہے اس کے اور تعلیم کے باہمی تعلقات

هیں لیکن ان سب کا ماحصل یهی هے کہ ملک کی معاشی تنظیم نہایت ابتر هے - یہ ابتری نہ صرف بےانتہا اقتصادی نقصان اور عام افلاس کا باعث هے بلکہ اس کی وجہ سے بےشمار افراد مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم هوگئے هیں - همارے نظام تعلیم کو جو مسائل درپیش هیں ان میں سب سے اهم غالباً یهی مسئلہ هے کہ یہ تنظیم کس طرح درست کی جائے تاکہ پیشہ شخصیت کی تربیت میں سد راہ هونے کے بجائے اس میں معین هو -

---

کا ایک باقاعدہ جدول تیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے منطالبات اور مواقع کے مطابق لوگوں کو مختلف راستوں پر لگایا جائے - اس میں یقیناً ایک حد تک انفرادی آزادے کی روک ضرور ہے لیکن یہ روک افراد اور معاشرے دونوں کے فائدے کے لیے ہے اور موجودہ زمانے میں ہر متمدن حکومت ایک حد تک افراد کی آزادی کو روکتی ہے تاکہ اجتماعی زندگی کے نظام میں فرق نہ آئے - اس کی وجہ سے افراد کا باہمی بےقید مقابلہ بھی کم ہوجائے گا جو ممکن ہے انتخاب طبیعی کے ناسمجھ حامیوں کو برا معلوم ہو لیکن ہر تمدنی نظام کا کام انتخاب طبیعی کے سخت‌گیر اور نقصان‌دہ اصول کی ترمیم کرنا ہے - لہذا ان کا اعتراض قابل توجہ نہیں - ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کیوں ملک کی تمام یونیورسٹیاں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں وکلا پیدا کر رہی ہیں جب ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس پیشے میں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ لوگ بھرے ہوئے ہیں اور تعداد کی یہ روزافزوں اور غیر مناسب زیادتی نہ صرف اس پیشے کے اراکین کے لیے مضر ہے بلکہ ان کی اندرونی زندگی اور باہمی مسابقت پر ایسا اثر ڈالتی ہے جو اخلاقاً اور عقلاً ہر طرح قابل اعتراض ہے - اس بد نظمی کا ایک ادنیٰ سا نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن کئی کئی سال کا تجربہ رکھنے والے وکلا ناکامی سے عاجز آ کر معلمی اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور معلم جو اپنے پیشے میں زیادہ توقعات نہیں پاتے وکالت کا امتحان پاس کرکے اس اُمید موہوم پر عدالتوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں کہ شائد وہ وہاں کامیاب ہو سکیں - ایسی ہی اور بھی بہت سی مثالیں دی جاسکتی

نہ صرف طلبہ کے لیے اچھا ہے کہ وہ بے روزگاری اور پریشانی سے محفوظ رہتے ہیں اور غیر موزوں کاموں میں اپنی صلاحیت اور زندگی کو برباد نہیں ہونے دیتے' بلکہ ملک کے لیے بحیثیت مجموعی یہ بات بہت اطمینان بخش ہے کہ اس کے افراد کی قوتیں صحیح مصرف میں لائی جائیں اور انہیں تخریبی مشاغل میں پڑنے سے بچا لیا جائے - کسی ملک میں بےروزگاری کا بڑھ جانا مرض کی علامت ہے اور اس کے تدارک کے لیے مناسب وسائل اختیار کرنا حکومت اور جمہور دونوں کا فرض ہے - حال ہی میں جرمنی نے استادوں کی تعلیم کا جو جدید نظام رائج کیا ہے اس کا ایک جزو لازم یہ ہے کہ ہر علاقہ کا ٹریننگ کالج مقامی حکام کی مدد سے یہ اندازہ کرے کہ مثلاً آئندہ پانچ سال میں کتنے نئے معلموں کی ضرورت ہوگی- کالج میں ہر سال طلبہ کو اسی اندازے سے داخل کیا جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معلموں کی تعداد ضرورت سے بہت بڑھ جائے اور محکمۂ تعلیم میں ان کے لیے گنجائش نہ نکل سکے - حال ہی میں ہندوستان کے ایک صوبے میں ٹریننگ کالج کو اپنی معمولی تعداد دفعتاً نصف کردینی پڑی کیونکہ ٹریننگ کے بعد معلموں کے لیے مدرسوں میں اسامیاں نہیں نکلتی تھیں - لیکن فوری حالات بالکل مجبور ہوکر یہ طرز عمل اختیار کرنا اور بات ہے اور دور اندیشی کے ساتھ مستقبل پر نظر ڈال کر ایک مناسب شاہ راہ عمل اختیار کرنا دوسری بات ہے - ہندوستان میں آج کل تعلیم یافتہ طبقے میں بےروزگاری اور بےکاری کا مسئلہ روز بروز زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے - اس کی اصلاح کے لیے ہر صوبے میں وسائل معاش اور پیشوں کے امکانات

یہ ہے (بلکہ یہ بات اندیشہ کی حد سے آگے بڑھ چکی ہے اور واقعہ بن گئی ہے) کہ مختلف صوبے ریوڑی بانٹنے والے اندھے کی طرح اس پالیسی پر اس قدر سختی کے ساتھ عامل ہوں کہ اس سے ملک کے بہترین تعلیمی مفاد اور ترقی کو نقصان پہنچے - بعض کام اور پیشے ایسے ہیں جن میں معمولی قابلیت ذہانت اور تعلیم کی ضرورت ہے یا جن میں کوئی خاص فنی مہارت درکار نہیں ہوتی - ان کے لیے تقریباً تمام امیدوار صوبے کے اندر سے حاصل ہوسکتے ہیں - لیکن ان پیشوں اور نوکریوں میں جن کے لیے مخصوص قابلیت اور تربیت کی ضرورت ہے یا جن میں شخصیت کا عنصر سب سے زیادہ اہم ہے حلقۂ انتخاب کو محدود کردینا اور تنگ نظری اور صوبجاتی تعصب سے کام لینا سراسر حماقت اور نادانی ہوگی - ظاہر ہے کہ وہاں انتخاب کا صحیح معیار سکونت نہیں بلکہ قابلیت ہے - بہترین اُمیدوار جہاں سے ملیں بلا کر مقرر کرنا چاہیے - اس کے مصداق سول سروس سے زیادہ تعلیم کے عہدے، علمی تحقیق و تفتیش کے کام، صنعت و حرفت کے ماہروں کی جگہیں، غرض وہ تمام خدمات ہیں جن کے لیے موجد، مخترع، محقق اور غیر معمولی طور پر ذہین لوگ درکار ہیں -

ہم نے پیشوں کے متعلق جس قسم کے عام معائنے کی ضرورت بتائی ہے وہ یورپ اور امریکا کے بعض ممالک میں بارہا کیا جا چکا ہے اور روز بہ روز زیادہ احتیاط کے ساتھ کیا جاتا ہے- وہاں ایسے ادارے قائم ہیں جن میں ماہرین نفسیات، ارباب صنعت و تجارت اور سرکاری محکموں کی مدد سے طلبہ کو ان کے مستقبل کے متعلق مفید مشورہ دیتے ہیں - اس کا نتیجہ

و کمال صوبجاتی حکومتوں کے سپرد کردیا گیا ہے ہر صوبے کے تعلیمی اور مالی محکموں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے صوبے میں اس قسم کا عام معائنہ کرائیں اور وقتاً فوقتاً اس کا اعادہ اور تصحیح کرتے رہیں اور مناسب تعلیم اور وسائل معاش کی تنظیم کے ذریعے رفتہ رفتہ کام کرنے والوں اور کسب معاش کے مواقع میں صحیح نسبت قائم کریں - موجودہ صورت حال کسی طرح قابل اطمینان نہیں ہے کیونکہ مروجہ تعلیمی پالیسی کا حال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھی مشین بغیر بازار کی طلب اور خریداروں کی ضروریات کا خیال کئے کسی ایک قسم کی چیز بے تحاشا بنائے چلی جائے' اور اس سے بحث نہ ہو کہ یہ تمام پیداوار کس مصرف میں آئے گی - لہذا اس حالت کی اصلاح کے لیے اولاً صوبوں کو علحدہ علحدہ کوشش کرنی ہوگی اور اس کے بعد تعلیم کے لیے وفاقی نظام میں جو محکمہ بھی قائم کیا جائے اس کو ان انفرادی کوششوں میں ربط اور تعاون قائم کرنا پڑے گا کیونکہ اگرچہ بہت سے معاشی وسائل ایسے ہیں جن کا تعلق محض علحدہ علحدہ صوبوں سے ہوگا لیکن بعض ایسے مسائل اور مشکلات بھی ہوں گی جن کا حل تمام ہندوستان کے لیے ایک ہی طرح پر سوچنا پڑے گا - آج کل نہایت سرعت کے ساتھ تمام صوبوں میں یہ پالیسی مروج ہوتی جاتی ہے کہ روزگار کے معاملے میں پنجاب پنجابیوں کے لیے ہے بنگال بنگالیوں کے لیے بمبئی بمبئی والوں کے لیے اور علیٰ ہذا القیاس ایک حد تک یہ نقطۂ نظر صحیح اور جائز ہے اور ہر صوبے کو حق ہے کہ وہ اپنے باشندوں کو اپنے یہاں کی ملازمتوں اور پیشوں کے لیے ترجیح دے لیکن اندیشہ

حکومت اور اہل سیاست کی توجہ کی محتاج ہے - پیشوں کی تعلیم کے لیے ایک خاص اہتمام کی ضرورت ہے - ایک طرف جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں طلبہ کی صلاحیتوں اور رجحانات کا امتحان کرنا لازم ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ وہ کن مشاغل اور پیشوں کے لیے فطرتاً موزوں ہیں - اس تفتیش میں ہمیں ان "آزمائشوں" (Tests) سے مدد ملے گی جو گزشتہ سالوں میں ماہرین فن نے ترتیب دی ہیں - اس کام کو نظم اور ترتیب سے کرنے کے لیے جا بجا ایسے ادارے قائم کرنے چاہییں جن میں وہ تمام مواد جمع کیا جائے جس کا اس مسئلے سے تعلق ہے یعنی تمام مقامی طلبہ کے متعلق ان کے والدین اور اساتذہ کی رائیں، ان کے مدرسوں کی رپورتیں، آزمائشوں کے نتائج وغیرہ - پھر ان اداروں کا یہ فرض ہو کہ ان تمام چیزوں کی بنا پر طلبہ کو پیشہ اختیار کرنے کے بارے میں معقول اور معتبر مشورہ دیں - لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے - ہم کسی ملک کی معاشي تنظیم محض افراد کی صلاحیتوں کی بنا پر نہیں کرسکتے - ہمارا دوسرا فرض یہ ہوگا کہ ہم باقاعدہ تحقیق کر کے معلوم کریں کہ ملک میں مختلف پیشوں اور کاروبار میں کہاں کہاں اور کس قدر گنجائش ہے - کہاں ایک خاص پیشے کے امیدواروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے اور کس شعبے میں ایسے مواقع ہیں جن سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا - ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اس کا انتظام کرنا یقیناً بہت مشکل اوو بڑی ذمہ‌داری کا کام ہے اور ممکن ہے کہ ان لوگوں کو جو تمام مفید تحریکوں کا مضحکہ اُڑایا کرتے ہیں یہ ناممکن معلوم ہو - لیکن اب جب کہ تعلیم کا مسئلہ تمام

ہے؟ ایسا کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ ہم ان کے مخصوص اور نمایاں رجحان کو بھی کمزور یا معدوم کردیں گے - ان طلبہ کو ایسے مضامین پسند کرنے کا موقع دینا چاہیے جن میں باہمی ربط ہو اور وہ سب ان کے خاص مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہوں اور ان کے لیے ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ وہ ان چند مضامین کا مطالعہ وسیع اور گہری نظر سے کر سکیں - ہماری موجودہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی کمزوری اور پیشوں کی تعلیم کی خرابی کا بڑا سبب یہی ہے کہ طلبہ تمام مضامین کا بالکل سرسری مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی واقفیت بہت سطحی ہوتی ہے وہ کسی مضمون پر بھی پورا عبور اور مہارت نہیں رکھتے - وہ مجبوراً محض امتحان کی ضرورت سے مر کھپ کر سب مضامین یاد کر لیتے ہیں - اس قسم کی تعلیم نہ ان میں علمی قابلیت پیدا کرسکتی ہے نہ عملی صلاحیت جو اکثر پیشوں میں درکار ہوتی ہے - اس بحث کا ما حصل یہ ہے کہ جب تک ثانوی تعلیم کی تنظیم نو اس طرح نہ کی جائے کہ طلبہ چند مضامین کا گہرا مطالعہ کرکے ان میں واقعی قابلیت حاصل کریں فنی تعلیم میں کامیابی نہیں ہوسکتی - تعلیمی مقصد اس وقت بھی معلم کی نظر میں پیش پیش رہنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی معلم اور متعلم دونوں کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایک عملی دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے جہاں محض لفظی اور سطحی علم سے کام نہیں چلتا بلکہ کم از کم کسی ایک چھوٹے سے شعبے میں ٹھوس معلومات اور مہارت کی ضرورت ہے -

اسی ضمن میں ایک بات ماہرین تعلیم سے زیادہ ارباب

ادھوری اور نا مکمل رہ جائے گی - بعض مضامین ایسے ہیں جنھیں لازمی قرار دینا مذاق اوو طبائع کے اختلاف کی وجہ سے قرین مصلحت نہیں - مثلا اگر ایک طالب علم صریحاً ادبی ذوق رکھتا ہے اور اس کو زبانوں سے' فنون لطیفہ سے' تاریخ سے دلچسپی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ اس کو ہندسہ اور جبر و مقابلہ سیکھنے پر مجبور کیا جائے - یا اگر ایک طالب علم فطرتاً سائنس کے عملی پہلو کی طرف زیادہ متوجہ ہے اور اس کی دماغی جدت اور جولانی کا اظہار اس کے ہاتھوں کے ذریعے ہوتا ہے تو کیا ضرور ہے کہ اس کا وقت اور محنت زبانوں کی تحصیل پر صرف کی جائے - ابتدائی مدارس میں وہ اپنی مادری زبان سیکھتا ہے اور کسی قدر انگریزی جو اس وقت ہمارے ملک میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے - ثانوی مدرسے میں وہ ان زبانوں کا مطالعہ جاری رکھتا ہے لیکن اونچی جماعتوں میں اس کی توجہ زیادہ‌تر ایسے مضامین کی جانب رہنی چاہیے کہ بحیثیت مجموعی اسے سائنس سے زیادہ گہری دلچسپی اور واقفیت پیدا ہو - مثلاً ایک طالب علم حساب اور طبیعیات کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کو مشینوں اور آلات سے دلچسپی ہے - وہ اپنے آپ کو انجینیری کے کسی شعبے کے لیے تیار کرتا ہے- یا ایک دوسرا طالب علم کیمیا اور حیاتیات سے شوق رکھتا ہے اور اُن علوم کو حاصل کرتا ہے جن کا تعلق اجسام نامیہ سے ہے - اس کے لیے آئندہ چل کر موقع ہے کہ وہ زراعت یا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے - کیا ان طلبہ کے نصاب میں بہت سے غیر ضروری مضامین اس خیال سے داخل کرنا مناسب ہوگا کہ ان سے ''دماغ کی تربیت'' ہوتی

لحاظ سے بھی تاریخ ، جغرافیہ ، ادب ، سائنس ، زبانیں اور دستکاریاں سکھانا فضول نہیں بلکہ مفید اور لازمی ہے کیونکہ اُن سے جو عام ذہنی بیداری پیدا ہوتی ہے اور جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ہر قسم کے پیشے کے لیے مفید ہیں - مگر شرط یہی ہے کہ یہ تمام مضامین اس طرح نہ پڑھائے جائیں کہ بچوں کی عملی قوتیں اور جسم و دماغ بالکل معطل ہوجائیں اور وہ محض حافظے کی مدد سے واقعات اور غیرمفید معلومات کا ذخیرہ دماغ میں ٹھونس لیں جو بجائے محرک عمل ہونے کے ذہن پر بار ہوکر رہ جائے - طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ طلبہ کو اپنی جدت اور اپچ کے اظہار کا موقع ملے، ان میں اشتراک عمل کی صلاحیت اور کاموں کی تقسیم و ترتیب کا ملکہ پیدا ہو اور وہ عملی اور نظری مشکلات سے عہدہ برآ ہونا سیکھیں اور رفتہ رفتہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بن جائیں -

ثانوی تعلیم میں پیشے کا رجحان مقابلتاً زیادہ نمایاں ہونا چاہیے اور اس کے نصاب اور مشاغل میں ایسے مضامین شامل کرنے چاہییں جو آگے چل کر پیشوں میں براہ راست مفید ہوسکیں مثلاً عملی سائنس، تجارتی جغرافیہ، کاروباری واقفیت وغیرہ - لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ طلبہ کو انتخاب مضامین کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اپنے اپنے مذاق اور طبیعت کے موافق بعض مضامین کو اختیار اور بعض کو ترک کرسکیں - ہمیں یہاں نصاب کی مفصل بحث منظور نہیں مگر جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ثانوی مدارس میں بعض مضامین تو لازمی ہوں گے کیونکہ اِن کے بغیر طلبہ کی تعلیم

کہ ہندوستان میں کس قسم کی صنعتی اور فنی تعلیم درکار ہے اور اس کے لیے بہترین انتظامات کیا ہوسکتے ہیں - لیکن مختصراً یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد کن اصولوں پر رکھنی چاہیے - ہمیں اندیشہ یہ ہے کہ کہیں رفتار زمانہ اور روزگار کے مسئلے سے پریشان اور ضرورت سے زیادہ متاثر ہو کر ہمارے مدارس اصلی تعلیمی مقاصد کو نظرانداز نہ کردیں اور محض مخصوص پیشہ‌ورانہ تعلیم میں منہمک ہوکر نہ رہ جائیں، کیونکہ بہ ظاہر اس میں فوری فائدہ اور مالی نفع زیادہ معلوم ہوتا ہے اور فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے قریب کی راہ ڈھونڈتی ہے خواہ آگے چل کر یہ جلد بازی نقصان کا باعث ہو - ایک حد تک یہ مطالبہ بعض جماعتوں اور ذمہ‌دار افراد کی طرف سے تحریر و تقریر کے ذریعے کیا بھی جارہا ہے - اس لیے ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ اس معاملے میں رائے عامہ کی صحیح رہنمائی کریں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور لوگوں کو سمجھادیں کہ ابتدائی مدارج میں عام تعلیم اور پیشہ‌ورانہ تعلیم کے مقاصد میں حقیقی تناقض نہیں ہے - اس منزل میں تعلیم کے عام مقاصد کو جن میں دماغ اور مختلف انسانی قوتوں کی صحیح نشو و نما اور استعمال شامل ہیں ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے لیکن اسی کے ساتھ ان عام مقاصد کے واسطے نصاب کی تدوین اور تعلیمی وسائل اور مدرسے کے مشاغل کی تنظیم اسی طرح کرنی چاہیے کہ طلبہ میں عمل اور ذہنی اجتہاد کی قوتیں بیدار ہوں جو دنیا کے تمام کاروبار اور پیشوں میں مفید ہیں - پیشہ‌ورانہ تعلیم کے

کا مسئلہ ایک نہایت اہم اور اندیشہ‌ناک مسئلہ ہے اور اس
کی ذمہ‌داری ایک بڑی حد تک ہمارے نظام تعلیم پر عائد
ہوتی ہے جو فارغ التحصیل طلبہ پر کسب معاش کی بہت
سی راہیں بند کر دیتا ہے جن میں ترقی کرنے اور دولت پیدا
کرنے کے مواقع ہیں - اور تعلیم یافتہ جماعت کے افراد کا ضرورت
سے زیادہ ہجوم چند محدود اور مقابلتاً کم مفید پیشوں میں
ہو جاتا ہے - ابتدائی مدارس میں دستکاری اور عملی مشاغل
کو اس لیے شامل کرنا چاہیے کہ وہ بچوں کی آرزوے تخلیق
و خواہش عمل کو پورا کرتے ہیں اور جسم و دماغ سے بیک
وقت کام لیتے ہیں - اور ثانوی مدارس میں ایسے مضامین '
علوم اور مشاغل کو داخل کرنا چاہیے جن کا تعلق نوجوانوں
کی آئندہ پیشے کی زندگی سے ہو تاکہ یہ تعلیم نہ صرف ان کے
لیے زیادہ مفید ثابت ہو بلکہ ان کے شوقوں اور دلچسپیوں کا
مرکز بھی بن جائے - لیکن شرط یہی ہے کہ یہ پیشہ‌ورانہ
رجحان عام ذہنی بیداری اور تہذیب نفس کے امکانات کو
مسدود نہ کرے بلکہ ان کو رفتہ رفتہ زندگی کی عملی ضروریات
کے ساتھ مربوط اور منسلک کر کے اور زیادہ مستحکم اور مستقل
بنا دے - اگر طلبہ میں علمی اور عملی مشاغل کے استمزاج
سے اپنے مشاغل کی صحیح تمدنی اہمیت کا احساس پیدا
ہو جائے گا تو وہ انسان‌نما مشینوں کے درجے سے گزر کر ذمہ‌دار
اور آزاد انسانوں کے مرتبے پر پہنچ جائیں گے جن کو اپنے کام
میں خوشی ' تہذیب نفس اور اظہار خودی کے موقعے حاصل
ہیں - ہم اس کتاب کے مختصر حدود میں پیشہ‌ورانہ تعلیم
کا کوئی نظام نہیں پیش کرسکتے نہ یہ بحث چھیڑ سکتے ہیں

ضرورت ہے، وہ شخص نہ معاشرت اور معیشت کے جدید نظام میں مفید طریقے سے حصہ لے سکتا ہے نہ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے اس لیے بقول پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کے -

"ایسی تعلیم کی شدید ضرورت اور تقاضا ہے جو کاری‌گروں کو ان مشاغل کے معاشرتی اور علمی نتائج اور اثرات سے آگاہ کرے کیونکہ جو لوگ اس تعلیم سے محروم رہیں گے وہ محض ان مشینوں کے پرزے بن کر رہ جائیں گے جن کو وہ چلاتے ہیں" ۱ -

لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ کاری‌گروں کو مختلف پیشوں کا یا کارخانوں کا کام سکھا دیا جائے یا مدرسوں میں وہی اقتصادی اور صنعتی نظام رائج کر دیا جائے جو عملی دنیا میں پایا جاتا ہے - ہمارے سامنے یہ سوال ہرگز درپیش نہیں کہ مدرسوں کو تجارت، کاروبار اور صنعت و حرفت کی ایک شاخ یا شعبہ بنا دیا جائے بلکہ تعلیمی مسئلہ یہ ہے کہ "صنعت و حرفت کے مشاغل کو کس طرح کام میں لایا جائے کہ مدرسوں کی زندگی زیادہ معنی‌خیز اور طلبہ کی موجودہ ضروریات اور مدرسے سے باہر کے تجربات کے ساتھ زیادہ مربوط اور ہم‌آہنگ ہو جائے" لہذا ہمارے ماہرین تعلیم کو خاص طور سے اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے کہ موجودہ نظری تعلیم میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو اس کو ملکی حالات کے لیے مناسب اور ملکی ضروریات کے لیے مفید بنا دیں - ہندوستان میں مفلسی اور بے‌روزگاری

۱—صفحہ ۳۱۷ Dewey : Democracy and Education.

بدل گئی ہے - یہ سچ ہے کہ موجودہ حالات میں اکثر لوگوں
کو نہ اپنے کام میں دلچسپی ہے، نہ اس کے نتائج اور عام
اثرات سے واقفیت - لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ صنعتی
انقلاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے تعلیم میں جو تبدیلیاں ہونی
چاہیے تھیں وہ نہیں ہوئیں - زمانۂ حال کے صنعتی کاروبار
میں سائنس کو بہت زیادہ دخل ہو گیا ہے بلکہ یوں کہنا
چاہیے کہ اس کی بنیاد تمام تر سائنس ہی پر قائم ہے -
اس وجہ سے پہلے کی نسبت اس میں علمی اور عقلی عنصر
بہت بڑھ گیا ہے یعنی اسے سمجھداری اور قابلیت سے انجام
دینے کے لیے بہتر اور وسیع تر تعلیم کی ضرورت ہے - موجودہ
صنعتی نظام کا اثر تمدنی ترقی پر پڑا ہے اور اس کا جو تعلق
انسان کی فلاح اور خوش حالی سے ہے اسے اچھی طرح سمجھنے
کے لیے ذہنی بیداری اور شدید دلچسپی درکار ہے - یہ
بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب نظام تعلیم میں
ایسی اصلاح کی جائے کہ وہ کاریگروں، مزدوروں اور مشین
چلانے والوں کو ان نئے تعلقات اور حالات کے لیے تیار کرے -
کوئی کاریگر جس کو ابتدائی تعلیم اور ذاتی مطالعے نے یہ
نہیں سکھایا کہ سائنس کی حیرت انگیز نشو و نما اور وسائل
آمد و رفت کی ترقی نے جماعتوں اور قوموں اور ملکوں کو
ایک نئے مضبوط اور قریبی رشتے میں منسلک کر دیا ہے اور
لوگوں کے مفاد اور مقاصد میں اتحاد اور یکجہتی پیدا
کر دی ہے، یا کم از کم اس کے پیدا ہونے کا امکان بڑھ گیا ہے؛
اور زندگی کو کامیابی اور خوش حالی سے بسر کرنے کے لیے
افراد اور اقوام اور فطرت کی تمام قوتوں میں اشتراک عمل کی

کی تعلیم اعلیٰ ہوتی ہے ' اس کے عمل کا دائرہ وسیع ہوتا ہے ' اسی نسبت سے اس کے فرائض اور "پیشے" بھی زیادہ ہوتے ہیں - اس کو مقامی ' ملکی اور بعض اوقات بین الاقوامی معاملات میں دلچسپی اور حصہ لینا پڑتا ہے ' اپنے حقوق سے مناسب طریقے پر فائدہ اٹھانا اور فرائض کو مناسب طریقے پر انجام دینا پڑتا ہے- وسیع انسانی نقطۂ نظر سے پیشہ‌ورانہ تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ انسان کو ان تمام پیشوں اور فرائض کے لیے تیار کیا جائے تاکہ وہ محض اقتصادی پیداوار کا ایک آلہ نہ بن جائے بلکہ ایک مفید اور کارکن شہری اور ذمہ‌دار فرض شناس انسان ثابت ہو -

یہ ہے پیشے کی تعلیم کا وسیع مفہوم - لیکن اگر ہم اس کے محدود اور معروف معنی پر غور کریں تو اس کے لحاظ سے بھی اس کا مفہوم یہ نہیں کہ ہر شخص کو ایک خاص کام سکھا دیا جائے اور بس - ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام کام کرنے والوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ ذہنی تربیت اور بیداری کے ان مواقع اور امکانات سے فائدہ اٹھا سکیں جو زمانۂ حال کی صنعت و حرفت کے نظام میں موجود ہیں - ممکن ہے بعض سرے سے اس کے قائل نہ ہوں کہ اس مشین کے عہد میں صنعت و حرفت کے مشاغل میں اس قسم کے کوئی امکانات پائے جاتے ہیں - ہم نے خود بھی اوپر اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عام لوگوں کے موجودہ مشاغل سے وہ عنصر مفقود ہو گیا ہے جو ان کی شخصیت کی تربیت میں مدد دیا کرتا تھا - لیکن اصل میں صورت حال یہ ہے - کہ اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد سے کام کی نوعیت

اس کا تیسرا "پیشہ" یہ ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں ' اپنے شہر یا گاؤں کے رہنے والوں کے حقوق ادا کرے اور اس پر جو تمدنی فرائض بحیثیت معاشرے کے ایک رکن کے عائد ہوتے ہیں ان کو پورا کرے یعنی لوگوں کے رنج و راحت میں شریک ہو' اپنی بساط کے موافق ان کی امداد کرے' ہر قسم کی اصلاحی تحریکوں کا ساتھ دے اور خراب رسموں اور روایتوں کو دور کرنے کی کوشش کرے - لہذا ہر شخص صرف ایک ہی پیشہ نہیں رکھتا بلکہ بہت سے پیشے رکھتا ہے جن میں سے ہر ایک کے خاص فرائض اور ذمہ‌داریاں ہیں جنہیں پورا کرنا اس پر فرض ہے - وہ یہ نہیں کر سکتا کہ صرف ایک پیشے کو جس کا تعلق حصول معاش سے ہے اپنی توجہ اور جد و جہد کا مرکز بنا لے اور باقی سب کی طرف سے غافل رہے - اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی شخصیت اور اس کی ترقی کے امکانات بہت محدود ہو کر رہ جائیں گے اور وہ نہ خود کامیابی حاصل کر سکے گا نہ معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوگا - اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کا معاشی پیشہ "وہ مخصوص گوشہ" ہوتا ہے جہاں سے وہ' بہ قول اسپرانگر (Spranger) کے "دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے" اور ایک لحاظ سے وہی اس کی روزمرہ کی جد و جہد اور سوسائٹی کی خدمت کا مرکز بن جاتا ہے - لیکن وہ مرکز جس کے گرد کوئی دائرہ نہ ہو بالکل بےمعنی اور مہمل ہوتا ہے - اور اس کی معاشی جد و جہد کا صحیح منشا اور مفہوم بھی اس وقت واضح ہوتا ہے جب وہ اس کو معاشرتی زندگی کے وسیع‌تر مقاصد کے ساتھ ربط دیتا ہے - جس قدر کسی شخص کے معاشرتی تعلقات زیادہ ہوتے ہیں ' اس

پاتے - ان نوجوانوں کے لیے تو خالص نظری تعلیم صریحاً بےسود ہوتی ہے - لیکن باقی طلبہ میں بھی اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعت پر گو عملی دلچسپیاں حاوی نہ ہوں پھر بھی ان کی زندگی کا ایک اہم جزو ضرور ہوتی ہیں - ان سب کے لیے اس نازک اور اہم دور میں پیشے کا تصور اور اس کی رہنمائی کرنے والے مشاغل بہت کشش رکھتے ہیں اور مفید ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ انہیں اپنے بہت سے نئے تجربات اور خیالات کا مرکز بنا سکتے ہیں - اگر معلم اس امر کی احتیاط رکھے کہ ان مشاغل کی وجہ سے نوجوانوں کی نظر اور ان کی ذہنی دلچسپیاں تنگ اور محدود نہ ہونے پائیں تو ہم تعلیم میں اس عنصر کو شامل کر کے ان کی تخلیقی قوتوں کو دعوت عمل دے سکتے ہیں جو موجودہ حالات میں نامناسب ماحول کی وجہ سے مرجھا کر رہ جاتی ہیں -

ہم نے جو مفہوم پیشے کی تعلیم کا پیش کیا ہے وہ اس مفہوم سے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے بہت زیادہ وسیع ہے - ہماری مراد اس سے محض یہی نہیں کہ ہر شخص کو ایک خاص کام یا صنعت سکھا دی جائے مثلاً ایک آدمی کو درزی، دوسرے کو جلاھا ، تیسرے کو انجینیر، چوتھے کو معلم بنا دینے سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا - کسی شخص کو دنیا میں صرف وہی ایک کام کرنا نہیں ہوتا جس کی علت غائی حصول معاش ہو بلکہ اس کے اور بھی بہت سے کام اور فرائض ہوتے ہیں - اگر درزی کا پیشہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے کپڑے سی کر اپنی روزی پیدا کرے تو اس کا دوسرا "پیشہ" یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان کی تعلیم و تربیت اور آسائش کا اہتمام کرے -

دماغی نشو و نما کے ابتدائی مدارج سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ لہذا اصلی فرق طریقۂ تعلیم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے مضامین کی نوعیت کو اس میں زیادہ دخل نہیں۔ اگر مدرسوں میں عملی مضامین کی تعلیم یعنی ان مضامین کی جن کا رجحان پیشہ آموزی کی جانب ہے اس طرح دی جائے کہ اس کے دوران میں طلبہ نئے نئے مسائل سے دوچار ہوں جن کو حل کرنے کے لیے جسمانی اور دماغی کاوش کی ضرورت ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ تمدنی زندگی کے وسیع تر اغراض و مقاصد سے ان کا کیا تعلق ہے تو یہ مضامین بھی علمی اور معاشرتی اعتبار سے ایسے ہی قابل قدر ثابت ہوں گے جتنے خالص علمی مضامین۔ بلکہ ہمارے خیال میں مخصوص پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی جو پیشہ آموز تعلیم گاہوں میں دی جاتی ہے یہی اصول کارفرما ہے۔

اس بحث سے عام تعلیم کے مسئلے پر کافی روشنی پڑتی ہے اور اس سے بعض مفید نتائج مترتب ہوتے ہیں جن کو ماہرین تعلیم نظرانداز نہیں کرسکتے۔ نوجوانوں کی نفسی ارتقاء کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مدرسوں کی نظری اور کتابی تعلیم ان کی مکمل تربیت اور ان کی شخصیت کی نشو و نما کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ بہت سے نوجوانوں کی دلچسپیاں اور جبلی شوق زیادہ تر عملی ہوتے ہیں۔ ان کو یہ تعلیم بیکار اور مصنوعی معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ ان کے عملی شوقوں کو اظہار کا موقع نہیں دیتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ کو اس پر صرف نہیں کرتے اس کے مقاصد کو اپنا نہیں بنا سکتے اس کے مشاغل اور درس و تدریس میں اپنی شخصیت اور مخصوص ذاتی رجحانات کے اظہار کا موقع نہیں

تعصب آج تک پوری طرح دور نہیں ہوا اور ہندوستان میں خاص طور پر پھیلا ہوا ہے - اس بارے میں پروفیسر ڈیوئی کی راے غور طلب ہے -

"اگر کسی نئے ہنر کے سیکھنے سے طالب علم بہت سے نئے خیالات سے روشناس اور متاثر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے خود انسانی زندگی کے مقصد اور منشا پر روشنی پڑتی ہے تو اس کو یقیناً علمی لحاظ سے بہت قابل وقعت سمجھنا چاہیے - حقیقت میں ہر فن اور ہنر کی علمی قدر کا معیار یہی ہے کہ آیا وہ فن طالب علم کی دلچسپیوں کا حلقہ وسیع کرتا ہے اور نئے حل طلب مسائل اور بحث مباحثے کے مواقع پیدا کرتا ہے یا نہیں" [۱] -

ممکن ہے کہ غلط اصولوں کو اختیار کرنے کی وجہ سے صنعت اور دستکاری کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ اس سے نہ طلبہ کی دلچسپیوں میں وسعت پیدا ہو' نہ ان میں ذہنی کاوش اور جد و جہد کا ملکہ بیدار ہو' نہ زندگی کے منشا پر کوئی روشنی پڑے بلکہ انسان محض نقل اور مشق کے ذریعے مشین کے پرزوں کی طرح ایک خاص کام کرنا سیکھ لے - لیکن یہ بات کچھ صنعتی تعلیم ہی پر موقوف نہیں - نظری اور کتابی تعلیم کی بھی یہ صورت ہو سکتی ہے - ممکن ہے (بلکہ بالعموم ہوتا یہی ہے) کہ استاد طلبہ کو مختلف علوم اس طرح پڑھائے کہ سواے حافظے کے ان کی اور کوئی دماغی قوت کام میں نہ آئے اور وہ باوجود اعلی امتحانات پاس کرلینے کے

---

۱ — Dewey : Democracy and Education

تنگ اور محدود ہیں - فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ بعض نوکریوں کے لیے طلبہ کو تیار کرتی ہے اور یہ بعض دستکاریوں اور عملی فنون کے لیے - لہذا اس روایتی اختلاف کو نظرانداز کرکے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کے اپنی اپنی جگہ پر کیا فوائد ہیں اور دونوں کے ذریعے ذہنی تربیت اور بیداری کے اسباب مہیّا ہوسکتے ہیں یا نہیں - موجودہ تعلیمی نظریے کا دعویٰ یہ ہے کہ پیشے کی تعلیم کو حقیر سمجھنا غلطی ہے کیونکہ اس میں ایسے امکانات موجود ہیں کہ اگر ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کو دانشمندی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ ذہنی تربیت اور تہذیب نفس میں بھی معین ہوسکتے ہیں - نفسیاتی تحقیقات نے اس امر کو ثابت کردیا کہ ذہنی عمل اور دستکاری میں بنفسہ کوئی تضاد نہیں اور یہ خیال غلط ہے کہ اگر کسی فن یا ہنر کے سیکھنے میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے تو وہ ذہنی تربیت کا ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا - اس غلط خیال کا اثر نہ صرف فنی تعلیم کے مسائل میں نظر آتا ہے بلکہ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ مدارس کے نصاب کی بحثوں میں بھی نمایاں ہے - اکثر ملکوں کے تعلیمی نظام پر صدیوں یہ غلط فہمی حاوی رہی ہے کہ لڑکوں کی تعلیم میں نجاری' پارچہ بافی اور مختلف قسم کی دستکاریوں اور فنون کو داخل کرنے سے یا لڑکیوں کی تعلیم میں امور خانہ‌داری ' کھانا پکانا ' گھر کی درستی اور صفائی کپڑوں کی سلائی وغیرہ کو اہمیت دینے سے ہم اس کو ذہنی تربیت کے نقطۂ نظر سے ناقص بنا دیں گے اور طلبہ کو ان چیزوں کا سکھانا معلم کے بلند اور اعلیٰ فرائض سے فروتر ہے - یہ قدیم

کرنا پڑتا تھا اس لیے انھوں نے ان تمام مشاغل کو حقیر جانا جن میں ھاتھ کا کام کرنے کی ضرورت ھوتی ھے یہاں تک کہ فنون لطیفہ اور صناعیوں کو بھی نظری علوم مثلاً فلسفہ، منطق اور ریاضی وغیرہ سے کم درجے کا قرار دیا - انھیں لوگوں نے اپنے محبوب خیالات اور تصورات کو مروجہ فلسفے کا جزو بنا دیا اور اسی کا نتیجہ ھے کہ آج تک تعلیم میں وہ فرق نمایاں ھے جو نظری علوم اور عملی مشاغل میں کیا گیا تھا -

جہاں تک ھمارے موجودہ نظام تعلیم کا تعلق ھے عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا - ھمارے یہاں کی "عام تعلیم" جس کو پیشے کی تعلیم سے علحدہ اور برتر سمجھا جاتا ھے در اصل بہت تنگ اور محدود معنی میں پیشے کی تعلیم ھے - کیونکہ ھمارے مدارس طلبہ کو ایک خاص قسم کی کتابی تعلیم دیتے ھیں جو ان کو سوائے چند مخصوص مثلاً دفتروں کی نوکری یا قانون یا تعلیمی ملازمت کے اور کسی لائق نہیں بناتی - اس سے ذھنی قوتوں کی عام تربیت اور بیداری کا مقصد حاصل نہیں ھوتا گو اس کا دعوی یہی ھے کہ وہ طلبہ کی سیرت کی تشکیل کرتی ھے - لیکن جن لوگوں کو اصول تعلیم اور طلبہ کی نفسی ارتقا کے اصولوں سے واقفیت ھے وہ جانتے ھیں کہ ھمارے تعلیمی طریقے اس درجہ ناقص اور امتحانوں کے تابع ھیں کہ طلبہ کے ذھنی رجحانات اور قوتوں کی نشو و نما کی طرف توجہ کر ھی نہیں سکتے - واقعہ یہ ھے کہ پیشہ آموزی کے نقطۂ نظر سے اُس تعلیم میں اور نجاری یا زراعت یا انجینیری کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں - دونوں کے مقاصد، خواہ ان کا دعوی کچھ بھی ھو،

فنون لطیفہ اور کام کے مشاغل یعنی دستکاری میں ایک حد
فاصل کھینچتے آئے ہیں - ان کا خیال یہ رہا ہے کہ وہ تعلیم
جو لوگوں کو نظری علوم سکھائے ان کو غور و فکر کی زندگی کے
لیے تیار کرے، ان میں فنون لطیفہ کا مذاق پیدا کرے بجائے
خود مکمل ہے اور اس تعلیم سے بدرجہا بہتر ہے جو عملی
مشاغل اور مادی علوم سکھاتی ہے اور لوگوں کو مختلف قسم
کے کاموں اور پیشوں کے لیے تیار کرتی ہے - وہ انسان کی
زندگی اور ضروریات پر ایک مجموعی اور ہمہ گیر نظر نہیں
ڈال سکتے بلکہ اس کو بالکل دو جداگانہ شعبوں میں تقسیم
کر کے ہر ایک کی علحدہ قدر و قیمت مقرر کرتے ہیں اور یہ
نہیں سمجھتے کہ جب تک ان دونوں میں اشتراک عمل نہ
ہو متمدن اور مہذب معاشروں کا قیام ہی ممکن نہیں - اس
خیال کی دوسری وجہ جیسا کہ موجودہ زمانے کے بہت سے
مفکرین اور تعلیم کے میدان میں بالخصوص پروفیسر ڈیوئی
(Dewey) نے اپنی تصانیف میں ثابت کیا ہے بعض
اقتصادی اور معاشرتی حالات ہیں جنہوں نے صدیوں سے
انسانی سوسائٹی کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے - وہ
جماعت جس کو ہر قسم کی اقتصادی سہولتیں حاصل رہی
ہیں اور معاش کی جد و جہد سے فرصت نصیب ہے اپنی
فرصت کے اوقات میں کتابی اور نظری علوم کی تحصیل کرتی
رہی - اس نے اپنی پسند کے علوم اور مشاغل کو ان تمام
علوم پر فوقیت دی جو صنعت و حرفت کے کار و بار سے یا
مادی اشیا کے بنانے اور فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرنے سے
حاصل ہوتے ہیں - چونکہ ان لوگوں کو خود ہاتھ سے کام نہیں

اُن میں تہذیب نفس پیدا کرنا - چونکہ یہ تعلیم روزی کمانے میں مدد نہیں دیتی اس لیے اس کو غیر افادی تعلیم بھی کہا جاتا ہے لیکن اِس کے حامی اس اصطلاح کو کسی برے معنی میں استعمال نہیں کرتے بلکہ فخر اور تعریف کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان شرفا کے لیے ہے جنھیں بوجہ اپنی خوش‌حالی کے کسب معاش کی ضرورت نہیں، محض ذہن کی تربیت اور اخلاق کی جلا درکار ہے -

برخلاف اس کے صنعتی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ براہ راست طلبہ کو کسی خاص شغل یا پیشے کے لیے تیار کرتی ہے- وہ محدود مادی معنوں میں "افادی" ہے اور عام طور پر ان لوگوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے جو اعلیٰ تعلیم پانے کی مقدرت نہیں رکھتے اور جن کے لیے ضروری ہے کہ وہ جلد سے جلد روزی کمانے لگیں - لوگ بالعموم "غیر افادی" تعلیم کو "افادی" تعلیم پر ترجیح دیتے ہیں اور "افادی" تعلیم کو مقابلتاً کم‌تر اور حقیر سمجھتے ہیں - لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب خیالات غلط فہمی پر مبنی ہیں جس کے بہت سے تاریخی اسباب ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں - یہ اسباب ایک طرف اس دوئی سے تعلق رکھتے ہیں جو فلسفے اور انسانی عقائد کی تاریخ میں مدت سے چلی آتی ہے جس کی وجہ سے ہم بالعموم دنیا کے تمام امور اور مسائل کو بجائے ایک کل کی صورت میں دیکھنے کے دو متضاد حصوں میں منقسم سمجھتے ہیں - چنانچہ لوگ ہمیشہ انسانی زندگی کے لازمی اجزا یعنی علم و عمل، عالم معقول اور عالم محسوس، فرصت کے مشاغل یعنی

ختم کرنے کے بعد کسی قسم کے کاروبار کے قابل ہی نہ رہیں اور انہیں محض یہ خواہش ہو کہ کسی دفتر میں محرری یا ملازمت اختیار کرلیں -

پیشے کی بحث میں ایک نہایت اہم سوال جس کی حیثیت ایک قدیم تاریخی مسئلے کی ہو گئی ہے یہ ہے کہ عام تعلیم اور پیشے کی تعلیم کا صحیح مفہوم کیا ہے اور آیا یہ دونوں دوسرے سے بالکل متضاد اور مختلف ہیں یا ان میں ربط اور تعلق کا امکان ہے - قدیم نقطۂ نظر تو یہی ہے کہ ان دونوں کے مقاصد بالکل جداگانہ ہیں اور ہم دونوں کو کسی طرح جمع نہیں کر سکتے - لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بہر حال دونوں قسم کی تعلیم ایک ہی شخص کو دی جاتی ہے گو ان کا زمانہ مختلف ہو اور دونوں ایک ہی نظام تعلیم کے جزو ہیں - اس لیے ہم اپنے نقطۂ خیال کے بموجب کسی ایسے نظریے سے مطمئن نہیں ہو سکتے جو ہمارے نظام تعلیم کے مختلف عناصر کو ایک سلسلے میں منسلک نہ کرے اور ان سب کو ان کے مشترک موضوع یعنی انسان کی شخصیت کی نشو و نما کا ذریعہ نہ بنائے - لہذا ہم ان الفاظ پر غور کر کے پہلے ان کے صحیح مفہوم کا تعین کریں گے اور اس کے بعد بتائیں گے کہ ان دونوں میں اتحاد مقاصد کس صورت میں ممکن ہے -

مدرسوں میں جو تعلیم بالعموم رائج ہے وہ عام تعلیم کہلاتی ہے - یہ طلبہ کو براہ راست کسی پیشے کے لیے تیار نہیں کرتی - اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا مقصد ہے طلبہ کی سیرت کی تربیت' ان کی ذہنی قوتوں کو بیدار کرنا '

هراول - یہ ضروری نہیں کہ وہ سب لوگ جو عام تعلیم اور اعلیٰ تعلیم سے بہرہ‌ور ہوں قوت ایجاد کا اظہار کریں - لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ہم ایک ہزار طلبہ کو تعلیم دے کر نو سو ننانوے معمولی ذہانت کے محنتی اور ایمان‌دار کام کرنے والے اور ایک غیر معمولی ذہانت کا موجد پیدا کر سکیں تو یہ دراصل بہت بڑی کفایت نہ ہوگی ؟ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ایک ہی شخص اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر علم اور صنعت و حرفت میں ایسی کایاپلٹ کر دے کہ باقی تمام کام کرنے والوں کی کارگزاری کئی گنی بڑھ جائے - جس شخص نے بھاپ کی قوت کو انسان کا مطیع بنایا اور اس کو مشینیں چلانے میں استعمال کیا اس نے نوع انسانی کی کارکردگی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ! لہذا عام تعلیم کا عمدہ انتظام کرنا نہ صرف ان اعلیٰ انسانی مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہے جن کا ہم مختصراً گذشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں بلکہ کاروبار اور حصول معاش کے نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے - لیکن شرط یہی ہے کہ "عام تعلیم" اس قدر "عام" نہ ہو جائے کہ اس کو طلبہ کی نفسی کیفیات اور دنیا کی عملی ضروریات سے کوئی تعلق ہی نہ رہے اور وہ محض نظری اور کتابی مطالعے میں محصور ہو کر رہ جائے - یہاں بھی صحیح راستہ اعتدال کا ' مختلف مطالبات کے درمیان توازن پیدا کرنے کا راستہ ہے - یعنی نہ تو ہمیں قبل از وقت پیشے کی مخصوص تعلیم شروع کرنی چاہیے اور نہ عام تعلیم کے زمانے میں بچوں اور نوجوانوں کو دنیا کے عملی اور مادی مشاغل سے اس قدر بےتعلق اور بےنیاز کر دینا چاہیے کہ وہ ثانوی تعلیم

زیادہ وقت پیشے میں مہارت حاصل کرنے اور روزی کمانے میں صرف کر سکیں - اس خیال کی محرک جس حد تک وہ بےاطمینانی ہے جو سمجھدار لوگوں کو ہمارے ملک کی کتابی اور نظری تعلیم سے ہے ہمیں اس سے ہمدردی ہے اور ہر شخص جو علمی دلچسپیوں کے علاوہ دنیا کے حالات اور ضروریات سے بھی واقفیت رکھتا ہے اس خیال کی تائید کرے گا کہ ہماری موجودہ تعلیم طلبہ کو اس زندگی کے لیے بخوبی تیار نہیں کرتی جو ان کو پیش آنے والی ہے - لیکن اس خیال کا وہ پہلو جو عام عقلی تعلیم و تربیت کو مضر اور فضول سمجھتا ہے اور اس کو بند کر کے وقت اور روپئے میں کفایت چاہتا ہے سراسر ناواقفیت اور تنگ نظری پر مبنی ہے - یہ کفایت اگر کی جائے تو آگے چل کر قوم کو بہت گراں پڑجائے گی - اس طرح یہ تو ممکن ہے کہ ہم ملک میں ایک بڑی تعداد معمولی کاری‌گروں اور پیشہ‌وروں کی مہیا کر سکیں جو لکیر کے فقیر بن کر ایک مقررہ راستے پر چلتے رہیں اور اپنے محدود دائرۂ عمل میں کافی مہارت پیدا کرلیں - لیکن قوم میں موجد اور مخترع، محقق اور نئے راستے نکالنے والے لوگ پیدا نہیں ہو سکتے جن کے بغیر کوئی ملک صنعت و حرفت کے سرگرم مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا - جب تک تمام لوگوں کو یہ موقع نہ ملے‌گا کہ وہ بہترین علوم و فنون اور خیالات کے مطالعے سے اپنی ذہنی قوتوں کو بیدار کریں اس وقت تک غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کے لوگ بھی اپنے جوہر کا اظہار نہیں کر سکیں گے - اس کے بغیر نہ تو معاشرتی زندگی کے رہبر پیدا ہو سکتے ہیں نہ صنعت و حرفت کے

ممالک میں جابجا ایسے ادارے قائم کئے گئے ہیں جو پیشوں کے انتخاب میں نوجوانوں کی رہنمائی کرتے ہیں، اور وہاں اس سلسلے میں بہت سے مفید مشاہدات اور تجربات ہوئے ہیں - ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوغ کے زمانے میں نوجوانوں کو اپنے مستقبل کے مشغلے اور پیشے کی بڑی فکر ہوتی ہے اور اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ نوجوان اپنی تمام دماغی جد و جہد اور توجہ تعلیم کی طرف مبذول کریں تو ان کی تعلیم میں پیشے کے رجحان کو زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ہے - محض نظری رسمی تعلیم جو ان کے نزدیک نہ ان کی موجودہ زندگی اور ضروریات کے لیے موزوں ہے نہ انہیں مستقبل کے لیے تیار کرتی ہے ہرگز یہ کشش نہیں رکھتی کہ وہ دل و جان سے اس میں محو ہو جائیں - اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ طلبہ کو قبل از وقت عام تعلیم سے ہٹا کر پیشوں کی تعلیم دلائی جائے کیونکہ یہ طریقۂ عمل نہ صرف ان کے شخصی ارتقا کے لیے مضر ہوگا بلکہ ان کی اقتصادی کارکردگی کو بھی یقیناً کم کردے گا - جو شخص اپنے بچپن اور نوجوانی میں عمدہ ادبی اور علمی تعلیم سے محروم رہتا ہے اس کی دماغی قوتیں پوری طرح نشو و نما نہیں پاتیں - خواہ وہ کوئی شغل اختیار کرے اسے اس میں پوری کامیابی اور کمال حاصل نہیں ہو سکتا - بعض لوگ، خصوصاً وہ جن کا تعلق براہ راست کاروبار سے اور اقتصادی پیداوار کے کاموں سے ہے، عام ادبی تعلیم کو بچوں اور نوجوانوں کے لیے غیر مفید سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وقت اور روپئے کی کفایت کر کے جلد سے جلد بچوں کو کوئی "کام کی چیز" سکھا دی جائے تاکہ وہ

پر زیادہ توجہ اور شوق صرف کرتا ہے جو اس کے نزدیک اس کی آئندہ زندگی میں مفید ثابت ہوں گے اور اسے اس کی منزل مقصود کی طرف لے جاتے ہیں - میرا یہ مطلب نہیں کہ واقعاً ہمارے ملک میں تمام نوجوانوں کی عملی اور ذہنی دلچسپیوں کا ارتقا اسی طریقے پر ہوتا ہے - بدقسمتی سے ہمارے یہاں ان میں سے اکثر کو یہ موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنی مخصوص صلاحیتوں اور رجحانوں کے مطابق اپنے لیے کوئی شغل زندگی اختیار کریں - مدرسے سب کو ایک ہی قسم کی کتابی تعلیم دے کر ایک اندھیری گلی میں چھوڑ دیتے ہیں - اس میں جو راستہ بھی مل جائے وہ اسی کو اختیار کر لیتے ہیں خواہ وہ ان کے فطری میلانات کے لحاظ سے مناسب ہو یا نہ ہو - لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اگر بچوں کی ابتدائی تعلیم صحیح اصول پر ہو اور عہدشباب میں نوجوانوں کے شوقوں اور جبلتوں کی پرورش مناسب طریقے پر کی جائے تو وہ ثانوی یا اعلیٰ مدارس میں پہنچ کر یقیناً بعض خاص مشاغل کی طرف زیادہ مائل ہوں گے اور اپنی علمی اور عملی دلچسپیوں سے ظاہر کر دیں گے کہ ان کا فطری میلان کس طرف ہے - یہ تو مشکل ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں کہ طالبعلم صحیح اور قطعی طور پر بتا سکے کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کرے گا - اس کے لیے تجربے کی پختگی اور خودشناسی درکار ہے جو ابھی اسے میسر نہیں آ سکتی - واقعہ یہ ہے کہ مناسب پیشے کا انتخاب نہایت مشکل اور بڑی ذمہداری کا کام ہے جس کے لیے ماہرین علم النفس اور والدین دونوں کی مدد درکار ہے - اس غرض کے لیے بعض ترقی یافتہ

عمارت یا دوسری چیزیں بنانا ، شکار یا صیادی، گھوڑے کی سواری، شمشیرزنی اور نشانہ‌بازی آئندہ زندگی کی عام ضروریات میں سے ہیں - اس لیے اگر بچے کو ان کا شوق ہو تو ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ وہ آئندہ چل کر ان میں سے کسی چیز کو اپنا پیشہ بنائے گا "[1] -

لیکن بچہ منزل طفولیت اور شباب کی پہلی منزل سے گزر کر شباب کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے تو وہ ان نقلی مشاغل پر قانع نہیں رہتا - اب معاش کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے یعنی اسے کوئی پیشہ اختیار کرنے کی خواہش اور ضرورت ہوتی ہے - اس کی بڑھتی ہوئی قوتیں عملی زندگی کے ساتھ نبردآزمائی کرنا چاہتی ہیں - وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کے گرد و پیش دنیا میں کیا کیا کام ہوتے ہیں اور وہ ان میں سے کس کام کے لیے زیادہ موزوں ہے - اس کے شوق جو چند سال پیشتر نچلے نہیں بیٹھتے تھے اب کسی ایک مرکز کے گرد جمع ہونے شروع ہوتے ہیں - وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کی طبعیت کو زیادہ لگاؤ ادبی مشاغل سے ہے، یا سائنس سے، یا عملی کاروبار سے - اس کا ذاتی مطالعہ، اس کی دلچسپیاں اس کے فرصت کے مشاغل یہ سب اسی چیز کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں جس کی طرف اسے خاص رجحان ہے - بالفاظ دیگر آئندہ پیشہ کی جھلک ابھی سے اس کی درسی زندگی پر اپنا اثر ڈالنا شروع کرتی ہے اور وہ بالعموم انہیں مضامین اور مشاغل کا انتخاب کرتا ہے اور انہیں

۱- صفحہ ۲۵۲ -

کی دلچسپی اور شوق کو تتلی کی طرح ایک جگہ قرار نہیں ہوتا - ان کی توجہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے - بچہ اپنی بڑھتی ہوئی شخصیت کے لیے نئے تجربے اس طرح حاصل کرتا ہے کہ کبھی وہ ایک شخص کا پارٹ کرتا ہے کبھی دوسرے کا - کبھی انجن ڈرائیور بنتا ہے تو کبھی ڈاکٹر، کبھی بچوں کو پڑھاتا ہے تو کبھی گھوڑا بن کر ایک خیالی گاڑی کھینچنے لگتا ہے گویا بقول ورڈزورتھ (Wordsworth) کے "اس کا کام یہی ہے کہ ہمیشہ نیا بہروپ بھرتا رہے" - اس کی کام کرنے کی خواہش جو آگے چل کر کوئی پیشہ اختیار کرنے کے ارادے میں تبدیل ہو جاتی ہے، مختلف کھیلوں اور نقلوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے - بچوں کے کھیلوں اور ان کے پیشوں کے شوق میں جو تعلق ہے اس کے بارے میں پروفیسر اسپرانگر (Spranger) جن کی رائے ہم نے اوپر بیان کی ہے لکھتے ہیں :—

"بچے جو پیشے کے خواب دیکھتے ہیں ان پر کھیل کا اور نقل کا رنگ غالب ہوتا ہے لیکن ان کھیلوں میں نہ صرف گہرے معنی ہوتے ہیں بلکہ ایک مخفی قوت تشکیل بھی جو بڑی گہری اہمیت رکھتی ہے - اس میں شک نہیں کہ پیشوں کے جو کھیل بچے کھیلتے ہیں ان میں سے بعض عہد طفلی سے مخصوص ہیں اور اُن سے آئندہ ارادے کا پتا نہیں چلتا - بعض پیشے ہر بچے کو متوجہ کرتے ہیں کیونکہ وہ عہد طفلی کی جبلی زندگی سے مناسبت رکھتے ہیں یا ان میں آئندہ زندگی کے اہم پہلو نمایاں ہوتے ہیں - مثلاً سپاہی یا کوچبان یا سوداگر بننا،

صفائی کے کام کی وقعت اور تمدنی اهمیت کا علم رکھتا ھے، اس کے لیے اس کا کام اسی معنی میں متبرک هو جاتا ھے جس معنی میں کارلائل (Carlyle) نے کہا تھا کہ "هر قسم کا سچا کام متبرک ھے........جس شخص کو یہ برکت نصیب ھے اسے کوئی اور برکت طلب کرنے کی حاجت نہیں" - لہذا تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ھے کہ عام لوگوں کی کاروباری زندگی کے تنگ اور محدود کرنے والے اثرات کو دور کرنے کے لیے طلبہ کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کی وسیع‌تر اهمیت سے آگاہ کر کے انھیں ان کی نظر میں معنی‌خیز بنائے اور ان میں یہ بات کر دے کہ پیشے کی زندگی میں بھی اعلیٰ مقاصد اور عین پسندی کو هاتھ سے نہ دیں، محض مشین بن کر نہ رہ جائیں بلکہ اپنی فطرت کی پوری بلندی اور وسعت کو حاصل کر سکیں - اس لحاظ سے هماری موجودہ تعلیم، جو محض رسمی علوم و فنون تک محدود ھے اور تمدن کے زندہ مسائل سے ان کا ربط ظاهر نہیں کرتی، بالکل ناقابل اطمینان ھے - وہ نہ صرف طلبہ کو معاشی نظام سے ناواقف رکھتی ھے بلکہ ان میں عملی کاموں کی صلاحیت کو بھی مردہ کر دیتی ھے - محنت اور هاتھ کا کام کرنے کے خلاف ان میں ایک تعصب پیدا هو جاتا ھے جو آگے چل کر ان کو بہت تکلیف پہنچاتا ھے اور معاش کی بہت سی راهیں ان پر بند کر دیتا ھے -

مندرجۂ بالا بحث کا تعلق زیادہ‌تر نوجوانوں کی تعلیم سے ھے - جیسا هم اوپر بتا چکے هیں بچوں کی تعلیم کو اس مسئلے سے براہ راست زیادہ تعلق نہیں - بچپن میں طلبہ

یہ ہے کہ صنعتی پیداوار کے اکثر شعبوں میں انسان اور اس کے کام میں کوئی زندہ اور معنوی کلّی رابطہ باقی نہیں رہا ہے محض اس لیے کہ ایک انسان سے کوئی پورا کام نہیں لیا جاتا"[1] -

اس صورت حال کی اصلاح کے لیے اول تو صنعت و حرفت کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ جو کام بالکل میکانکی ہیں یعنی جن میں صرف ایک مقررہ حرکت درکار ہے ان کو مشینوں ہی کے ذریعے انجام دیا جائے تاکہ لوگوں کی زندگی اور وقت ان کے لیے وقف نہ ہو جائے - یہ ایک وسیع تمدنی اور عملی مسئلہ ہے جس کا تعلیم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں - البتہ تعلیم کا یہ فرض ضرور ہے کہ طلبہ کی علمی اور دماغی تربیت اس طرح کرے کہ وہ آئندہ زندگی میں اپنے محدود کاموں کی غیر محدود اہمیت کو سمجھ سکیں- خواہ اُن کے ذمے محض اتنا ہی کام ہو کہ مشین کے ذریعے سوئی کے ناکے میں سوراخ کریں پھر بھی ان کو کارخانے کے پورے نظام سے واقفیت اور تمدنی زندگی میں اس کی اہمیت کا علم ہونا چاہیے تاکہ وہ کولہو کے بیل کی طرح کام نہ کریں بلکہ یہ سمجھ سکیں کہ وہ اپنے محدود دائرۂ عمل میں ایک ضروری خدمت انجام دے رہے ہیں اور اس قسم کی خدمتوں کی انجام دہی پر معاشرے کے پیچیدہ نظام معاش اور کاروبار کا دار و مدار ہے - جو مزدور اور کاری گر اس حقیقت کو سمجھ کر اپنا فرض انجام دیتا ہے، جو خاکروب

۱- صفحہ ۲۲۸ -

دوچار کردیا ہے - چونکہ صنعت و حرفت وغیرہ کے معمولی مشاغل میں شخصی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع تقریباً مفقود ہوگئے ہیں اس لیے اکثر عمدہ عادتیں اور صنعتیں جو مدرسے کی تعلیم کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں بہت سے پیشوں کے ناسازگار ماحول میں ضائع ہو جاتی ہیں - تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ طلبہ میں جدت، تجسس اور اپج کا مادہ ابھارے لیکن بچارے کارخانوں کے مزدوروں کو اپنے روزمرہ کے مشاغل میں ان چیزوں سے کیا مطلب ؟ ان کا وقت تو ایسے کاموں میں صرف ہوتا ہے جس سے نہ دماغ کی تربیت ہو سکتی ہے نہ روح کی - انسان کی نفسی ترکیب میں بےشمار عناصر شامل ہیں جن میں سے بعض جسمانی نشو و نما چاہتے ہیں، بعض ذہنی جد و جہد کی طرف راغب ہیں، بعض مشاہدۂ حقیقت اور نظارۂ جمال کے جویا ہیں - لیکن اس قسم کے مشین‌نما کام میں ان میں سے کسی خواہش کی تشفی بھی نہیں ہو سکتی اور انسان کی شخصیت پست اور محدود ہوکر رہ جاتی ہے - اسپرانگر (Spranger) لکھتے ہیں :—

" اب اگر ہم موجودہ زمانے میں پیشے کی زندگی کی خارجی ترکیب پر غور کریں تو ہمیں یہ دیکھ کر افسوس اور رنج ہوگا کہ ہر پیشے میں، خصوصاً اقتصادی پیداوار کے کاموں میں اس عین پسندی (idealism) کی کس قدر کم گنجائش ہے - یہ شکایت کہ صنعتی کاروبار تخصیص پسندی اور مشین پرستی کے سبب سے روحانیت سے خالی ہوگئے ہیں ایک نغمۂ دلدوز ہے جو ہمارے آہنگ تمدن میں نشید اجل کی طرح سنائی دیتا ہے........ مختصر

ذریعے ہونے لگا ہے - بڑے بڑے کارخانے قائم ہوگئے ہیں جن میں سیکڑوں مزدور مشین کے پرزوں کی طرح کوئی ایک مقررہ حرکت یا کام کرتے رہتے ہیں - ان ممالک کے علاوہ ہندوستان میں بھی دستکاروں اور صنّاعوں کی سر پرستی کم ہوتی جاتی ہے - کیونکہ جو کام وہ بہت وقت اور محنت صرف کر کے کرتے تھے وہ اب آسانی اور کفایت سے مشین کے ذریعے ہو سکتا ہے - لیکن اس تبدیلی سے جہاں ایک طرف وقت اور روپئے کی کفایت ہوئی وہاں دوسری طرف یہ نقصان ہوا کہ عام لوگوں کے مشاغل میں سے صناعی اور دستکاری کا وہ عنصر مفقود ہوگیا جو ان کی شخصیت اور سیرت کی تربیت میں مدد دیتا تھا - ایک صناع جو کوئی چیز مثلاً جوتیوں کا ایک جوڑا یا کپڑے کا ایک تھان محنت اور شوق سے بناتا ہے اس ذریعہ سے نہ صرف اپنی روزی پیدا کرتا ہے بلکہ اس میں اپنے ذوق طبع کا اظہار بھی کرتا ہے - ایک حد تک اُس چیز میں جو وہ تیار کرتا ہے اپنی شخصیت کا رنگ بھرتا ہے اور اس طرح اسے اپنے کام میں اظہار خودی کی مسرت حاصل ہوتی ہے - برخلاف اس کے جو شخص تمام عمر کسی کارخانے میں محض مشین کے پرزے کی طرح کام کرتا ہے اور اس کا کام بھی محض چند مقررہ حرکات تک محدود ہوتا ہے اسے ہرگز اس میں لطف نہیں آسکتا نہ اس کے ذریعے اس کی قوتوں کی نشو و نما ہو سکتی ہے - اس کا دماغ اس تمام عرصے میں معطل رہتا ہے وہ نہ اس کام کی ابتدا سے واقف ہوتا ہے ۔ نہ انتہا سے، نہ اس کی پوری تنظیم کو سمجھتا ہے نہ یہ جانتا ہے کہ اس کی تمدنی اہمیت کیا ہے - اس صورت حال نے تعلیم کو نئی مشکلات اور نئے مسائل سے

" نفسیات عنفوان شباب" [1] میں لکھتے ہیں :—

"ہر پیشہ انسان کے لیے نوشتۂ تقدیر بن جاتا ہے - چند سال کے عرصہ میں وہ انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کی سیرت کی تشکیل کرتا ہے - کیونکہ یہی ذہن خارجی کا وہ پہلو ہے جس سے فرد کو بہت قریبی تعلق ہوتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اس کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے - صرف پیشہ ہی ہمارا نہیں ہوتا بلکہ ہم بھی پیشے کے ہوجاتے ہیں - پیشے کے اثر سے انسان کے تصور کائنات کے بیشتر حصے کی تشکیل ہوتی ہے - یہی وہ گوشہ ہے جہاں سے انسان دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے......جہاں نوجوان کی ذات پوری قوت سے مکمل خارجی تمدن سے ٹکراتی ہے" [2]-

ایک دوسرا سبب جس سے پیشوں کی تعلیمی اہمیت اور بڑھ گئی ہے وہ ان کی جدید اندرونی تنظیم ہے - یورپ اور دوسرے مغربی ممالک میں گزشتہ دو سو برس میں جو صنعتی انقلاب ہوا ہے اُس نے لوگوں کے کاروبار اور مشاغل کی نوعیت کو بالکل تبدیل کردیا ہے - پہلے تقریباً ہر قسم کا کام ہاتھ سے یا بہت سادہ آلات اور اوزاروں سے کیا جاتا تھا جو ہاتھ ہی سے چلائے جاتے تھے - ماہرین فن اپنے اپنے شاگردوں کو مختلف کاموں کی تعلیم دیتے تھے - لیکن اب تقریباً ہر قسم کا کام مشینوں کے

۱—یہ کتاب جرمن زبان میں (Psychologie des Jugendalters) کے نام سے شائع ہوئی ہے - اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا ہے جو اردو اکیڈمی جامعۂ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے -

۲—صفحہ ۲۷ -

کو بعض نقادوں نے "دکانداروں کی قوم" کا خطاب دیا ہے۔
اس نام سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کا سب سے
بڑا اور اہم وسیلۂ معاش تجارت اور اس کے متعلقہ کاروبار ہیں
بلکہ یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان کی قومی سیرت اور
سیاسی ارتقا کو سمجھنے کے لیے اس خصوصیت کو پیش نظر
رکھنا لازم ہے۔ اسی طرح سوئٹزرلینڈ "یورپ کا مہمان خانہ" کہا
جاتا ہے۔ جو شخص سوئس لوگوں کی قومی خصوصیات سے
واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ان کے اخلاقی اور ذہنی رجحانات پر
مہمانداری کے پیشے کا کس قدر گہرا اثر پڑا ہے اور ان کی خوبیوں
اور کمزوریوں دونوں کو سمجھنے میں اس سے کس قدر مدد
ملتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہندوستان صدیوں سے زراعت کا گھر
رہا ہے اس وجہ سے کوئی شخص ہماری قومی تاریخ اور قومی
سیرت کی بھلائیوں اور برائیوں کو اس وقت تک نہیں سمجھ
سکتا جب تک وہ اس مسئلے پر غور نہ کرے کہ اس ملک میں
اسّی فیصدی لوگ کاشتکاری کرتے ہیں یا اسی کے متعلق اور کام
انجام دیتے ہیں اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ اسی قناعت
آموز اور صبر طلب شغل میں بسر ہوتا ہے۔ پھر کیا تعجب
ہے کہ بچے جو اپنے بڑوں کی سیرت اور ماحول کا اثر بڑی جلدی
قبول کرتے ہیں ایک غیر محسوس طریقے پر ان معیاروں کو
تسلیم کرلیتے ہیں جو ان کے ماحول میں مانے جاتے ہیں اور
اس پیشے کے گرویدہ ہوجاتے ہیں جو ان کے گرد و پیش رائج
ہے۔ خواہ وہ زراعت ہو یا تجارت یا صنعت و حرفت۔
پروفیسر اسپرنگر (Spranger) اپنی قابل قدر تصنیف

بالغوں کے پیشوں کا کوئی اثر بچوں کی زندگی پر گو براہ راست نہیں پڑتا اور ان کے تعلیمی نصاب میں پیشوں کی تربیت کو داخل کرنے کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے قابل تسلیم نہیں تاہم کسی خاص جماعت یا ملک کے پیشوں کے نظام کا جو اثر اس کے افراد پر پڑتا ہے وہ بالواسطہ بچوں کی طبیعت' عادات اور مشاغل کو بھی متاثر کرتا ہے - بچہ اپنے تمدنی ماحول سے مختلف قسم کے اثرات قبول کرتا ہے - ان میں ایک بڑا اور مستقل حصہ اس اثر کا ہوتا ہے جو کسی جماعت کے پیشوں اور وسائل معاش کی تنظیم کا لوگوں کی زندگی پر پڑتا ہے - لوگوں کی ذہنی اور عملی دلچسپیاں' ان کا نظریۂ حیات ' ان کی سیرت کا عام رنگ بہت کچھ اس کام کی بدولت معین ہوتا ہے جو وہ اپنی روزی کمانے کے لیے آٹھ دس گھنٹے روزانہ کرتے ہیں - ہر شخص کو جو کسی پیشے میں داخل ہوتا ہے ایسے شرکاے کار سے سابقہ پڑتا ہے جن کی گفتگو ' خیالات' عادتیں اور تفریحی مشاغل ایک خاص قسم کے ہوتے ہیں- وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ' خواہ ابتدا میں اس کی طبیعت بالکل ہی مختلف کیوں نہ ہو - رفتہ رفتہ ان مشاغل اور خیالات کا رد عمل اس کی خانگی زندگی اور فرصت کے مشاغل پر بھی ہوتا ہے جو براہ راست اس کی اولاد کی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں - اس مثال کو اگر زیادہ واضح کردیا جائے تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ پیشوں کی تنظیم کس طرح قومی سیرت اور ذہنیت کو بناتی اور بگاڑتی ہے اور "کاروباری اخلاق" اور "کاروباری ذہنیت" کس طرح رفتہ رفتہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھا جاتی ہے - انگریزوں

باب چہارم

تعلیم اور مسئلۂ معاش

اب هم تعلیم اور مسئلۂ معاش کے تعلق کی طرف رجوع
کرتے هیں اور اس تعلق کی نوعیت اور نتائج سے کسی قدر
تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے کیونکہ صنعت و حرفت
کے موجودہ دور میں اقتصادی مسائل کی اهمیت بہت بڑھ
گئی هے اور برابر بڑھتی جاتی هے اور پیشے کی اهمیت محض
اقتصادی نہیں بلکہ تمدنی اور اخلاقی بھی هے - اس لیے نظریۂ
تعلیم کے طالب علم کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری هے -
علاوہ بریں اس مسئلے کے متعلق عام طور پر لوگوں میں اس
قدر غلط فہمیاں پھیلی هوئی هیں اور تعلیمی مسائل میں ان
کی وجہ سے ایسی پیچیدگیاں پیدا هوگئی هیں کہ یہ بحث
خیالات کو سلجھانے کے لیے ضروری هے - اس ضمن میں پہلا
سوال یہ پیدا هوتا هے کہ هم نے معاشی نظام کو ان تمدنی
اداروں میں کیوں شامل کیا هے جو بچوں اور نوجوانوں کی
تربیت سے تعلق رکھتے هیں اور اس کا اثر ان کی طبیعت اور
سیرت پر کس طرح پڑتا هے -

بعض ملکوں میں. اکثر مدرسوں کی عمارت اور تمام تعلیمی وسائل اور آلات. شام کے وقت گرد و نواح کے لوگوں کے لیے بطور کلب اور تفریح گاہ بلکہ ایک حد تک بطور بالغوں کی تعلیم گاہ کے استعمال کئے جاتے ہیں اور اس طرح مدرسہ تبادل خیالات' باہمی میل جول اور تفریحی مشاغل کا مرکز بن جاتا ہے - مدرسے اور ماحول کی زندگی میں یہ زندہ رابطہ پیدا کرنا تعلیم کے اہم ترین مسائل میں سے ہے اور اس کو حقیقی معنوں میں "قومی تعلیم" بنانے کا جزو لازم ہے -

---

کی وہ ترتیب و تدوین خراب نہ ہونے پائے جو طلبہ کی عام ذہنی بیداری اور جذبات کی نشو و نما کے لیے قائم کی گئی ہے -

دوسرا اہم مسئلہ جو ہم کو اس ضمن میں پیش آئے گا وہ یہ ہے کہ مدرسے کو عمرانی زندگی کا مرکز کس طرح بنایا جائے - ہم نے گھر اور مدرسے' والدین اور معلموں کے باہمی تعلق کو واضح کرتے ہوئے اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے - ہمارے ملک میں بدقسمتی سے یہ خیال بہت عام ہے کہ مدرسہ بھی بہت سے سرکاری دفاتر اور اداروں کی طرح ایک سرکاری ادارہ ہے جس کا قومی زندگی اور قومی ضروریات سے کوئی قریبی تعلق نہیں ہے - اس کے بہت سے تاریخی وجوہ ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں - ان وجوہ کی بنا پر اس خیال کا پیدا ہونا ایک حد تک قرین عقل ہے- مگر اس کا اثر تعلیم کی ترقی پر بہت برا پڑا ہے اور قومی زندگی اور تعلیم‌گاہوں کا وہ تعلق جو تعلیم میں روح پھونکتا ہے اور اسے اثر آفرینی کی قوت بخشتا ہے مفقود ہو گیا ہے - اس لیے ہمیں ایک طرف تو تعلیم کو بحیثیت مجموعی قومی ضروریات کا کفیل اور قومی مقاصد اور معیاروں کا ضامن بنانا ہے اور دوسری طرف یہ کوشش کرنی ہے کہ ہر مدرسہ اپنے خاص ماحول اور اس کے باشندوں کی زندگی کے لیے تہذیب کا ایک مرکز ہو تاکہ معاشرہ یہ محسوس کرے کہ یہ درسگاہ نہ صرف بچوں کو بعض ضروری علوم و فنون کی تعلیم دیتی ہے بلکہ کل جماعت کے لیے براہ راست مفید ہے اور اس کو بہتر مقاصد اور دلچسپیوں سے روشناس کرتی ہے -

ذاتی صلاحیت اور شوق اور مختلف مدرسوں کے ماحول کی ضروریات پر ہو۔ گزشتہ باب میں جن نفسیاتی تعلقات سے بحث کی گئی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ ذہانت رکھنے والے طلبہ دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جن کا رجحان علمی ہے یعنی ادب یا سائنس کی طرف ہے۔ دوسرے وہ جن کی دلچسپیاں زیادہ‌تر عملی ہیں۔ ان دونوں سے ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ اوسط یا کم‌تر ذہانت کے طلبہ کی نسبت مندرجۂ بالا نصاب سے زیادہ کام کریں گے۔ لیکن پہلی قسم میں جو طلبہ شامل ہیں اُن کے نصاب میں حساب، فرانسیسی، جرمن، لاطینی، طبیعیات، کیمیا جیسے مضامین پڑھائے جائیں گے۔ اور دوسری قسم کے طلبہ کے لیے عملی مضامین کا اضافہ کیا جائے گا مثلاً مختلف دستکاریاں اور صنعتیں اور عملی سائنس کی وہ شاخیں جن کا ان سے تعلق ہے'' ۱۔

ظاہر ہے کہ مقامی حالات اور جماعتی ضروریات کا اثر نصاب کے دونوں حصوں پر پڑے گا لیکن پہلے حصے کی نسبت دوسرے حصے پر اس کا اثر زیادہ نمایاں ہوگا۔ ''اگر مدرسہ دیہاتی ماحول میں ہے تو ان علوم و فنون پر زور دیا جائے گا جن کا زراعت سے قریبی تعلق ہے۔ اگر مدرسہ کسی کان‌کنی کے مرکز میں واقع ہے تو علوم طبیعی پر زیادہ زور دیا جائےگا''۔ لیکن ہر صورت میں یہ احتیاط شرط ہے کہ نصاب اور مشاغل

۱ــ صفحہ ۹۷ -

مدارس میں، علم نباتات و حیوانات، مطالعۂ قطرت وغیرہ پر زیادہ زور دیں گے اور صنعتی علاقوں کے مدارس کی توجہ ریاضی اور طبیعیات اور کیمیا کی طرف زیادہ ہوگی اگرچہ تعلیمی مصلحت سے ان میں سے کسی شاخ کو بھی بالکل نظرانداز کرنا مناسب نہ ہوگا - ڈاکٹروھیلر (Wheeler) نے اپنی کتاب (Youth) "شباب" میں نوجوانوں کے نصاب تعلیم سے بحث کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ثانوی منزل میں نصاب کے دو حصے ہو جانے چاہییں - ایک وہ حصہ جو تمام طلبہ کے لیے مشترک اور ہر اسکول میں ایک سا ہو اور جس کا پورا کرنا ذہین اور کند ذہن، سائنس پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے، شہری اور دیہاتی غرض سب طلبہ کے لیے لازمی ہو - اس حصے میں وہ مندرجہ ذیل مضامین کو شامل کرتے ہیں :—

جسمانی تربیت - کوئی صناعی یا دستکاری - مطالعۂ قطرت - مادی زبان یا زبانیں - ادب - تاریخ و جغرافیہ - معاشرتی اور مذہبی تربیت -

دوسرے حصے میں ان کے نزدیک ایسے مضامین ہونے چاہییں جن کو نوجوان طلبہ اپنی مخصوص قابلیت اور ضروریات کے مطابق منتخب کر سکیں - اس حصے میں باقی تمام مضامین جو بالعموم نصاب کا جزو ہوتے ہیں شامل ہیں وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں :—

"زیادہ ذہین طلبہ کے لیے اس چھوٹے سے چھوٹے نصاب میں بعض ایسے مضامین اور مشاغل بھی شامل کرنے چاہییں جن کی تعداد اور نوعیت کا انحصار افراد کی

کی تربیت اور انتخاب کرتے وقت ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ جس خاص ماحول میں مدرسہ واقع ہے جہاں اس کے طلبہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہاں معاشرے کی بہبود اور کامیابی کے لیے کن چیزوں پر زور دینے کی اور کیا کیا سکھانے کی ضرورت ہے - معاشرے کے مشاغل کیا ہیں ان کا تعلق صنعت و حرفت سے ہے یا تجارت سے یا زراعت سے - لوگوں کا طرز معاشرت کس قسم کا ہے - ان کے عام رجحانات' کار و بار کے اصول' تفریح اور فرصت کے مشغلے کیا ہیں - ان مشاغل اور معاشرت کے طریقوں کا پرتو مدرسے کے نصاب پر بھی پڑے گا - اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہم براہ راست پیشوں کی تعلیم دیں گے یا فرقہ‌وارانہ تعصبات اور تنگ نظری کو مستقل بنانے کی کوشش کریں گے اور تعلیم کے وسیع‌تر مقاصد یعنی دماغ اور روح کی بیداری اوز انسانی قوتوں کی ہم‌آہنگ تربیت کو نظرانداز کر دیں گے - لیکن یہ ضرور ہے کہ مدرسے کی اونچی جماعتوں کی تعلیم میں پیشوں کی مناسبت کا خیال رکھا جائے گا اور ان مضامین میں بھی جو تمام مدارس میں مشترک ہوں گے ایسے حصوں پر زور دیا جائے گا جن کا تعلق بالخصوص ماحول کی زندگی سے ہو - مثلاً یہ ضروری نہیں کہ سائنس یا جغرافیہ یا حساب پڑھانے میں دیہات اور شہر کے مدارس میں یا زراعتی اور صنعتی اضلاع میں ان مضامین کا بالکل ایک ہی نصاب مقرر کیا جائے - بلکہ یہ بہت بہتر ہوگا کہ عام اصولوں کی تشریح کے لیے عملی مثالیں ایسی منتخب کی جائیں جو مدرسے کے مخصوص ماحول سے لی گئی ہوں - اس طرح سائنس کی تعلیم میں ہم دیہاتی

تحفظ اور استحکام کی کوشش کرتے ہیں - انگلستان کے ہر ضلعے کی کرکٹ ٹیم وہاں کے باشندوں کی مشترک چیز ہوتی ہے جس پر وہ ناز کرتے ہیں - اسی طرح ہر ضلع اپنے اپنے مدارس' اپنے حفظان صحت کے نظام وغیرہ میں دوسرے ضلعوں پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتا ہے - ہندوستان میں ابھی تک یہ احساس کسی مفید شکل میں پیدا نہیں ہوا - مختلف صوبوں کے باشندوں میں باہمی رقابت ہونا اور ان کا ایک دوسرے کو حقیر سمجھنا اس جذبے کا بدل نہیں ہو سکتا - لیکن ہماری حالت کو دیکھتے ہوئے اس جذبے کی تربیت اور رہنمائی نہایت ہی ضروری ہے کیونکہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور جب اس میں عنقریب وفاقی نظام قائم ہو جائے گا تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہمیت حاصل کرے گا کہ لوگوں میں کس طرح ملکی حب وطن کے ساتھ ساتھ مقامی حب وطن کا احساس گہرا اور مستحکم کیا جائے -

یہاں ہم ان تمام اصولوں کے عملی نتائج سے بحث نہیں کر سکتے - لیکن یہ ظاہر ہے کہ تعلیم اور معاشرتی جماعتوں کے باہمی تعلق کا صحیح احساس تعلیم کے تمام پہلوؤں پر بہت نمایاں اثر ڈالے گا - اور اس کی وجہ سے نہ صرف تعلیم کے عام مفہوم میں تبدیلی لازم آئے گی بلکہ مدرسوں کے نصاب اور تعلیمی طریقوں اور ضبط و تربیت کے نظام سب میں اس بات کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ یہ چیزیں طلبہ کو معاشرتی زندگی کی ذمہ‌داریوں کے لیے تیار کرتی ہیں یا نہیں - نصاب کی تدوین اور مدرسے کے تمام مشاغل

مطالعے اور تخیل کی صلاحیت پیدا ہوجائے تو انسان ادب اور فلسفے اور سیاست کے بڑے سے بڑے اور گہرے سے گہرے مسائل میں دلچسپی اور حصہ لے سکتا ہے -

هم چو پرکاریم در راہ شریعت مستقیم
پاے دیگر سیر هفتاد و دو ملت می کنیم

اس میں "راہ شریعت" سے هماری مراد سامنے کے فرائض اور معاملات هیں اور "هفتاد و دو ملت" وہ بیشمار مسائل جن کی بدولت همارا تعلق بحیثیت انسان کے تمام دنیا کے انسانوں سے هے - مستقبل کی تعلیم کے لیے یہ ایک نہایت هی اهم مسئلہ هے کہ مخصوص مقامی حب وطن اور تعلقات اور همارے وسیع‌تر مفاد اور دلچسپیوں میں کس طرح هم‌آهنگی پیدا کی جائے تاکہ تعلیم یافتہ لوگ ایک دو طرفہ خطرے سے محفوظ رهیں - بعض تو ایسے هیں جو بالکل اپنے سامنے کی چیزوں کو نہیں دیکھتے بلکہ عام معاملات میں محض ایک سطحی اور نظری دلچسپی کا اظہار کر کے یہ سمجھ لیتے هیں کہ وہ نظام عالم میں ایک مفید خدمت انجام دے رهے هیں - اور بعض ایسے هیں جن کی توجہ ذاتی اور وقتی مسائل میں اس درجہ منہمک هوتی هے کہ ان کو دنیا کی وسعت اور گوناگوں دلچسپیوں اور مسائل کا علم هی نہیں هوتا - اس قسم کی تعلیم کا تشکیل دینا مشکل ضرور هے لیکن ناممکن نہیں - انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں تعلیم' طلبہ میں مقامی حب وطن کا احساس پیدا کرتی هے اور لوگ اپنے اپنے ضلعوں اور شہروں کے مخصوص ادارات اور روایات سے محبت رکھتے هیں اور ان کے

کے فرائض انجام دیتے ہیں - لہٰذا قومی اصلاح اور سیاسی اور معاشرتی تعمیر اسی وقت ممکن ہے جب تمام افراد قوم کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ چھوٹے چھوٹے مفید کاموں اور فرائض میں انہماک اور دلچسپی کا اظہار کریں اور ان کو نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ انجام دیں کیونکہ یہی وہ قطرے ہیں جو مل کر سمندر بن جاتے ہیں اور جن کے بغیر ساری کوششیں جو بڑی بڑی قومی انجمنوں اور اداروں میں کی جاتی ہیں بیکار ثابت ہوتی ہیں - ہندوستان میں جو مفید تحریکیں آئے دن ناکام ہوتی رہتی ہیں ان کی اصل وجہ یہی ہے کہ لوگ بڑے بڑے منصوبوں اور دعووں کے ساتھ ان کو شروع کرتے ہیں لیکن جب وقتی جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو کوئی ایسی خاموش کارکن جماعتیں نہیں ملتیں جو باوجود مشکلات اور ہمت‌شکن حالات کے استقلال کے ساتھ انہیں اپنے اپنے حلقۂ عمل میں چلاتی رہیں - ہماری موجودہ تعلیم کا ایک اندیشہ ناک رجحان یہ ہے کہ وہ افراد کو ایک حد تک ان کے قریبی ماحول اور اس کے اہم اور غور طلب مسائل سے بیگانہ کردیتی ہے اور دور از کار باتوں میں الجھا دیتی ہے یا محض ذاتی فوائد کے پھیر میں ڈال دیتی ہے - ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ نصاب، طریقۂ تعلیم اور تعلیم کی اندرونی روح کو اس طرح بدلیں کہ طلبہ میں مقامی "حب وطن" پیدا ہو اور وہ مقامی معاملات میں توجہ اور ہمدردی کے ساتھ حصہ لے سکیں - اب آگے انہیں جہاں تک توفیق اور ان میں جتنی قابلیت ہو- انسان کا ذہن زنجیروں سے بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ آزادی سے نامحدود فضا میں اڑتا ہے - اگر اس میں

نے ابتدا میں کسی محدود حلقۂ عمل میں خلوص اور محنت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام کرکے بڑے کارناموں کے انجام دینے کی قابلیت بہم پہنچائی - اس کے علاوہ ہم میں سے زیادہ‌تر لوگوں کے لیے یہ امکان ہی نہیں کہ براہ راست قومی یا بین‌الاقوامی معاملات پر کوئی زبردست اثر ڈال سکیں - وہ حلقۂ عمل اُن لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے اپنی قابلیت ' اپنی مسلسل محنت اور ایک حد تک اچھے موقعوں سے فائدہ اُتھا کر مسلمہ حیثیت پیدا کرلی ہے. جس کی بدولت' وہ اُن معاملات میں حصہ لے سکتے ہیں - باقی لوگوں کا فرض اور نہایت اہم فرض یہی ہے کہ وہ اپنے محدود حلقۂ عمل میں اپنے متعلقین اور گرد و پیش کے لوگوں کی خدمت کریں - اس خدمت کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقامی ماحول کا مطالعہ کریں اور اس کو سمجھیں' عمرانی زندگی کے نظام پر غور کریں اُور اپنی اپنی قابلیت کے مطابق جہاں تک موقع ملے ان میں اصلاح اور بہتریٔ کی کوشش کریں - معاشرے کے جمہوری نظام کی کامیابی کے لیے یقیناً قابل لیڈروں کی ضرورت ہے لیکن اتنی ہی ضرورت تربیت یافتہ اور فرض شناس پیرووں کی ہے جو ان لیڈروں کے ماتحت اپنا اپنا کام ذمہ‌داری اور دانشمندی کے ساتھ انجام دیں - اول تو لیڈر بجاے خود کچھ نہیں کرسکتے جب تک ان کے ساتھ ایک جماعت نہ ہو جو اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چل سکے - دوسرے جمہوری نظام میں لیڈر بننے کے لیے کسی خاص طبقے میں پیدا ہونا یا دولتمند ہونا شرط نہیں بلکہ انہیں عام لوگوں میں سے غیر معمولی قابلیت کے لوگ اپنی اپچ اور کارکردگی کی بدولت آگے بڑھ کر قیادت

گاؤں میں اجنبی بن کر زندگی بسر کرے گا اور ان معاملات میں دلچسپی نہ لے گا تو ایک طرف وہ خود خوشی اور مسرت سے محروم رہے گا اور دوسری طرف اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی کوئی خدمت نہ کر سکے گا۔

ہندوستان کے موجودہ تعلیمی حالات اور رجحانات کو دیکھ کر اس بات پر زور دینے کی ضرورت خاص طور پر محسوس ہوتی ہے - اس سے ہمارا مقصد تنگ نظری اور محدود مذاق کی حمایت کرنا نہیں اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گاؤں کے رہنے والوں کو صرف گاؤں سے دلچسپی ہو اور شہروں کے رہنے والے اپنے سامنے کی چیزوں کے سوا کسی چیز کو نہ دیکھیں اور نہ اس پر غور کریں - موجودہ زمانے کی ایجادات اور سائنس کی ترقی نے دنیا کو اس طرح ملا دیا ہے اور تمام انسانوں کو تعلقات اور باہمی احتیاج کی زنجیروں میں اس شدت سے جکڑ دیا ہے کہ ہمارے لیے ہرگز مناسب نہیں کہ ہم اپنی فوری ضروریات کے علاوہ اور تمام مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں - لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کا باشندہ بننے سے پہلے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے گاؤں کے دیہاتی یا اپنے شہر کے مفید اور ذمہ‌دار شہری بنیں - حقیقت میں کوئی شخص جس کو اپنی مقامی حالات سے واقفیت اور دلچسپی نہ ہو وسیع‌تر قومی اور بین‌الاقوامی معاملات میں معقول اور مفید طریقے پر شرکت نہیں کرسکتا - وہ " لیڈری " کرسکتا ہے مگر خدمت اس کے بس کی بات نہیں - اکثر لوگ جنہوں نے خاموشی اور استقلال کے ساتھ اپنے ملک اور قوم کی قابل قدر خدمت انجام دی اور صفحۂ تاریخ پر اپنا نقش ثبت کر گئے وہی تھے جنہوں

کر سکیں - ہر شخص کی زندگی صرف مجموعی معاشرے کے زیر اثر نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کا ماحول زیادہ‌تر ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور گروہوں پر مشتمل ہے جو اس کی گھر کی زندگی کو کئی ہم‌مرکز دائروں کی طرح گھیرے ہوئے ہیں - ہم کیسے کسی شخص کو صحیح طور پر تعلیم یافتہ کہہ سکتے ہیں جب تک اس میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ اپنے گھر والوں، اپنے ہمسایوں اور پڑوسیوں، اپنی "برادری" کے اشخاص کے ساتھ مناسب سلوک کر سکے ؟ مناسب سلوک سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ ان جماعتوں کے اصول معاشرت، روایات، اور مخصوص معاملات کو سمجھے اور ان سے ہمدردی کرے، بالعموم اس کے افعال ان کے ساتھ ہم‌آہنگ ہوں اور وہ ان فرائض کو خوش‌اسلوبی کے ساتھ ادا کرے جو ان جماعتوں کا رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے ذمے عائد ہوتے ہیں - مثال کے طور پر ہندوستان کے کسی گاؤں کے باشندے کو لے لیجیے جس نے مقامی یا ضلع کے مدرسے میں تعلیم پائی ہے - اگر یہ تعلیم اس کو اپنے مخصوص دیہاتی ماحول میں زندگی گزارنے کے قابل نہ بنا سکے، اگر اس کو مناظر فطرت سے دل‌چسپی باقی نہ رہے، کام اور محنت کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے، گاؤں کی زندگی کے بنیادی اصول یعنی باہمی امداد اور اشتراک عمل اس کے دل کو نہ لگیں تو وہ تعلیم اس کے لیے نہ صرف بےکار ہے بلکہ نہایت مضر ہے - اس کو اپنی زندگی اسی ماحول میں گزارنی ہے اور سوائے خاص صورتوں کے اسی ماحول میں گزارنی چاہیے - لہذا اگر وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود اپنے

جائے؛ تاکہ ہر فرد بغیر کسی روک ٹوک کے ایک آزاد اور سازگار ماحول میں اپنی قوتوں کو پوری طرح نشو و نما دے سکے اور ان کو اجتماعی اور قومی اور اس سے بڑھ کر نوعی خدمت کے لیے استعمال کرنا سیکھے - لہذا جمہوری تعلیم کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ان ناجائز سہولتوں اور غیر معمولی رعایتوں کو دور کیا جائے جو بعض افراد یا جماعتوں کو بغیر ذاتی استحقاق کے حاصل ہو گئی ہیں اور تمام افراد قوم کے لیے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) کی معرکۃآرا کتاب "تعلیم اور جمہوریت" (Democracy and Education) جو اس صدی کی بہترین تعلیمی تصنیف ہے اس مبحث پر ہر پہلو سے روشنی ڈالتی ہے اور اس کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے ان تمام اجتماعی بندشوں اور سختیوں کو دور کیا جائے جنہوں نے افراد کی قوتوں اور صلاحیتوں کو جکڑ رکھا ہے اور عام لوگوں کے اندر جو جوہر ہے اسے ابھرنے کا موقع نہیں دیتیں - اس طرح تعلیم تمدنی اصلاح کے لیے ایک زبردست آلۂ کار بن جاتی ہے جو نئی نسل کے افراد میں ایک نئی ذہنیت پیدا کر کے معاشرتی ناانصافیوں کو دور کرنے کی فکر کرتی ہے -

لیکن اسی کے ساتھ تعلیم کا یہ بھی کام ہے کہ وہ جماعتوں کی مختلف خصوصیات اور تمدنی روایات[۱] کا لحاظ رکھے اور افراد کی تربیت اسی طرح کرے کہ نہ صرف ان کی ذہنی قوتوں کی نشو و نما ہو بلکہ وہ ان کو اپنے عمرانی ماحول میں بغیر کشمکش اور تصادم کے خوبی اور عمدگی کے ساتھ استعمال

جماعتوں کے باہمی ربط و ضبط اور اشتراک عمل میں سدّ راہ ہیں اور لوگوں کے دلوں میں قومی روح اور وحدت مقاصد کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتے - یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے یوں نظری طور پر تو ہر شخص تسلیم کر لیتا ہے لیکن اگر لوگ خلوص اور ہمت کے ساتھ اس پر عمل کریں تو نہ صرف تعلیم بلکہ تمام نظام معاشرت میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جائے کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تعلیم کے اداروں اور انتظامات کا مجموعی اور متحدہ رجحان یہ ہو کہ ذات پات کی تمام بیجا بندشوں، جماعتی خود غرضیوں، اقتصادی مظالم اور ناانصافیوں کی بیخ‌کنی کی جائے - اگر تعلیم کے میدان میں یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو کسی "اونچی" ذات کا لڑکا کسی "نیچی" ذات کے لڑکے کے ساتھ تعلیم پانے سے کیوں کر انکار کر سکتا ہے؟ مختلف طبقوں کے لیے مختلف قسم کے تعلیمی ادارے کب جائز رکھے جا سکتے ہیں؟ محض دولت‌مند ہونا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی شرط کیسے قرار پا سکتا ہے؟ ہر طبقے اور ہر گروہ میں اشتراک عمل کے بجائے مقابلہ اور رقابت کے جذبات پیدا کرنا کس طرح گوارا کیا جا سکتا ہے؟ جمہوریت کا اصل مفہوم یہی ہے کہ ہر اس چیز کو جو معاشرے کے افراد کو اجتماعی بندشوں میں جکڑ کر ان کی آزادانہ نقل و حرکت اور میل جول کو روکتی ہے، جو نام و نسب کی اضافی صفات کے مقابلے میں ذاتی صلاحیت کو خاطر میں نہیں لاتی، جو بعض لوگوں کو صرف محنت کی کڑیاں سہنے کے لیے اور بعض کو محض فرصت کا لطف اٹھانے کے لیے مخصوص کرتی ہے، مٹا دیا

تربیت کے' کیا بہ لحاظ اخلاقی اور دماغی نشو و نما کے ہر طالب علم اور تمام طلبہ سے مختلف ہوتا ہے یہاں تک کہ ان طلبہ میں بھی جو کم سے کم ذہنی اعتبار سے بظاہر ایک ہی معیار کے معلوم ہوتے ہیں پوری طرح غور اور امتحان کرنے پر بہت بڑا فرق نکلتا ہے - ان سب کی تربیت کرنا مدرسے کا فرض ہے - کسی قدر پیچیدہ اور دشوار ہے یہ فرض اگر اس کو پوری طرح سمجھا جائے ! ہم دیکھ چکے ہیں کہ مدرسہ ایک تمدنی ادارہ ہے جسے معاشرہ اپنے مشترک اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے قائم کرتا ہے - برخلاف اس کے خاندان کا نقطۂ نظر تمامتر انفرادی ہوتا ہے یعنی جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے نزدیک ہر بچہ ایک مخصوص میرث کا مالک ہے جس کی نشو و نما گھر کی تربیت کا سب سے زیادہ اہم فرض ہے - مطالبات کی اس کشمکش میں مدرسے کا نازک فرض یہ ہے کہ نہ صرف طلبہ کی انفرادی بہبود کا خیال رکھے بلکہ ان کو اجتماعی ذمہ داریوں اور فرائض کی بجاآوری کے لیے بھی تیار کرے - اس فرض کی دقت اور نزاکت کا پورا احساس انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو یہ جانتے ہیں کہ اگرچہ حالت کمال میں فرد اور جماعت کی اغراض بالکل متحد اور ہم آہنگ ہونی چاہئیں لیکن عملاً ہماری اس ناقص دنیا میں ہر ہر قدم پر انفرادی آزادی اور معاشرے کے اٹل مطالبات میں جنگ ہوتی رہتی ہے - بہر حال اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کی اہلیت پیدا کی جائے اور ان تعصبات اور اختلافات کو دور کیا جائے جو افراد اور

میں بہت سی اصلاحی اور سیاسی تحریکوں کی وجہ سے ذات پات کی بندشیں ڈھیلی ہو گئی ہیں اور ایسے اثرات کام کر رہے ہیں جو غالباً کچھ مدت میں ان کو بالکل توڑ دیں گے لیکن ابھی تک ان کا اثر اتنا وسیع اور راسخ ہے کہ نظریۂ تعلیم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کا تعلق ان جماعتی اثرات سے کیا ہے - اس مسئلے کے بعض پہلو تو بالکل صاف اور واضح ہیں - مدرسہ اکیلا اپنے طلبہ کی تربیت کا فرض ادا نہیں کرسکتا اس کے ساتھ دوسرے تمدنی اداروں کی شرکت بھی ضروری ہے کیونکہ اس کا اثر ان کے روزمرہ کے اوقات کے ایک تھوڑے سے حصے تک محدود ہوتا ہے اور باقی اوقات میں ان کی تربیت وہ تمام عمرانی تعلقات اور روایات کرتی ہیں جن کا مرکز مدرسے سے باہر ہے لہذا کوئی تعلیمی اصلاح اس وقت تک پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ وسیع‌تر تمدنی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے تاکہ تمام تمدنی اداروں کا مجموعی اثر ہم‌آہنگ اور طلبہ کی تربیت کے لیے مفید ہو - ظاہر ہے کہ اگر عمرانی اثرات مدرسے کے کام میں معین ہوں تو تربیت کا فرض بہت سہل ہو جاتا ہے - اور یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ ان اثرات کی وجہ سے مدرسے کے طلبہ میں انفرادی اختلافات بہت نمایاں ہو جاتے ہیں - اول تو فطری اختلافات کا دائرہ بجائے خود بہت وسیع ہوتا ہے پھر جب اس کے ساتھ گھر اور عمرانی ماحول کا فرق بھی شامل ہو جائے تو افراد میں باہم اور زیادہ تفاوت ہو جاتا ہے - کیا بہ لحاظ جسمانی اور معاشرتی

کرنے کی نہ عادت ہوگی نہ شوق - بلکہ اگر اس کی تربیت "شرافت" کے غلط تصور کے زیر اثر ہوگی تو وہ محنت اور دستکاری کو ذلیل سمجھے گا اور تعلیم ھی کے زمانے میں "نوکری" کو اپنا مطمح نظر بنائے گا - اس کو شائد یہ احساس بھی نہ ہو کہ وہ زندگی کتنی محدود اور تنگ ہوتی ھے جس میں انسان کو ہمیشہ دفتر میں بیٹھ کر مشین کی طرح کام کرنا پڑتا ھے - فطرت کے مناظر اور مظاہر سے اسے نہ واقفیت ہوگی اور نہ دلچسپی - وہ اپنے خیال میں معاشرے کو دو طبقوں میں تقسیم کرے گا - ایک وہ لوگ جن کے رہنے سہنے کا طریقہ اس سے ملتا جلتا ھے ' جنھوں نے تھوڑی بہت تعلیم پائی ھے' جدید تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے ہیں - دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہوگا جو اس کے نزدیک "ذلیل" اور کم درجہ کے کام کرتے ہیں اس سے کم‌تر حیثیت رکھتے ہیں اور معاشرتی زندگی کے آداب و رسوم میں بھی اس سے مختلف ہیں - اس کے ساتھ یہ امکان بھی ھے کہ یہ لڑکا گفتگو ' آداب مجلس ' عام علمی اور کتابی واقفیت اور ذہنی بیداری میں اپنے ہم عمر جاہل کے لڑکے سے بہتر ہو کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بچے بغیر کسی خاص تعلیمی اہتمام کے خود بخود اپنے ماحول سے سیکھ لیتے ہیں - یہ دونوں مثالیں اس خاص مطلب کو واضح کرنے کے لیے دی گئی ہیں کہ اگر تعلیم و تربیت کے اثرات اور طبعی اختلافات کا دخل نہ بھی ہو تو بھی قرین قیاس یہ ھے کہ محض عمرانی ماحول کے فرق کی وجہ سے دو اوسط درجے کے بچوں میں اس قسم کا فرق پایا جائے گا - یہ اور بات ھے کہ خاص اثرات کے ماتحت ان دونوں کی شخصی نشو و نما اس

ان سب چیزوں کو مجموعی طور پر نہ صرف افراد کی سیاسی اور اقتصادی نشو و نما میں دخل ہے بلکہ وہ ان کی معاشرتی تعلیمی اور مذہبی حالت کو بھی متاثر کرتی ہیں -

جب بچہ زندگی کا سفر شروع کرتا ہے تو وہ نہ صرف گھر کی فضا میں پرورش پاتا ہے بلکہ اس کے گرد ایک دائرہ عمرانی زندگی کا ہوتا ہے جو اکثر غیر محسوس لیکن نہایت موثر طریقے سے اس کی عادات' خیالات اور سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے - اس کی چال ڈھال' اس کا طرز گفتگو اور ذخیرۂ الفاظ ' اس کے اخلاقی اصول اور نصب‌العین اپنے ماحول کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں - اوپر کی مثالوں کو لے کر ان پر غور کیجیے - اگر بچے کی ابتدائی زندگی جلاہوں کی کسی منظم اور محنتی جماعت میں بسر ہوگی تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اس میں اپنے اس ماحول کی وجہ سے عمرانی احساس بہت مستحکم ہوگا محنت کرنے کی عادت ہوگی ' ہاتھ سے کام کرنے میں عار نہ ہوگا ' لیکن اگر اس کے خاندان میں تعلیم کا چرچا نہیں تو وہ ان خوبیوں کے باوجود تنگ خیال اور تنگ نظر ہوگا - اس کی ہمدردی اور مشاغل کا دائرہ محدود ہوگا - اس کو چند انی گنی چیزوں کے علاوہ دنیا کی کسی اچھی چیز سے دلچسپی نہ ہوگی - اس کے مقابلے میں کسی ایسے بچے کو لیجیے جو ایک تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ شخص کے گھر میں پیدا ہوتا ہے اور جسے ہوش سنبھالتے ہی زیادہ‌تر اسی جماعت یا طبقے کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے - اس کی بول چال اس کے خیالات' اس کی طرز زندگی سب پہلے بچے سے مختلف ہوں گے - اغلب یہ ہے کہ اس کو ہاتھ کا کام

خاندان کا فرد ہوتا ہے - کسی گروہ کو اس معنی میں ایک جماعت بننے کے لیے کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے - اس کے افراد کی مالی حیثیت، رسم و رواج، طرز معاشرت، تہذیب و تمدن کی روایات کم و بیش ایک سی ہوں اور ان میں خود بخود اتحاد اور میل جول ہو - مثال کے طور پر اس معنی میں کسی شہر کے جلاہے یا قصاب ایک ''جماعت'' ہوتے ہیں نہ اس وجہ سے کہ وہ ایک ہی پیشہ اختیار کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں ہر طرح یکجہتی اور یکسانی پائی جاتی ہے - وہ لفظاً اور معناً ایک ہی برادری کے ہوتے ہیں - اسی طرح کسی شہر کے تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ لوگ جن کی اقتصادی اور معاشرتی حیثیت ایک سی ہوتی ہے اور آپس میں میل جول ہوتا ہے ایک جماعت کے افراد ہیں - یا انگلستان میں کچھ عرصے پیشتر تک جو طلبہ وہاں کے بڑے بڑے تاریخی پبلک اسکولوں مثلاً ایٹن (Eton) اور رگبی (Rugby) وغیرہ میں تعلیم پانے کے لیے داخل ہوتے تھے وہ خوش حال امرا کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی خاص روایات اور خاص نقطۂ نظر ہوتا تھا جو اپنی خوبیوں اور خرابیوں دونوں کے لحاظ سے اور تمام جماعتوں سے علحدہ اور ممتاز ہوتا تھا - یہاں ہم نے ماضی کا صیغہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ گزشتہ چند سال میں جہاں اور بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں وہاں جمہوری تحریکوں کی بدولت ان مدرسوں میں بھی وہ امتیازی شان نہیں رہی جو پہلے تھی - اس معاشرتی ماحول میں ہم پڑوس کے اثرات اور بعض صورتوں میں شہری اور دیہاتی زندگی کے مجموعی تمدنی اثرات کو بھی شامل کرسکتے ہیں - کیونکہ

براہ راست فائدہ پہنچائیں - موجودہ نظریۂ تعلیم کا یہ اصول کہ مدرسے کو اپنے شہر یا گاؤں کی تمدنی زندگی کا مرکز ہونا چاہیے اور لوگوں کو بہتر طرز زندگی سے روشناس کرنا چاہیے اسی خیال کی تفسیر ہے - مغربی ممالک میں جا بجا اور ہندوستان میں کہیں کہیں اس قسم کے جو تجربے کیے گئے ہیں خصوصاً گاؤں کی زندگی کی اصلاح اور لوگوں کی طرز معاشرت اور حفظان صحت کے انتظام میں مدرسوں نے جو حصہ لیا ہے وہ غور اور مطالعے کے قابل ہے اور اس قسم کے کام اس سے بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے - اگر ہندوستانی مدارس کی تنظیم جدید میں اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا تو اس سے نہ صرف ان لوگوں کو فائدہ پہنچے گا جن کی مدرسے خدمت کریں گے بلکہ خود مدرسے کی تعلیم زیادہ مفید، زیادہ دلچسپ اور زیادہ علمی ہو جائے گی کیوں‌کہ طلبہ محسوس کریں گے کہ ان کے تعلیمی مشاغل بےکار اور بےمقصد نہیں ہیں بلکہ ان سے ایسے کاموں کو کرنے میں مدد ملتی ہے جو صریحاً مفید ہیں اور ان کی تعمیری قوتوں کو اُبھرنے کا موقع دیتے ہیں -

معاشرتی زندگی کا تعلیمی اثر

گھر بچے کا سب سے پہلا اور قریبی ماحول ہوتا ہے - اس سے زیادہ وسیع ماحول جو اس کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے اُن گروہوں اور جماعتوں پر مشتمل ہے جن سے بچے کا قریبی تعلق ہوتا ہے - انہیں ہم مجموعی طور پر معاشرتی طبقے کہتے ہیں - ان میں سے ایک تو وہ خاص جماعت ہے جس میں بچہ پیدا ہوتا ہے اور جس کا رکن وہ تقریباً اسی حیثیت سے ہوتا ہے جس حیثیت سے اپنے

زبان کا جزو ہوتا ہے اور کچھ ان کے گرد و پیش کی روزمرہ کا - کچھ عرصے کے بعد وہ مدرسے کی زبان رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں اور تقریباً وہی زبان بولنے لگتے ہیں جو ان کے گرد و پیش رائج ہوتی ہے - اس مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اکثر تعلیمی مقاصد اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک گھر اور مدرسہ یعنی والدین اور استاد مل جل کر' بچوں کی تربیت کا انتظام نہ کریں - یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں کہ ان دونوں اداروں میں اشتراک عمل کے لیے کیا عملی طریقے استعمال کئے جائیں لیکن اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اس مقصد کے لیے محض دو تین سالانہ جلسے کافی نہیں - جن میں والدین تماشا دکھلانے کے لیے بلا لیے جاتے ہیں - اس کے لیے وہ مخصوص ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن سے والدین اور سرپرست یہ محسوس کریں کہ ان کے شہر یا گاؤں کا مدرسہ کوئی اجنبی یا سرکاری ادارہ نہیں جو ان کی زندگی اور مشاغل سے بےتعلق ہے - بلکہ ان کی تمدنی زندگی کا ایک اہم اور لازمی جزو ہے جس کے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا - اس مقصد کے حصول کے لیے دو باتوں کی خاص ضرورت ہے - ایک تو یہ بدیہی امر ہے کہ والدین اور معلموں میں باہمی میل جول ہونا چاہیے تاکہ وہ ایک دوسرے کی ضروریات اور مقاصد سے واقف ہو جائیں اور اپنے بچوں کی تربیت کے لیے بہترین اور مناسب‌ترین ذرائع اختیار کریں - دوسری بات جو ایک لحاظ سے زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ مدرسے کو بحیثیت ایک تعلیمی ادارے کے ایسے مشاغل اختیار کرنے چاہییں جو گرد و پیش کے بالغ لوگوں کو

نہیں کی جا سکتی کہ انہیں ایک دوسرے سے تعلق نہ ہو
چہ جائیکہ بچوں کی زندگی جن کی ذات سراسر وحدت کا
مظہر ہوتی ہے - بچے روزانہ چوبیس گھنٹوں میں سے تقریباً
اٹھارہ گھنٹے مدرسے سے باہر گھر میں اور اس کے آس پاس بسر
کرتے ہیں - ان کے ذہن اور سیرت کی تشکیل صرف مدرسے کے
وقت تک محدود نہیں بلکہ بیداری کے ہر لمحے میں ہوتی
رہتی ہے اور کم سے کم بچپن میں تو گھر کا اثر مدرسے کے مقابلے
میں زیادہ ہوتا ہے - اگر گھر کا مجموعی اثر مفید ہے اور مدرسے
کے کام میں اعانت کرتا ہے تو بچے کی نشو و نما مناسب طریقے
پر ہوگی لیکن اگر ان دونوں کے اثرات ہم آہنگ نہیں اور مدرسے
کی تربیت گھر میں آکر زائل ہو جاتی ہے یا گھر کی عمدہ
روایات اور عادتیں مدرسے میں پختہ نہیں ہوتیں تو طالب علم
کے نفس میں ایک کشمکش پیدا ہو جاتی ہے - جس کا
نتیجہ اس کی زندگی کے لیے اچھا نہیں ہوتا - اس کی ایک
معمولی سی مثال زبان اور گفتگو کا مسئلہ ہے - اکثر طلبہ کے
گھروں پر جو زبان بولی جاتی ہے وہ غلط یا گنواروں کی زبان
ہوتی ہے - مدرسے میں بحیثیت مجموعی اس سے بہتر اور
زیادہ صحیح زبان رائج ہوتی ہے - جب طالب علم مدرسے
میں داخل ہوتا ہے تو استاد کوشش کرتے ہیں کہ وہ صحیح
زبان بولے لیکن گھر کی پڑی ہوئی عادت آسانی سے نہیں
چھوٹتی بلکہ روزمرہ کے اثر سے اور پختہ ہوتی جاتی ہے -
بالعموم یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جو طلبہ ابتدائی یا ثانوی مدارس
کی تعلیم حاصل کر کے چھوڑ دیتے ہیں وہ پہلے تو ایک عجیب
مخلوط زبان بولتے ہیں جس میں کچھ ان کی "تعلیمی"

کی پوری اهمیت کو نہیں سمجھتے جو اس زمانے میں هوتے هیں - اس وقت بھی وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ وهی سلوک کرنا چاهتے هیں جو بچوں کے ساتھ کیا جاتا هے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اب ان کو زیادہ آزادی راے اور آزادی عمل حاصل هونا چاهیے اور بجاے تحکمانہ برتاو کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا زمانہ آگیا هے - اس ناواقفیت یا تحکم پسندی کی بدولت والدین اور اولاد کے تعلقات خراب هو جاتے هیں اور روزمرہ کے جھگڑوں کی وجہ سے ان کی نشو و نما کے لئے سازگار ماحول پیدا نہیں هو سکتے - چنانچہ گھر جو در اصل ایک تعلیمی ادارہ هے فرائض کی ادائگی سے قاصر رهتا هے - اسی وجہ سے بچوں اور نوجوانوں کی نفسی زندگی کے صحیح اور واضح علم کی اشاعت والدین کی آگاهی کے لیے ضروری هے - ورنہ یہ اندیشہ هے کہ هماری موجودہ غلط فہمی اور جہالت هماری طبیعت میں راسخ هو جاےگی اور نوعمروں کی صحیح تربیت نہ گھر کے بس کی بات رهے گی نہ مدرسے کے بس کی - بچوں کی نشو و نما سے گھر کا جو تعلق هے اس سے یہ بھی ظاهر هوتا هے کہ طلبہ کی تعلیم اس وقت تک قابل اطمینان نہیں هوسکتی جب تک مدرسہ اور گھر دونوں مل کر اس میں حصہ نہ لیں اور باهمی اتحاد عمل کے ساتھ ان کی زندگی کو سدھارنے اور مفید بنانے کی کوشش نہ کریں - آج کل تو یہ حالت هے کہ مدرسے کے معلموں کو گویا طلبہ کی خانگی زندگی سے اور گھر والوں کو ان کی تعلیمی زندگی سے کوئی واسطہ هی نہیں - یہ صورت حال بہت افسوسناک اور مضر هے - کسی شخص کی زندگی بھی مختلف شعبوں میں اس طرح تقسیم

ہمارے ہندوستانی گھروں میں بچوں اور نوجوانوں کو دو مختلف خطرے درپیش ہیں - ایک خطرہ تو یہ ہے کہ بعض اوقات ان کی اس قدر بےجا ناز برداری اور رعایت کی جاتی ہے کہ وہ بڑے ہوکر معاشرتی زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رہتے یا بہت سے تلخ تجربے اُٹھانے کے بعد دوسروں کے حقوق اور فرائض کا احترام کرنا سیکھتے ہیں - دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کے ساتھ اس قدر بےجا سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ ان میں آزادی سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی ان کی اپج دب جاتی ہے ان کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے یا ان کے دل میں والدین اور عزیزوں کی طرف سے نفرت اور خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو انہیں اندر ہی اندر "باغی" اور "سرکش" بنا دیتے ہیں - اور لطف یہ ہے کہ اکثر ایک ہی بچے کے ساتھ دونوں قسم کا برتاؤ کیا جاتا ہے - کبھی تو والدین ان کے ساتھ حد سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہیں' ان کی ہر بات اور ہر ضد کو مان لیتے ہیں اور کبھی کم از کم بچوں اور نوجوانوں کے خیال میں' منطق کے تمام کُلّیے توڑ کر خواہ مخواہ ان پر ناراض ہوتے ہیں اور ان کی قدرتی خواہشوں کو روکنا چاہتے ہیں - یا والدین میں سے ایک بےجا نازبرداری اور دوسرا غیر ضروری سختی کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے بڑوں کے ساتھ صحیح اور مستحکم تعلقات قائم نہیں کرسکتا- اور اس وجہ سے ان کی صحبت کے عمدہ اثرات سے بھی مستفید نہیں ہوسکتا - کچھ عرصے کے بعد جب بچہ بڑا ہوکر نوجوانی کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو یہ قباحت پیدا ہوتی ہے کہ والدین اور گھر کے دوسرے لوگ ان تبدیلیوں اور انقلابات

دیرپا اور وسیع ہوتا ہے - اس کے بعد نوجوانی کے دور میں جب بچپن کا توازن تہ و بالا ہو جاتا ہے نئی جبلتیں اور نئے جذبات رونما ہوتے ہیں اور نوجوان طالب علم کو طرح طرح کی تحریصوں اور کششوں کے درمیان اپنے لیے راہ نکالنا پڑتی ہے - اس وقت بھی گھر کی فضا اور روایات اس کی رہنمائی کرتی ہیں - ممکن ہے کہ یہ فضا خراب اور یہ روایات ناقص اور گمراہ کن ہوں - ایسی حالت میں نوجوان کی بے مرکز زندگی کا خدا حافظ ہے - لیکن اگر اس وقت والدین اور بھائی بہن اور عزیزترین دوستوں کی صحبت اور مثال خاموشی کے ساتھ اپنا عمدہ اثر ڈالتی ہے تو نوجوان کی زندگی ہمیشہ کے لیے سدھر جاتی ہے - اسی جد و جہد اور کشمکش کے دور میں اگر نوجوان کو یہ احساس ہو کہ اس کا گھر اس کے لیے ایک امن و سکون کی منزل ہے جہاں ایسے اصولوں اور قدروں کی حکمرانی ہے جن کا وہ احترام کرتا ہے تو ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ وہ اس تقویت اور اطمینان قلب کی بدولت تمام تحریصات پر غالب آئے - بقول ڈاکٹر وہیلر کے :—

"والدین اور بھائی بہنوں کی محبت ' گھر کی مسرت بخش زندگی' عزیزوں کی باہمی مراعات' وہ بےتکلفی اور ارتباط جو ایک چھوٹی سی قدرتی جماعت ہی میں پیدا ہو سکتا ہے ' حفظ حقوق و مراتب کی فضا میں زندگی بسر کرنا ' حق ' خیر اور حسن کا احترام ' یہی چیزیں ہیں جو فرد کے جذبات کی تربیت کرتی ہیں " [1] -

---

1— Wheeler. Youth

خواہ اور سب بچوں سے بڑھ کر ہے - وہ اس کی نظر میں غیر معمولی طور پر ذہین اور محبت کرنے والا اور عجیب و غریب صفات کا مالک ہوتا ہے یعنی ماں جو گھر کی سردار اور اس کی روح کا بہترین مظہر ہوتی ہے ہر بچے کی غیر محدود انفرادی قدر کو تسلیم کرتی ہے - اس کا یہ نقطۂ نظر، خواہ وہ محبت کی وجہ سے کتنا ہی مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو، معلم کے رسمی نقطۂ نظر کی نسبت حقیقت سے زیادہ قریب ہے - معلم بالعموم یہ سمجھتا ہے کہ سب بچے ایک لاٹھی سے ہانکے جاسکتے ہیں اور ان سے ایک ہی قسم کے معیار عمل کی توقع کی جاسکتی ہے کیونکہ اسے یہ بات اچھی طرح محسوس نہیں ہوتی کہ ان میں سیرت اور قابلیت کے اعتبار سے کسی قدر بیّن فرق ہوتا ہے - زمانۂ حال کی نفسیاتی تحقیقات نے پوری طرح ثابت کردیا ہے کہ ان بچوں میں بھی جو ایک ہی یا ایک سے ماحول میں رہتے ہیں اور ایک ہی تعلیمی منزل میں ہوتے ہیں بعض اوقات نہایت زبردست دماغی اور جذباتی اختلافات پائے جاتے ہیں جن کی طرف سے بے پروائی برتنے سے اکثر طلبہ کی زندگی برباد جاتی ہے یا کم سے کم ان کی ابتدائی تربیت ناقص رہ جاتی ہے اور ان کی صلاحیتوں کی ارتقا پوری طرح نہیں ہونے پاتی - مندرجۂ بالا بحث میں بچوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بڑی حد تک ان نوجوانوں پر بھی عائد ہوتا ہے جو بچپن کی وادیِ عیش سے نکل کر شباب کی پُرآشوب منزل میں قدم رکھتے ہیں- بچپن میں، جب عادتیں مستحکم ہونی شروع ہوتی ہیں اور طلبہ کے جذباتی میلانات نشو و نما پاتے ہیں، گھر کا اثر مدرسے سے بہت زیادہ

کو قائم رکھنا ھے - لیکن رفتہ رفتہ اس کے مقاصد میں اچھی طرح زندگی بسر کرنا بھی شامل ھو جاتا ھے - لیکن یہ امر کہ خاندان کا اثر بچے کی طبیعت اور خیالات پر خوشگوار ھوگا یا نہیں خاندان کی پرانی روایات اور اصول اور بزرگوں کے طرز عمل اور مثال پر منحصر ھے - اگر اس کے محدود ماحول میں ایسے مواقع موجود ھیں جن سے فائدہ اتھا کر بچے اپنی شخصیت کی تشکیل اور اپنی جبلتوں کا اظہار کر سکتے ھیں تو اس کا اثر ان کی زندگی پر اچھا پڑتا ھے - برخلاف اس کے اگر خاندانی روایات تنگ نظری پیدا کرکے بچوں کے مشاغل اور دلچسپیوں کا میدان بہت محدود کردیتی ھیں اور رسم و رواج اور بزرگوں کی سخت گیر طبیعت کے دباؤ سے ان کی شخصیت اُبھرنے نہیں پاتی تو اسی کا مجموعی اثر جیسا کہ ھم آئے دن دیکھتے ھیں بہت خراب ھوتا ھے - کیونکہ جب بچوں کی تربیت کی بنیاد ھی کمزور ھوگئی تو اس پر جو عمارت بنائی جائے وہ کسی طرح مستحکم نہیں ھوسکتی -

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج !

بچے کی سیرت کی تشکیل میں گھر کی زندگی کے دو اثرات خاص طور پر قابل ذکر ھیں - ایک طرف تو وہ بچے کو تمدنی زندگی کے سب سے پہلے اور سادہ‌ترین نظام سے آشنا کرتی ھے اور اس کے دل میں محبت' ھمدردی اور تعاون کا بیج بوتی ھے اور دوسری طرف بچے کی شخصیت اور انفرادیت کی حفاظت کرتی ھے - ھر ماں کا یہ خیال ھوتا ھے کہ اس کا بچہ دنیا بے

باب سوم

خانگی اور معاشری زندگی کے اثرات

بچے کی درس گاہ اولین

گھر کی زندگی اور خاندان کے افراد کا جو اثر اوائل عمر میں بچے کی شخصیت پر پڑتا ہے اس کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات ہر شخص کے ذاتی مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے - پہلے ماں کی گود میں اور اس کے بعد اور گھر والوں کی محبت میں بچہ وہ ابتدائی حرکات اور مشاغل سیکھتا ہے جو زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں - اور یہی نہیں بلکہ اس کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت بھی زیادہ تر گھر ہی میں ہوتی ہے - یہاں وہ سب سے پہلے یہ محسوس کرتا ہے کہ کس طرح متعدد افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر مشترک مقاصد کے لیے کوشاں ہیں اور جب تک ان میں سے ہر ایک اپنا اپنا کام نہ کرے گھر کا کارخانہ نہیں چل سکتا - باہمی احتیاج اور امداد کا یہ احساس ساری اخلاقی اور تمدنی تربیت کی بنیاد ہے - اس میں شک نہیں کہ جیسا ارسطو نے کہا ہے اور سب تمدنی اداروں کی طرح خاندان کی ابتدائی غرض بھی محض زندگی

سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں اور مدرسے کے نصاب اور نظام عمل پر اثر ڈالتے ہیں -

پروفیسر فنڈلے (Findlay) نے اپنی تازہ تصنیف "تعلیم کی بنیادیں" (Foundations of Education) میں ان اداروں کو مندرجۂ ذیل نقشے کے ذریعے ظاہر کیا ہے :—

تمدنی ادارے جن کا تعلیم سے تعلق ہے

گھر یا خاندان | معاشرتی طبقے | نظام معاشی | ریاست (حکومت) | تہذیب | مذہب

تہذیب ← علم (علوم و فنون) — اشاعت علم (تعلیم)
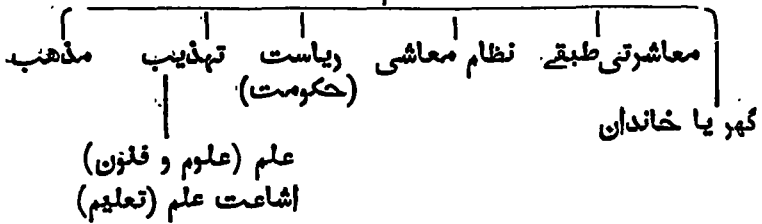
کتاب کے اس حصے میں ہم اُن مختلف اداروں کے تعلیمی اثرات اور مطالبات سے بحث کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ دور حاضر میں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں جنھوں نے ہمارے نظام تعلیم کو صریحاً متاثر کیا ہے - البتہ تہذیب اور مذہب کے اثرات کی بحث کو کتاب کے آخری حصے کے لیے ملتوی رکھیں گے جس کا تعلق طلبہ کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت کے مسائل سے ہے -

مثلاً مختلف پیشوں کی برادریاں' صنعت و حرفت کے کارخانے' وہ تمام ادارے جو پیدائش دولت اور تقسیم دولت کا کام انجام دیتے ھیں - اور بعض اوقات ایک دوسرے سے بالکل علحدہ اور دور رہنے والے لوگوں کو ایک رشتے میں منسلک کرتے ھیں - تیسری قسم ان جماعتوں کی ھے جن کی بنیاد قانونی ھے - ان کی سب سے اھم اور بڑی مثال ریاست ھے - ان تمام اداروں سے مل کر ھمارا تمدنی ماحول بنا ھے - بقول پروفیسر ایڈمسن (Adamson) یہ ھماری "دنیاے تمدن" ھے جو "طبیعی دنیا" اور "اخلاقی دنیا" کے ساتھ ساتھ ھماری زندگی کا احاطہ کئے ھوئے ھے [1] - اور ھماری فطرت کے اظہار کے لیے مواقع اور وسائل بہم پہنچاتی ھے - بچے' جوان' بوڑھے سب اپنی اپنی قابلیت اور حالات کے مطابق ان کے مشاغل میں حصہ لیتے ھیں اور اپنی قوتوں اور جبلّتوں کا اظہار کرتے ھیں اور اسی طرح ان کی علمی' اخلاقی اور تمدنی نشو و نما ھوتی ھے جس کا تجزیہ آئندہ باب میں صراحت کے ساتھ کیا جائے گا -

ھمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ھم ان تمام جماعتوں اور اداروں کے تعلیمی اثرات سے بحث کر سکیں جو بچے کی زندگی کا احاطہ کئے ھوتے ھیں کیونکہ ان کی تفصیل کے لیے معاشرے کے ھر شغل کا تجزیہ لازم آتا ھے - اس لیے ھم مختصراً صرف ان اداروں کا ذکر کریں گے جو بچے کی زندگی

---

۱ — ایڈمسن (Adamson) نے اپنی معرکۃالارا تصنیف "فرد اور ماحول" (Individual Environment) میں انسانی ماحول کی تقسیم اس عنوان سے کی ھے -

یا بالکل نہیں ہوتا بلکہ باوجود بعد مقام کے تمام اراکین ایک سلسلے میں منسلک ہوتے ہیں۔ مثلاً ریاست کا نظام، صنعت و حرفت کے کارخانے، یا علمی تحقیق و تفتیش کرنے والوں کی جماعتیں جن کے ارکان کا ایک دوسرے سے ذاتی طور پر ملنا جلنا ضروری نہیں - وہ اپنے اپنے اداروں کے عام نظم و نسق سے متاثر ہوتے ہیں، کتابوں، کانفرنسوں، رسالوں کی مدد سے ایک دوسرے کے کام سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور گو باہم صورت آشنا تک نہ ہوں مگر حقیقت میں ایک ہی جماعت کے رکن ہوتے ہیں -

مندرجۂ بالا تقسیم پروفیسر اسمتھ (Smith) نے اپنی کتاب "معاشیات تعلیمی" (Educational Sociology) میں افراد کے باہمی تعلقات کی بنا پر کی ہے - اگر ان اداروں کی تقسیم ان کے مقاصد کے لحاظ سے کی جائے تو ہمیں میکنزی (Mackenzie) کے نقطۂ نظر سے مدد ملے گی [1] اس کے خیال کے مطابق بعض جماعتوں اور اداروں کا مقصد مذہبی یا تہذیبی ہوتا ہے جن میں بنائے اشتراک یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب نفس یا تفریح کے لیے اجتماعی طور پر اہتمام کریں - اس ذیل میں ہم مذہبی نظاموں، تعلیمی اداروں، علمی انجمنوں اور فنون لطیفہ کے مرکزوں کو شمار کر سکتے ہیں - دوسری قسم ان جماعتوں کی ہے جن کی وجہ قیام اقتصادی ہے اور مادی کار و بار سے تعلق رکھتی ہے

۱—دیکھو میکینزی : زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamental Problems of life) صفحہ ۱۲۹ -

تعلق اور ربط سے ہمیشہ دونوں پر کچھ نہ کچھ ' برا یا بھلا '
اثر ضرور پڑتا ہے- یہ تعلقات عمرانی زندگی میں محض اتفاقی
اور عارضی نہیں بلکہ اپنی اپنی نوعیت کے مطابق مستقل
اداروں (institutions) کی شکل میں منظم ہیں- ان میں سے
بعض ایسے ہیں جن میں افراد کا تعلق اور اشتراک عمل بہت
گہرا اور قریب کا ہوتا ہے اور وہ براہ راست ایک دوسرے سے
مل جل سکتے ہیں - مثلاً خاندان' کھیل کی ٹیمیں' محلے
والوں کی جماعت - بعض اداروں میں باہمی تعلقات ایک
حد تک بلاواسطہ ہوتے ہیں اور ایک حد تک بالواسطہ - مثلاً
مدرسے یا مذہبی جماعتیں' یا امداد باہمی کی مختلف
قسم کی انجمنیں - ان میں افراد ایک دوسرے سے براہ راست
بھی ملتے جلتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں اور بعض اثرات بغیر
ذاتی میل جول کے بھی اپنے کام کرتے ہیں - مثلاً مدرسہ ایک
لحاظ سے ایک مقامی ادارہ ہے جس میں استاد طلبہ آپس
میں ملتے جلتے ہیں اور ذاتی تعلقات سے متاثر ہوتے ہیں
اور ایک لحاظ سے اس کے اثرات غیر شخصی ہوتے ہیں -
کتابیں' تعلیمی آلات اور وسائل ' مدرسے کا عام نظم و نسق
ایسی چیزیں ہیں جو تمام تعلیمی اداروں ' معلموں اور
متعلموں کو ایک سلسلے میں منسلک کرتی ہیں- اسی
طرح مذہبی اداروں میں جہاں لوگ ایک دوسرے سے یا
مذہبی پیشواؤں کی زندگی سے براہ راست مستفید ہوتے ہیں
وہاں ان کے خیالات اور عقائد پر رسوم و عبادات اور روایات کا
بھی اثر پڑتا ہے - تیسری شکل ان تمدنی اداروں کی ایسی
ہے جن میں افراد میں بلاواسطہ تعلق بہت ہی کم ہوتا ہے

طبیعت کی تشکیل ہمیشہ ان مشاغل میں شرکت کرنے سے ہوتی ہے جو معاشرے میں رائج ہیں یا مناسب ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ مدرسے میں رائج کئے جاتے ہیں - مدرسے کو اپنے مخصوص کام میں حقیقی کامیابی صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب اس کا طریقۂ تعلیم انہیں اصولوں پر مبنی ہو جن پر عمل کرنے سے تمدنی زندگی کا نظم اور ربط قائم ہے - اور وہ انہیں محرکات عمل سے کام لے جو بالغ افراد کی زندگی میں کارفرما ہیں - ورنہ محض کتابی اور لفظی تعلیم کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو طوطوں کو رٹانے کا - یعنی بچوں کی واقفیت سطحی اور اوپری ہوتی ہے اور ان کے اخلاق و عادات محض نقالی بن کر رہ جاتے ہیں - "بچوں کے نفس میں ان عادات اور رجحانات کی تربیت کے لیے جو عمرانی زندگی میں تسلسل اور ترقی کو قائم رکھتے ہیں یہ طریقہ کارگر نہیں ہو سکتا کہ براہ راست انہیں الفاظ کے ذریعے عقائد، جذبات اور معلومات کا درس دیا جائے - طبیعت کی مستقل اور ہمہ‌گیر تشکیل دانشمندی کے ساتھ اسی وقت ہو سکتی ہے جب نوعمر بچے رفتہ رفتہ ان مختلف عمرانی جماعتوں کے مشاغل میں حصہ لیں جن سے وہ تعلق رکھتے ہیں [1]-

اس باب میں ہم انہیں عمرانی جماعتوں کے نظام اور تعلیمی اثرات سے بحث کرنا چاہتے ہیں جن سے بچے کو تعلق ہوتا ہے اور جو اس کی تربیت پر گہرا اور پائدار اثر ڈالتے ہیں- ہم دیکھ چکے ہیں کہ دو اشخاص یا دو جماعتوں کے باہمی

۱— Dewey: Democracy and Education صفحہ ۲۶ -

دیتی ہیں یا اس میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں - تعلیمی مباحث کے لیے یہ وسعت نظر نہایت اہم ہے - کیونکہ اس کے بغیر ہم مدرسے کو ایک مفید اور موثر ماحول نہیں بنا سکتے - مدرسے کے بےشمار اور گوناگوں مسائل مدرسے کی چاردیواری ہی میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ تمدنی زندگی کے وسیع اور ہمہ‌گیر نظام کے مختلف شعبوں میں ان کی ابتدا ہوتی ہے اور وہاں سے ان کا اثر مدرسے کے اندر پہنچتا ہے- مدرسے کا خاص کام یہ ہے کہ وہ ان مسائل کے حل کرنے میں بچوں کی مخصوص ضرورتوں اور نفسی کیفیتوں کا لحاظ رکھے- مدرسے کے باہر معاشرے کے بالغ افراد بھی ان مسائل سے دوچار ہوتے ہیں - لیکن وہ ان کا حل دوسرے اثرات اور تجربات کی رہنمائی میں تلاش کرتے ہیں - مدرسہ ان سب چیزوں سے مسالے کا کام لیتا ہے اور ان کی تشکیل ایک مخصوص طرز پر کرتا ہے - اس لیے تمام تمدنی اداروں سے ہر وقت اس کا رابطہ قائم رہتا ہے اور رہنا چاہیے - اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ مدرسہ محض ایک رسمی درس‌گاہ بن کر رہ جائے گا جہاں زندگی کے بہترین عناصر کا تجربہ حاصل ہونے کے بجائے محض کتابوں کے سبق پڑھائے جاتے ہیں اور تربیت قدرتی اصولوں کے مطابق نہیں مصنوعی اور دور از کار طریقوں سے ہوتی ہے - جو استاد یا ماہرین تعلیم مدرسے اور نظام تمدن کا صحیح تعلق نہیں سمجھتے وہ ہمیشہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ مدرسے کے سبقوں اور درسی مشقوں کو مقصود بالذات بنا لیتے ہیں اور اس اصول کو بھول جاتے ہیں کہ ہم بچے کو کوئی چیز، کوئی بات، کوئی کام بلا واسطہ نہیں سکھا سکتے -

میں ہم ہر معاملے اور ہر تجربے کو اپنا معلم کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ ہماری طبیعت اور ہمارے اعمال میں تبدیلی پیدا کرتا ہے - بہ قول غالب :

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں!

غرض "تربیت" وہ عمل ہے جس کے ذریعے سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ' بلاواسطہ یا بالواسطہ ' افراد (بالخصوص بچوں) کی حرکات اور اعمال کی نگہداشت اور اصلاح کی جاتی ہے - تاکہ ان میں بعض تبدیلیاں جو پسندیدہ سمجھی جاتی ہیں پیدا کی جائیں - ان تبدیلیوں کو پیدا کرنا اور نوعمروں کی طبیعت کو ان مقاصد اور اصولوں کے مطابق ڈھالنا جو بحیثیت مجموعی اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے بہترین قرار پائیں معلموں اور تعلیم‌گاہوں کا فرض منصبی ہے - لیکن ظاہر ہے کہ یہ فرض محض تعلیم گاہوں تک محدود نہیں ' نہ وہ اس کو بغیر بیرونی امداد کے پورا کرسکتی ہیں - بچے کی طبیعت کی ساخت اور تشکیل میں' اس کی ابتدائی تربیت میں' اس کے شوقوں اور رجحانوں کے ابھارنے اور سدھارنے میں مدرسے کے علاوہ اور بھی بہت سے تمدنی اداروں کو دخل ہے - ان میں سے بعض کو تمام عمر اور بعض کو زندگی کی مخصوص منازل میں انسان کی ذہنی نشو و نما سے بہت قریبی اور گہرا تعلق ہوتا ہے - جو شخص مسئلۂ تعلیم پر غائر اور وسیع نظر ڈالنا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ان تمام عناصر اور قوتوں کو خیال میں رکھے جو بچے کی شخصیت کو بنانی یا بگاڑتی ہیں اور مدرسے کے کام میں مدد

نما میں بھی معین ہوتا ہے - اسی طرح جو تربیت ہم عمرانی زندگی میں براہ راست شریک ہوکر حاصل کرتے ہیں وہ ہمارے علم میں بھی اضافہ کرتی ہے اور اس کا اثر مدرسے کی تعلیم پر بھی پڑتا ہے - اس لیے ہم حسب ضرورت کہیں دونوں الفاظ کا استعمال کریں گے اور کہیں صرف ایک کا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمیں اس عمل کے کسی پہلو پر زور دینا مقصود ہے -

ہماری شعوری کوششوں سے بہت پہلے فطرت نے وسیع معنی میں نسل انسانی کی تعلیم و تربیت کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا - اس کے تمام مظاہر اور تمام قوتیں ابتدائی زمانے کی انسانی جماعتوں پر مختلف طریقوں سے اپنا اثر ڈالتی تھیں اور ان کے مفید اور مضر اثرات کا تجربہ حاصل کر کے انسان اپنے اعمال و افعال میں حسب ضرورت ترمیم اور تغیر کرتے تھے - اِس اثر آفرینی کا ذریعہ قدرتی ضبط اور سزا کا وہی طریقہ تھا جس کا ذکر ہم گزشتہ باب میں کر چکے ہیں - لیکن جب معاشرتی اور تمدنی ادارے قائم ہوئے اور افراد ان میں شریک ہونے لگے تو تعلیم و تربیت کے نئے ذرائع اور وسائل پیدا ہو گئے - کیونکہ فطرت کی قوتوں کی طرح، نظام معاشرت کے اثرات نے بھی ان کی طبیعت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا - حقیقت یہ ہے کہ ہر معاملہ جو دو انسانوں میں ہوتا ہے، ہر تجربہ جو ہم معاشرتی زندگی یا قدرتی مظاہر کے سابقے سے حاصل کرتے ہیں ہمارے خیالات، ہمارے چال چلن ہماری کارکردگی پر اثر ڈالتا ہے اور ہمارے عام رویے میں تبدیلی پیدا کرتا ہے - یہ اثر سب لوگوں کے لیے عام ہے خواہ وہ نوعمر ہوں یا سن رسیدہ - اس معنی

اس تعریف میں زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ معاشرے کے بالغ اور ذمہ‌دار افراد بالارادہ نوعمر بچوں اور نوجوانوں کی تشکیل سیرت میں حصہ لیں اور ان کی نشو و نما پر اثر ڈالیں - اس محدود معنی میں تعلیم کا عمل دو فریقوں سے تعلق رکھتا ہے - ایک طرف والدین اور اساتذہ وغیرہ کی جماعت ہے اور دوسری طرف نوعمر بچے - ان کی باہمی اثر آفرینی اور اثر پزیری تعلیم کہلاتی ہے - تعلیم کا ایک دوسرا مفہوم زیادہ عام اور وسیع ہے جس کے مطابق انسان کو زندگی اور اس کے تمام مظاہر اور ادارے تعلیم دیتے ہیں - اس کے لیے انگریزی میں (Education) کا لفظ استعمال ہوتا ہے - جس کا ترجمہ "تربیت" کیا جاسکتا ہے - بعض مصنفوں نے "تعلیم" اور "تربیت" کے الفاظ کو ان معنوں میں احتیاط کے ساتھ علحدہ علحدہ استعمال کیا ہے "تعلیم" کو مدرسے کے اندر علوم و فنون سکھانے کے محدود معنی میں اور "تربیت" کو عام ذہنی نشو و نما کے معنی میں - لیکن ہم ان الفاظ کو اس طرح استعمال نہیں کرتے - اول تو اردو میں یہ تفریق رائج نہیں - دوسرے معنوی اور نفسی اعتبار سے بھی یہ مناسب نہیں کہ ان میں ایک حد فاصل قائم کر دی جائے کیونکہ در اصل تعلیم و تربیت کے حدود آپس میں ملتے ہیں اور ان میں آسانی سے تمیز نہیں کی جاسکتی - جب ہم کسی بچے کو کوئی نیا علم یا فن سکھاتے ہیں مثلاً اس کو پڑھنے یا لکھنے کی تعلیم دیتے ہیں یا ڈرائنگ اور مصوری کا ہنر سکھاتے ہیں تو اس کا اثر محض دماغی تعلیم تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی شخصیت کی عام تربیت اور نشو و

اکتفا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہوتی - اور اس میں وہ نظم و تربیت نہیں پائی جاتی جو ایک مخصوص تعلیمی ماحول میں ہونا چاہیے جہاں ہر کام اس مقصد سے داخل کیا جائے کہ اس کے ذریعے بچوں کی مکمل تربیت اور نشو و نما ان کی نفسی زندگی کے قوانین کے مطابق ہو سکے - لہذا با قاعدہ مدرسوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور تعلیمی ادارے قائم کئے گئے جن کی بعض اہم خصوصیات کا ذکر ہم کر چکے ہیں -

اس تمام بحث میں ہم نے تعلیم کے لفظ کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے - ایک تو وہ خاص مفہوم ہے جس سے ہر شخص واقف ہے اور جو "علم" کے لفظ کے ساتھ وابستہ ہے - اس معنی میں مدرسوں میں "تعلیم" دی جاتی ہے یعنی طلبہ کو بعض علم و فنون سکھائے جاتے ہیں جو بعد کی زندگی میں ان کے کام آتے ہیں اور کسی نہ کسی حیثیت سے ان کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں - اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لیے اور اسے لفظ تعلیم کے دوسرے وسیع معنی سے ممیز کرنے کے لیے انگریزی میں (Instruction) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے لغوی معنی "سکھانے" کے ہیں - پروفیسر فنڈلے (Findlay) نے اپنی کتاب "مدرسہ" (The School) میں تعلیم کی یہ تعریف کی ہے :—

"تعلیم ان تدابیر اور وسائل کے مجموعے کا نام ہے جو نوعمروں کو تمدنی زندگی کا اہل بنانے کے لیے بالارادہ کام میں لائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے ان کے دماغوں کو بعض خاص اثرات اور مقاصد سے متاثر کیا جاتا ہے"-

باب دوم

تعلیم اور تمدنی ادارے

ہم نے گزشتہ باب میں، مختصر اور عام الفاظ میں تعلیم اور تمدن کا تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ تمدنی زندگی کا سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ اس طرح قائم رہتا ہے کہ مختلف ذرائع اور وسائل سے ہر نسل اپنے تمدنی ورثے کو جس میں وہ خود اپنی جد و جہد سے اضافہ کرتی ہے اپنے بعد آنے والی نسل کی طرف منتقل کردیتی ہے - جب یہ عمل انتقال دو فریقوں کے درمیان واقع ہو جن میں سے ایک پختہ‌کار اور سن رسیدہ ہے اور دوسرا ناتجربہ کار اور نوعمر تو ہم اسے اصطلاحاً تعلیم و تربیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں - یہ تعلیم و تربیت جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں معاشرہ براہ راست بھی کرتا رہتا ہے اور بہت سی مفید اور ضروری باتیں جو بچے سیکھتے ہیں وہ زیادہ‌تر معاشرے کے بلاواسطہ اثر سے سیکھتے ہیں یعنی بچے ان مشاغل میں جو ان کے گرد و پیش ہوتے رہتے ہیں شرکت کرتے ہیں اور عملی تجربے کی بدولت اپنی واقفیت اور کارکردگی میں اضافہ کرتے ہیں - لیکن معاشرے کی موجودہ حالت میں تمدنی ترقی کی وجہ سے ہم اس بلاواسطہ تعلیم پر

ترغیبیں اور ماحول کے ات ان کو مختلف سمتوں میں کھینچتے ہیں اور عقل ۔ رانی کی اندھیری رات میں راستہ ٹٹولتی ہوئی بھٹکتی پھرتی ہے -

---

معاشرتی طبقوں، مذہبوں اور جماعتوں سے ہوتا ہے ساتھ پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں، مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں تو ان کے لیے مدرسے ان کے گھروں سے زیادہ وسیع اور مؤثر ماحول بن جاتا ہے جہاں ایک ہی قسم کے مشاغل میں مصروف رہ کر ان میں اتحاد خیال اور ہم رنگی پیدا ہو جاتی ہے جو ایک ملک کے باشندوں اور ایک قوم کے افراد کے لیے لازم ہے - "مدرسے کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ہر فرد کی طبیعت میں اُن تمام اثرات کی ہم آہنگ تنظیم کرے جو مختلف معاشرتی اداروں میں شرکت کرنے سے حاصل ہوتے ہیں - گھر کی زندگی میں ایک ضابطۂ اخلاق کی کارفرمائی ہوتی ہے، اور گلی اور بازار میں دوسرے کی، دکانوں کارخانوں میں تیسرے کی، مذہبی تعلقات میں چوتھے کی - جب ایک ہی آدمی ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جاتا ہے تو اس پر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی قوتیں عمل کرتی ہیں اور اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت پر ایسا اثر پڑے کہ وہ مختلف موقعوں پر عمل و جذبات کے مختلف مقتضا اور معیار کے مطابق کام کرے - اس وجہ سے مدرسے کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی طبیعت میں استقلال اور وحدت کا رنگ پیدا کرے"[1] -

اگر مدرسے میں تربیت کا انتظام اچھا ہے تو بچے کی زندگی اور کردار کے لیے ایسے اٹل قانون قائم ہو جائیں گے جو اس کو آئندہ زندگی میں سیدھے راستے پر چلاتے ہیں اور ایسے وقت میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں جب مختلف قسم کی

۱- Democracy and Education صفحہ ۲۶-

مخرب اخلاق اغراض کی تکمیل کے لیے قائم کیا گیا ہو، اپنے
اراکین کی تربیت میں دخیل ہوتا ہے اور وہ افراد جو اس
میں شریک ہوتے ہیں اس کے مطالبات کو پورا کرنے میں نئے
تجربات سے متاثر ہوتے ہیں - اس کشمکش کی زندگی میں
جہاں ہر فرد پر مختلف اور متضاد قوتوں کے اثرات کام کرتے
رہتے ہیں بچوں کے لیے مدرسہ نہ صرف ایک تربیت گاہ ہے
بلکہ جائے امن ہے - یہاں بغیر اُس کی شعوری واقفیت کے اس
کے نفس میں ان اخلاقی قدروں اور معیاروں کا نظام مرتب ہوتا
ہے جو تمام عمر اس کی زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں - اگر
معاشرہ اس قسم کا کوئی مرکزی ادارہ قائم نہ کرے تو نوعمر
نسلوں کی تربیت بہت ناقص، نامکمل اور یک طرفہ ہو اور ان
کی طبیعتوں میں بھی وہ توازن اور انصاف پسندی پیدا نہ
ہو سکے جو حقیقی تہذیب کی بنیاد ہیں اور جن کی بدولت
انسان نظری تحقیق اور عملی زندگی میں متانت اور
سلامت روی سے کام لیتا ہے اور ہر بات کے کل پہلوؤں پر غور
کر کے فیصلہ کرتا ہے - اس زمانے میں جب ہمارے ملک میں
باہمی اختلافات بے حد بڑھ چکے ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں بلکہ
اختلافات کی حد سے گزر کر مناقشات کی شکل اختیار کرتے
جاتے ہیں اور معاشرہ بےشمار جماعتوں میں تقسیم ہوتا چلا جا
رہا ہے جن میں اغراض و مقاصد، رسوم و روایات کا فرق ہے،
ایک ایسے تعلیمی نظام کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے
جو قوم کے تمام بچوں اور نوجوانوں کے لیے ایک سا ماحول
مہیا کرے اور مناسب حد تک ان میں یکسانی پیدا کرے -
جب کسی مدرسے میں بہت سے بچے جن کا تعلق مختلف

ہے تو وہ اکثر صورتوں میں نہ صرف موجودہ صنعت و حرفت کے نظام اور شہری زندگی سے بےخبر ہوتا ہے بلکہ ان تمام تہذیبی مشاغل سے بھی نابلد رہتا ہے جن میں فرصت کا وقت خوش‌دلی اور عمدگی سے بسر ہو سکتا ہے - غرض خواہ بچہ معاشرے کے کسی طبقے میں پیدا ہو وہ اپنے محدود ماحول میں مقید ہوتا ہے اور آسانی سے اس سے باہر نہیں نکل سکتا - صرف مدرسہ ہی ایک ایسا منظم اور گوناگوں ماحول ہے جہاں خاص طور پر اس بات کا التزام ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ بچے کی نشو و نما کے لیے ایک مناسب فضا پیدا کی جائے جس میں وہ مختلف قسم کے دماغی اور جسمانی مشاغل میں شریک ہو سکے اور مکمل اور ہم‌آہنگ تربیت پا سکے اور ساتھ ہی وہ ان مشاغل کے دوران میں اپنی مخصوص صلاحیتوں اور رجحانات کا پتا چلا سکے - مدرسے کو اس کے لیے ایک آزاد ماحول ہونا چاہیے جہاں وہ اپنی تعلیم کے زمانے میں بغیر بےجا روک ٹوک کے مختلف قسم کے تجربے کر سکے اور زندگی کی مختلف راہوں سے واقفیت حاصل کرے - مدرسے سے باہر دنیا میں مختلف قسم کے ادارے ہیں جو نوعمر طلبہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں - ہر فرد صرف ایک ہی جماعت کا رکن نہیں ہوتا بلکہ بہت سی جماعتوں میں شریک ہوتا ہے اور ان میں سے ہر جماعت کی رکنیت سے اس کی طبیعت اور مشاغل اور دلچسپیوں پر اثر پڑتا ہے جیسا کہ ہم اس سے اگلے باب میں وضاحت کے ساتھ بتائیں گے - ہر معاشرتی ادارہ خواہ اس کا تعلق اقتصادی مسائل سے ہو، یا سیاسی مسائل سے، یا وہ خلاف قانون اور

نئے تعلیمی ماحول کی دوسری خصوصیت کہ وہ تمدن حاضرہ کے بےشمار مظاہر میں سے بہترین اور مفیدترین کو چن کر انہیں نوعمر بچوں کے گرد اس طرح ترتیب دے کہ وہ ان میں منہمک ہو کر اپنے اندر اس تمدن کو سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت پیدا کریں -

تعلیمی ماحول کی تیسری خصوصیت پروفیسر ڈیوئی (Dewey) یہ بیان کرتے ہیں [۱] کہ وہ تمدنی ماحول کے مختلف عناصر میں ہم‌آہنگی اور توازن پیدا کرتا ہے - اکثر بچوں کا گھر اور پڑوس کا ماحول بہت تنگ اور محدود ہوتا ہے اور اس میں اتنی گنجائش اور امکانات نہیں ہوتے کہ وہ ان کی مجموعی اور مکمل تربیت کر سکے - مثلاً ایک بچہ کسی صناع یا مزدور کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو اس کے گرد و پیش کے تمام حالات اس کو مزدوری یا صنعت و حرفت کی طرف رغبت دلاتے ہیں - اسی قسم کے خیالات، جذبات اور دلچسپیاں اس میں پیدا کرتے ہیں - اس طرح اگر کوئی بچہ کسی دولت‌مند گھرانے میں پیدا ہوتا ہے جس کے افراد کوئی خاص کام نہیں کرتے تو وہ صنعت و محنت کے سارے نظام سے ناواقف رہتا ہے اور اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ

ز مزد بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیب خواجۂ ناکردہ‌کار رخت حریر

اگر کوئی بچہ گاؤں میں کسی کاشتکار کے یہاں پیدا ہوتا

۱—Democracy and Education باب اول صفحہ ۲۳-۲۶ -

ہم آئندہ کسی باب میں نصاب کے مسئلے پر بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ ہمیں نہ صرف درسی نصاب کے مضامین میں ترمیم اور انتخاب کی ضرورت ہے بلکہ موجودہ اصول انتخاب کو صحیح راستے پر لانا ہے ہمارا مقصد مدرسے کی تعلیم سے یہ بھی نہیں کہ مفیدترین علوم و فنون کی تمام ضروری ابتدائی باتیں بچے کو سکھا دی جائیں کیونکہ ان کا دائرہ بھی بہت بڑا ہے اور ایک محدود مدت میں کسی اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے طالب علم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ادب' سائنس' علم معاشرت اور آرٹ کی مبادیات پر بھی عبور حاصل کر سکے - ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس میں اس امر کی صلاحیت پیدا کریں کہ وہ مدرسے کی ذہنی تربیت کی مدد سے اپنی ضرورت اور مصلحت کے مطابق آئندہ چل کر جس علم یا ہنر کو ضروری سمجھے اسے حاصل کر سکے - یعنی اسے علوم پر نہیں بلکہ تحصیل علم و فن کے ذرائع اور وسائل پر قابو حاصل ہو جائے۔ ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ مدرسے کی مختصر زندگی کے دوران میں طالب علم اس ساری زمین کو کھود کر کاشت کرے جو اس کو زندگی بھر میں درکار ہوگی - لیکن ہم مدرسے کی تعلیم کی بدولت اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت' اس کے دماغ میں بیداری' حوصلہ اور جوش' اس کے دل میں ولولۂ عمل پیدا کر دیں اور اس کے ہاتھ میں ایسے اوزار دے دیں کہ وہ آگے چل کر بغیر کسی بیرونی جبر یا تحریص یا نگرانی کے جس زمین کو چاہے کھود کر کاشت کرے اور اسے لہلہاتا ہوا کھیت یا ہرا بھرا چمن بنا دے - یہ

(Comenius) کے زمانے تک اس قسم کی ہمہ‌دانی پر مبنی تعلیم مرتب کرنے کا شوق ماہرین تعلیم میں عام تھا - اس وقت اگر ایک حد تک یہ خیال قابل عمل تھا بھی' تو ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ہم اس کو قابل غور بھی نہیں سمجھ سکتے - کیونکہ یہ نہ صرف ناممکن ہے بلکہ ممکن بھی ہوتا تو مفید نہیں ہو سکتا تھا - اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ وقتاً فوقتاً بہت احتیاط اور وسعت نظر کے ساتھ مدرسے کے نصاب کی چھان بین اور پڑتال کی جائے - یعنی بالفاظ دیگر معاشرے کے مشاغل اور ضروریات کا جائزہ لیا جائے کیونکہ دراصل یہی نصاب کا ماخذ اور سرچشمہ ہیں- چونکہ یہ ضروریات اور مشاغل بدلتے رہتے ہیں اس لیے نصاب میں بھی ترمیم اور تبدیل کی ضرورت ہوتی رہتی ہے - اگر اس کی طرف سے غفلت برتی جائے گی تو مدرسے کے نصاب میں ہر قسم کی رطب و یابس چیزیں بھر جائیں گی - بہت سی چیزیں جن کی اہمیت عارضی ہے یا کم ہے یا بالکل نہیں وہ نصاب کا جزو بن جائیں گی اور بہت سی ضروری چیزیں ناواقفیت کی وجہ سے یا اس اندیشے سے چھوٹ جائیں گی کہ نصاب میں بہت زیادہ مضامین کا ہجوم نہ ہو جائے - اس میں بہت سے دور از کار مضامین جو ماضی کی یادگار ہیں اور حال کی ضروریات سے ہم‌آہنگ نہیں محض قدامت‌پرستی کی وجہ سے باقی رہ جائیں گے' بعض مضامین انفرادی ذوق کی وجہ سے داخل ہو جائیں گے اور نصاب کے مسئلے پر جو ایک طرف تمدنی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے اور دوسری طرف بچوں کی نفسی زندگی سے' کماحقہ غور نہ ہو سکے گا -

ہوگی ۔ وہ بچوں کے طفلانہ کھیلوں اور اُن کے پڑھنے لکھنے میں ان مہتم بالشان مقاصد کی جھلک دیکھ سکتے ہیں جن کا حاصل کرنا مدرسے کا انتہائی فرض ہے -

مدرسے کے ماحول کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُسے اُن اثرات سے پاک ہونا چاہیے جو طلبہ کی دماغی نشو و نما اور اُن کی معاشرتی عادات پر برا اثر ڈالیں - معاشرے کے ارباب فکر اور ارباب عمل خصوصاً معلموں اور ماہرین تعلیم کا فرض ہے کہ وہ عہد حاضر کے تمدنی ورثے میں سے ان چیزوں کا انتخاب کریں جو نئی نسل کی تربیت اور معاشرے کی آئندہ ترقی کے لیے مفید ہیں اور پھر ان چیزوں کو بہ اسلوب مناسب مدرسے کے نصاب میں داخل کریں - اس زمانے میں یہ انتخاب خاص طور پر ضروری ہو گیا ہے کیونکہ ہر شعبۂ زندگی میں اس قدر تیزی کے ساتھ ترقی اور توسیع ہو رہی ہے اور علوم و فنون کی دنیا اس قدر پھیلتی چلی جاتی ہے کہ تمام چیزوں کا حاصل کرنا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں - ایک زمانہ ایسا تھا جب لوگ یہ کوشش کرتے تھے کہ اعلیٰ تعلیم پانے والے جملہ علوم و فنون پر عبور حاصل کریں - مشرق اور مغرب دونوں کی تعلیمی تاریخ میں ایسے دور گزرے ہیں کہ اعلیٰ درسگاہوں میں لوگ طب، فلسفہ، ادب، منطق، ریاضی وغیرہ جملہ علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور اب بھی ایک حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم کی بنیاد اسی خیال پر قائم ہے اگرچہ اب رفتار زمانہ نے اس کی ظاہری حیثیت میں تبدیلیاں کر دی ہیں - یورپ میں بھی قرون وسطیٰ میں، بالخصوص کومینیس

اس ماحول کو بیرونی دنیا کی نسبت زیادہ سادہ اور واضح ہونا چاہیے تاکہ اُس کا نظم و نسق اور اصول عمل بچے کی سمجھ میں آسانی سے آ جائے - موجودہ متمدن سوسائٹی کا نظام اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ بچہ اُس کو بلا واسطہ تمام و کمال کیا جزوی طور پر بھی نہیں سمجھ سکتا - اِس لیے مدرسہ اس نظام میں سے اُن اجزا اور عناصر کا انتخاب کرتا ہے جو تربیت کے لیے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں اور بچوں کی زندگی کے ساتھ ہم‌آہنگ ہو سکتے ہیں اور اُن کو ایسی ترتیب سے پیش کرتا ہے کہ جو چیزیں بچہ اپنے شوق سے سیکھتا اور کرتا ہے اُنہیں کے ذریعے اُس پر علم اور واقفیت کے نئے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اِنسانی مشاغل میں سمجھ بوجھ کر شرکت کرنے لگتا ہے - نصاب کی تدوین اور مدرسے کے تمام مشاغل کی تشکیل میں معلم کو ہمیشہ یہی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ تمدنی زندگی کے اہم‌ترین عناصر کو سادہ اور دلچسپ شکل میں مدرسے کی زندگی کا جزو بنا دے اور اُن کی ترتیب اس طرح کرے کہ جوں جوں بچوں کی عمر اور تجربے میں ترقی ہو وہ رفتہ رفتہ تمدنی زندگی کے زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل سے روشناس ہوتا جائے - جہاں تک خود بچوں کا تعلق ہے اُنہیں ہمیشہ یہی محسوس ہونا چاہیے کہ وہ ایسے مشاغل میں شریک ہیں جو اُن کے لیے دلچسپ ہیں' جن میں اُن کی قوتوں کا اظہار ہوتا ہے' جن سے اُنہیں مسرت حاصل ہوتی ہے - البتہ معلم اور والدین جو اُن مشاغل کے نتائج کو سمجھ سکتے ہیں اور جانتے ہیں کہ آگے چل کر اُن کی تکمیل کیسی شکل میں

موقع حاصل ہے - بیرونی دنیا میں آسانی کے ساتھ مختلف قسم کے اثرات میں تمیز اور انتخاب نہیں کر سکتے - اس میں بری' بھلی' نیک اور بد' نشو و نما میں مدد دینے والی اور رکاوٹ پیدا کرنے والی' غرض سب طرح کی قوتیں اور اثرات موجود ہوتے ہیں - نوعمر اور ناتجربہ‌کار بچوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ بغیر بیرونی امداد اور رہنمائی کے اُس کے عمدہ اثرات سے فائدہ اُٹھائیں اور برے اثرات سے محفوظ رہیں - علاوہ اِس کے دنیا میں اتنے مختلف قسم کے ادارے ہیں اور اُن میں باہمی کشمکش اور جد و جہد کی وجہ سے اس قدر پیچدگیاں پائی جاتی ہیں کہ نوعمر طلبہ بغیر رہنما کے اس بھول بھلیاں میں نہیں چھوڑے جا سکتے - اُن کو تنہا اس ہنگامے میں ڈھکیل دینا ایسا ہے جیسا کسی شیرخوار بچے کو مثلاً کسی بہت بڑے مشینوں کے کارخانے میں چھوڑ دینا جس کا ایک کل یا پرزہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا - اس لیے سوسائٹی نے بچوں کی تعلیم کے لیے خاص قسم کے تعلیمی ادارے قائم کر دیے ہیں - تاکہ اُن کی اثرپذیر شخصیتیں ایسے ماحول میں نشو و نما پائیں جہاں وہ اثرات نہ ہوں جو انسانی شخصیت کی نشو و نما میں حائل ہوتے ہیں - بلکہ وہ تمام محرکات اور اسباب مہیا کئے جائیں جو اُس کی تربیت میں مدد دیں -

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اِس خاص طرز پر ڈھالے ہوئے ماحول کی کیا خصوصیتیں ہیں جو اُس کو اور ہر قسم کے عمرانی ماحول سے ممتاز کرتی ہیں - ایک خصوصیت ف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ

آنے والی زندگی کے لیے تیار کرے بلکہ اُن کی موجودہ زندگی کو تجربات سے مالا مال کرنا اور خوشگوار بنانا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسے کی تنظیم کس طرح کی جائے؟ ظاہر ہے کہ ہمارے مروجہ مدارس تو یہ مقصد پورا نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کی توجہ تمام تر چند مقررہ مضامین کے پڑھانے میں صرف ہوتی ہے جو نصاب کا جزو ہیں - یہ مدرسے مناسب حالات میں زندگی کی تفسیر کرنے میں مدد ضرور دیتے ہیں لیکن زندگی کے قائم مقام نہیں بن سکتے - اوپر کی تمام بحث سے جو تعلیم اور تمدن کے تعلق کو واضح کرتی ہے صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں اپنے تعلیمی ماحول کی تنظیم اِس طرح کرنی چاہیے کہ اِس میں معاشرے کی زندگی کا ایک نمونہ پایا جائے - مدرسے کو بقول پروفیسر ہاورتھ (Howarth) کے' بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا چاہیے جس میں وہ تمام عمدہ اثرات اور مشاغل مہیا کئے جائیں جو تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں - یہی بات در اصل مدرسے کی دنیا اور بیرونی دنیا میں ما بہ الامتیاز ہونی چاہیے - اُن دونوں کا اصل فرق یہ نہیں کہ دنیا میں اِنسان زندگی بسر کرتے ہیں' کام کرتے ہیں' تعاون اور تامل برتتے ہیں' عمرانی مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں اور مدرسے میں بچے پڑھتے ہیں' سبق یاد کرتے ہیں' کتابوں کے ساتھ مغز مارتے ہیں گویا یہ کہنا چاہیے کہ زندگی کو ایک دھندلے سے آئینے میں دیکھتے ہیں - زندگی کی روح تو دونوں میں یکساں ہونی چاہیے لیکن مدرسے میں یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انتخاب و تنظیم کا زیادہ عمدہ

کے لیے تیار کیا جائے یا نہیں - اگر تعلیم کے معنی
نشو و نما کے ہیں تو لازم ہے کہ وہ موجودہ امکانات کو
بتدریج قوت سے فعل میں لائے اور اِس طرح افراد میں
آئندہ کے فرائض پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرے- نشو و نما
کوئی ایسی چیز نہیں جو یوں ہی کبھی کبھی واقع ہو
جایا کرے - وہ تو برابر رفتہ رفتہ موجودہ کیفیت سے
مستقبل کی طرف بڑھنے کا نام ہے - اگر مدرسے کا ماحول
اور خارجی حالات ایسے ہیں جن میں بچوں کی موجودہ
صلاحیتوں کو مناسب طریقے پر کام میں لایا جا سکتا ہے
تو مستقبل جو حال ہی میں سے پیدا ہوتا ہے خود
بخود بہتر اور خاطر خواہ صورت اختیار کر لے گا - غلطی
یہ نہیں کہ بچوں کو مستقبل کے لیے تیار کرنے پر زور
دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس مقصد کو موجودہ کوشش اور
جد و جہد کا مرکز اور مدار قرار دیا جائے - چونکہ
واقعتاً یہ بات بہت اہم ہے کہ نوعمر طلبہ کو اس زمانے
کی زندگی کے لیے جو دم بدم ترقی کرتی رہتی ہے تیار
کیا جائے اس لیے لازم ہے کہ اُن کے موجودہ تجربات کو
معنی‌خیز اُور گوناگوں بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی
جائے - جب غیر محسوس طریقے پر حال مستقبل
میں تبدیل ہو جائے گا تو ہم دیکھیں گے کہ حال کی
فکر کرنے میں مستقبل کی فکر خود بخود ہو گئی ہے"-[1]

اگر تعلیم کا مقصد محض یہی نہیں کہ بچوں کو کسی

1—Democracy and Education صفحہ ٦٥ -

لازم ہے کہ جو کام وہ کر رہے ہیں وہ ان کے لیے بامعنی
اور اہم ہے یعنی ان کے مشاغل کی نوعیت خود ان کے
عمل کی محرک ہونی چاہیے - اور جیسا کہ ہم اوپر بتا
چکے ہیں - یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ مدرسے کے
مشاغل بچوں کے تمام فطری جذبات اور دلچسپیوں کو ابھاریں
اور ان کی تنظیم کریں - گو ان کا آخری مقصد یہی ہو کہ
انہیں مفید اور ضروری علوم و فنون کی تعلیم دی جائے،
لیکن ان کی فوری غرض یہ ہونی چاہیے کہ بچوں کی روزمرہ
کی زندگی اُن کے لیے زیادہ سے زیادہ خوشگوار، نتیجہ خیز
اور بامعنی تجربے سے مالا مال ہو جائے - ورنہ یہی ہوگا کہ
پنی اپنی طبیعت کے مطابق بعض استاد سزا کے خوف اور
ئندہ کی بہتری کے کمزور حربوں کو اِستعمال کریں گے اور
بعض یہ کوشش کریں گے کہ غیر دلچسپ مضامین اور سبقوں
کو عارضی اور مصنوعی طور پر دلچسپ بنانے کے لیے ایسی
تدبیریں اختیار کریں جن کی تعلیمی نقطۂ نظر سے کوئی
اہمیت نہیں - اُن تدبیروں سے کام لینا گویا کونین کی تلخ
گولی شکر میں لپیٹ کر کھلانا ہے مگر یہ یاد رہے کہ اس
قسم کی دوا کو جو فی نفسہٖ ناگوار ہو، زبردستی یا
بہ لطائف الحیل کھلا دینے سے جسمانی امراض کا علاج ممکن
ہے لیکن دماغی اور اخلاقی نشو و نما ایسی چیز ہے کہ جب
تک اس میں خود متعلم اپنے ارادے اور خواہش سے شریک نہ
ہو خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey)
فرماتے ہیں کہ :-

"سوال یہ نہیں ہے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو مستقبل

تعلیم کا پڑتا ہے - وجہ یہ ہے کہ وہ کام اس کی بعض بنیادی جبلتوں مثلاً جسمانی نقل حرکت یا دستکاری' یا تعمیر کو اُبھارتا ہے - اور اُس کی محرک اُس کی موجودہ قوتیں اور رجحانات ہوتے ہیں - بر خلاف اس کے مدرسے کا کام سطحی اور مصنوعی معلوم ہوتا ہے جو اس کے زیادہ دلچسپ مشاغل کے راستے میں حائل ہوتا ہے - اس مشاہدے سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انسانی زندگی بجائے خود بہترین اور موثرترین معلم ہے اور تعلیم اپنے مقاصد میں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب وہ بھی انہیں محرکات عمل کو کام میں لائے جو تمدنی زندگی میں کار فرما ہیں -

اس کے علاوہ پروفیسر ڈیوئی (Dewey) نے اس نظریۂ تعلیم کی ایک اور خرابی بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب طلبہ کی موجودہ دلچسپیوں کے لیے مدرسے کے مشاغل میں کوئی سامان نہیں ہوتا تو ان کی توجہ کو جذب کرنے کے لیے ہمیں خارجی ذرائع سے امداد لینی پڑتی ہے - کبھی انہیں سزا کا خوف دلایا جاتا ہے کبھی انعام کا لالچ دیا جاتا ہے - اگر ہم کسی کام میں بالکل محو اور مشغول ہو جاتے ہیں تو اس کام کی فطری کشش ہمیں تمام مشکلات اور ترغیبات سے نکال لے جاتی ہے - بالغ افراد کے لیے بھی اکثر یہ خیال کافی نہیں ہوتا کہ فلاں کام کو استقلال کے ساتھ کرنے سے کبھی آگے چل کر ہمیں بڑا فائدہ ہوگا - ان میں بھی جوش و انہماک پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ محسوس کریں کہ ان کا کام ان کی موجودہ ضروریات کے لیے بھی مفید ہے اور ان کی فطری قوتوں کے اظہار کا ذریعہ ہے - بچوں کے لیے تو اس بات کا احساس اور بھی زیادہ

متحرک عمل ہوتی ہیں اور جن کی بنا پر وہ ہر کام کو استقلال
اور جوش کے ساتھ انجام دیتے ہیں - بچوں کی نفسی زندگی
کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حال کا زمانہ ان کی تمام
دلچسپیوں کا مرکز ہوتا ہے - وہ اپنے ذہن میں مستقبل کی
تصویر صاف طور پر نہیں کھینچ سکتے - ان کے نزدیک مستقبل
کا زمانہ ایک مبہم اور غیر یقینی چیز ہے جس میں اتنی
کشش اور زور نہیں کہ وہ ان کی موجودہ دلچسپیوں پر غالب
آسکے - اس لیے بچوں کی فوری ضروریات اور ان کی موجودہ
نشو و نما کے اقتضا سے قطع نظر کر کے ہر قدم پر مستقبل کی
امیدوں اور فرائض کا واسطہ دینے سے تعلیم میں جان باقی نہیں
رہتی - وہ محض رسمی مشقوں اور سبقوں کے پڑھنے پڑھانے
تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے - بچوں کی سمجھ میں کوئی
معقول وجہ نہیں آتی کہ وہ کیوں اپنے گرد و پیش کی
ہنگامہ آفریں زندگی کو چھوڑ کر اپنی تمام توجہ کو مدرسے کے
کاموں پر مبذول کریں - ان کی توجہ میں انتشار پیدا ہوجاتا
ہے - وہ اپنی تمام دماغی قوتوں کو درسی مشاغل پر مجتمع
نہیں کر سکتے جو ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت دونوں کے لیے
مضر ہے - یہی وجہ ہے کہ جو تعلیم طلبہ تمدنی زندگی میں
براہ راست شریک ہو کر حاصل کرتے ہیں اس کا اثر ان پر زیادہ
دیرپا ہوتا ہے خواہ اس میں بالقصد تعلیم مد نظر نہ ہو - مثلاً
جب گاؤں میں کوئی بچہ اپنے باپ کے کھیت پر کام کرتا ہے اور
کام ہوتے دیکھتا ہے: آدمیوں، جانوروں، زمین، پانی، بارش، کا
تجربہ حاصل کرتا ہے تو اس تمام واقفیت کا نقش اس کے دل
و دماغ پر بہت گہرا ہوتا ہے بمقابلہ اس اثر کے جو مدرسے کی

مجموعی شخصیت کی ارتقا برابر جاری رہے - ایک واقعی تعلیم یافتہ اور جاہل آدمی میں اصلی فرق یہ نہیں کہ ان میں سے ایک کو بہت سی باتیں معلوم ہیں اور دوسرے کو نہیں معلوم - ایک کو بہت سے کام آتے ہیں دوسرے کو نہیں آتے - بلکہ اصلی فرق یہ ہے کہ پہلے میں سیکھتے رہنے کی غیر محدود صلاحیت ہے اور دوسرے میں یہ صلاحیت نہیں - پہلے کی تعلیم ہمیشہ جاری رہتی ہے کبھی ختم نہیں ہوتی، دوسرے کی اگر کبھی شروع بھی ہوئی تھی تو اب بند ہے - اسی بنا پر اسلام کے معلم اعظم نے فرمایا ہے کہ گہوارے سے لے کر قبر کی منزل تک تمام عمر تحصیل علم کرتے رہو - حیات‌بخش صرف وہی علم ہو سکتا ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے، ہمیشہ متحرک رہے- جب علم میں یا تعلیم میں جمود پیدا ہو جائے تو اصل میں انسان کی زندگی کی موت ختم ہو جاتی ہے اگر ہم تعلیم کے اس حرکی [1] نظریے کو قبول کریں تو اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ شیرخوارگی کے زمانے سے لے کر سن شعور تک زندگی کی ہر منزل کے لیے اس کی ضروریات کے مطابق تعلیم کا نظام مرتب کریں اور ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھیں کہ عمر کے قدرتی رجحانات کیا ہیں جن سے کام لے کر ہم طلبہ کی فطری قوتوں کو اپنا معین و مددگار بنا سکتے ہیں اور ان کو تعلیم کا وسیلہ قرار دے سکتے ہیں - تعلیم کو محض تیاری کا ذریعہ سمجھنے کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ ہم ان فطری قوتوں کی طرف سے بےپروائی برتنے لگتے ہیں جو بچوں کے لیے

Dynamic—1

مطابق مرتب کرنے کے مختلف لوگوں کے درمیان ایک گیند بنا دیا ہے جو کبھی ایک طرف اُچھالا جاتا ہے کبھی دوسری طرف۔ کوئی مضمون دماغ کی تربیت اور "اس میں تیزی" پیدا کرنے کے خیال سے شامل کیا جاتا ہے۔ کوئی برکت کی خاطر، کوئی مفید ہونے کی بنا پر۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں کا نصاب ایک معجون مرکب بن کر رہ گیا ہے جس سے کوئی ایک مقصد بھی کامیابی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ نہ افادی ہے، نہ تہذیبی، نہ مذہبی!

دیوئی کا نظریۂ تعلیم

بہر حال یہاں ہماری غرض نصاب کی بحث میں پڑنا نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اگر ہم تعلیم کے مسئلے پر غور کرنے میں بچے کی اپنی ذات اور اس کی فطرت کے مقتضا کو نظرانداز کریں تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔ پروفیسر دیوئی (Dewey) نے اپنی مذکورۂ بالا تصنیف میں جا بجا اس خیال پر زور دیا ہے کہ تعلیم کو در اصل نشو و نما کے مرادف سمجھنا چاہیے۔ اس کو کسی دوسرے بیرونی مقصد کے تابع کر دینے سے اس کا حقیقی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ وہ نہ کسی مستقبل بعید کے لیے تیاری کا نام ہے، نہ دماغ کی چند مخصوص قوتوں کو تیز اور مرتب کرنے کا۔ دیوئی (Dewey) کے نزدیک تعلیم کا کوئی خارجی مقصد یا کوئی علحدہ منزل مقصود نہیں۔ وہ خود ہی راہ ہے اور خود ہی منزل، آپ ہی مقصد اور آپ ہی مقصود۔ بالفاظ دیگر اس کا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعے سے انسان میں علمی، اخلاقی، معاشرتی نشو و نما کی قوت زیادہ ہوتی جائے اور اس کی

کا کیا تقاضا ہے - اُنھیں تو یہ آرزو ہے کہ اپنے محبوب مقاصد کی تکمیل اور اپنے عزیز خوابوں کی تعبیر دیکھیں - بچے کی نشو و نما اور اُس کی نفسی زندگی سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں - کوئی چاہتا ہے کہ بچہ جلد سے جلد ایک خاص پیشہ سیکھ لے، خواہ طبیعت اور میلان فطری کے لحاظ سے وہ اُس کے لیے موزوں ہو یا نہ ہو - کسی کو خواہش ہے کہ اُس کی اولاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرے خواہ فطرت نے اُسے اُن تمام دماغی اوصاف سے محروم رکھا ہو جن کے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا محض تضیع اوقات ہے - بعض کی نیت یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح بچے کو چھوٹی سی عمر میں علوم دین کا عالم بنا دیں چنانچہ (اگر اُن میں سوچنے اور اظہار رائے کرنے کا مادہ ہے) تو وہ اپنے اپنے خیال کے مطابق مدرسے کے نصاب میں ترمیم اور تبدیلی چاہتے ہیں - بعض علوم و ادب کو غیر ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ براہ راست پیشے کی تعلیم میں کام نہیں آتے - بعض عملی تعلیم کی تمام تحریکوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں کیونکہ وہ اُن کی رائے عالی میں اعلیٰ تعلیم کے منافی ہیں - بعض اس بات پر مصر ہیں کہ بچوں کو ابتدا سے مذہبی مسائل اور علوم اور مذہبی زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت وغیرہ کی تعلیم دی جائے خواہ بچہ اپنی مادری زبان سے بھی اچھی طرح واقف نہ ہو اور ان علوم کی اہمیت اور مفہوم سمجھنے سے بالکل قاصر ہو - اس تمام خلط مبحث کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفسیات اطفال اور فن تعلیم کے صریحی قوانین کے برخلاف، طلبہ کے کسی خاص مقصد بعید کے لیے تیار کرنے کے خبط میں لوگوں نے نصاب کو بجائے تعلیمی ضروریات کے

میں اُستادوں کی یہی کوشش رہتی تھی کہ جلد سے جلد نوعمر بچوں کو "سوسائٹی" میں شریک ہونے کے قابل بنا دیا جائے - اُن کی دماغی نشو و نما سے قطع نظر کر کے اُنہیں گفت و شنید' نشست و برخاست کے وہ آداب سکھا دیے جائیں جن سے یہ دیکھنے میں قبل از وقت بالغ معلوم ہوں - اس حماقت اور کوتہ‌اندیشی سے نہ معلوم بچوں کی کتنی نسلوں کو نہایت سخت جسمانی اور دماغی نقصان پہنچا - روسو (Rousseau) نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "امیل" (Emile) میں اس خیال کے خلاف بہت قابلیت اور زور کے ساتھ جہاد کیا اور اس خلاف فطرت تعلیم کی بنیادیں ہلا دیں - یہی وجہ ہے کہ یہ باتفاق رائے تعلیم جدید کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا پیغمبر مانا جاتا ہے' حالانکہ اُس کے پیش کردہ نظام تعلیم میں جزئیات اور تفصیلات کے اعتبار سے بےشمار غلطیاں بھری پڑی ہیں - اُس کی حقیقی عظمت کا راز یہی ہے کہ اُس نے تعلیم کے بنیادی اصول کو سمجھ لیا کہ خواہ تعلیم کا منتہا کچھ ہو اُس کا نقطۂ آغاز بچے کی ذات ہے جس کی جبلتوں اور کمزوریوں اور مخصوص رجحانات کا احترام اور اُن کی ہدایت معلم کا اولین فرض ہے - ہمارے ملک میں اب بھی یہ خیال عام طور پر رائج ہے اور اُستاد اور والدین سب کی یہی خواہش ہے کہ کسی طرح بچہ بہت جلد "پڑھ جائے" یعنی تعلیم کے مرئی اثرات جلد از جلد ظاہر ہونے لگیں - اس کے دماغ میں ہر قسم کی خشک غیر ضروری اور دور از کار معلومات بھر دی جائیں' اور وہ کسی دفتر میں یا کسی اور ملازمت میں کام کرنے لگے - اس سے بحث نہیں کہ اس کی دماغی ارتقا کس حد تک ہوئی ہے اور اُس

اپنا نصب‌العین ٹھہرایا اور تعلیم کے مرکز ثقل کو بالکل بدل دیا - اس میں شک نہیں کہ منزل مقصود تو بلوغ کی زندگی ہے - لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے جس قدر درمیانی منزلیں راستے میں پڑتی ہیں وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ اتنی ہی اہم اور قابل توجہ ہیں جتنی وہ آخری منزل - اور جب تک ہم بچے کے تعلیمی سفر یعنی اُس کی نشو و نما کے ہر ہر قدم کو اُس کے لیے معنی‌خیز اور دلچسپ نہ بنائیں ہم اُس کی تربیت کو مکمل نہیں کر سکتے' اُس کے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا نہیں کر سکتے - معلم کے لیے غالباً سب سے زیادہ ضروری اس حقیقت کا پہچاننا ہے کہ ہر نوعمر بچہ ایک مخصوص شخصیت کا مالک ہے اور مخصوص شوق اور رجحانات رکھتا ہے - جن کا دریافت کرنا اُس کا فرض ہے اور جن کی تربیت کے لیے مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنا اُس کا خاص فن ہے - لیکن اُستادوں اور والدین نے عام طور پر اس نفسیاتی نکتے کو بھلا دیا اور مستقبل کی تیاری کی دھن میں بچوں کی موجودہ قوتوں اور ضرورتوں کو نظرانداز کر کے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ بچہ جلد سے جلد اس "بےکار" زمانے سے گزر کر سن شعور کو پہنچ جائے - گویا سن شعور کوئی طلسمات کا دروازہ ہے جس کے اندر قدم رکھتے ہی ناتجربہ‌کار یا خام‌کار افراد پر زندگی کے تمام حقائق منکشف ہو جاتے ہیں ! یورپ میں یہ خیال صدیوں کارفرما رہا - روسو (Rousseau) کے زمانے میں فرانسیسی سوسائٹی میں اس نظریۂ تعلیم کا دور دورہ تھا - بچپن کی اہمیت کو کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا - گھر پر والدین اور مدرسے

تعلیم کا ایک غلط تصور

لیکن اِس نظریے کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ہم مسئلۂ تعلیم پر اُس کے موضوع یعنی بچوں کے نقطۂ نظر سے بھی غور کریں اور دیکھیں کہ اُن کے نزدیک اس تمام سلسلۂ مشاغل کے کیا معنی ہیں جو تعلیم گاہوں وغیرہ میں رائج ہے - اُن کو اُن تمام سبقوں اور کھیلوں کے سیکھنے سے کیا حاصل ہوتا ہے جن میں وہ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کرتے ہیں ؟ تعلیم پر یک‌طرفہ غور کرنے سے اکثر معلموں نے اور تعلیمی نظریے قائم کرنے والوں نے بہت بڑی غلطیاں کی ہیں جن کا خمیازہ بےچارے بچوں نے صدیوں بھگتا ہے - انہیں غلطیوں میں سے ایک یہ خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف اِتنا ہے کہ بچوں کو آئندہ زندگی کے لیے تیار کرے - بظاہر یہ خیال نہ صرف بالکل بےضرر بلکہ بہت صحیح اور مفید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اِس میں تعلیم اور تمدنی زندگی کا باہمی تعلق مد نظر رکھا گیا ہے - لیکن ہر خیال جو بجائے خود مفید ہوتا ہے اگر ہم اس میں اس قدر محو ہو جائیں کہ ہمیں دائیں بائیں آگے پیچھے کچھ نہ دکھائی دے تو وہ بہت سی غلطیوں کا سبب بن جاتا ہے - تعلیم کا کام یقیناً یہ ہے کہ طلبہ کو اُن فرائض اور ذمہ‌داریوں کے لیے تیار کرے جن سے اُن کو سابقہ پڑے گا لیکن اِس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے جو عملی نتائج نکلے وہ سراسر نقصان‌دہ ثابت ہوئے ہیں - اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ معلم نے بجائے اِس کے کہ بچوں کی موجودہ ضرورتوں، قوتوں اور دلچسپیوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا مستقبل کی توقعات، اور ضروریات کو

تعلیم کوئی ایسا نظام نہیں جس کو بعض ضروریات سے مجبور ہوکر انسان نے قائم کر لیا ہو اور نہ وہ ایسا شغل ہے جس کو انسانی زندگی کے لیے محض زینت کا باعث سمجھا جائے - وہ تو تمدنی زندگی کے رگ و ریشے میں پیوست ہے اور جسم اجتماعی میں جان بن کر سماعی ہوئی ہے - لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر دکھایا ہے اس کا مقصد اب محض اتنا نہیں کہ وہ تسلسل حیات کو قائم رکھے بلکہ وہ "حیات برتر" کا ایک وسیلہ بن گئی ہے جس کے ذریعے ہم ناواقف اور ناتجربہ کار بچے کو بہترین اخلاقی اور معاشرتی اقدار[1] اور اصولوں سے روشناس کرتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے ورثے کے ان عناصر کو جو بہترین تعلیمی قدر رکھتے ہیں بچے کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں خود بخود ایک بہتر معاشرے کی بنیاد ڈالنے کی اہلیت پیدا ہو جائے' اس طرح تعلیم ایک طرف بچے کی شخصیت کی تکمیل کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف اسے تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہے - بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ شخصیت کی نشو و نما ہی ان مشاغل کے ذریعے کرتی ہے جو تمدنی زندگی کا اہم جزو ہیں اور جن کے ذریعے سے بچہ رفتہ رفتہ اُسے سمجھنے اور اس میں شرکت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے- لیکن یہ نظریہ تعلیم کا صرف ایک رخ ہے- یعنی اگر ہم عمل تعلیم کو معاشرے یا بالغ افراد کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے بچوں کو تمدنی زندگی کے لیے تیار کر رہے ہیں -

---

1 - Values

ہے جو بچے اپنے افعال کا قدرتی خمیازہ بھگتنے سے حاصل کرتے ہیں - وہ اپنی معرکۃ لآرا تصنیف " فلسفۂ تعلیم " میں لکھتا ہے :—

" یہ قدرتی سزائیں جو بچے کے بےجا کاموں کا نتیجہ ہیں۔ مستقل بلا واسطہ اور یقینی ہیں اور ان سے چھٹکارا نہیں ہوسکتا - یہاں زجر و توبیخ کا کچھ کام نہیں - بلکہ چپ چاپ سختی سے کام لیا جاتا ہے - اگر بچہ اپنی انگلی میں سوئی چبھو لے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو تکلیف ہوتی ہے - اگر دوبارہ ایسا کرتا ہے تو پھر یہی نتیجہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ بچہ موجودات غیر ذی روح کے ساتھ اپنے تمام معاملات میں یہ بات معلوم کرتا ہے کہ وہ اپنی خاصیت سے منحرف نہیں ہوتے - کوئی عذر نہیں سنتے اور ان کی نہ داد ہے نہ فریاد۔ اس سخت مگر فیض پہنچانے والی تربیت کو پہچان کر بچہ نہایت ہی ہوشیار ہو جاتا ہے کہ آئندہ ان کی خلاف‌ورزی نہ کرے.........معاشرتی تربیت اور بچوں کی ابتدائی تربیت جو قدرت کرتی ہے ان دونوں تربیتوں کی باہمی مشابہت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے - اور کنایتاً اس بات کا بھی یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہی تربیت سب سے زیادہ موثر ہے "۔ ۱

اس تمام بحث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ تعلیم اور تمدن ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں -

---

۱—ہربرٹ اسپنسر : فلسفۂ تعلیم (مترجمہ خواجہ غلام الحسنین)

بےبسی کی وجہ سے اپنے گھر والوں کا' خصوصاً اپنے والدین کا سہارا لیتا ہے - محض اسی بات سے کہ وہ پیدا ہوتے ہی اپنے سے زیادہ عمر اور تجربے کے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے - اور ان سے تعلقات پیدا کرتا ہے اس کی تعلیم کی ابتدا ہو جاتی ہے - شروع میں اس "تعلیم" کا مقصد علم سکھانا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا قائم رکھنا ہوتا ہے - والدین اس کی حفاظت اور نگہداشت کے لیے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں جن کا منشا اس کی جسمانی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کی نشو و نما کرنا ہوتا ہے- اگر اس کے لیے یہ انتظام نہ ہو تو زندگی محال ہو جائے - اب جوں جوں اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت اور دماغ میں آدمیوں اور چیزوں کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے وہ اپنے انسانی اور طبیعی ماحول سے تعلقات پیدا کرتا ہے - اپنے والدین ' عزیزوں اور دوستوں کی ہمت‌افزائی اور روک تھام ' اور ایک حد تک قدرتی تادیب کے ذریعے اس کی عمرانی اور اخلاقی تعلیم بھی شروع ہو جاتی ہے - خاندان کے افراد اور متعلقین جو تعلیمی اثر بچے پر ڈالتے ہیں اس کی تفصیل ہم ایک آئندہ باب میں کریں گے لیکن اس کی ابتدائی تربیت میں قدرتی تادیب کی اہمیت کا سمجھ لینا ضروری ہے - اکثر محبت اور احتیاط کرنے والے والدین اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ بچے اس تکلیف سے بالکل محفوظ رہیں جو غلط اور نامناسب حرکات کی وجہ سے انھیں پہنچنی چاہیے -. لیکن مشہور انگریزی مفکر ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) نے شد و مد اور قابلیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اخلاقی تعلیم کے لیے وہ تادیب بہت موثر ہوتی

مشورتی کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس نے تعلیم بالغان کے
مسئلے پر غور کر کے ایک نہایت قابل‌قدر رپورٹ پیش کی
ہے۱ اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ عہد بلوغ کے
شروع ہوتے ہی بچوں کو مدرسے سے نکال کر زندگی کی کشمکش
اور آزمائشوں میں ڈال دینا اور ان کو تعلیمی ہدایت اور
رہنمائی سے محروم رکھنا ' بہت خطرناک چیز ہے - شہری
زندگی کے فرائض اور اصولوں کو سمجھنے کے لیے یہ نہایت
ضروری ہے کہ عمر کی اس اہم اور نازک منزل میں ان کے لیے
مناسب تعلمی ماحول اور سہولتیں فراہم کی جائیں -
اقتصادی اور تمدنی مشکلات اور ایک حد تک انفرادی
اختلافات کا خیال کرتے ہوئے وہ اس بات کو مناسب نہیں
سمجھتے کہ تمام نوجوان ثانوی' تعلیم کے کل مدارج مدرسوں
میں طے کریں - اس لیے انہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے
کہ تعلیم مزید کے موجودہ نظام کو مرتب اور مکمل کیا جائے
اور وہ تمام طلبہ جو با قاعدہ ثانوی مدارس میں تعلیم نہیں
پا سکتے اپنے وقت کا ایک حصہ' جو ان کے اقتصادی مشاغل سے
بچایا جائے ' ان مدرسوں میں صرف کریں اور وہاں ان کو
تعلیم ایسی دی جائے کہ وہ نہ صرف اپنے مخصوص اقتصادی
کار و بار میں زیادہ قابلیت کے ساتھ حصہ لے سکیں بلکہ اپنے
عمرانی وظائف کو بھی اچھی طرح سمجھ کر ادا کریں -

اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی تمدن کے نظام
میں تعلیم کی ابتدا کس طرح ہوئی - بچہ اپنی کمزوری اور

Report of the Consultative Committee on the—1
Education of the Adolescent.

کیا جا سکتا ہے - کوئی معین مدت نہیں بلکہ اُس کی میعاد ضرورت کے مطابق خود بخود بڑھتی جاتی ہے تاکہ بچے اس عرصے میں کم از کم اُن وسائل پر قابو پا سکیں جن کی مدد سے وہ نظام تمدن کو سمجھ لیں اور اُن کی جسمانی اور دماغی نشو و نما صحیح راہ پر لگ جائے - تعلیم کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم کا زمانہ واقعی زیادہ طویل ہوتا گیا ہے - گزشتہ صدی کی تعلیمی جد و جہد کا ایک اہم باب وہ کوششیں ہیں جو بچوں کی لازمی تعلیم کی مدت کو بڑھانے کے لیے کی گئی ہیں - اکثر مغربی ممالک میں صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد سے برابر یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ نہ صرف بچپن کے زمانے میں بلکہ زمانۂ بلوغ میں بھی طلبہ تعلیمی ماحول اور تعلیمی اثرات میں رہیں کیونکہ ماہرین تعلیم محسوس کرتے ہیں کہ دور حاضرہ کے تمدن کے بہت سے اصول اور فرائض ایسے ہیں جن کو طلبہ بچپن کے زمانے میں نہیں سمجھ سکتے - اُن کو عمدگی کے ساتھ سمجھنے کے لیے زیادہ پختہ تجربے کی ضرورت ہے جو بلوغ کے زمانے میں حاصل ہوتا ہے، جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں عمرانی زندگی کے حقوق اور فرائض کو خود اپنے عملی تجربے کی بدولت پہچانتے ہیں - اسی وجہ سے امریکا میں ثانوی تعلیم کو بھی تمام طلبہ کے لیے مفت اور لازمی قرار دیا گیا ہے اور جرمنی میں ہر طالب علم کو ابتدائی تعلیم کے مدارج ختم کرنے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر تک " تعلیم مزید " کے کسی شعبے میں داخل ہونا پڑتا ہے - انگلستان میں چند سال ہوئے ایک

اِسی طرح سینہ بسینہ پہنچے ہیں - مگر انسان کا دماغ اِس ناقابل اعتبار اور محدود انتظام پر قناعت نہیں کر سکتا - اُس کی قوت اِختراع نے اپنے تجربات کی حفاظت کے لیے بہت سے نئے ذرائع اِیجاد کر لیے - فن تحریر نے انسانی خیالات کو حیات دوام بخش دیا اور ہمیں حافظے کے فریب سے آزاد کر دیا - آوازوں کو قائم رکھنے اور منتقل کرنے کے لیے بھی مختلف قسم کے آلات' گراموفون وغیرہ بنائے گئے - صورتیں مصوری اور عکاسی کے ذریعے فنا ہونے سے بچا لی گئیں - یہ تمام ذرائع انسانی تجربات کو منتقل کرنے کے کام میں آنے لگے ہیں اور اُن میں آئے دن نت نئی اِیجادیں اور اضافے ہوتے رہتے ہیں - چنانچہ آج ہر متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں خیالات کو منتقل کرنے کے ذرائع اِس کثرت سے موجود ہیں کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر علوم و فنون کے کسی شعبے میں کام کرتے ہیں ایک دوسرے کی کوششوں' کامیابیوں' اور ناکامیوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں - زمان و مکان کے قیود سے انسان بڑی حد تک آزاد ہو گیا ہے اور خیال کے گویا پر لگ گئے ہیں کہ جہاں ضرورت ہو وہاں پہنچ سکتا ہے - اخباروں کے ذریعے تمام ملکوں کی خبریں روز کے روز معلوم ہو جاتی ہیں - گراموفون کے ذریعے ہم حال اور ماضی کے بڑے بڑے موسیقی دانوں اور مقرروں کی آواز سن سکتے ہیں - ٹیلیفون' سنیما ' لاسلکی' وغیرہ خیالات کو سرعت کے ساتھ پھیلاتی ہیں اور اشتراک عمل کے امکانات کو زیادہ کرتی ہیں - اُن تمام چیزوں کی مدد سے تہذیب و تمدن کا نظام' جس کی بنیاد وحشیوں اور نیم

رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔ اور یہ اُس کے سامنے کس شکل میں پیش کیا جائے کہ وہ اِسے آسانی سے سمجھ لے - سوائے اس صورت کے کہ ہم بالکل پیش یاافتادہ اور جانی بوجھی باتیں سکھانا چاہیں ہمیشہ اِس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے تجربے کو موثر طور پر کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہم ایک حد تک' اپنی قوت تخیل سے اُس کے تجربات کو اپنے تجربات بنا لیں'' ۱ -

نظام تمدن کا ارتقا

انسان نے جوں جوں ترقی کی ہے' انتقال تجربات کے وسائل بھی بڑھ گئے ہیں اور زیادہ مکمل ہو گئے ہیں - سب سے قدیم اور موثر ذریعہ تو یہی ہے کہ لوگوں کو ایسے مشاغل میں شریک کیا جائے کہ وہ براہ راست اُن کو حاصل کریں جن کو منتقل کرنا مقصود ہے - اور تعلیم کی ابتدا بھی اسی طرح ہوئی کہ بالغوں نے بچوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں شریک ہونے کا موقع دیا اور اس طرح اُن کو وہ ضروری فنون اور رسوم و روایات سکھائیں جو معاشرے کے نزدیک قائم رکھنے کے قابل تھیں - لیکن اس کے ساتھ ہی خود بالغ افراد کے روزافزوں تجربات کو محفوظ رکھنے کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا تھا - اول اول اُن کو محفوظ رکھنے کے لیے محض حافظے سے کام لیا جاتا تھا - اور اُن کو منتقل کرنے کے لیے زبانی الفاظ سے - چنانچہ قدیم‌ترین ادب اور شاعری کے شاہکار ہم تک

---

۱ - Dewey - Democracy and Education - صفحہ ۷ -

کاوش کرنی پڑتی ہے جو خود ان کی ذات کے لیے مفید ہوتی ہے - غرض بالغوں کے نقطۂ نظر سے فن تعلیم کے معنی یہی ہیں کہ معاشرے کے تجربات کو ایسی شکل میں منتقل کیا جائے کہ وہ بچوں کے خیالات جذبات اور دلچسپیوں کے ساتھ ہم‌آہنگ ہو جائیں - اور ان کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے نامکمل اور مبہم تجربات کی تکمیل اور تنظیم کر کے تہذیب و تمدن کے حامل بن جائیں - جو لوگ فن تعلیم سے پوری واقفیت رکھتے ہیں انہیں اندازہ ہے کہ یہ کام کس درجہ مشکل اور کتنی ذمہ‌داری کا ہے - اس کو انجام دینے کے لیے کسی قدر علمی قابلیت اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے اور اگر یہ ایمان‌داری اور خلوص کے ساتھ کیا جائے تو اس سے خود معلموں کی قابلیت میں کتنا اضافہ ہوتا ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ذرا اس بات کی کوشش کیجیے کہ کسی تجربے کو وضاحت اور صحت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو سمجھایا جائے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ خود آپ کا نقطۂ نظر اس کے متعلق بدل گیا - بالخصوص اس صورت میں کہ وہ تجربہ ذرا پیچیدہ اور مشکل ہو........کسی تجربے کو منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کو ایک مخصوص شکل میں مرتب کیا جائے - اور ترتیب دینے کے لیے لازم ہے کہ ہم بےتعلقی سے اس پر غور کریں، اسے دوسرے شخص کے نقطۂ نظر سے دیکھیں، یہ سوچیں کہ اس تجربے میں اور دوسرے کی زندگی میں کسی طرح

ہے - اسی طرح جب وہ اپنے ہم‌عمروں میں کھیلتا ہے، ان کی نقل اتارتا ہے، ان کے ساتھ مقابلہ یا تعاون کرتا ہے تو اس کے تجربے میں وسعت اور وضاحت پیدا ہوتی ہے - اسے اپنے تخیل سے کام لینا پڑتا ہے - اپنے خیالات کو، اپنی گفتگو کو، اپنے سارے طرز عمل کو ذمہ‌داری کے ساتھ معین اور مرتب کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ دوسروں کے دوش بدوش زندگی بسر کرسکے - عمرانی زندگی ہی کی بدولت وہ تمام مواقع حاصل ہوتے ہیں - جو انسان کو غور و فکر اور محاسبۂ نفس کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اس کے تجربے کو منظم اور نمو پذیر بناتے ہیں - بالکل تنہائی کی زندگی میں تو انسان کو اِس سے زیادہ غور و فکر اور تگ و دو کی ضرورت نہ پڑتی کہ وہ اپنی حیوانی ضروریات کو کس طرح پورا کر لے - اسی طرح اس اشتراک عمل سے وہ بالغ افراد بھی مستفید ہوتے ہیں جو نوعمر بچوں کو اپنے تجربات میں شریک کر کے ان کی تربیت کرنا چاہتے ہیں ان کے تجربات اکثر ان کے عمل کا جزو بن جاتے ہیں اور عادت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں - جب وہ کسی بات کو ایک دفعہ سیکھ لیتے ہیں تو انہیں یہ ضرورت نہیں رہتی کہ اس کی منطقی یا نفسیاتی تحلیل کریں - اور اپنی معلومات کو معین اور واضح شکل میں ترتیب دیں - لیکن جب انہیں نوعمر بچوں سے سابقہ پڑتا ہے تو ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے تجربے کو اس طرح مرتب کریں کہ بچے اس سے مستفید ہو سکیں یعنی ان کے پختہ اور مکمل تجربے اور بچوں کے نامکمل اور آزمائشی تجربات کے درمیان رابطہ قائم ہو جائے - اس مقصد کے لیے انہیں بہت کچھ دماغی

معاشرے کی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے اور جس میں مدرسے کی تعلیم کو ایک اہم لیکن جزوی حیثیت حاصل ہے - بیشک مدرسوں کا کام بھی یہی ہے، جیسا کہ ہم آئندہ چل کر زیادہ تفصیل کے ساتھ دکھائیں گے کہ وہ گزشتہ اور موجودہ نسلوں کے تجربات کو منظم اور مرتب کر کے بچوں اور نوجوانوں کے سامنے پیش کریں اور اُن کے افکار اور اعمال پر معاشرتی مقاصد اور اغراض کے مطابق اثر ڈالیں - لیکن اس کام کی پوری اہمیت اور اُس کی حدود کو ہم اُس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ وہ مستقل اور بنیادی طریقے کیا ہیں جن کے ذریعے معاشرہ خود بخود افراد کی تربیت کرتا ہے اور جس کی تکمیل اور تنظیم کے لیے مدرسے کا مخصوص ماحول ترتیب دیا گیا ہے - ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے افراد کو تبادلۂ خیالات اور ایک دوسرے کے تجربات سے متاثر ہونے کا موقع ملتا ہے - یعنی اس کی وجہ سے ان کے خیالات میں وسعت اور کارکردگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے - جو تربیت کا مرادف ہے - اس داد و ستد میں صرف اسی شخص کو فائدہ نہیں پہنچتا جو شاگرد کی حیثیت سے اُستاد سے کچھ سیکھتا ہے بلکہ تجربے میں شرکت ایسی چیز ہے جو دونوں فریقوں کے لیے مفید ہے - جب کوئی بچہ کسی کام میں شریک ہوکر اپنے والدین کے خیالات اور جذبات سے واقفیت حاصل کرتا ہے تو ایک حد تک اس کا طرز عمل اور نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے- اس کی طبیعت اور اس کے علم میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ گویا ایک نئی ہستی بن جاتا

دوسرے سے بہت فاصلے پر ہوں لیکن اُن میں باہمی مراسلت وغیرہ کے ذریعے سے وہ تعلقات قائم ہوں جو افراد کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے ہیں اور اُنہیں صحیح معنوں میں ایک زندہ جماعت بناتے ہیں -

"ایک کتاب یا ایک خط کے ذریعے سے اُن لوگوں میں جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہیں ایسے قریبی مراسم اور تعلقات قائم ہو سکتے ہیں جو ممکن ہے ایک ہی گھر میں رہنے والوں کے درمیان نہ پائے جائیں........افراد کو ایک جماعت یا سوسائٹی کی شکل میں منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے مقاصد، اُن کے عقائد، اُن کی خواہشات، اُن کا علم مشترک ہو، ان میں یکجہتی اور باہمی مفاہمت ہو - اس قسم کی چیزوں کو مادی حیثیت سے، اینٹ پتھروں کی طرح، ایک سے دوسرے کو منتقل نہیں کیا جا سکتا - اُن میں لوگ اس طرح شریک نہیں ہو سکتے جس طرح کسی کھانے کی چیز کے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ سکتے ہیں - وہ باہمی داد و ستد جس سے یکجہتی پیدا ہوتی ہے - ایسی ہونی چاہیے جس سے ذہنی اور جذباتی میلانات میں یکسانیت پیدا ہو اور افراد توقعات اور ضروریات کو ایک ہی طرح پورا کریں"[1]-

افراد کی باہمی اثر پذیری

ابھی ہم تعلیم کے محدود اور مسلمہ معنی سے بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ افراد کی عام تربیت اور تاثیر و تاثر کے اس وسیع تر نظام کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں جو

1- Dewey: Democracy and Education صفحہ ۵ -

ہیں، علوم و فنون میں اضافہ کیا ہے اور تمدن کی مجسم یادگاریں چھوڑی ہیں - اس لیے انسان کے بچوں کو اپنے غیر محدود، تغیر پذیر، نمو پذیر ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے گزشتہ نسلوں کے صدیوں کے تجربات کو سمجھنے اور ان سے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے خاص اہتمام کی اور طویل مدت کی ضرورت ہے - یہی خاص اہتمام تعلیم کہلاتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے قدرت نے بچپن کا زمانہ جو تعلیم کا بہترین زمانہ ہے مقابلتاً طویل رکھا ہے - تعلیم کا مسئلہ دراصل ایک نسل سے دوسری نسل کو مفید تجربات منتقل کرنے کا مسئلہ ہے - معاشرے کی تمدنی اور اخلاقی زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ انسان جو کچھ تجربے سے سیکھتا ہے اس کو آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کرتا رہے - اگر یہ علمی خزانے اور علمی وسائل مناسب طریقے پر ایک نسل سے دوسری نسل تک نہ پہنچائے جائیں تو تھوڑے سے عرصے میں نہایت متمدن اور تہذیب یافتہ جماعتیں بھی وحشی اور جاہل افراد کا مجموعہ بن کر رہ جائیں - واقعہ یہ ہے کہ عمرانی زندگی کا انحصار ہی ان چیزوں پر ہے جو اس کے تمام افراد میں مشترک ہوتی ہیں اور جن کو وہ اسی طرح حاصل کرتے ہیں کہ اُن میں مبادلۂ خیالات اور داد و ستد ہوتی رہتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید ہوتے ہیں - اگر اس تعامل اور داد و ستد کا سلسلہ بند ہو جائے تو جماعت کی یک‌جہتی کا فوراً خاتمہ ہو جائے کیونکہ جماعت محض افراد کے ایک جگہ اکٹھا ہو جانے سے نہیں بنتی بلکہ اُن کے اتحاد خیالات اور اتحاد اغراض و مقاصد سے وجود میں آتی ہے- یہ ممکن ہے کہ لوگ ایک

ڈرامے "رجوع بہ میتھوسلا" (Back to Methuselah) میں
ایک ایسے زمانے کی پیشین گوئی کرتا ہے جب پیدائش ہی کے
وقت بچوں کی عمر سترہ سال کی ہوگی یعنی وہ اُس زمانے سے
گزر چکے ہونگے جو اب نابالغی اور خام‌کاری کا سمجھا جاتا ہے
اور وہ تمام باتیں سیکھے سکھائے پیدا ہونگے جو اب بہت مشکل
اور محنت سے سیکھنا پڑتی ہیں - اِس تخیل کے لطیفے سے
قطع نظر کرکے، جس کا اگر امکان بھی ہوتا تو ہرگز مفید نہ
ہوتا، غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے بچپن کا طویل
ہونا عین مصلحت ہے - جانوروں کے لیے بہت مختصر سا
بچپن کا زمانہ ان تمام مشاغل کو سیکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے
جن سے اُن کو آئندہ سابقہ پڑنے والا ہے اور اس عرصے میں وہ اپنے
کم و بیش محدود اور معین ماحول کی ضروری چیزوں سے
واقف ہو جاتے ہیں - انسان کی حالت اُس سے مختلف ہے
اُس کا ماحول نہ معین ہے نہ محدود - جوں جوں زمانہ گزرتا
گیا ہے اُس نے تہذیب و تمدن میں ترقی کی ہے، علوم و فنون
میں کمال حاصل کیا ہے، مادی اور ذہنی نظام قائم کیے ہیں -
اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اور تمام حیوانات کی نسبت
یہ صلاحیت بہت زیادہ ہے کہ گزشتہ تجربات سے فائدہ اُٹھا کر
نئے کاموں اور نئے مواقع سے زیادہ عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکے
اپنی سیرت کو ضرورت کے مطابق ڈھالے اور اپنے طرز عمل اور طرز
زندگی میں ترمیم اور اصلاح کرے - اس صلاحیت کی وجہ سے
ابتدائے آفرینش سے اب تک انسان کی ترقی جاری رہی ہے
اور اُس نے گزشتہ تجربات کے نتائج کو آئندہ کامیابی کے لیے
استعمال کیا ہے اس طرح ہر نسل نے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے

ماحول کو سمجھ لیتے ہیں' خوراک تلاش کرنا ' رہنے کے لیے کسی قسم کا گھر بنانا یا ڈھونڈنا ' اپنے دشمنوں اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے بچنا - بقاے نسل کے فرائض ادا کرنا یہی چند چیزیں بالعموم اُن کا شغل زندگی ہوتی ہیں - اور اُن سب کو وہ آدمی کے بچے کی نسبت بہت جلد سیکھ جاتے ہیں اور بچپن کا زمانہ ختم کرکے اپنی نوعی زندگی میں شریک ہو جاتے ہیں - برخلاف اس کے انسانوں کی تعلیم میں دو مشکلات ہیں - اول تو یہ کہ بچہ پیدائش کے وقت بالکل بےبس اور بےکس ہوتا ہے - وہ اپنی حفاظت اور پرورش کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا اور ہر بات میں ماں کا یا دوسرے لوگوں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس کے بچپن کا زمانہ اور تمام حیوانات کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتا ہے - یہاں بچپن سے مراد وہ تمام زمانہ ہے جب تک فرد میں اس قدر جسمانی اور دماغی پختگی نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی زندگی کا رہنما بن سکے اور بحیثیت ایک آزاد شہری کے معاشرے کے مشاغل میں شریک ہو کر اپنے فرائض پورے کر سکے - انسانی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان کا بچپن اور تمام حیوانات کی نسبت کیوں زیادہ مدت تک رہتا ہے - بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے ' اور بعض لوگوں کا سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال ہے ' کہ بچپن کا یہ تمام زمانہ ایک طرح سے اکارت جاتا ہے کیونکہ اس سارے عرصے میں بچہ اپنا وقت اُن اہم انسانی مشاغل میں صرف نہیں کر سکتا جو اُس کے شایان شان ہیں - جارج برنارڈ شا (G. B. Shaw) اپنے

بچپن کے زمانے کی تعلیمی اہمیت

اس تمام بحث سے تعلیم کے معنی اور اس کی عمرانی
اغراض پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - ہم دیکھ چکے ہیں کہ
جب تک افراد کی تعلیم اور اُن کے فطری قوتوں کی نشو و نما
کے لیے کوئی مناسب انتظام نہ کیا جائے گا وہ اپنے ماحول کو
سمجھنے اور اُس سے کام لینے سے قاصر رہیں گے اور زندگی کے
کار و بار میں عمدگی کے ساتھ حصہ نہ لے سکیں گے - اگر ہم
اسی مسئلے کے دوسرے پہلو کو دیکھیں یعنی بچے کی نفسی
زندگی کا مطالعہ کریں تب بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے
کیونکہ تعلیم کا عمل افراد اور جماعت کے باہمی ربط اور تعلق
پر منحصر ہے اور اُس کا کوئی نظریہ اُس وقت تک صحیح
نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ اُس ترازو کے دونوں پلوں پر
برابر نہ اُترے - ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ تمام انسانی اداروں اور
نظاموں کی بنیاد انسان کی فطرت اور جبلت پر ہے - یہی حال
تعلیم کا ہے - اگر بچے میں شوق اور تجربہ حاصل کرنے اور اُسے
برتنے کی قابلیت نہ ہوتی تو سرے سے تعلیم دینا ناممکن تھا -
لیکن انسان کو تعلیم دینے کے لیے محض یہ جبلی قوتیں
کافی نہیں - حیوانوں کے لیے اُن کی جبلت اور اُن کے گرد و
پیش کی مفید اور مضر قوتیں معلم کا کام دیتی ہیں اور اُنہیں
کی مدد سے وہ اپنی مقابلتاً محدود اور سادہ زندگی کا کار و
بار انجام دینے کے قابل ہو جاتے ہیں - وہ کھیل کود کے
ذریعے، زیادہ تجربہ‌کار حیوانوں کی تھوڑی سی ہدایت سے اور
زیادہ‌تر اُن جبلتوں کی بدولت جو انسانوں اور حیوانوں دونوں
کے لیے محرک عمل ہوتی ہیں، ضرورت کے مطابق اپنے

ہے:- اسی طرح جس شخص کے ذوق حسن کی تربیت نہیں ہوئی وہ نہ مناظر فطرت کی خوبصورتی سے لطف اُٹھا سکتا ہے نہ مصوری اور فن تعمیر کے شاہکاروں سے محظوظ ہو سکتا ہے - یہی حال عمرانی زندگی کے نظام کا ہے جو صدیوں کی کوششوں اور تجربے سے وجود میں آیا ہے - اُس کے حقوق و فرائض سے آگاہی کے بغیر کوئی شخص اس سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکتا - مثلاً نظام بلدیہ کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے ہر شہری اپنی زندگی کو بہت آرام‌دہ اور مفید بنا سکتا ہے - لیکن ہندوستان میں کتنے فی صدی لوگ ایسے ہیں جو اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں یا اُٹھا سکتے ہیں ؟ ان کے لیے اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے:- متمدن ممالک میں جا بجا کتب خانے، عجائب خانے، مختلف قسم کے علمی جلسے اور نمائشیں منعقد ہوتی ہیں لیکن بہت کم لوگ وہاں جاکر اپنے علم، ذوق اور تجربے میں اضافہ کرتے ہیں - لہذا اُن کے لیے یہ تمام چیزیں کوئی معنی نہیں رکھتیں - یہ سب اسی بیش بہا تمدنی خزانے کے اجزا ہیں جو ماضی نے حال کو وراثتاً دیا ہے اور جس میں ہماری کوشش اور ذہنی اجتہاد سے روز بروز اضافہ ہو رہا ہے - لیکن جیسا کہ مندرجۂ بالا مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے یہ تمام ورثہ باوجود اس کے کہ ہر وقت ہمارے سامنے موجود ہے در اصل گویا ایک سنگین عمارت میں بند ہے جس کے دروازے اُس وقت تک نہیں کھل سکتے جب تک افراد کی دماغی اور معاشرتی نشو و نما مناسب طریقے پر نہ کی جائے اور اُن میں اُن چیزوں کی قدردانی کی صلاحیت اور اُن کے استعمال کی قابلیت پیدا نہ ہو-

مثلاً کوئی میز یا کرسی ہماری ملکیت ہوتی ہے - بلکہ میز کرسی پر بھی صحیح طور پر ملکیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کا مناسب استعمال جانتے ہوں اور کرتے ہوں - جب معمولی مادی اشیا پر تصرف کے لیے خاص قسم کی اہلیت درکار ہے تو ظاہر ہے کہ وہ قیمتی اور گوناگوں ورثہ حاصل کرنے کے لیے' جس کا تعلق مادی اور ذہنی دنیا دونوں سے ہے' ہم پر اور زیادہ سخت شرائط عائد ہوتے ہیں - ایک لحاظ سے یہ ورثہ ہر وقت ہمارے پاس ہے ' ہمارے چاروں طرف موجود ہے - ہم ہر قدم پر اُس کے اثرات دیکھتے ہیں - سائنس نے فطرت کی بیشتر قوتوں کو مسخر کر کے اُنھیں ہمارا غلام بنا دیا ہے ' ادب فلسفہ اور تاریخ نے ماضی' حال اور مستقبل کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں ' فنون لطیفہ کے شاہکار ہر طرف نظر کو کھینچتے ہیں - معاشرتی زندگی کا وسیع اور پیچیدہ نظام ہمیں اس طرح گھیرے ہوئے ہے جیسے کرۂ ہوا - لیکن یہ تمام چیزیں ہمارے لیے ایک مضمون سربستہ کے مانند ہیں جب تک ہم اس کو پڑھنے اور سمجھنے اور اس سے لطف‌اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا نہ کریں - دنیا میں بہت سے آدمی ایسے ہیں جن کی آنکھیں ہیں مگر اندھے ہیں - یعنی بہت سی چیزوں پر اُن کی نظر پڑتی ہے - لیکن نہ وہ انھیں دیکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اُن سے کام لے سکتے ہیں - عالم رنگ اُن کے لیے کوئی وجود نہیں رکھتا - اسی طرح بہت سے آدمی ہوتے ہیں جن کے کان موسیقی سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں - اُن کے لیے بہترین نغمہ بھی خواہ وہ عالم فطرت میں پایا جائے یا انسانی تخلیق کا نتیجہ ہو ' بالکل بے معنی

معاشرتی ورثے سے مستفید ہونے کے لیے تعلیم کی ضرورت

لیکن انفرادی جسمانی اور اجتماعی تمدنی ورثے میں ایک نہایت اہم فرق ہے جن کو ذہن نشین کرنا فلسفۂ تعلیم کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہے- جسمانی ورثہ بھی تمدنی ورثے کی طرح ہر انسان کو ملتا ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے یا اس پر قابو پانے کے لیے کسی خاص جد و جہد کی ضرورت نہیں - وہ خصوصیتیں اور جبلتیں جو بچے کو اپنے آبا و اجداد کی طرف سے وراثتاً ملتی ہیں رفتہ رفتہ طبعی حالات میں' خود بخود ظاہر اور پختہ ہوتی جاتی ہیں - یہ سچ ہے کہ جبلت کے اظہار کے لیے کسی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس قسم کی مناسب تحریکیں ہر حیوان کے ماحول میں موجود ہوتی ہیں - بچے میں غذا حاصل کرنے کی جبلت ہوتی ہے چنانچہ وہ بغیر کسی وقت اور پس و پیش کے ماں کا دودھ پینے لگتا ہے - اس کو نقل و حرکت کرنے ' کھیلنے ' چیزیں بنانے اور بگاڑنے ' انہیں اپنی ملک بنانے کی جبلی خواہش ہوتی ہے اور وہ اُن خواہشوں کو مناسب وقت پر اپنے ماحول کے اشیا کے ذریعے پورا کرتا ہے - لیکن تمدنی ورثے کا معاملہ زیادہ نازک ہے - یہاں محض قبضے کا نام ملکیت نہیں - اس کی تشریح ایک معمولی سی مثال سے ہو سکتی ہے - کوئی کتاب اس وقت تک واقعی طور پر ہماری نہیں ہو سکتی جب تک ہم دماغی کاوش سے اس کا مطالعہ کر کے اس کے مضمون پر عبور حاصل نہ کر لیں - محض قیمت ادا کرنے سے وہ ہماری حقیقی ملک نہیں بن سکتی - وہ ایک خارجی چیز رہتی ہے اور صرف اسی معنی میں ہماری ملکیت ہے جس معنی میں

کو لے کر انہیں ایک نئی ترتیب کے ساتھ پیش کر دے یا ان کے مشاہدے سے ایسے قانون دریافت کرے جن کے سمجھنے سے اس سے پہلے کے صاحبان فکر قاصر رہے ہوں - اس لیے گو اس کی ایجاد یا دریافت کی قدر کتنی ہی زیادہ ہو لیکن وہ اپنی کامیابی کے لیے سراسر متقدمین کا محتاج ہوتا ہے - ایک انگریز مصنف اپنی کتاب [1] میں لکھتا ہے کہ

"اگر ہم کسی قابل‌ترین شخص کے کارناموں کا مقابلہ اس علمی دولت سے کریں جو اس کو ماضی سے وراثتاً ملی تھی اور جس کی وجہ سے وہ اپنا کام کر پایا تو اس کے کارنامے مقابلتاً بالکل ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔"

تعلیم و تہذیب کے نقطۂ نظر سے یہ تمدنی ورثہ بھی ہمارے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا وہ جسمانی اور نفسی ورثہ جو ہم اپنے آبا و اجداد سے براہ راست حاصل کرتے ہیں ہماری دماغی نشو و نما کے لیے یہ ماضی کا عطیہ اسی قدر ضروری ہے جس‌قدر جسمانی صحت کے لیے تازہ ہوا اور صاف پانی۔ بالڈون (Baldwin) اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :—

"بچہ بالکل اسی طرح معاشرتی تعلقات کے نظام کے اندر پیدا ہوتا ہے جس طرح وہ کرۂ ہوا کے اندر پیدا ہوتا ہے - جس طرح ہوا میں سانس لے کر اس کا جسم بڑھتا ہے اسی طرح اس عمرانی ورثے کو جذب کرنے سے اس کی دماغی نشو و نما ہوتی ہے [2] ۔"

۱— Brown: Underlying Principles of Modern Legislation صفحہ ۱۱۲ -

۲— ملاحظہ ہو : Social and Ethical Interpretations

یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کبھی معدوم نہیں ہوتا بلکہ حال کا ایک جزو لازم بن کر مستقبل کی تعمیر میں نہایت اہم حصہ لیتا ہے - ہم ماضی کے بوجھ کو اپنے شانوں سے اتھا کر اس طرح نہیں پھینک سکتے جس طرح ایک مزدور اپنے بوجھ کو پھینک دیتا ہے کیوں کہ اس کا اثر ہمارے رگ و ریشے میں، ہمارے قلب و دماغ میں خون کی طرح سرایت کر چکا ہے - یہ اور بات ہے کہ ہم گزشتہ زمانے کے خیالات یا رسم و رواج کی مخالفت کریں، اس کی برائیوں کے خلاف جنگ کریں اور اپنے لیے نئے شاہراہ عمل کی بنیاد ڈالنا چاہیں - لیکن اس جنگ میں ہم جس قدر ذہنی اور مادی آلات اور وسائل کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی تمام‌تر اسی زمانۂ ماضی کا عطیہ ہوتے ہیں ! قدامت پسندی اور جدت پسندی میں یہ فرق نہیں کہ قدامت پسند ماضی کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور جدت پسند اس سے آزاد - وابستہ دونوں ہوتے ہیں اور اس سے مدد لیے اور فائدہ اتھائے بغیر دونوں کو چارہ نہیں - فرق صرف نقطۂ نظر کا ہوتا ہے کہ اس معاشرتی ورثے کو جو انہیں ملا ہے کس طرح استعمال کریں - آیا اپنی علمی اور عملی قوتوں کو محض اپنے بزرگوں کے کارناموں کی تشریح اور تفسیر اور حفاظت میں صرف کریں - یا ان کارناموں پر خود اپنے ارتقاپذیر تجربے کی بنیاد رکھیں اور ان میں اپنی عقل سے اپنے زمانے کی روزافزوں ضروریات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی عمل میں لائیں - بڑے سے بڑا سائنس داں اور فلسفی اور موجد بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا کہ دنیا کی پچھلی معلومات اور واقفیت سے فائدہ اتھا کر مادی یا ذہنی مظاہر میں سے بعض

انسان خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے -

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم سفال آفریدی، ایاغ آفریدم،
بیابان و کوهسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم،
من آنم که ازسنگ آئینه سازم من آنم که از زهر نوشینه سازم،

غرض اس ماحول سے جو ہمیں گویا ورثے میں ملا ہے، ہماری مراد ایک طرف تو مظاہر فطرت کی وہ جامد دنیا ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف علوم و فنون، اخلاق و سیاست کی نموپذیر دنیا جو گذشتہ نسلوں کی دماغی جد و جہد اور تخلیقی کوششوں کا نتیجہ ہے اور جس کی ترقی ہماری اپنی مسلسل کاوشوں پر منحصر ہے - ہماری موجودہ زندگی کا ہر پہلو خواہ وہ عملی ہو یا نظری تمام تر اسی معاشرتی ورثے کا مرہون منت ہے جو ہم نے اپنے پیش رووں سے پایا ہے - ہمارے علوم اور ادب، ہماری موسیقی اور مصوری، ہمارا قانون اور سیاست، ہمارے مدرسے، ہماری صنعت و حرفت، غرض ہر چیز اس منتظم اور تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے جس میں بےشمار افراد اور جماعتیں گزشتہ زمانوں میں حصہ لے چکی ہیں، جن میں سے بعض کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اور اکثر کی کوششیں گمنامی کے پردے میں پوشیدہ ہیں - اس لحاظ سے یقیناً ہماری موجودہ نسل ان تمام نسلوں کے ترکے کی حامل ہے جو ہم سے پہلے گذر چکی ہیں اور ہم تہذیب و تمدن کے ارتقاے پیہم میں اپنی کوششیں اس منزل سے شروع کرتے ہیں جہاں سے گزشتہ نسل نے اس کو چھوڑا ہے - اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ ہر بچہ تمام گزشتہ زمانوں کا وارث ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہم،

کی زندگی میں بھی ایک تسلسل قائم ھے۔ جس طرح حیات حیوانی کا سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعے سے جاری رھتا ھے اسی طرح معاشرے کی زندگی کا تسلسل اس پیچیدہ نظام کے ذریعے قائم رھتا ھے جس کی طرف ھم نے اوپر اشارہ کیا ھے اور جس سے ایک نسل اپنے تمام عملی اور اخلاقی کمالات اور فنون لطیفہ کے خزانوں کو دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی ھے - ھم اپنے چاروں طرف جو ماحول دیکھتے ھیں وہ ھمارا عمرانی ورثہ ھے اور ھمیں اپنی پیشرو نسلوں سے ملا ھے - اس ماحول کے بہت سے ادارے اور عناصر تو صریحاً ایسے ھیں جو انسانی صناعی اور خلاقی کا نتیجہ ھیں - مثلاً علم و ادب کے شاھکار' فنون لطیفہ کے نمونے' عمارتیں' کارخانے اور اسی قسم کی تمام چیزیں جو انسان نے اپنی دماغی کاوش سے ترتیب دی ھیں یا ایجاد کی ھیں - لیکن وہ چیزیں بھی جو بظاھر فطرت کا عطیہ ھیں - ایک حد تک انھیں انسانی کوششوں کی مرھون منت ھیں اور ان کو بھی اسی عمرانی ورثے میں شمار کرنا چاھیے - ھم اپنے گرد و پیش جو دریا اور پہاڑ کھیت اور سڑکیں وغیرہ دیکھتے ھیں یہ سب بھی اپنی ابتدائی فطری حالت میں نہیں ھیں بلکہ انسان کی قوت تخلیق و تسخیر کے کارنامے ھیں جس نے زمین کی شکل و صورت تک کو بدل دیا ھے اور اس کی تمام پوشیدہ اور زبردست قوتوں کو' جو ایک زمانے میں ضعیف انسان سے نبردآزما رھتی تھیں' قابو میں لاکر انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ھے -

اقبال نے انسان اور خدا کے درمیان مکالمے کی شکل میں انسانی کوششوں کے اس اعجاز کو نہایت خوبی سے بیان کیا ھے -

مشاغل کا ایک ضمنی نتیجہ ہوتا ہے - ممکن ہے اس اثر کا عام رجحان یہ ہو کہ وہ شخصیت کو زیادہ مکمل اور موثر بنائے - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی امکان ہے کہ اس سے پیشہ‌ور کی دلچسپیاں زیادہ تنگ اور محدود ہو کر رہ جائیں- چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اکثر صنعت و حرفت کے کاموں میں تقسیم عمل اتنی زیادہ ہوگئی ہے اور مشینوں کو اس قدر غلبہ حاصل ہو گیا ہے کہ کارخانوں کے مزدوروں میں تنگ نظری' اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہو جاتی ہے - پیشے کی طرح مذہب بھی وسیع معنی میں تربیت انسانی کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس کا اصلی مقصد اس تعلق کو جو خدا کے اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے واضح اور مستحکم کرتا ہے - غرض ان تمام اداروں میں تعلیم کا نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جو بلاواسطہ اور بالقصد اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی نشو و نما اور ان کی اخلاقی اور معاشرتی رجحانات کی تشکیل کا انتظام کرے - اور اس کی صورت یہ قرار دی گئی ہے کہ ان کو بچپن اور بلوغ کے زمانے میں ایسے ماحول میں رکھا جائے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو فعل میں لاکر دنیا کی زندگی میں کامیابی اور عمدگی کے ساتھ حصہ لے سکیں اور اسی نظام تعلیم کی مدد سے ہر نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو اپنے گوناگوں تجربات اور معلومات میں شریک کرتی رہے اور اسے آئندہ فرائض کی ادائگی کے قابل بنائے -

ماحول کی تخلیق میں انسان کا حصہ

ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کی زندگی کی طرح جماعتوں

عملی تعلیم میں کیسی انقلاب انگیز تبدیلیاں لازم آتی ہیں اور نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں کن بنیادی تغیرات کی ضرورت پڑتی ہے - یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اگر کسی جماعت کو مختلف قسم کے مشاغل کے مواقع حاصل نہ ہوں گے تو اس کی عمرانی زندگی کا دائرہ بہت تنگ ہوگا اور اس کے افراد کی نشو و نما بھی محدود رہے گی - انسانوں کا باہمی تعلق اور ان کی جماعت بندی خواہ کسی مقصد سے اور کسی شکل میں ہو ان کے ارتقا پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی- جس حد تک ہم ان تعلقات کو جو کسی جماعت کی رکنیت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں منظم کریں گے یہ اثر زیادہ نتیجہ خیز اور بہتر ہوگا اور جس قدر ان کے افراد میں باہمی اشتراک عمل ہوگا اتنی ہی ان کی زندگی میں خیال اور عمل کی آزادی زیادہ ہوگی -

نتیجہ یہ نکلا کہ تمام عمرانی اداروں کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ افراد کو وسیع‌ترین معنوں میں تعلیم دیں اور ان کی شخصیت کی تشکیل کریں تاکہ وہ اپنی مختلف فطری قوتوں کو اس طرح استعمال کرسکیں کہ خود ان کو بھی فائدہ پہنچے اور معاشرے کو بھی - لیکن یہ ان اداروں کا "مقصد اعلیٰ" ہے جس کا ہمیشہ ان کے اراکین کے پیش نظر رہنا ضروری نہیں - ان کے فوری مقاصد جو ان کے عمل پر زیادہ موثر ہوتے ہیں بالعموم دوسرے ہوا کرتے ہیں - مثلاً انسان جو پیشہ اختیار کرتا ہے اس سے اس کی طبیعت اور مزاج پر اثر پڑتا ہے اور اس کی شخصیت پر ایک خاص رنگ چڑھ جاتا ہے - یہ بھی وسیع معنوں میں تربیت کا ایک جزو ہے لیکن یہ اثر بالعموم ان

تحقیقات میں، آرٹ کی تخلیق میں یا بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت میں یا اسی قسم کے اور ہزاروں مشغلوں میں سے کسی ایک میں - اگر کسی شخص کو لڑنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں آتا تو اس کے عزم للقوۃ کی تسکین صرف جنگ و جدل ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے - برخلاف اس کے اگر اس کو اور بھی بہت سے کام آتے ہیں تو اسے ان میں اظہار خودی کر کے مسرت حاصل ہوگی......اگر موقع ملے تو میں مدرسے کے لڑکوں اور لڑکیوں کو طوفانی سمندروں میں جہاز چلانا، بلندی سے پانی میں غوطہ لگانا، موٹر اور ہوائی جہاز چلانا سکھاؤں - میں انہیں اونڈل کے پبلک اسکول کے ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) کی طرح مشینیں بنانا اور سائنس کے تجربات کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالنا سکھاؤں اور جہاں تک ممکن ہو فطرت کی قوتوں کو ان کے سامنے حریف مقابل بنا کر پیش کروں'' [۱]

اس مقولے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ افراد کی نشو و نما میں جماعت کا حصہ کس قدر زیادہ ہے اور وہ اپنی قوتوں کو مناسب شکل اسی وقت دے سکتے ہیں جب یہ قوتیں عمرانی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر استعمال کی جائیں - نظریۂ تعلیم میں اس اصول کی بڑی اہمیت ہے اور ہم کسی آئندہ موقع پر اس کے نتائج سے بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے مدرسے کی

۱- صفحہ ۱۰۵ -

ہوتی ہے لیکن فطرت کی طرف سے ان کے لیے کوئی خاص طریقے اظہار کے معین نہیں ہوتے - یہ بچے کے ماحول اور مشاغل پر منحصر ہے کہ وہ اپنی کسی خاص جبلت' مثلاً تجسس یا ملکیت کو کسی طریقے پر ظاہر کرتا ہے - ممکن ہے کہ وہ بڑا ہو کر تجسس کا اظہار اس طرح کرے کہ دوسرے لوگوں کے بھید معلوم کرنے کی فکر میں رہے اور غیر متعلق اور فضول افواہوں سے دلچسپی لے - یا عمدہ نگرانی اور ہدایت کے ذریعے اس قوت کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ بڑا ہو کر علمی تحقیق و تفتیش اور مظاہر فطرت کے مشاہدے سے اپنی اس جبلت کو تسکین دے - اس کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہے کہ گھر اور مدرسے میں بچے کو ایسے مشاغل میسر آتے ہیں یا نہیں جن کے ذریعے وہ ان جبلتوں سے عمدہ اور معاشرتی نقطۂ نظر سے مفید طریقے پر کام لے سکے - برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) اپنی کتاب "تعلیم" میں بچوں کی جبلت کی تربیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"غرض تعلیم کا گر جہاں تک اس کا تعلق سیرت کی تشکیل سے ہے یہی ہے کہ طلبہ کو ایسے کام اور ہنر سکھائے جائیں جن کے ذریعے سے وہ اپنی جبلتوں کو بطریق احسن استعمال کر سکیں - اظہار قوت کی جبلت جس کو بچہ نوعمری میں بھونڈے طریقے سے نیل ریش [1] کی نقل اتار کر ظاہر کرتا ہے بڑی عمر میں زیادہ موزوں اور معقول صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے مثلاً سائنس کی

۱—Bluebeard - ایک فرضی شخص جس کی کہانی مشہور ہے کہ وہ بہت سی عورتوں سے شادی کرتا تھا اور انھیں قتل کر دیتا تھا -

بڑائی چیز نہیں جو قدرت کی طرف سے ہر شخص کو ملتی ہو بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا تخلیقی کارنامہ ہے جس کو انجام دینے کے لیے فرد اور جماعت کی قوتوں میں اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ڈیوئی (Dewey) جو امریکا کے سب سے بڑے تعلیمی مفکر ہیں، اپنی کتاب "فلسفے کی تعمیر نو" (Reconstruction in Philosophy) میں لکھتے ہیں کہ:

"انفرادی سیرت سے مراد ہے جدت، ایجاد، تدبیر کا مادہ اور اعمال و عقائد کے معاملے میں ذاتی انتخاب کی ذمہ داری اور یہ سب چیزیں فطرت کا عطیہ نہیں ہیں۔ انہیں حاصل کرنا پڑتا ہے" [1]۔

اس کا آخری جملہ قابل غور ہے۔ شخصیت کے حصول کے لیے پیہم اور مستقل کوشش کی ضرورت ہے اور یہ اسی حد تک حاصل ہوتی جاتی ہے جس حد تک انسان کوشش کرکے اپنی جبلتوں اور صلاحیتوں کو تربیت دیتا ہے اور ان کو ہم آہنگ کرکے اپنی ذات میں قوت اور سکون اور توازن پیدا کرتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ انسان یہ کوشش تنہائی میں رہ کر نہیں کر سکتا۔ اس کی کوششوں کی جولاں گاہ بننے اور ان میں معنی اور مقصد پیدا کرنے کے لیے عمرانی زندگی کی ضرورت ہے کیونکہ اسی میں وہ مختلف قسم کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ جو افراد کی قوتوں کو ابھارتے ہیں اور ان کو دعوت عمل دیتے ہیں۔ بچے کی جبلتوں کی ابتدائی شکل بالکل غیر معین ہوتی ہے۔ ان کو اظہار کی خواہش

۱ — صفحہ ۲۰۹۔

جس کے اظہار کی سب سے زیادہ پائدار اور سادہ شکل ماں اور بچے کی محبت ہے اور جو وسیع ہو کر تمام عالم کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے - البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ مخصوص طرز جو عمرانی زندگی اختیار کرتی ہے مختلف حالات کا نتیجہ اور مختلف فوائد کے حصول کا ذریعہ ہیں -

معاشری ماحول میں تربیت نفس

بہر حال خواہ سوسائٹی کی ابتدا کسی طرح بھی ہوئی ہو اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی بنیاد نہایت مضبوطی کے ساتھ عمرانی زندگی پر قائم ہے - اور انسان بچپن ہی سے مختلف تمدنی اداروں اور نظاموں کا رکن بن جاتا ہے - کامیاب زندگی کا بڑا معیار یہی ہے کہ انسان پر ان تمام اداروں کی رکنیت کی وجہ سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کو عمدگی کے ساتھ ادا کرے اور جو حقوق حاصل ہوتے ہیں ان سے پورا فائدہ اُٹھائے - ان اداروں میں شرکت کر کے اسے اپنی قوتوں کے اظہار اور نشو و نما کا موقع ملتا ہے اور وہ حقیقی معنی میں انسان بن جاتا ہے - پیدائش کے وقت آدمی محض جسمانی شکل و صورت اور جبلتوں کے اعتبار سے انسان ہوتا ہے - عمرانی اور اخلاقی اعتبار سے انسانیت کے مرتبے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص ایک مسلسل اور منظم جد و جہد کے ذریعے اپنی شخصیت کی تشکیل و تربیت کرے - اس جد و جہد کی نگرانی بچپن اور نوجوانی میں والدین اور استاد اور معاشرے کے مختلف ادارے کرتے ہیں اور بلوغ کے بعد خود انسان اپنا رہنما اور محتسب بن جاتا ہے - انسانی شخصیت کوئی بنی

میں انسان بھی بعض جانوروں کی طرح تنہائی کی زندگی بسر کرتے تھے - لیکن رفتہ رفتہ ان کو عقل اور تجربے کی مدد سے معاشری زندگی کے فوائد کا احساس ہوا اور انھوں نے مختلف معاشرتی ادارے قائم کیے - اس نقطۂ نظر کو امریکا کے دو مفکرین ڈیلے (Dealey) اور وارڈ (Word) نے اپنی کتاب "درس عمرانیات" (Text Book of Sociology) میں پیش کیا ہے- وہ لکھتے ہیں :

"انسان بالطبع معاشرت پسند نہیں ہے - معاشرہ اُس کی عقل کی جد و جہد کا نتیجہ ہے اور رفتہ رفتہ اس کے دماغی ارتقا کے ساتھ صورت‌پذیر ہوا ہے - بہ الفاظ دیگر، معاشرے کی بنیاد اس طرح پڑی کہ انسان نے اس کے فوائد کو محسوس کیا اور جوں جوں یہ فوائد عقل پر ظاہر ہوتے گئے (عقل ہی ایک ایسی قوت ہے جو ان کو سمجھ سکتی ہے) معاشرے کا نظام ظہور میں آتا گیا"

اگر ہم اس خیال کو صحیح مانیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرہ ایک عارضی گروہ بندی کا نام ہے جو چند مخصوص فوائد کے حصول کے لیے قائم ہے اگر ان فوائد کا حاصل کرنا انسانوں کے لیے ضروری نہ رہے تو اس کا شیرازہ بکھر جائے گا اور انسان پھر اسی اِنفرادی زندگی کی طرف رجوع کریں‌گے جو اس خیال کے مطابق شروع میں تھی - اس نقطۂ نظر میں بڑی غلطی یہ ہے کہ اس میں عمرانی زندگی کے اصل اصول اور اُس کی تشکیل کے مختلف طریقوں میں تمیز نہیں کی گئی - ان دونوں مصنفوں نے یہ نہیں سمجھا کہ عمرانی زندگی کی بنیاد انسانی فطرت کے اس جذبے پر قائم ہے

اقتصادی تربیت کا گہوارہ بن جاتا ہے - اس کے مقاصد زیادہ وسیع، اس کے باہمی روابط زیادہ مستحکم اور اس کے فرائض زیادہ متنوع ہو جاتے ہیں - اس کا کام محض یہی نہیں رہتا کہ حیات موجودہ کو قائم رکھا جائے- بلکہ اسے یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ حیات برتر کی بنیاد ڈالی جائے - خاندان کے افراد آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں اور کاموں کو تقسیم کرکے اپنی کارکردگی کو بڑھاتے ہیں - وہ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لیتے ہیں اور ان کو نہ صرف وہ کام اور وہ عادتیں سکھاتے ہیں جن کی مدد سے انہیں آئندہ چل کر اپنی روزی کمانی ہوگی - بلکہ عملی مثال اور زبانی تعلیم کے ذریعے ان اصول اور اخلاق سے بھی آگاہ کرتے ہیں جو اس خاندان میں چلے آتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی عمدہ رسوم و روایات اور پسندیدہ اصول زندگی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہو کر مستقل صورت اختیار کر لیں - اسی وجہ سے خاندان تعلیم و تربیت کا سب سے قدیم اور غالباً سب سے زیادہ اثرآفریں مرکز ہے اور تعلیمی مسائل کو سمجھنے کے لیے اس کی اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا ضروری ہے - ہم اس مسئلے پر زیادہ تفصیل کے ساتھ ایک آئندہ باب میں بحث کریں گے - یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ کس طرح ایک معاشری ادارے کا، جو کسی محدود اور مخصوص مقصد کے لیے قائم ہوتا ہے، حلقۂ عمل وسیع ہو جاتا ہے - بعض لوگوں نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے کہ انسان بالطبع معاشرت پسند ہے اور دوسرے افراد کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنا اس کی فطرت کا اٹل قانون ہے - ان کا خیال ہے کہ ابتدا

قدیم اور سب سے زیادہ پائدار جماعت ہے' اس کی ابتدا یوں نہیں ہوئی کہ افراد نے تجربے سے معلوم کیا ہو کہ خاندان کی زندگی بسر کرنے میں خاص فوائد اور آسائشیں ہیں جو تنہائی کی زندگی میں ممکن نہیں اور اس تجربے کی بنا پر انہوں نے اپنی تنظیم' خاندانوں کی شکل میں کر لی ہو - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خاندان کی بنیاد اس فطری محبت پر قائم ہے جو قدرتاً والدین کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے اور جس کا اظہار حیوانوں کی زندگی میں بھی ہوتا ہے - ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بالکل بےکس اور بےبس ہوتا ہے - اس کی زندگی ہر قدم پر والدین کی خبرگیری اور نگہداشت کی محتاج ہے - اس خبرگیری کا مستقل انتظام کرنے کے لیے قدرت نے والدین میں محبت کا جذبہ ودیعت کیا ہے - جو ان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ بچے کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں اور خود تکلیفیں جھیل کر اُس کو آرام پہنچائیں بنی نوع انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے قدرت کا یہ انتظام لازم تھا - اُس کے بغیر انسانی زندگی اور تمدن کی موجودہ تشکیل ممکن ہی نہیں تھی - لیکن خاندانی زندگی کا محض یہی فائدہ نہیں کہ بچوں کی پرورش کی جائے اور ایک نسل دوسری نسل کو زندہ رکھنے کا انتظام کرے - عمرانی زندگی کا ایک عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی ادارہ کسی خاص مقصد کے لیے قائم ہوتا ہے تو اس کی جد و جہد کے دوران میں بہت سے نئے اور ضمنی لیکن نہایت اہم نتائج پیدا ہو جاتے ہیں - یہی خاندان جو ابتدا میں محض بچوں کی جسمانی خبرگیری کا کام کرتا تھا رفتہ رفتہ ان کی تمدنی' اخلاقی اور

وسیع‌تر معنی میں اس کی زندگی کی تکمیل اور ترقی کا بھی انحصار ہے - ہر جماعت باوجود افراد کے فنا ہو جانے کے اس طرح قائم رہتی ہے کہ معینہ تدبیروں کے ذریعے سے اپنے سارے ذہنی اور تمدنی سرمائے کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی رہے - اس کی روز افزوں ترقی کا راز یہی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے تمام علمی اور عملی مشاغل میں پوری جد و جہد سے کام لے اور دوسری طرف ایسے ادارے ترتیب دے جن کے ذریعے سے ہر نئی نسل اپنے سے پہلی نسلوں کے خزانوں پر قابض ہو کر اُن کی مدد سے ترقی کے میدان میں اور آگے قدم بڑھا سکے -

غرض معاشرے کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے قیام اور اپنی بقا کے لیے ایسی تدابیر عمل میں لائے جن سے افراد سہولت اور کامیابی کے ساتھ اتفاق و اتحاد کی زندگی بسر کر سکیں - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے چاروں طرف ایسے نظام اور ادارے قائم ہیں جن میں شریک ہو کر ہم اپنی قوتوں کو مناسب اور موثر طریقے پر استعمال کرتے ہیں اور اپنی محنت اور جد و جہد کے نتائج کو مستقل شکلوں میں محفوظ رکھتے ہیں - یہ ادارے کسی عارضی مقصد یا مصلحت کی خاطر قائم نہیں ہوئے بلکہ انسان کی فطری ضرورتوں پر مبنی ہیں - اس میں شک نہیں کہ بہت سی مصلحتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو ان کی اہمیت کو اور نمایاں کر دیتی ہیں - لیکن بغیر فطرت انسانی کے تقاضے کے یہ انتظامات، اگر کیے بھی جاتے' تو قائم نہ رہتے - مثال کے طور پر خاندان کو لیجیے جو تمام عمرانی جماعتوں میں سب سے

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو "روح کی اس خوفناک تنہائی" میں بھی ہم حقیقت میں تنہا نہیں ہوتے - ہماری اندرونی زندگی بھی اپنی تشکیل کے لیے دوسرے لوگوں کے خیالات جذبات اور معاشری تعلقات کی محتاج ہے اور ہمارے دل کے پوشیدہ ترین خیالات کا نظام بھی محسوس یا غیر محسوس طریقے پر ان تجربات اور احساسات سے وابستہ ہے جن کو ہم بغیر دوسرے لوگوں کی مدد کے حاصل نہیں کر سکتے - اسی وجہ سے شاعر نے کہا ہے کہ :—

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

معاشری زندگی کا مفہوم

ہم نے مندرجۂ بالا عبارت میں "افراد کی زندگی اور معاشرے کی زندگی" کے الفاظ استعمال کیے ہیں یہ الفاظ کسی قدر تشریح طلب ہیں - زندگی سے یہاں ہماری مراد صرف وہ جسمانی زندگی نہیں جس کا مدار سانس کی آمد و رفت پر ہے جو ہم میں اور تمام حیوانوں میں مشترک ہے - یہاں ان الفاظ کے مفہوم میں افراد اور جماعتوں کے وہ تمام تجربات، کارنامے، ذہنی اور علمی کمالات اور سیرت کی خصوصیات شامل ہیں جو ہر فرد اور ہر جماعت کو باقی تمام افراد اور جماعتوں سے ممتاز کرتی ہیں - اس لیے جب ہم کسی خاص معاشرے یا کسی جماعت کی زندگی کا ذکر کرتے ہیں تو اُس سے ہماری مراد ہوتی ہے اس کا رسم و رواج، مذہب، علوم و فنون، اقتصادی اور سیاسی مشاغل، خانگی زندگی کے اصول اور قاعدے جن پر نہ صرف اس کی حیات محض کا دار و مدار ہے بلکہ

اور دماغ عقل و روح اور حیوانی جبلتیں وغیرہ سب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور گرد و پیش کے حالات سے ایک ساتھ متاثر ہوتی ہیں - دوسرے انسان تنہا بطور ایک فرد واحد کے زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ اور افراد کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور معاشری کار و بار اور مشاغل میں حصہ لیتا ہے - معاشرت کا تعلق ہماری زندگی سے اس قدر گہرا اور لازمی ہے کہ انسانوں کی وہ حالت جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ معاشرے کی شکل میں وابستہ نہ ہوں ہمارے تصور سے باہر ہے - سچ پوچھیے تو معاشرے کا رکن ہونا ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔ اس کے بغیر اس کی ذہنی اور روحانی قوتوں کی پوری نشو و نما ہو ہی نہیں سکتی - اگر ہم اپنے مشاغل کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کا مقصد اور معنی سمجھنے کے لیے ہمیں ہر قدم پر معاشرے کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے- ہماری تجارت، ہماری صنعت و حرفت، ہمارا نقل و حمل ' غرض وہ تمام کام جن کے ذریعے ہم اپنی زندگی کی ضروریات بہم پہنچاتے ہیں افراد کے اشتراک عمل پر منحصر ہیں۔ اگر لوگ مل جل کر ان کاموں کو انجام نہ دیں تو ایک دن میں معاشرے کا بنا بنایا نظام درہم برہم ہو جائے - کارخانے کے مزدوروں کی ایک معمولی سی ہڑتال اس حقیقت کو نہایت موثر انداز میں ہم پر واضح کردیتی ہے - لیکن فرد اور جماعت کا تعلق اس سے بھی زیادہ گہرا ہے - انسان کی ذہنی اور روحانی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کے لحاظ سے بہ ظاہر وہ بالکل تنہا ہوتا ہے اور صرف اپنے ذاتی خیالات، جذبات اور عقائد کی دنیا میں رہتا ہے جہاں کسی دوسرے شخص کا گزر نہیں -

لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی بحثوں میں جو زیادہ‌تر نظری اور اصولی ہیں ہمیں مخصوص اور معین تعلیمی طریقوں سے سروکار نہیں ہوگا بےشک جو طریقے دوسرے ملکوں میں یا کہیں کہیں ہمارے ملک میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں ان کا ہم ذکر کریں گے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تعلیم میں جو ایک زندہ فن ہے اور جس کا موضوع ذی روح اور نمو پذیر افراد ہیں' کوئی خاص طریقہ ایسا نہیں جو ہر حالت میں کام آسکے- اس میدان میں کامیاب ہونے کے لیے عام اصول تعلیم سے واقفیت اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے تاکہ معلم اپنے گرد و پیش کے خاص حالات کے لحاظ سے ان اصولوں کی روشنی میں تعلیم اور نظم تعلیم کے مناسب طریقے اختیار کرسکے -

فرد اور معاشرے کا تعلق

چونکہ تعلیم کا موضوع انسان کی سیرت اور اس کی زندگی کی تشکیل ہے اس لیے اس کے مطالعے کے لیے وسعت نظر کی خاص طور پر ضرورت ہے - انسان کی زندگی کی مثال سمندر کی سی ہے جس کو لکیریں کھینچ کر یا لکڑی کے تختے لگا کر مختلف حصوں میں اس طرح تقسیم نہیں کیا جا سکتا کہ ایک حصے کا دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو - جس طرح سمندر کی ہر موج اُٹھتی ہے اور روانی کے ساتھ پانی کی سطح پر پھیلتی ہوئی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے' کہیں دوسری موجوں کے ساتھ مل کر طوفان بپا کردیتی ہے اور کہیں ہلکے سے تھپیڑے سے کشتی کو آگے بڑھا دیتی ہے' اسی طرح جو اثر انسان کی شخصیت یا سیرت پر ڈالا جاتا ہے اس کے حدود متعین نہیں کیے جا سکتے - اول تو خود انسان کی شخصیت میں جسم

اور کہاں تک ان کے لیے نامناسب ہے - اسی طرح تعلیمی اصلاح کا مسئلہ بھی اتنا سہل اور سادہ نہیں کہ اس کا حل کوئی شخص وثوق کے ساتھ پیش کرسکے - اگر خرابیوں کو سمجھنے کے لیے دقت نظری' وسعت خیال' تاریخی واقفیت اور تمدن کا مطالعہ درکار ہے تو اصلاحی تجاویز پیش کرنے کے لیے علاوہ ان تمام چیزوں کے ایک ایسے تخیل کی ضرورت ہے جو ایک آنکھ سے ماضی اور حال کے گوناگوں مناظر کا جائزہ لے سکے اور دوسری سے مستقبل کے دھندھلکے کی سیر کرسکے- یعنی دوش و امروز کے آئینے میں فردا کو دیکھ سکے - اس کتاب کے محدود دائرے میں ہمارا مقصد نہ تو موجودہ نظام تعلیم کا مفصل تنقیدی تجزیہ ہے نہ کوئی مکمل اصلاحی پروگرام پیش کرنا جس پر فوراً عمل کیا جا سکے - ہم زیادہ تر ان مستقل اور ہمہ‌گیر اصولوں سے بحث کریں گے جن کے مطابق ہر نظام تعلیم کی تشکیل ہونی چاہیے اور یہ دکھائیں گے کہ اس عمل تشکیل میں ہر ہر قدم پر تعلیم کو تمدن اور انسانی زندگی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور تعلیم کا نصاب' اس کے طریقے اور عام نظم و نسق یہ سب چیزیں اسی حالت میں درست ہو سکتی ہیں جب وہ تمدن و معاشرت کی کسوٹی پر کسی جائیں - جہاں تعلیم و تمدن کا یہ رشتہ ٹوٹا تعلیم کا اثر بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے اور تمدنی ترقی کے راستے میں بےشمار رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں - ان امور پر غور کرنے کے دوران میں توضیح اور مثال کے طور پر ہم اپنے موجودہ نظام کا ذکر کریں گے اور ضمناً یہ بھی بتائیں گے کہ وہ کس لحاظ سے ناقص ہے اور کس طرح اس کے نقائص دور کیسے جا سکتے ہیں-

باب اول

تعلیم، تمدن اور مدرسہ

موضوع کا تعین

ہمارا مقصد اس کتاب میں یہ ہے کہ تعلیم کے بنیادی اُصولوں اور نظریوں پر بحث کریں اور اس بحث کے ضمن میں اپنے ملک کے موجودہ نظام تعلیم کے نقائص کو ظاہر کرکے اس کی اصلاح کی تجاویز پیش کریں - یہ کام بہت مشکل اور بہت وسیع ہے اور ہم اس کے تمام پہلوؤں پر اس کتاب کے محدود دائرے میں نظر نہیں ڈال سکتے - موجودہ نظام تعلیم کی تنقید بجائے خود ایک مستقل بحث ہے جس کے لیے کئی جلدیں درکار ہیں کیوں کہ اس فرض کو انجام دینے کے لیے ہمیں اس نظام کے تاریخی ارتقا کا مطالعہ کرنا ہوگا تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ اس کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور کس طرح اس میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں ہوتی رہیں جن کے مجموعی اثر سے اس نے موجودہ شکل اختیار کی - اس کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کو پرکھنے کے لیے ہمیں اپنے ملکی تمدن کا مطالعہ کرکے ایک معیار قائم کرنا پڑے گا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ہماری تعلیم کس حد تک ہماری قومی ضرورتوں اور آرزوؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہے

میں بہت تامل ہوتا ۔ علاوہ اُن کے مجھے کتاب کی ترتیب اور مسودے کی صفائی میں اپنی بیوی اور اپنی بہن (بیگم عابد حسین) سے بھی بہت مدد ملی جن کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے - اگر وہ اِس کام میں میرا ہاتھ نہ بٹاتیں تو نہ معلوم اِس میں کتنی تاخیر اور ہوتی -

عزیز جہاں منزل
علی گڑھ

خواجہ غلام السیدین -

تعلیمی خیالات نے مجھ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے اور جن کے تعلیمی نقطۂ نظر سے بڑی حد تک مجھے اتفاق ہے - لیکن میں نے اِس کتاب میں خود کو کسی خاص مصنف یا ماہر تعلیم کے خیالات کا پابند نہیں بنایا بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ جدید تعلیمی خیالات پر ہندوستان کی مخصوص ضروریات اور حالات کے نقطۂ نظر سے تنقید کروں اور انہیں پیش نظر رکھ کر اُن سے استفادہ کروں - کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی مخصوص روایات' اپنی تہذیب و تمدن کے مطالبات' اپنی نفسی زندگی اور اپنے فلسفے کو پس پشت ڈال کر اندھادھند کسی دوسرے ملک کی تقلید کریں گے تو ہرگز منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتے - تعلیم کی جڑیں قومی زندگی کی گہرائیوں میں پنہاں ہیں اور قومی زندگی عبارت ہے ان تمام اثرات اور عناصر سے جن کا تدریجی ارتقا ہماری تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے - اِس لیے ہم کسی نظام تعلیم کو نہ پرانے لباس کی طرح بےپروائی سے اُتار کر پھینک سکتے ہیں نہ نئے لباس کی طرح بےتکلفی سے پہن سکتے ہیں - وہ ایک نفسی اور روحانی نظام ہے جو ایک پودے کی طرح آہستہ آہستہ قومی زندگی کی سر زمین سے اُگتا ہے اور اُس کی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے -

آخر میں مجھے اپنے فاضل دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب (ناظم اُردو اکیڈمی جامعہ ملیۂ اسلامیہ دھلی) کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اِس کتاب کے مسودے کو تمام و کمال پڑھا اور اُس کی زبان میں جابجا اصلاح اور ترمیم کی - اگر وہ اِس ذمہ‌داری کو اپنے سر نہ لیتے تو مجھے کتاب کی اشاعت

نکلیں وہ اپنی ذات میں اہم ترین اور مفید ترین اخلاقی صفات اور اقدار کے حامل ہوں -

میں نے اِس کتاب میں بالعموم تمام تعلیمی بحثوں کو مدرسے کی تعلیم تک محدود رکھا ہے' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیمی مسائل کو اِس میں شامل نہیں کیا کیونکہ اول تو اِس ایک کتاب میں وہ تمام مسائل سما نہیں سکتے - دوسرے تعلیمی اصولوں کے تعین اور توضیح کے لیے سب سے زیادہ موزوں میدان مدرسے کی تعلیم کا ہے جہاں طلبہ کی جبلتوں اور نشو و نما کا مطالعہ زیادہ مکمل اور واضح طریقے پر کیا جا سکتا ہے اور اُن کی تربیت پر فیصلہ‌کن اثر ڈالا جا سکتا ہے - کالج اور یونیورسٹی میں پہنچ کر مرکز ثقل تبدیل ہو جاتا ہے - تربیت کی ذمہ‌داری بہت زیادہ حد تک خود طالب علم کے اوپر عائد ہو جاتی ہے اور تعلیم اور تعلیم‌گاہ کی زیادہ توجہ عقلی اور ذہنی تربیت پر صرف ہوتی ہے - لیکن وہاں بھی ہم کوئی دیرپا کامیابی حاصل نہیں کر سکتے جب تک مدرسے کی تعلیم کو صحیح اصولوں پر قائم نہ کریں - اِس کتاب کا مقصد اِنہیں صحیح اصولوں کی تشریح اور توضیح ہے -

میں نے اِس کتاب کی تصنیف میں مغرب کے بہترین ماہرین تعلیم کے خیالات اور تحریری تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے - اُن کے ناموں کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ اُن کے حوالے جابجا کتاب میں موجود ہیں البتہ میں خاص طور پر امریکا کے جدید فلسفی اور تعلیم جدید کے سرگروہ پروفیسر جان ڈیوئی کا مرہون منت ہوں جن کے

تیسرے حصے کا تعلق اخلاقی اور معاشری تربیت کے اصولوں سے ھے لیکن ابتدا ھی میں یہ بات ظاھر کر دی گئی ھے کہ عقلی اور اخلاقی تربیت کے اصولوں میں کوئی نقیض یا مستقل فصل نہیں ھے بلکہ یہ تقسیم محض اظہار خیال کی سہولت کی خاطر کی گئی ھے - کیونکہ دراصل تعلیم کا موضوع، خواہ تعلیم دماغی ھو یا جسمانی ھو، اخلاقی ھو یا معاشرتی، بچے کی ذات ھے جو ایک سالم اور واحد ھستی ھے اور تمام اثرات جو اُس پر ڈالے جاتے ھیں اُس کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ لیتے ھیں - اِس لیے اِس حصے میں پہلے اخلاق کا حقیقی مفہوم واضح کیا گیا ھے تاکہ اُس کی پوری وسعت اور ھمہ گیری کا اندازہ ھو جائے اور اُس کا کوئی تنگ اور یک‌طرفہ مفہوم نہ لیا جائے - اس کے بعد یہ بحث اٹھائی گئی ھے کہ اخلاق کا تعلق عمل سے اور عقلی تربیت سے کیا ھے اور مدرسے کے مجموعی نظام کا ھر جزو کس طرح اخلاقی تربیت میں معین یا خارج ھوتا ھے - اِس سلسلے میں نصاب، طریقۂ تعلیم، نظام ضبط و تادیب، انعام اور سزا اور معلم کی شخصیت کے اثرات کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا گیا ھے کہ جس وقت تک ان تمام عناصر کی تنظیم بعض خاص اصولوں کے تحت میں نہ کی جائے تاکہ اُن کا مجموعی اثر طلبہ پر ھم‌آھنگ ھو کر پڑے مدرسہ موثر طریقے پر اخلاقی اور معاشرتی تربیت کا مرکز نہیں بن سکتا - آخری باب میں اخلاقی سیرت کے عناصر کا تجزیہ کر کے یہ بتایا گیا ھے کہ طلبہ کی اخلاقی سیرت کی تعمیر کس طرح کرنی چاھیے تاکہ ھمارے مدرسوں سے جو نوجوان تعلیم پا کر

کیا اثر ڈالتی ہے - ہمارے نظام معاشی نے ماہرین تعلیم اور
تعلیم گاہوں کے لیے کیا جدید اور اہم مسائل پیدا کر دیے
ہیں - حکومت کا تعلق تعلیم کی نوعیت اور اُس کے نظم
و نسق سے کیا ہے اور ملک کی موجودہ سیاسی حالت میں
کس قسم کی تعلیم درکار ہے؟ مختصر یہ کہ اِس حصے
میں تعلیم کے وسیع تر علائق اور نتائج سے بحث کی گئی ہے
تاکہ بالخصوص معلموں کو یہ محسوس ہو جائے کہ اُن کے کام
کی اہمیت اور حیثیت محض ایک اصطلاحی فن کی نہیں
بلکہ اُس کے اثرات بہت دور رس ہیں اور اُس پر تمدنی
زندگی کے تمام شعبوں کا رد عمل ہوتا رہتا ہے -

دوسرے حصے میں "درسی تعلیم" کے عنوان کے ماتحت
اُن مباحث کو پیش کیا گیا ہے جو بالعموم رسمی طور پر
عقلی اور دماغی تربیت کے سلسلے میں اٹھائے جاتے ہیں
مثلاً ذہنی تربیت، تدوین نصاب، جسمانی تربیت وغیرہ -
لیکن ان ابواب کے ذیل میں "درسی تعلیم" کا جو نظریہ
پیش کیا گیا ہے وہ استادوں کے عام نقطۂ نظر سے بہت مختلف
ہے کیونکہ برخلاف اِس مفہوم کے جو مدرسے کے متعلق اُن کے
ذہن میں ہے اِس میں "مدرسۂ عمل" کے اصولوں کی تشریح
کی گئی ہے اور علم اور زندگی، علم اور عمل، رسمی مضامین
اور عملی مشاغل اور دستکاریوں اور ذہنی اور جسمانی تربیت
کے تعلق اور وحدت کو ظاہر کیا گیا ہے اور تعلیم کے مختلف
شعبوں کے درمیان جو فصل اور تناقض قائم ہو گیا ہے
اُس کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے - یعنی جام کہن
میں مے نو پیش کی گئی ہے کہ وہ مے کہن سے بہتر ہے -

کے نام سے دو جلدوں میں شائع کر دیا ہے جن سے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ اور اہم تعلیمی مسائل پر روشنی پڑتی ہے - نارمل اسکولوں کی درسی کتب علمی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں - بس یہ ہے ہمارا کل تعلیمی سرمایہ! لہذا جہاں اِس کتاب کی تصنیف کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندستانی اکیڈیمی نے مجھے اِس کو لکھنے کی دعوت دی وہاں دوسری وجہ یہ احساس ہے کہ موجودہ زمانے میں ہر تعلیمی تصنیف ایک نہایت شدید ضرورت کو پورا کرتی ہے اور شعبۂ تعلیم سے دل‌چسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان میں تعلیمی تصانیف کا اضافہ کر کے اِس کی موجودہ کم‌مائگی کو دور کریں -

اِس کتاب کا مقصد اور نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اِس کے مضامین کی تقسیم کا اصول بیان کر دیا جائے - کتاب کے پہلے حصے میں میں نے تعلیم اور تمدن کے باہمی تعلق سے بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ تعلیم کا رشتہ تمدن کے مختلف شعبوں سے کیا ہے اور وہ کس طرح اُس پر اثرانداز ہوتے ہیں - فن تعلیم کے بہترین ارباب فکر کا نظریہ یہی ہے اور یہی رہا ہے کہ ہم تعلیم کے کسی مسئلے کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک اُس کا مطالعہ اُس کے تمدنی ماحول میں نہ کیا جائے - لہذا اِس حصے میں میں نے اُن تعلیمی مسائل سے بحث کی ہے جو موجودہ تمدنی اداروں کے مطالبات اور خصوصیات کی بدولت پیدا ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ خانگی زندگی اور درسی زندگی کا کیا تعلق ہے - افراد کی سیرت اور شخصیت پر اجتماعی زندگی

اصول تعلیم

دیباچہ

اُردو زبان میں فن تعلیم پر کتاب لکھنے کے لیے کسی معذرت کی ضرورت نہیں- یہ اُن علوم میں سے ہے جن پر ہماری زبان میں بہت ہی کم کتابیں لکھی گئی ہیں حالانکہ نظری اور عملی اہمیت کے اعتبار سے اس کو انسانی علوم کی صف اول میں جگہ دینی چاہیے - شائد فی الحال ہمارے پاس چند ترجموں، چند مختصر تالیفوں اور نارمل اسکولوں کی درسی کتابوں کے سوا تعلیمی لٹریچر میں کچھ بھی نہیں - ترجموں میں سب سے مقتدر اور مستند کتاب ہربرٹ اسپنسر کی "فلسفۂ تعلیم" ہے - کچھ رسالے اخلاقی تعلیم اور تعلیم کے بعض اور خاص مباحث پر لکھے گئے ہیں - کچھ مفید اور قابل قدر مواد اخباروں اور رسالوں وغیرہ کے متفرق مضامین میں ملتا ہے مثلاً سر سید احمد خاں کے مضامین تہذیب الاخلاق کی جلدوں میں یا اُن خطبوں میں جو وقتاً فوقتاً ملک کی تعلیمی انجمنوں کے اجلاسوں میں دیے گئے ہیں - آل انڈیا مسلم' ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے گزشتہ چالیس سالانہ جلسوں کے خطبات صدارت کو "خطبات عالیہ"

تعلق - مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب تعلیم‌یافتہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد اپنی مادری زبان کو بگاڑ کر بولنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتی تھی - شکر ہے خدا کا کہ وہ زمانہ اب ختم ہوتا جا رہا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جو خود اپنی تہذیب اور روایات کی عزت نہیں کرتے' ان کی عزت غیر قومیں بھی نہیں کرتیں -

اس کتاب کا وہ حصہ جس کا تعلق فن معلمی سے ہے ہمارے ملک کے اساتذہ کے لیے بےحد مفید ثابت ہوگا - اس کے پڑھنے سے اُن کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ آج کل دنیا میں مختلف ممالک کس قسم کی تعلیمی جد و جہد میں مشغول ہیں اور مختلف قوموں نے اپنا تعلیمی نصب‌العین کیا قرار دیا ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں - یہ کتاب ایک ایسے وقت میں شائع ہو رہی ہے جب ہمارے ملک کے سیاسی ماحول کے بدلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں - مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے ہر شخص کی معلومات میں اضافہ ہوگا چاہے اس کا تعلق تعلیم سے ہو یا سیاست سے - اگر ان اصولوں پر عمل کیا گیا جن کو اس کتاب میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے تو یہ ہمارے ملک کے لیے ایک نیک فال ہوگی اور وہ زمانہ جلد آجائے گا جب ہم یہ کہہ سکیں گے کہ تعلیمی دنیا میں ہمارا ملک بھی کوئی وقعت رکھتا ہے-

سید راس مسعود

بھوپال

جنوری سنہ ۱۹۳۵ع

پیش کر سکتے ہیں جو دوسرے ممالک کی زبانوں میں اس
مضمون پر لکھی جارہی ہیں - جہاں تک تعلیم کے اصولی
مباحث کا تعلق ہے مصنف نے ہر پیچیدہ مسئلے کو نہایت
قابلیت کے ساتھ ایک سلیس زبان میں عام فہم بنا کر ناظرین
کے سامنے پیش کر دیا ہے - اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ
اِس زمانے میں جب کہ ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کا
شیرازہ بکھرا ہوا ہے تعلیم و تربیت اور تعلیم و تمدن کا گہرا
باہمی تعلق از سر نو سمجھا جائے اور یہ بتایا جائے کہ تعلیم
بغیر تربیت کے ملک کے لیے مفید نہیں ہو سکتی - مجھے
لائق مصنف کی اس رائے سے بھی پورا اتفاق ہے کہ کوئی نظام
تعلیم صحیح معنوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا جس نے اپنے
تمدنی ماحول اور تاریخی روایات کو نظرانداز کر دیا ہو -

میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا عقیدہ ہے کہ ہمارے ملک
میں صحیح تعلیم اُس وقت تک نہیں پھیل سکتی جب تک
کہ ہم اپنی مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم نہ بنائیں - موجودہ
نقّالی سے جو نقصان ہو رہا ہے وہ اظہرمن الشمس ہے اور اسی
کا ایک بڑی حد تک یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے مدرسوں کے پڑھے
لکھوں میں غور و فکر کا مادّہ کم ہوتا جاتا ہے - ان کی زیادہ‌تر
قوت نقّال بننے میں صرف ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ
ہماری قومی زندگی کی جڑیں زیادہ مضبوط ہوں اور سچی
خودداری میں اضافہ ہو دونوں میں کمزوری بڑھتی جاتی ہے -
موجودہ غلط طرزِتعلیم نے ایک ایسا فرقہ ہمارے ملک میں پیدا
کرنا شروع کر دیا تھا جس کو نہ اپنی قومی روایات سے کوئی
دلچسپی تھی، نہ ملک کے عام باشندوں کے ساتھ ہمدردی اور

مقدمہ

(از جناب نواب مسعود جنگ بہادر ڈاکٹر سر راس مسعود صاحب
ایل - ایل - ڈی - ڈی لٹ' بیرسٹر ایٹ لا - سابق وائس چانسلر
علی گڈھ مسلم یونیورسٹی)

اس کتاب کے فاضل مصنف کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس نے ہمیشہ ادب کی اور بالخصوص اردو ادب کی صحیح خدمت کی ہے - خواجہ غلام السیدین صاحب کی رگوں میں الطاف حسین حالی مرحوم کا خون ہے اور یہ اسی کا فیض ہے کہ اِن کی تحریر میں وہی سادگی اور صداقت پائی جاتی ہے جس نے حالی کی بیش بہا تصانیف کو اردو کے آئندہ ادیبوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بنا دیا ہے -

یہ ایک نہایت دل خوش کن شگون ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے ہونہار نوجوانوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے جنھوں نے مغرب میں تعلیم پانے کے بعد اُردو زبان کی کم مائگی کو دور کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور جن کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ اب اردو میں بھی اِس قسم کی کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں جن پر ہر ملک فخر کر سکتا ہے - میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ تعلیم اور اصول تعلیم پر خواجہ غلام السیدین صاحب کی اس کتاب سے بہتر آج تک کوئی کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی - یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کو ہم فخریہ ان مستند کتابوں کے مقابلے میں

فہرست مضامین

صفحہ

انتساب

میں اپنی اِس تصنیف کو اپنے والد ماجد آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں جنہوں نے اپنی تمام عمر اُن صحیح خیالات اور قدروں کی اشاعت میں صرف کی جن پر قومی زندگی کی صحت اور بقا کا انحصار ہے اور جن کی موثر تبلیغ، تعلیم کا مقدس فرض ہے۔

نہاں در سینۂ ما عالمے ہست
بخاک ما دلے، در دل غمے ہست
ازاں صہبا کہ جانِ ما بر افروخت
ہنوز اندر سبوے ما نمے ہست

غلام السیدین

اصول تعلیم

مصنفهٔ

خواجه غلام السیدین، بی - اے - ایم - ایڈ
پروفیسر تعلیمات و پرنسپل ٹریننگ کالج
مسلم یونیورسٹی - علی گڈھ

(مع مقدمہ از ڈاکٹر سرسید راس مسعود، ایل-ایل-ڈی-ڈی لٹ)

الہ آباد :
ہندستانی اکیڈیمی، یو - پی
۱۹۴۱